اکبر سے اورنگ زیب تک

(ہندوستان کی معاشی تاریخ کا ایک مطالعہ)

ڈبلو۔ ایچ۔ مورلینڈ

مترجم

جمال محمد صدیقی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سر چشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور

پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

دیباچہ

میں نے تصنیف ہذا میں ہندوستان کی معاشی تاریخ کے مطالعہ کو جس کا پہلا حصہ "انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر"[1] میں پیش کیا گیا تھا، ایک منزل اور آگے بڑھایا ہے۔ میں نے اس تصنیف میں سترھویں صدی کے آغاز پر جو معاشی حالات تھے انھیں مجملاً بیان کیا تھا۔ اب میری تحقیقات کا موضوع وہ تبدیلیاں ہوں گی جو ان حالات میں اگلے پچاس یا ساٹھ سال کی مدت میں پیش آئیں۔ یہ مدت مغلیہ شہنشاہان جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد حکومت پر محیط ہے۔ تاریخی ترتیب یا بادشاہوں کے سلسلہ کے قابل لحاظ امور سے قطع نظر یہ مدت خود اپنی ایک وحدت رکھتی ہے۔ تجارت کے معاملہ میں، پرتگیزیوں کا عملی اخراج، ملک کے اندر ولندیزی اور انگریز تاجروں کا استقرار اور ان نو وارد تاجروں کے مشاغل کا پہلا تجرباتی دور، اس عہد کی نمایاں خصوصیات ہیں اور وسیع تر معاشی میدان میں یہ مدت اکبر کے انتظامی ضابطوں کے انحطاط کے اہم ترین مراحل پر حاوی ہے۔ یہ موضوعات تفصیلی تحقیقات کے مستحق ہیں اور ان کا علیحدہ ہی سے مطالعہ مفید ہوگا۔ ہمیں اپنے اس مطالعہ کے دائرہ میں ان نئے حالات کو شامل نہ کرنا چاہیے جو عہد عالمگیری کی امتیازی خصوصیات ہیں یعنی مزید انتظامی تبدیلیاں، مرہٹہ طاقت کا عروج اور علاقائی مسائل سے غیر ملکی تاجروں کی بڑھتی ہوئی دلچسپی، جو مالابار میں ولندیزی، بمبئی میں انگریزی، اور پانڈیچری میں فرانسیسی آبادیوں کے قیام سے ظاہر ہوتی ہے۔

مطالعہ کی ترتیب زیادہ تر، قابل حصول معلومات کی نوعیت کے اعتبار سے متعین کی گئی ہے۔ اس دور کی ولندیزی اور انگریزی تحریریں نامکمل ہونے کے باوجود ان اقوام کے بنیادی مقصد یعنی تجارت کے ایک خاصے باضابطہ مطالعہ کے لیے کافی وسیع ہیں اور جب ہم اس مقصد کے تحت ان تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ضمنی مشاہدات کا ایک کثیر ذخیرہ بہم پہنچتا ہے جو ہندوستانی ماخذ سے پورے ملک کی معاشی زندگی اور اس پر مسلط مختلف ملکی انتظامات

---

[1] INDIA AT THE DEATH OF AKBAR

کے متعلق حاصل ہونے والی متفرق معلومات کی ایک قدرے پُراعتماد تشریح میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ پس ہم نے بیرونی تجارت کے بیان سے شروع کرنا اور پھر اس طور پر جو معلومات سامنے آئیں انھیں زیادہ اندرونی دلچسپیوں کے موضوعات کی وضاحت کا ذریعہ بنانا مفید خیال کیا۔ شروع ہی سے میں نے اولین انگریز تاجروں کی سرگرمیوں کو ان کے پیشرو ولندیزیوں کی وسیع تر اور نفع بخش کارروائیوں کی صحیح نسبت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ولندیزی کارروائیوں کو ہندوستانی تاریخ کی بعض مروجہ درسی کتابوں میں بیشتر نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ یہ انگریز نہیں بلکہ ولندیزی تھے جو پرتگیزیوں کے ایشیائی سمندروں پر تسلّط کے جانشین ہوئے اور ایک صدی کے بیشتر حصہ میں ولندیزی ہی ہندوستان کی بیرونی تجارت کے سب سے بڑے حصہ کے شریک دار رہے۔ میرے خیال میں یہ ایک افسوسناک بات ہے کہ ابھی تک بہت ہی کم مورخین نے ان کے اس قدر اہم اثرات کو اپنی توجہات کا موضوع بنایا لیکن جن ماخذ سے ان کے متعلق معلومات حاصل کی جا سکتی تھی ان تک عدم رسائی اس فروگذاشت کی ایک معقول توجیہہ ہو سکتی ہے۔ اول تو ولندیزی اہل علم کا براعظم کے معاملات کے بجائے جہاں ان کی قوم نے اپنے قدم نہ جمائے تھے، اپنے جزیرہ کی عظیم مملکت کی تاریخ کی طرف متوجہ ہونا ایک بالکل قدرتی عمل تھا اور مجھے ڈاکٹر ٹرپسٹرا کی دو جلدوں کے علاوہ، جن کا میں نے اکثر حوالہ دیا ہے، کوئی اور ایسی مثال نہ مل سکی جس میں ولندیزیوں نے قابل حصول معلومات کو کسی بھی خالص ہندوستانی مسئلہ کے مطالعہ کے سلسلے میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہو۔ دوسرے یہ کہ بیشتر انگریز اور تقریباً تمام ہندوستانی مورخین اس زبان سے ناواقف ہونے کے باعث ولندیزی زبان کی مطبوعہ تحریروں کو بھی استعمال میں لانے سے معذور رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں مختلف مقبول عام تصانیف میں اولین انگریز مہم بازوں کی ان کی جرأت مندانہ پیش قدمیوں کے لیے توصیف یا ان کی غیر شائستہ بداعمالیوں کے لیے مذمت جیسی بھی صورت ہوتی ملتی ہے، حالانکہ یہ لوگ اپنے اس عمل میں محض اپنے پیشرو ولندیزیوں کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ اس عہد کی تاریخ کے سلسلہ میں ولندیزی ماخذ کو نظرانداز کرنا اس لیے مزید افسوس کا موجب ہے کہ بعض پہلوؤں سے یہ انگریزی ماخذ سے بلاشبہ بہتر ہیں۔ ولندیزی تاجروں نے بہت سی باتوں کو ضبط تحریر میں لانے کا اہتمام کیا اور انگریزوں نے انھیں بطور امر مسلمہ قبول کر لیا۔ ان کے نسبتاً زیادہ پھیلے ہوئے مشاغل نے انھیں نظر کی وسعت عطا کی اور بٹاویا کے حکام کے نافذ کردہ نظم کے نتیجہ میں دور دراز مقامات پر جو کاروبار کیے جاتے ان کی تفصیلی اور باضابطہ تحریریں وجود میں آئیں۔

انگریزی داں طالب علم بیشتر انگریزی ماخذ پر قدرتی طور پر اعتماد کرتے رہیں گے لیکن اگر انھوں نے ان کے ساتھ ساتھ ولندیزی ماخذ کی فراہم کردہ معلومات۔ سے بھی استفادہ نہ کیا تو اس کا امکان ہے کہ بہت سے اہم مسائل پر ان کی قائم کی ہوئی رائے غلط یا ناقص ثابت ہو۔

عہد زیر بحث کے غیر مطبوعہ ماخذ کے بارے میں یہ بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ یہ اب انڈیا آفس کے کاغذات میں تقریباً بالکل نہیں پائے جاتے۔ مسٹر ولیم فوسٹر کی خود تیار کی ہوئی یا ان کے زیر نگرانی تیار کی گئیں فہرستیں (کیلنڈرس) عام طالب علموں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی مفصل ہیں۔ میں نے اصل کاغذات سے معلومات جمع کی ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ مجھے ان میں ایسا بہت ہی کم مواد مل سکا جو پہلے سے طبع نہ ہو چکا ہو، مثلاً تجارتی دستاویزات سے تھوڑے بہت ایسے اعداد اور وقتاً فوقتاً چند ایسے فقرے جو کسی غیر اہم مسئلہ پر مزید روشنی ڈالتے ہوں۔ لہٰذا انگلستان کا سفر کرنے سے معذور ہندوستانیوں کو اس امر پر مطمئن رہنا چاہیے کہ ان مطبوعہ فہرستوں (کیلنڈرس) سے انھیں پورے واقعات معلوم ہو سکیں گے۔ ولندیزیوں کی ضخیم تحریروں کے متعلق ایسے کیلنڈر موجود نہیں ہیں لہٰذا ان کے مشمولات پر یقین کے ساتھ کوئی گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ میں ان پر کوئی باضابطہ تحقیقات نہ کر سکا اور میرے علم کی حد تک ہندوستانی نقطۂ نگاہ سے ان کا ابھی تک جو واحد مطالعہ کیا گیا ہے وہ وہی ہے جس کے نتیجہ میں ہیگ کے محافظ خانہ سے ٹرانسکرپٹس (TRANSCRIPTS) نام کی تحریر جو انڈیا آفس میں موجود ہے وجود میں آئی۔ اس تصنیف کے سلسلے انگلستان میں تحقیقاتی کام کرنے والے طالب علموں کے لیے بے بہا قدر و قیمت کے حامل ہیں مگر معاشیاتی نقطۂ نگاہ سے یہ بالکل ناکمل ہیں۔ مخصوص مسائل پر معلومات فراہم کرنے کی میری خواہش پر، ولندیزی پبلک ریکارڈ کے دفتر نے مجھے معمولاً ان اہم دستاویزات کے عکسی فوٹو فراہم کیے جو ٹرانسکرپٹس میں شامل نہیں ہیں یا جن کے ابھی تک انگریزی زبان میں حوالے نہیں آئے ہیں اور زیر بحث عہد کے تمام طالب علموں کو غیر محقق مواد کے اس کثیر ذخیرہ کو ذہن میں رکھنا چاہیے کسی فرد واحد کے لیے معلومات کے اتنے بڑے ذخیرہ کی چھان بین غالباً ایک بہت بڑا کام ہوگا۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ ہندوستانی تاریخ کی تحقیقات سے دلچسپی رکھنے والی انجمنیں یا ادارے ادھر متوجہ ہوں۔

جہاں تک ہندوستانی ماخذ کا تعلق ہے، مجھے سوائے ان کے جو اس ملک میں موجود ہیں، دیگر ہمعصر مخطوطات کی چھان بین کا موقع نہ مل سکا اور مجھے اس میں ذرا شک نہیں کہ تصنیف نہا کے

اخیر ابواب میں جن موضوعات پر بحث آئی ہے، ان میں ہندوستانی دارلمطالعات میں موجود ذخیرد ل کے مطالعہ کے بعد کافی معلومات کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا میری سابقہ تصنیف کی طرح پیش نظر کتاب بھی موضوع متعلقہ پر کوئی فیصلہ کن تحریر نہیں ہے بلکہ یہ محض ایک اجمالی خاکہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں اُن تمام یا بیشتر تمام فی الوقت مطبوعہ شواہد پر جو کثیر التعداد تصنیفوں میں جا بجا منتشر ہیں اور جو سب کا سب ہندوستانی مطالعہ کرنے والوں کے لیے بہ سہولت قابل حصول نہیں ہیں تبصرہ کیا گیا ہے اور اس میں بعض ان ماخذ کو بھی جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں، ملحوظ رکھا گیا ہے حالانکہ انھیں بالکل ختم کرنے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ عہد زیر بحث کی تاریخ کے سلسلہ میں ابھی تحقیقات کی بیحد گنجائش رہ جاتی ہے۔ اس گنجائش کو محض ولندیزی تحریر دل ہی تک محدود نہ تصور کرنا چاہیے بلکہ اس کے دائرہ میں وہ جملہ تحریری مواد بھی شامل ہے جو ہندوستانی طالب علموں کی رسائی کے اندر ہے اور جن کے وہ بہترین مفسر ہو سکتے ہیں۔

میں نے اس کتاب کی ترتیب کچھ اس طور پر قائم کی ہے جو عام قارئین کے لیے قابل فہم ہونے کے علاوہ غور و فکر کرنے والے طالب علموں کو اصل ماخذ سے متعارف کرانے کا ذریعہ بھی ثابت ہو۔ جو بھی واقعات اس کتاب میں درج کیے گئے ہیں میں امید کرتا ہوں کہ ان سب کے حوالے ہر باب کے اختتامی نوٹوں میں ملیں گے اور میں نے ضمیموں میں ایشیائی تجارت کے متعلق ایسی نیز تفصیلات کو یکجا کر دیا ہے جن میں سے بعض بہت زیادہ آسانی سے قابل حصول نہیں ہیں یہ طالب علموں کے لیے ان کے مطالعہ کی ابتدائی منزلوں میں جب تک تجربہ سے وہ ان تحریروں کی اصطلاحی زبان سے روشناس نہیں ہو جاتے مفید ثابت ہوں گے۔ میں نے قدیم مصنفین اور دستاویز کے اقتباسات میں، ہجے اور تلفظ کو معمولاً جدید طرز پر تبدیل کر دیا ہے۔ باستثنار ہندوستان کے سوتی سامانوں کے بیان کے ہندوستانی الفاظ کے سلسلہ میں میں نے ایک زبان کے لفظ کو دوسری زبان میں لکھنے کا وہ طریقہ جو امپیریل گزیٹیر میں ملتا ہے معمولاً اختیار کیا ہے۔ اس کے نظام تسمیہ پر ایک وسیع مطالعہ کی گنجائش پائی جاتی ہے۔ بہت سی تجارتی اصطلاحوں کی اصل ابھی تک تحقیقات طلب ہے اور جب تک ان پر پردہ پڑا ہوا ہے انھیں دوسری زبان میں صحیح طور پر منتقل کرنا ناممکن ہوگا۔ ایسی صورت میں، میں نے ناموں کی عام ہمعصر شکلوں کو اختیار کرنا مناسب سمجھا جس سے میرا مقصد لسانی معاملات پر اظہار رائے سے جس کا میں خود کو اہل نہیں سمجھتا احتراز کرنا ہے۔

اب صرف اس ملک اور برِّ صغیر ہندوستان کے صاحب علم اصحاب کے فراخدلانہ تعاون کا اعتراف باقی رہ جاتا ہے۔ مخصوص مسائل پر معلومات یا تعاون کے لیے مِس ایل۔ ایم۔ انیٹے، ڈاکٹر ڈبلو آر شب، مسٹر آر۔ برن، مسٹر سی۔ ای۔ کیر نگٹن، مسٹر رابرٹ گلان، مسٹر ولیز لی ہیگ، پروفیسر جادو ناتھ سرکار، پروفیسر شفاعت احمد خاں، پروفیسر جی ڈبلیو۔ ڈینیلس اور برٹش میوزیم کے شعبۂ سکہ جات وتمغات و شعبۂ مشرقی مخطوطات کے دیگر عہدہ داران ہمارے خصوصی تشکریہ کے مستحق ہیں۔ لندن یونیورسٹی کے پروفیسر پی۔ گیل نے بعض ولندیزی تحریروں کے پورے پورے مفہوم کو سمجھنے میں مجھے انتہائی بیش قیمت، امداد فراہم کی ہے۔ رٹر کار تسیف کے ڈاکٹر ہے۔ ڈی۔ ہولو نے اپنے زیرِ نگرانی قدیم کاغذات سے معلومات تلاش کر کے مجھے فراہم کرنے میں انتہائی فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے اور آخر میں انڈیا آفس کے مسٹر ڈبلو۔ فوسٹر نے دوبارہ مجھے زیرِ بحث عہد کے متعلق اپنی غیر معمولی واقفیت سے مسلسل استفادہ کا موقع دیا ہے۔

فہرست

ضمیمہ جات

نقشہ

باب - ۱

ایشیائی ماحول

فصل ۱ - سیاسی صورتِ حال

اس تصنیف کا موضوع ان معاشی سرگرمیوں کا مطالعہ ہے جنھوں نے سترھویں صدی کے نصف اول میں ہندوستان کو متاثر کیا۔ لیکن مناسب ہوگا کہ اول ہندوستان اور ان ممالک کے جن سے ان دنوں ہندوستان کے تجارتی روابط قائم تھے سیاسی حالات کا مختصراً تعارف کرادیا جائے۔ تصنیف موسومہ 'انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر' کی طرح اس کتاب میں بھی لفظ ہندوستان سے وہ علاقہ مراد ہے جو فی الوقت مملکت ہند اور ہندوستانی ریاستوں کے نام سے موسوم ہے اور جس سے صوبۂ برما جس کا ہندوستان سے سیاسی الحاق بہت بعد میں عمل میں آیا خارج ہے۔

اس علاقہ کا بیشتر حصہ تین بڑی تقسیموں پر مشتمل تھا۔ شمال میں مملکت مغلیہ، وسط میں دکنی سلطنتیں اور جنوب میں ہندو سرداروں کے علاقے۔ جہاں تک مملکت مغلیہ کا تعلق ہے، مدت زیر مطالعہ کا جہانگیر اور شاہ جہاں کے ادوار حکومت سے تعلق ہے۔ اہل معاشیات کے لیے ان ایام کی سیاسی تاریخ اپنے اندر دلچسپی کا کوئی سامان نہیں رکھتی۔ علاوہ ان بدیہی حقائق کے کہ بدامنیوں کے تواتر سے وقتی نقصانات کے علاوہ مستقبل کی تجارتی سرگرمیوں میں ہرج واقع ہوتا اور اخراجات عامہ میں زیادتی پیدا کرنے والوں پر انتظامیہ کا دباؤ بڑھ جاتا، ان ایام کی وقتی بغاوتیں، تخت نشینی کی جنگیں اور درباری سازشوں کے

'INDIA AT THE DEATH OF AKBAR'

لامتناہی چکر ایسے موضوعات ہیں جن سے ہمارا کوئی خاص تعلق نہیں۔ سرحدوں کے معاملہ میں شمال کی طرف کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا اور مغرب میں قندھار پر قبضہ کرنے کی غرض سے فارس سے جو جنگ پیش آئی اس کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس جنگ نے ان دو ملکوں کے درمیان زمینی تجارت کے علاوہ خلیج کھمبات کی تجارت کو بھی متاثر کیا۔ مشرق میں مغلوں کی حکومت کا عمل دائرہ دہانہ میگھنا یا اس کے قریب تک پہنچ کر ختم ہو گیا تھا اور مشرقی بنگال کے کچھ حصے 1666ء تک، جب حکومت مغلیہ نے چٹاگانگ پر قبضہ کر کے اس کو معہ درمیانی علاقہ کے اپنی حکومت میں شامل کیا، اراکان کے بادشاہ کے ہی زیر نگیں رہے۔ جنوبی سرحد پر البتہ زیادہ اہم تبدیلیاں پیش آئیں جہاں دکنی سلطنتوں کو زیر تسلط لانے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ دکنی سلطنتوں سے عموماً جن پانچ اکائیوں کا مفہوم تھا ان میں سے بیدر کو اس کے پڑوسی ہڑپ کر کے اس کے وجود کو صفحۂ تاریخ سے مٹا چکے تھے اور خاندیش پہلے ہی مغلوں کا ایک صوبہ تھا۔ اکبر کی احمد نگر کو فتح کرنے کی کوشش 1636ء میں کامیاب ہوئی اور اسی سال اس کے بیشتر علاقوں پر مغلوں کا تسلط ہوا اور تقریباً انھیں ایام میں بیجاپور اور گولکنڈہ کی دو بقیہ سلطنتوں پر بھی قبضہ کیا گیا مگر عملاً یہ قبضہ ان کے اندرونی نظام پر اثر انداز نہ ہوا۔

جنوب کے ہندو علاقوں کی تفصیلی تاریخ بیان کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی 1565ء میں وجے نگر کی طاقت کو ختم کرنے کے بعد اس علاقہ کو وہاں کے سرداروں کے قبضہ میں جو نایک کہے جاتے تھے رہنے دیا گیا تھا۔ یہ سردار نظری طور پر اور کبھی کبھی عملاً بھی وجے نگری خاندان کے نمائندہ کی جو چندر گری کے بادشاہ اور عرف عام میں کرناٹک کے بادشاہ کے لقب سے موسوم تھا فرمانروائی کو تسلیم کرتے تھے۔ ولندیزی اور انگریزی تحریروں سے معلومات کی جو جھلکیاں بہم پہنچتی ہیں ان کے مطابق یہ نایک آپس میں مسلسل لڑتے رہتے تھے۔ ان خانہ جنگیوں میں بادشاہ کی حیثیت کبھی کٹھ پتلی کی اور کبھی ایک سرگرم شریک کار کی رہا کرتی تھی جماعت بندیوں میں جلد جلد تبدیلیاں ہوا کرتی تھیں جس کے باعث امن و امان تقریباً مفقود تھا۔ اسی اثنا میں گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتیں ان نایکوں میں سے کبھی ایک کی اور کبھی دوسرے کی مدد سے اس سمت اپنے علاقوں میں توسیع کر رہی تھیں۔ ان جنگوں کے جواز میں ایسے وجوہ کا جو موجودہ معیار سے معقول تصور کیے جائیں سراغ نہیں ملتا۔ مگر ان دنوں عام طور پر حصول محاصل و خزانہ کے امکان ہی کو جنگوں کا معقول سبب تصور کیا جاتا تھا۔ ان سے نسبتاً چھوٹے ہندوستانی

علاقوں میں پرتگالیوں کے حالات کا بیان اگلی فصل میں آئے گا۔ بقیہ علاقے معاشی نقطۂ نگاہ سے غیر اہم ہیں بجز کالی کٹ کی چھوٹی ریاست کے جو اس وقت تک عملاً خود مختار تھی اور مالابار کے سیاہ مرچ پیدا کرنے والے ساحل پر واقع ہونے کے باعث اس دور کی تجارتی سیاست میں قدرے اہمیت کی حامل تھی۔

ہم جنوبی ہندوستان کے مذکورہ حالات کو تقریباً بجنسہ ایشیا کے بیشتر حصہ پر منطبق کر سکتے ہیں۔ ہندوستان سے جن ممالک کے ان دنوں روابط قائم تھے ان سب میں اگر جنگ معمولات میں داخل نہ تھی تو بھی وہاں کے تاجروں اور پیدا کرنے والوں کو اس کا ہمہ وقت خطرہ لاحق رہا کرتا تھا۔ دوسری طرف اس قدر حقیر اسباب پر جنگیں چھڑ جاتی تھیں کہ کوئی معقول پیش بینی بھی ممکن نہ تھی اور بجز اس کے کہ حالات جب اور جیسے پیدا ہوں، ان سے موافقت پیدا کرلی جائے، کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔ ہندوستان کے مغرب میں اہم ترین ممالک فارس اور ترکی تھے۔ ان کے درمیان اکثر جنگوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا جو تجارت پر اثر انداز ہوا کرتے اس کے علاوہ ترکوں کا بھی بحر قلزم کے سواحل پر قبائیلیوں سے کبھی کبھی مناقشہ رہا کرتا تھا۔ ہندوستان کے پورب میں اراکان، پیگو، آوا، اور سیام کے ممالک کا ایک مجموعہ تھا جن کے متعلق یہ کہنا درست ہوگا کہ ان کے درمیان کسی وقت بھی جنگ چھڑ سکتی تھی اور سیام کے بارے میں تو یہ سوچا جا سکتا تھا کہ وہ اس علاقہ میں جس کو اب ہند چین کہتے ہیں اور جہاں مقامی جنگیں کچھ کم نہ تھیں، دخل اندازی کرے گا۔ اس دور میں چین پر حملہ آوروں کا تسلط ہو رہا تھا اور جاپان جس نے حال ہی میں کوریا پر اپنا اقتدار جمانے کی کوشش کی تھی خود طویل خانہ جنگیوں کی جولاں گاہ بنا ہوا تھا۔

جنوبی جزائر میں غالباً صورت حال براعظم سے بھی بدتر تھی کیونکہ یہاں چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کی موجودگی کی وجہ سے باہمی نزاع کے مواقع اور زیادہ تھے۔ سماترا میں خاص طاقت اشین کے جابر حکمراں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ خاندان سولہویں صدی میں چند قدیم بادشاہتوں کا قلع قمع کرنے کے بعد وجود میں آیا تھا۔ اشین کا مغربی ساحل کے بیشتر سیاہ مرچ پیدا کرنے والے علاقہ پر قابو تھا اور یہ بار بار مزید مشرق کے چھوٹے چھوٹے بادشاہوں کو زیر اقتدار لانے کے درپے تھا۔ لیکن اس کی دشمنی کا خاص نشانہ ملاکا کے پرتگالی تھے جن کے علاقوں پر اس کو کوئی خاص حق نہ پہنچتا تھا مگر وہ اپنے تجارتی مفاد کے باعث اس کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ مغربی جاوا میں بنتم اور جاکرتا کی پڑوسی سمندری مملکتوں کو خود آپس میں یا اپنے پڑوسیوں سے جنگ کا ہمہ وقت خطرہ لگا رہتا تھا

اور ولندیزیوں کے بتاویا پر تسلط کے بعد بھی ابتداً امن و امان قایم نہ ہو سکا۔ جزیرۂ سلیبز کے خاص مقام مکسر کا بادشاہ مشرقی جاوا کی فتح کا آرزومند تھا اور اس کا تجارتی مفاد اس کو ولندیزیوں سے کبھی کبھی برسرپیکار دیکھتا تھا۔ سولہویں صدی کے اختتام پر سالہ کے جزیروں کی صورت حال بیحد تشویشناک ہو چکی تھی۔ ان دنوں جزیرہ بندہ کے باشندے پرتگیزیوں سے رہائی حاصل کرکے وقتی طور پر ایک غیر یقینی نوعیت کی خود مختاری کے مزے لے رہے تھے۔ امبینا پر ابھی تک پرتگیزیوں کا تسلط قایم تھا جس کا خاص سبب ان کے مقامی دشمنوں کا باہمی جنگ و جدل تھا۔ خاص جزیرہ ملکز میں جس قدر جزیرے تھے اتنی ہی جماعتیں اور چونکہ ایک پرمنفعت مشرقی تجارت کے لیے ان جزائر کی برآمدات پر اپنا اختیار جمانا ضروری تھا لہٰذا شروع شروع میں ولندیزیوں اور انگریزوں کی آمد سے انتشار بڑھا۔ لیکن بالآخر ولندیزیوں کو برتری حاصل رہی اور باوجودیکہ انھوں نے ان علاقوں میں صلح و مصالحت کی بھرپور کوشش کی پھر بھی قیام امن میں کافی وقت صرف ہوا۔

اہل معاشیات ان نزاعات کی تفصیلات کو نظرانداز کر سکتے ہیں۔ لیکن بہرحال، یہ امر ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ ان دنوں ایشیائی ممالک میں چین کے علاوہ کوئی دوسرا ملک کسی باضابطہ بحری طاقت کا مالک نہ تھا۔ ہمیں بے شک ان دنوں پیگو یا چین کے قائم کیے ہوئے "جہازی بیڑوں" کی اطلاعات ملتی ہیں لیکن ان کی سرگرمیوں کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی نوعیت جنگی بیڑوں کے بجائے باربرداری کے ایک آلۂ کار کی تھی۔ چنانچہ مثلاً اشین کی ملاکا کے خلاف مامور کردہ روش کی حقیقت اس قدر تھی کہ ایک فوج مختلف اقسام کی سینکڑوں کشتیوں پر سوار ہو کر درمیانی سمندروں کو عبور کرنے کے بعد دشمن کے ساحل پر جا اترتی اور اگر اثنائے راہ میں صحیح معنوں میں پرتگالی بیڑوں سے ان کا مقابلہ ہو جاتا تو یہ باربردار کشتیاں ساحل سمندر سے فی الفور ہٹا کر بھگا دی جاتیں۔ خود سلطنت مغلیہ کسی بحری طاقت کی مالک نہ تھی اور یہ ایک دردناک

---

[1] اس زمانہ کی تحریروں میں جزیروں کے مختلف نام ملتے ہیں۔ میں نے مسالہ کے جزیروں کی اصطلاح کو ایک وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے، اس کے حدود میں جزائر ملکز، سیرام، امبینا اور بندہ کو شامل کیا اور سہولیت کی خاطر ملکز کی اصطلاح کو گلولو کے مغرب میں واقع چھوٹے جزیروں تک محدود رکھا ہے۔ ملکز اور امبینا میں لونگ کی اور صرف بندہ کے جزیروں میں جاوتری اور جائفل کی پیداوار تھی۔ لونگ سیرام میں ہوتی تھی لیکن زیر مطالعہ دور میں اس جزیرہ کی کوئی نمایاں حیثیت نہ تھی۔ جزیروں کے جائے وقوع کو صفحہ ۱۳ کے بالمقابل نقشہ پر واضح کیا گیا ہے۔

صورت حال ہے کہ سورت کے حکام کو اپنے بندروں کی حملوں سے مدافعت کے لیے ایک یا دو ولندیزی یا انگریزی جہازوں کی استدعا کرنی پڑتی۔ آگے ذکر آئے گا کہ کیوں کر توپوں سے لیس صرف چند ولندیزی جہازوں نے گولکنڈہ کے حکمران کو صلح کی خواہش پیش کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایک موقع پر شاہ فارس کے ایک عہدہ دار نے بالکل بجا طور پر اعلان کیا کہ اس کا بادشاہ سمندر کا نہیں بلکہ خشکی کا حکمراں ہے۔ بندرگاہ مخا پر ترکوں کے جہازی بیڑہ کا آگے ذکر آئے گا۔ یہاں صرف اس قدر لکھنا کافی ہوگا کہ سولھویں صدی کے اواخر تک پرتگیزیوں نے ہندوستانی سمندروں میں بلا مداخلت غیرے اپنا سکہ جما لیا تھا۔ اس کا سبب کوئی خود ان کی داخلی طاقت نہ تھی بلکہ ایشیائی قوموں میں بحری طاقت کی اہمیت کا عدم احساس تھا۔ زیر مطالعہ عہد میں ہندوستانی تجارت کا بہت گہرا تعلق موزمبیق اور جزیرہ ملکز کے درمیانی خطہ کی سمندری طاقت کی پرتگیزیوں سے ولندیزیوں کو منتقلی ہے۔ لہٰذا اس منتقلی کا قدرے تفصیلی بیان ضروری معلوم ہوتا ہے۔

فصل 2 پرتگیزیوں کی سمندری مملکت

ہندوستانی سمندروں میں پہلے پہل پرتگیزی جہاز پندرھویں صدی کے اواخر میں داخل ہوئے اور چند برسوں کے اندر اندر ایک ایسی مملکت کی تشکیل کا تصور وجود میں آگیا جس کا ایشیا کو کوئی حالیہ تجربہ نہ تھا۔ منصوبہ اس طور پر بنایا گیا کہ سمندر پر بزور بازو اقتدار جما کر حکمران طاقت کے مفاد کی خاطر سمندری تجارت پر قابو حاصل کر لیا جائے۔ یہ ہزاروں میل دور رہنے والی ایک چھوٹی

---

[1] مثلاً ENGLISH FACTORIES V. 310 ff میں درج ہوئی متھیونڈ ڈائری ملاحظہ ہو۔ جب سورت بندر پر بحری قزاقوں کے حملے کا خطرہ پیدا ہوا اور انگریز اس کی مدافعت پر مائل نہ ہوئے تو مغل صوبیدار نے "تین چھوٹے جنگی جہاز مرتب کر کے اس پر چند غریب اور ناتجربہ کار ملاحوں اور دیگر اشخاص کو سوار کیا۔ ان کو سمندری زندگی کا کوئی تجربہ نہ تھا لہٰذا وہ اس مقصد کے لئے کچھ مفید ثابت نہ ہوئے۔ علاوہ اس کے ان کے جہاز بعض اوقات بھٹک کر پانی سے باہر چلے جاتے تھے اور پھر ہمارے ہی جہازوں کی نگرانی میں بلکہ ان پر سوار ہو کر رات گئے تک دوبارہ پانی میں واپس آتے۔"

MOCHA ×

قوم کے لیے بڑا جوکھم کام تھا اور اس کی تکمیل صرف ایشیائی طاقتوں کی مذکورہ بحسی ہی کی وجہ سے ممکن ہو سکی منصوبہ کی کامیابی کا دار و مدار دو باتوں پر تھا۔ اوّل، اس قدر مضبوط جہازی بیڑے کی فراہمی جو سمندری حملوں سے اپنی حفاظت کر سکے، دوئم، چند سمندری ٹھکانوں کی موجودگی جو خود زمینی اور سمندری حملوں سے محفوظ ہونے کے ساتھ ساتھ اس لائق بھی ہوں کہ جنگی بیڑوں کے لیے پناہ اور رسد کا سامان اور مستقبل میں جہاز رانوں اور لڑنے والوں کے لیے کمک فراہم کر سکیں۔ چونکہ کسی قابل لحاظ مخالف طاقت کی غیر موجودگی کے باعث پرتگیزیوں کے لیے اوسط طاقت کے سمندری بیڑوں ہی سے سمندر پر اپنا تسلط قائم کرنا ممکن ہو گیا لہٰذا شروع شروع میں ان کے لیے اصل مسئلہ سمندری ٹھکانوں کے حصول اور ان کے استحکام کا تھا۔ ان کے ابتدائی ٹھکانے تین مقامات پر قائم کیے گئے۔ ہندوستان کے مغربی ساحل پر گوا میں، اس سے بعید ترمشرق کی گزرگاہ پر ملاکا میں اور خلیج فارس کے دہانے ہرمز میں۔ ابتدائی منصوبے میں بحر قلزم میں آمد و رفت پر قابو رکھنے کے خیال سے بندرگاہ عدن بھی شامل تھا مگر عرب کے ساحل پر ترکوں کی بڑھتی طاقت اس کے حصول میں مانع ہوئی اور مذکورہ بالا تین مقامات ہی تقریباً ایک صدی کے لیے کافی ثابت ہوئے۔ ان کے علاوہ پرتگیزیوں کے قبضہ میں مخصوص مقاصد کے تحت تیار کیے ہوئے مختلف قلعے بھی تھے۔ ان میں سے خاص موزمبیق، ڈیو اور دمان، کوچین اور کولمبو میں تھے۔ افریقہ کے مشرقی ساحل پر موزمبیق، یورپ سے آنے والے جہازی بیڑوں کے مقام کرنے کی جگہ کے علاوہ ایک تجارتی مرکز کا بھی کام کرتا تھا۔ ڈیو اور دمان سے خلیج کھمبات کی جو ہندوستانی تجارت کی نکاس کی جگہوں میں اہم ترین تھی نگرانی ہوتی تھی۔ کوچین، ملابار کی سیاہ مرچ کا خاص بندر تھا اور اس کی مقدار یورپ جانے والی اشیاء میں تنہا سب سے زیادہ تھی۔ اس طور پر کولمبو سے قابل فروخت دارچینی کے خاص مراکز کی نگرانی بھی ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مسالہ کے جزیروں کی مخالف آبادیوں میں لونگ، جاوتری اور جائفل کی تجارت کی غرض سے اور مشرقی افریقہ کے ساحل پر بلحاظ موقع منتخب کیے ہوئے منتشر مقامات پر بھی انھوں نے چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لیے تھے اور ان میں سے بعض ٹھکانوں پر یا ان کے قریب خصوصاً مغربی ہندوستان میں پرتگیزیوں نے وقتاً فوقتاً چھوٹے چھوٹے علاقوں پر بھی اپنا تسلط جمانا شروع کیا۔

جیسے جیسے صدی گزرتی گئی، کچھ مختلف قسم کی پرتگیزی برادریاں وجود میں آئیں ان میں سے بعض کے لیے قلعوں کا انتظام کیا گیا جن کے کمانڈر گوا سے مقرر ہوئے اور بعض کے لیے غیر

ملکی علاقوں میں نوآبادیاں قائم کی گئیں۔ لیکن ان سب کا امتیازی وصف یہ رہا کہ وہ طاقت کے بجائے بنیادی طور پر تجارت کے مراکز تھے۔ اس قسم کی نوآبادیاں ہندوستان کے پورب میں سینٹ ٹھوم میں، جنوب میں نیگاپٹم اور بنگال میں ہگلی اور چٹاگانگ کے مقامات پر قائم تھیں۔ مزید مشرق میں کینٹن* کے راستہ پر مکاؤ تھا جہاں کے تاجروں کو براعظم چین کے ساتھ تجارت میں کڑی پابندیوں کے ساتھ شریک کیا گیا۔ یہاں سے دور فاصلہ پر واقع جزیرہ تیمور میں ایک مختصر نوآبادی ان اطراف کے سفید صندل فراہم کرنے کا کام کرتی تھی اور اس کے مابعد مدت میں ممکسر میں ایک وسیع نوآبادی قائم ہوئی۔ لیکن یہ ان سے کم اہم مقامات پر واقع دیگر نوآبادیوں سے پرتگیزیوں کی طاقت میں نہیں مگر ان کی دولت میں ضرور اضافہ ہوا۔ ان ایام میں گوا طاقت کا مرکز اور جہازی بیڑوں کا مستقر رہا اور یہیں سے پورب یا پچھم کی طرف حسب ضرورت کمک روانہ کی جاتی تھی۔ تمام چھوٹے اور کچھ بڑے جہاز بھی ہندوستان ہی میں گوا یا بسین میں تیار کیے جاتے تھے اور گوا شہر کی گودی میں جہاز بنانے کا کام ان دنوں غالباً ملک کی منظم ترین صنعت تھی۔

اب پرتگیزیوں کی سمندری تجارت کا نظم مختصراً بیان کیا جاتا ہے۔ صورت حال اس طور پر تھی کہ اوّل تو بعض تجارتی راستوں کو شاہ پرتگال کی اجارہ داری قرار دے دیا گیا تھا اور ان سے دیگر قوموں کے جہازوں کو گزرنے کی ممانعت تھی۔ یہ محفوظ راستے وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتے رہتے تھے لیکن سولھویں صدی کے اختتام پر صورت حال یہ تھی کہ کوئی بھی ہندوستانی جہاز پرتگیزیوں کی گرفت یا ان کی لائی ہوئی تباہی سے بچ کر مشرقی افریقہ، جاپان یا مسالہ کے جزیروں کا رُخ نہ کرسکتا تھا۔ ان ممالک سے تجارت یا تو سرکاری سطح پر ہوتی تھی جس کے حقوق، انعام کے طور پر بعض افراد کو عطا کیے جاتے یا سرکاری خزانہ کی آمدنی کے خیال سے اس کا ٹھیکہ دے دیا جاتا۔ دوسرے کسی بھی جہاز کو بعض مخصوص اشیاء، مثلاً سامان جنگ و سیاہ مرچ کی باربرداری کی اجازت نہ تھی اور جو جہاز اس کی خلاف ورزی کرتا تباہ یا ضبط کرلیا جاتا۔ تیسرے بغیر ادائیگی فیس اور حصول اجازت نامہ (قرطاس) کوئی بھی ایشیائی جہاز خالی یا سامان لے کر کسی بندرگاہ کو نہ جاسکتا تھا اور علاوہ اجازت نامہ کی فیس کے ہرمز اور ملاکہ ایسے بندروں پر محصول درآمد بھی عائد کیا جاتا تھا چنانچہ نظری اعتبار سے سمندری تجارت پوری طور پر سرکاری

---

* CANTON

نگرانی میں تھی۔ لیکن صحیح صورت حال کو سمجھنے کے لیے یہ ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ پرتگیزی انتظامیہ حد درجہ رشوت خور تھا۔ مختلف ٹھکانوں پر متعین کمانڈروں کی آمدنی کا تخمینہ عام طور پر ان کی باضابطہ تنخواہوں کی مقدار سے نہیں بلکہ ان کی ناجائز کمائیوں سے لگایا جا سکتا تھا اور جیسا کہ پرارڈ نے ہرمز کے متعلق لکھا ہے کہ وہاں حکام "روپیہ لے کر ہر چیز کو گزرنے دیتے تھے"۔ اسی مصنف کا قول ہے کہ پرتگیزی، ہندوستانیوں کی ناجائز کاروائیوں میں اکثر شریک رہا کرتے تھے اور ظاہر ہے کہ یہ شرکت مقررہ ضابطوں سے بچنے ہی کے لیے عمل میں آتی تھی۔ اسی وجوہ سے مختلف ہندوستانی حکمرانوں کو بغیر کسی پابندی کے جو اجازت نامے دیے گئے تھے ان کو بھی اسی مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ ماحصل یہ کہ حالانکہ پورے ہندوستانی سمندروں میں تجارت کو فروغ حاصل تھا لیکن نفع کا بیشتر حصّہ پرتگیزیوں ہی کے ہاتھ آتا تھا اور جائز اور ناجائز وصولیوں کی میزان کا رجحان "تجارتی کاروبار کی قوت برداشت" کے لگ بھگ رہنے کا تھا۔ کسی کمانڈر کی دستبرد پر سوائے اس بندش کے کہ وہ اپنے بندرگاہ کی تجارت پر روک ٹوک نہ لگا سکتا تھا کیونکہ ایسا کرنا خود اس کے مفاد کے لیے ضرر رساں ہوتا کوئی اور پابندی نہ تھی۔

یہاں اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پرتگیزیوں کو ہندوستانی سمندروں پر اپنا اقتدار جمانے کا کیوں کر حق پہنچتا تھا۔ اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی معقولیت کے محدود دائرہ میں تصفیہ کن ہے۔ خود پرتگیزیوں کے لیے اس قدر کافی تھا کہ ان کو اس پر خطر منصوبہ میں پوپ کی منظوری اور دعائی برکت حاصل تھی۔ یاد رہے کہ دنیاوی معاملات میں اس وقت پوپ کی حیثیت قومیت سے بالا و برتر تھی اور یہ کہ اس کے "فتوے" (جنھیں ہم اب اس نام سے موسوم کر سکتے ہیں) پوری لاطینی دنیائے مسیحیت میں قابل احترام تھے۔ لہٰذا ان قوموں کے لیے جو پوپ کی مذکورہ حیثیت کے قائل تھیں پرتگیزیوں کا حق سند کے درجہ میں تھا۔ دوسری طرف، ولندیزیوں اور انگریزوں کے زمرہ کی قوموں کی نگاہ میں جو سولھویں صدی کے اختتام پر پوپ کی مذکورہ حیثیت کی منکر ہو چکی تھیں، اس کے احکام کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی اور ایشیائی طاقتوں کے لیے تو یہ سرے ہی سے ایک بے معنی شے تھی۔ ایشیائی نقطۂ نگاہ سے بھی ہندوستانی سمندروں میں پرتگیزیوں کی مملکت کے قیام کا پورا جواز پایا جاتا تھا۔ شاہ پرتگال ہندوستانی سمندروں پر اس

لیے حکمراں کرتا تھا کہ وہ اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لیے ضروری طاقت کا مالک تھا اور کوئی دوسری طاقت ایسی نہ تھی جو مدمقابل آ کر اس کو بے دخل کر سکے۔ اکبر کی ہندوستان کے بری علاقوں کی شہنشاہیت کا بجنسہٖ یہی راز تھا۔ اگر ایشیاء سابقہ قبضہ کے حق یا سبقت زمانی ذرا بھی پاس کرتا تو وہ مغلوں کے بالمقابل پرتگیزیوں کو ہندوستان کی بادشاہت کا بہتر حق دار تسلیم کرتا کیونکہ بابر کی عظیم الشان مہم کے آغاز کے قبل ہی پرتگیزی ہندوستان میں مستحکم طور پر اپنے قدم جما چکے تھے لیکن ان دلنوں مقبوضات کی وسعت کو عملاً دوسروں کے حقوق کی راہ میں مزاحم نہ تصور کیا جاتا تھا۔

اکبر نے اپنے جہازوں کو بحر قلزم میں بھیجنے کے لیے پرتگیزیوں سے اجازت نامہ حاصل کر کے ان کے اقتدار کو چپ چاپ تسلیم کر لیا تھا۔ علاوہ بریں مغلوں نے سمندروں کو ان سے آزاد کرانے یا ان پر اپنا قبضہ جمانے کی بھی کوشش نہ کی۔ بیجاپور ایک سے زائد بار گوا پر حملہ آور ہوا اور 1571 کے لگ بھگ مختلف مسلم طاقتوں کی اجتماعی کاروائی کو مملکت پرتگالیہ کے لیے مجموعی طور پر ایک خطرے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ سب بے اثر ثابت ہوئیں۔ صدی کے اوائل میں ترکوں نے ہندوستانی سمندروں پر اپنا تسلط قائم کرنے کی جو کوشش کی تھی ان کا چند برسوں بعد پھر سے اعادہ کیا مگر اپنی عربی مملکتوں میں جہاز سازی کے صرف میں کام آنے والے شہتیروں کی کمی کی بنا پر انھوں نے مشرقی افریقہ کے ساحل پر جہاں جنگلوں کی افراط تھی اپنا ٹھکانہ قائم کیا۔ لیکن ان کے بادبانی جہازوں والے "بیڑے" جن میں سے ایک سمندر کے لائق نہ تھا اور جن کی معاون چھوٹی چھوٹی کشتیوں کی جنگی صلاحیت بہت کم تھی، اس مقصد کے لیے بالکل ناکافی ثابت ہوئے اور پرتگیزیوں کو اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لینے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ اس کے بعد پرتگیزیوں کی سمندری سلطنت کو دوسرا واحد خطرہ مالابار کے سمندری قزاقوں کے بادشاہ "کنیل" سے تھا۔[1] اس کے بام ترقی پر پہونچنے کے قصے اہم نہیں مگر

---

[1] بحری قزاقوں کے بادشاہ کا نام مختلف شکلوں میں ملتا ہے اور مجھے اس کے صحیح طریقہ سے نقل کرنے پر اطمینان نہیں ہے۔ خیال ہے کہ کنعلی، نام کی صحیح شکل ہے۔ بقول ایک ولندیزی تذکرہ کے وہ بادبانی جہازوں پر بھیج دیا گیا تھا۔ (RENNI VILLE 111-451) اسے پھانسی دیے جانے کی اطلاع پرتگیزی ماخذ میں ملتی ہے۔

حیرت انگیز ضرور ہیں۔ اس کو کالی کٹ کے حکمراں کی در پردہ حمایت حاصل تھی اور اس نے دھیرے دھیرے پرتگیزی جہازوں کے لیے ایک شدید خطرہ کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس نے سولھویں صدی کے اواخر تک "ہندوستانی سمندروں کے فرمانروا" کا لقب اختیار کر کے مثل پرتگیزیوں کے خود بھی جہازوں کے اجازت نامے جاری کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے خلاف پرتگیزیوں کی ایک مہم ناکام رہی اور اس نے اب اپنے کو "اسلام کا محافظ اور پرتگیزیوں کا دفع کنندہ" قرار دیا۔ لیکن وہ ان القاب سے زیادہ دنوں تک استفادہ نہ کر سکا کیونکہ اس کے خلاف پرتگیزیوں کی دوسری مہم پوری طور پر کامیاب رہی اور کہا جاتا ہے کہ "ہندوستانی سمندروں کے فرمانروا" کو بالآخر گوا میں پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیا گیا۔ اس طور پر صدی کے اختتام تک پرتگیزی اپنے مدمقابل آنے والی ہر طاقت پر غالب رہے اور خود ایشیا میں ایسی طاقتیں زیادہ نہ تھیں جنھوں نے سمندری تسلط کے لیے ان سے بہتر صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہو۔

مملکت پرتگالیہ کو بظاہر تو استحکام حاصل رہا۔ لیکن حقیقت میں اس کی بنیادیں متزلزل ہو چکی تھیں اور کسی پُر زور حملہ سے ٹکّر لینے کی تاب باقی نہ تھی۔ اس کے زوال کی داستان کو بیان کرنا، ایک سیاسی مورّخ کا کام ہے۔ پالیسی اور نظم ونسق کی متعدد فاش غلطیوں کے علاوہ، مرکزی حقیقت یہ تھی کہ پرتگالی طاقت کے لیے ایشیا، افریقہ اور برازیل میں بیک وقت مہم جوئی کا بار ناقابل برداشت تھا۔ ملک کی آبادی سولھویں صدی میں بے حد کم ہو گئی اور اس کے اختتام تک تو گھٹ کر تقریباً موجودہ کلکتہ کی سطح پر آ گئی۔ غرضیکہ صورت حال یہ ہو گئی تھی کہ سال بہ سال ملک سے باصلاحیت افراد کا، جو ان کاموں سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکیں، باہر بھیجنا ممکن نہ رہا اور جو لوگ جاتے تھے ان میں سے بہت تھوڑے ہی واپس ہوتے تھے۔ مجبوراً جہاز رانی اور ایشیائی مقبوضات کی حفاظت کے کام پر زیادہ سے زیادہ اس مخلوط نسل کے افراد تعینات ہونے لگے جو مختلف نوآبادیوں میں پیدا ہوئے تھے۔ اس حقیقت کے اظہار سے کہ اس نسل کے افراد اپنے مورثوں کے ہم پلہ نہ تھے، ان کی صلاحیتوں کو کم کر کے دکھانا مقصود نہیں ہے۔ بے شک، وقت پر وہ بے جگری سے لڑ سکتے تھے، لیکن، بہرحال وہ ان غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک نہ تھے جس نے ابتدائی ایام میں پرتگیزیوں کو ایشیا میں

زمین اور سمندر کی ایک ناقابل تسخیر طاقت کا مقام عطا کیا تھا۔ مخلوط نسل کے افراد ناقابل تسخیر نہ تھے اور اس پر مستزاد یہ کہ ان کی تعداد مسلسل جارحانہ اور دفاعی جنگوں کے لیے کافی نہ تھی۔ گوایں اب بھی جہاز تو تیار ہوتے رہے لیکن وہاں سے برابر ضرورت کے مطابق جہاز راں فراہم نہ ہو سکے[1]

پرتگالیوں کی اس بنیادی کمزوری میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب 1580 کے اختتام پر پرتگال اور ہسپانوی بادشاہتوں کے متحد ہو جانے پر پرتگیزی وسائل ہسپانیہ کی ضرورت پورا کرنے پر صرف ہونے لگے۔ یہ اتحاد خالصتہ شخصی تھا۔ پرتگیزیوں کی جداگانہ قومیت برقرار رہی لیکن اس کے بعد ساٹھ سال کی مدت تک شاہ ہسپانیہ ہی پرتگال کے سیاہ وسفید کا مالک رہا اور اس چھوٹے سے ملک کی کچی کھچی مادی طاقت یورپ میں ہسپانیوں کا تسلط قایم کرنے پر صرف کی جاتی رہی۔ ۱۶۴۱ میں پرتگیزیوں کے دوبارہ خود مختاری حاصل کرنے کے وقت ایشیا میں صورت حال نازک تھی۔ محب وطن پرتگیزی اتحاد کو "غلامانہ محکومی" سے تعبیر کرتے تھے اور اس دور میں ان کے صرف مادی وسائل ہی کا غلط استعمال نہ ہوا بلکہ وہ قومی حوصلہ بھی جس کا انھوں اپنی ایشیائی مہم میں مظاہرہ کیا تھا پست ہو گیا۔ چنانچہ اس دور کی تحریریں ان کے پُر اعتماد عزائم کے بجائے راضی بہ رضا رہنے کی عکاس ہیں۔ ایشیا میں پرتگیزیوں نے جلد ہی اندازہ لگا لیا کہ ان کو اپنے پڑوسیوں کے خلاف یورپ سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ مگر ساتھ ساتھ انھیں یہ بھی سوچنا چاہیے تھا کہ ہسپانیہ سے ان کے تعلق نے ان کے لیے نئے دشمن پیدا کر دیئے ہیں

---

[1] ان دنوں پرتگال کی آبادی کا صحیح تعین ناممکن ہے میری نظر سے ایک ایسا تخمینہ گزرا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں پر 1500 کی بیس لاکھ کی آبادی، ایک صدی بعد گھٹ کر اس کی نصف ہو گئی لیکن اس حساب کی بنیاد کا مجھے علم نہ ہو سکا۔ زیر مطالعہ دور میں "آدمیوں کی تعداد" کی کمی کا متعدد قیمتی حوالوں سے پتہ چلتا ہے۔

نشاٹن (تقریباً 1583) کا بیان ہے کہ تقریباً 1550 میں 1500 یا اس سے زائد سپاہی سالانہ گوا بھیجے جاتے تھے جن میں سے واپس ہونے والوں کی تعداد شاذ ہی ۱۰۰ رہتی۔

اور یہ کہ ہسپانیہ کے سخت دشمن یعنی ولندیزیوں کی طرف سے ان کی سمندری طاقت کو بھی شدید خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

فصل 3 ۔ ولندیزیوں اور انگریزوں کا ظہور

ہسپانیہ اور ہالینڈ کے درمیان دشمنی، سولھویں صدی کے نصف آخر کی یورپی سیاست کی ایک اہم حقیقت ہے۔ جس ملک کو ہم ہالینڈ کہتے ہیں وہ "نیدرلینڈز" کے ان متحدہ صوبوں سے وجود میں آیا ہے جس نے شاہ ہسپانیہ کی شہنشاہیت کے خلاف علم بغاوت بلند کر کے اپنی قومی آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا ملک تھا جس کے داخلی وسائل بہت مختصر تھے۔ اس کی قومی آمدنی کا بیشتر حصہ مچھلیوں کے کار و بار اور سمندری نقل و حمل کی تجارت پر موقوف تھا اور ولندیزی جہاز ایک بڑی تعداد میں پچھمی سمندروں میں چلا کرتے تھے۔ لیکن جہازی بار برداری کا قیام، آمدنی کا ایک ذریعہ ہونے کے علاوہ ان کے قومی وجود کے بقا کا بھی ضامن تھا۔ ہالینڈ، ہسپانیہ کا صرف سمندری طاقت ہی کے سہارے مقابلہ کر سکتا تھا اور اس کی کوششوں کی کامیابی کا انحصار ایک اعلیٰ درجہ کی سمندری طاقت پر موقوف تھا۔ ایسی سمندری طاقت جس کے لیے سمندروں میں جہازوں کا تنہا ایک بیڑہ کافی نہ تھا بلکہ کافی تعداد میں ہر قسم کے جہاز، ان کی تعمیر اور مرمّت کے لیے گودی کی موجودگی ماہر ملّاحوں اور جہاز رانوں کی مسلسل فراہمی اور پھر اس قدر دولت جو ان وسائل سے پوری طور پر مستفید ہونے کے لیے ضروری ہو، درکار تھی۔ پس تجارتی جہازوں کے بیڑے کی کارکردگی سے ان کا اوّلین قومی مفاد وابستہ تھا۔ لیکن شاہ ہسپانیہ کے پرتگال کے تخت کا مالک ہو جانے پر ہالینڈ کے مذکورہ قومی مفاد کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا، کیونکہ ان دنوں ولندیزی جو تجارتی مال جنوب کی طرف لے جاتے تھے ان کے لیے لزبن اور اس کے قریبی بندرگاہ اہم منڈی کا کام کرتے تھے۔ وہ انھیں مقامات پر بحیرۂ بالٹک سے لائے ہوئے غلہ، شہتیر اور جہاز سازی کے دیگر سامان کی بیشتر مقدار اور خود اپنے ملک کی نمک میں محفوظ کی ہوئی مچھلی اور دیگر پیداواروں کو فروخت کیا کرتے تھے اور یہیں سے وہ اپنے سفر کی واپسی میں شمال کی طرف لے جانے کے لیے سامان خصوصاً مچھلی محفوظ کرنے کے لیے نمک اور مسالے اور دیگر مشرقی سامان حاصل کرتے تھے اور جن کے دوسرے مقامات کو تقسیم کا خاص

مرکز پہلے اینٹورپ اور پھر بعد میں ایمسٹرڈم ہوگیا تھا۔ لہٰذا پرتگیزی بندرگاہوں کے واقعتہً بند ہوجانے کی وجہ سے تیلی اور جہاز کے دیگر کاروبار کو جس پر ہالینڈ کا وجود منحصر تھا زبردست نقصان پہنچا اور اگر یہ امر یقینی نہیں تو مشتبہ ضرور ہے کہ آیا اس وقت کے حالات کے تحت ولندیزی جہازوں کے لیے یورپی سمندروں سے دیگر مقامات پر کافی روزگار فراہم ہوسکتا تھا۔ یہ عام خیال کہ پرتگال کے ساتھ ولندیزی تجارت حقیقتاً بند ہوگئی صرف اس حد تک درست ہے کہ ممانعت کے احکام وقتاً فوقتاً جاری ہوتے رہے۔ لیکن پرتگیزی اپنے ذاتی مفاد سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے اور باوجود ممانعت کے ان کا ولندیزیوں کے ساتھ تجارتی سلسلہ قائم رہا۔ تاہم ولندیزی، دشمن ہی کے ملک سے اس دولت کے حصول کو جو ان سے خلاف لڑنے کے لیے درکار تھی ایک محکم حکمت عملی تصور کرتے تھے۔ چنانچہ ان ممالک کے درمیان تجارتی کاروبار چلتا رہا لیکن اس میں اکثر کاوٹ بھی پیدا ہوجایا کرتی تھی۔ پرتگیزی سمندروں میں، ولندیزی جہازوں کو پکڑ کر ان سے سمندری فوج کا کام لیا جاتا تھا، تاجر اور جہاز چلانے والے گرفتار کر کے تحقیقاتی عدالتوں کے سپرد کر دیے جاتے تھے۔ مال کی ضبطی عمل میں آتی اور یہ خطرات وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتے رہے۔ ان حالات میں ولندیزیوں کے لیے اس امر کا امکان پیدا ہوگیا تھا کہ ان کی پرتگیزیوں کے ساتھ تجارت بند ہوجائے۔ ایسی صورت میں ان کے لیے بہترین متبادل صورت یہ تھی کہ وہ اپنے کاروبار کے دائرہ کو وسیع کریں اور ان ممالک کے ساتھ براہ راست تجارتی روابط قائم کریں جو ابھی تک ہسپانیہ اور پرتگال کی عملی اجارہ داری میں تھے۔ ایسا منصوبہ ان تصورات سے جو ان دنوں ہالینڈ میں تیزی سے پھیل رہے تھے ہم آہنگ تھا۔ کاروباری مرکز کے اینٹورپ سے ایمسٹرڈم کو منتقل ہوجانے کے بعد سے ملک کے مادی وسائل بھی بہت بڑھ گئے تھے۔ ساتھ ساتھ قومی جذبہ زور و شور کے ساتھ بڑھ رہا تھا اور ایسے مشکل کام جن کی انجام دہی دس سال قبل ناممکن معلوم ہوتی تھی اب معقول کاروباری دھندے تصور کیے جانے لگے۔

تقریباً انھیں دنوں، انگریز تاجر بھی مشرقی تجارت میں شرکت کے متمنی تھے اور وہ خاص طور پر بحیرۂ روم کے راستہ سے سفر کے امکانات پر غور کر رہے تھے کیونکہ ہسپانیوں یا پرتگیزیوں کی اجارہ داری کے دعوے کی وجہ سے ان کے لیے راس امید کے راستہ

مے سمندری سفر بند تھا۔ اس وقت ان کی کوششوں کا خاص نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ انھوں نے جون نیوبری جس نے ان دنوں رالف فچ کی ہمراہی میں براہ خشکی ہندوستان کا سفر کیا تھا اس کی فراہم کردہ اطلاعات سے استفادہ کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کیا۔ بحیرۂ روم کا راستہ غیر نفع بخش محسوس ہوا لیکن 1588 میں ہسپانوی ارمیڈا کی شکست کے بعد جس کے نتیجہ میں انگریزوں کے ساتھ ساتھ ولندیزی بھی اپنے فوری سیاسی خطرات سے محفوظ ہو گئے، راس اُمید کے راستہ سے سمندری سفر کرنا ممکن ہو گیا۔ اس کے تین سال بعد جارج ریمنڈ* کی سرکردگی میں انگریزوں کی ایک مہم مشرق کے سفر پر روانہ ہوئی جو بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ لیکن جہاں تک ولندیزیوں کا تعلق ہے انھوں نے اپنی مہم کے سلسلہ میں زیادہ تفصیلی معلومات کا انتظار کر کے بہتر سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔ انھوں نے خاص طور پر دو ذرائع سے حاصل کردہ معلومات پر عمل کیا 1592 میں، وان لنشاٹن*، گوا میں اپنے پانچ سال سے زائد قیام کے بعد ہالینڈ پہونچا، جب کہ تقریباً انھیں دنوں چند تاجروں نے کرنیلس ہاؤٹمین* کو خفیہ معلومات فراہم کرنے کی غرض سے لزبن بھیجا اور دو برس بعد اس کی واپسی پر ولندیزی اس قابل ہو سکے کہ وہ مشرقی تجارت میں شرکت کی قطعی کوششوں کا آغاز کریں۔ ؎

ولندیزیوں کے ابتدائی سفر صرف تجارت تک محدود رہے۔ حالانکہ یہ ایک

؎ وان لنشاٹن کے حاصل کئے ہوئے بعض تجربے 1596 تک شائع نہ ہوئے تھے لیکن یہ امر واضح ہے کہ ہاؤٹمین کے اپنے راس اُمید کے راستہ سے پہلے سمندری سفر کے وقت یہ اطلاعات اس کے علم میں تھیں (بحوالہ LXXXI HOUTMAN ص 62 اور رجا بجا)۔ چونکہ وہ 1594 اور 1565 کی شمالی مہم میں شریک تھا لہٰذا ظاہر ہے کہ اس کی معلومات مہم کے مجوزین کے پاس موجود تھیں چونکہ ہاؤٹمین کی فراہم کی ہوئی اطلاعات کو پرتگیزیوں نے مکمل طور پر خفیہ رکھنے کی کوشش کی لہٰذا اس کی لزبن میں کارروائیوں کی تفصیلات کا صیغۂ راز میں رہنا توقع کے مطابق ہے۔ لیکن اس کا سفر ایک واضح حقیقت ہے

*CORNELIS HOUTMAN, *VAN LINSCHOTON,

*GEORGE RAYMOND

حقیقت ہے کہ تقریباً 1603 اور اس کے بعد سے ولندیزی جہازوں کے بیڑوں نے جنگ اور تجارت دونوں ہی کاموں کے لیے تیاری کر کے سمندر میں داخل ہونا شروع کر دیا تھا لیکن اس کے دس برس قبل تک ان کی یہ پالیسی رہی کہ ہسپانیوں یا پرتگیزیوں سے بغیر الجھے ہوئے مشرقی سمندروں میں پہنچ کر ان ایشیائی ممالک کے ساتھ تجارتی روابط قائم کریں جو پرتگیزیوں کے براہ راست زیر اثر نہ ہوں۔ نظری اعتبار سے مشرقی سمندروں میں پہنچنے کے تین راستے تھے۔ پہلا ایشیا کے شمال کا چکر لگا کر، دوسرا امریکہ کے جنوب سے اور تیسرا راس امید کی طرف سے۔ چونکہ شمالی سمندروں میں ہسپانیہ یا پرتگال میں سے کسی ایک کے بھی قدم جمے نہ تھے، لہٰذا یہی راستہ ان کے لیے زیادہ پرکشش تھا چنانچہ 1594 اور 1595 میں شمال کی طرف جہاز روانہ کیے گئے، لیکن اس طرف جہازوں کو چلانے میں ناقابل عبور دقتیں محسوس ہوئیں۔ امریکہ کے جنوب کے راستہ کا بھی تجربہ کیا گیا اور 1600 میں ولندیزی جہاز اس راستہ سے اپنے مطلب کی منڈیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے، لیکن یہ راستہ تجارت کے لیے مناسب نہ تھا کیونکہ ہسپانوی جنوبی امریکہ کے مغربی ساحل پر کافی طاقت کے مالک تھے اور فیلیپائنس میں بھی جہاں بحرالکاہل کو عبور کرنے کے بعد جہازوں کا تازہ دم ہونے کے لیے قیام ضروری تھا یہی صورت حال تھی۔ اب افریقہ کی طرف سے گھوم کر جانے کا راستہ رہ گیا تھا جس کا 1595 میں پہلی بار تجربہ کیا گیا اور ایمسٹرڈم سے چار جہاز مسالے، مفرد ادویات اور مشرق کے دیگر تجارتی سامان کو براہ راست مغربی یورپ لانے کی غرض سے روانہ کیے گئے۔ اس معمولی سی ابتدا کے نتیجہ میں بالآخر جو اہم سیاسی تبدیلیاں ظہور میں آئیں ان کے پیش نظر اس حقیقت کو واضح کرنا مناسب ہوگا کہ ابتدا میں علاقہ گیری یا کسی ایسے منصوبہ کے قیام کا جسے موجودہ زبان میں 'نوآبادیات' کہتے ہیں کوئی پتہ نہیں چلتا۔ حد یہ ہے کہ پہلے سمندری سفر کے مجوزین نے مشرقی منڈیوں میں اپنی "تجارتی کوٹھیاں" یا ایجنسیاں قائم کرنے کے متعلق بھی نہ سوچا تھا۔ ان کا منشا صرف اس قدر تھا کہ ان کے جہاز مشرقی بندرگاہوں پر پہنچ کر اپنا تجارتی مال فروخت کرلیں اور جب ان کے پاس مناسب مال کا ذخیرہ فراہم ہو جائے تو واپس ہو جائیں اور اس تجارتی تنظیم میں تبدیلیاں تبدریج ہوئیں، مثلاً پہلے تجارتی کوٹھیاں قیام میں آئیں اور پھر قلعوں کی تعمیر شروع ہوئی، اور بالآخر علاقائی تسلط، مشرقی منڈیوں کے

خصوصی حالات کے نتیجہ میں عمل میں آیا۔ ان واقعات نے ثابت کر دیا کہ منصوبہ کے اوّلین مجوزین کو پہلے سے ان حالات کا بخوبی اندازہ نہ تھا۔

تجربہ سے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ افریقی راستہ کی دشواریاں ناقابل عبور نہ تھیں۔ اس راہ سے سمندری سفر کے پہلے مرحلہ میں دشمن کے جہازوں سے دو چار ہونے کا خطرہ تھا لیکن ولندیزی جہازوں کے بیڑے اس قسم کے اتفاقیہ مقابلوں کے لیے لیس رہتے تھے۔ راس امید سے گزر جانے کے بعد منزل کا صحیح انتخاب ہونے کی صورت میں محفوظ راستہ مل سکتا تھا۔ بالکل ابتدائی سمندری سفروں کے حامیوں کے نزدیک ہندوستان کوئی کشش نہ رکھتا تھا۔ سب سے زیادہ مانگ کے سامانوں میں، ہندوستان سے سوائے سیاہ مرچ کے اور کچھ نہ مل سکتا تھا اور اس کے حصول کی غرض سے مالابار کے ساحل کا سفر، پرتگیزیوں کو ان کی طاقت کے خاص مرکز پر دعوت جنگ دینے کے مترادف تھا۔ ابتدائی اطلاعات سے معلوم ہوا کہ پچھمی جاوا اور اشین سماترا میں انتہائی اہم جگہیں تھیں اور یہ علاقے ولندیزی مہم بازوں کے لیے بے حد پرکشش تھے[1]۔ سماترا کے مغربی ساحل پر سیاہ مرچ کی بھاری مقدار اشین سے آتی تھی اور ساتھ ساتھ وہاں لنکا کے پوربی ساحل سے دار چینی جس کی فراہمی یہاں متوقع تھی، یہ سہولیت پہونچائی جاسکتی تھی۔ علاوہ اس کے یہ ایک ایسا تجارتی مرکز تھا جہاں پر دیگر مشرقی سامان بھی حاصل کیا جاسکتا تھا۔ یہاں کا بادشاہ اپنی بے مروتی کے لیے مشہور تھا، مگر اس کی پالیسی کی نمایاں خصوصیت اس کی پرتگال دشمنی تھی۔ لہٰذا یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ پرتگیزیوں کے مشہور دشمن کا خیر مقدم کرے گا۔ لیکن یہ توقع مکمل طور پر پوری نہ ہوئی۔ پچھمی جاوا میں بنتم اور جاکرتا اس سے بھی زیادہ پرکشش تھے۔ یہاں پرتگال کے نمائندہ صرف چند تاجر تھے اور یہاں

---

[1] ان مقامات پر جو سہولتیں حاصل تھیں ان پر لنشاٹن نے واضح طور پر روشنی ڈالی ہے۔ اس نے فقرہ ۲۰ میں بتایا ہے کہ پرتگیزیوں کی سماترا میں کوئی نوآبادی نہ تھی اور شاہ اشین ان کا جانی دشمن تھا اور فقرہ ۲۰ میں اس نے پچھمی جاوا میں سیاہ مرچ کی تجارت کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے بغیر پرتگیزیوں کی مداخلت کے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

سیاہ مرچ اور مختلف مشرقی سامان بھی سہل الحصول تھے چنانچہ ان بندرگاہوں میں سے کسی ایک پر بھی تجارتی سلسلہ قائم ہوجانے کی صورت میں آگے کی طرف مسالوں کے جزائر کے لیے راہ کھل جانے کی توقع تھی۔ ابنائے ملاکا سے ہوکر بنتم جانے والے راستہ کو پرتگیزی سمندری ٹھکانہ کی موجودگی کے سبب بچانا ضروری تھا لیکن اس دشواری کو سماترا سے باہر باہر سفر کرتے کرتے ہوئے ابنائے سندا سے گزر کر جس کا جہاز رانی کے لیے لائق ہونا اس وقت تک معلوم ہوچکا تھا رفع کیا جاسکتا تھا۔ بالکل ابتدائی سمندری سفروں میں معینہ راستہ اس طور پر تھا کہ راس امید کے گرد چکر لگانے کے بعد موزمبیق سے بچتے ہوئے نکلا جائے اور اگر ضرورت ہو تو مداغاسکر کے جنوبی سرے پر یا اس جیسا ماریشس[1] میں تازہ دم ہوکر کھلے ہوئے سمندر کو بہ سمت سماترا عبور کیا جائے۔

اس راستہ پر کیے گئے ابتدائی سفر فی الجملہ سود مند ثابت ہوئے۔ بعض مہمیں تباہی سے دوچار ہوئیں لیکن بعض خصوصاً وہ جس کی وان نک نے 1595 میں رہنمائی کی تھی بے حد کامیاب رہی۔ اس مہم کے روشن امکانات کو عام طور پر تسلیم کیا گیا اور 1602 تک ولندیزی تاجر صرف بنتم واشین ہی میں نہیں بلکہ لنکا کے پوربی ساحل پر مسالہ کے جزائر اور مشہور سیاسی بازاروں میں متعارف ہوچکے تھے۔ لیکن کامیابیاں نئے تردّدات کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ ہالینڈ کے تقریباً ہر بندر سے علیحدہ علیحدہ جو مختلف مہمیں روانہ کی گئیں وہ مشرق میں پہنچ کر ایک دوسرے کے مدمقابل آگئیں اور انھوں نے جلد ہی ایک دوسرے کے خلاف قیمتوں کو بڑھانا شروع کر دیا۔ دوسری طرف یورپ میں افراط مال کی آمد کے باعث منڈیاں مسالوں سے پٹ گئیں۔ مگر قومی نقطۂ نگاہ سے اس تجارت کی اہمیت اس قدر زیادہ تھی کہ اس ضرر رساں باہمی مقابلہ کو ختم کرنا ضروری تصور کیا گیا اور ہالینڈ کے سب سے بڑے عہدہ دار "اسٹیٹس جنرل" کی مداخلت سے ان مدمقابل حریفوں کو بالآخر ایک واحد طاقتور کمپنی کی شکل میں متحد کر کے اس کو تنہا مشرق سے تجارت کرنے کے حقوق عطا کیے

---

[1] راس امید پر ان دنوں تازہ دم ہونے کی بظاہر کوئی تجویز نہیں ملتی۔ ولندیزی اپنی نوآبادی قائم کرنے کے پہلے ہی جاوا میں بخوبی جم چکے تھے۔

ایشیائی سمندر
افریقہ
فارس
چین
سوز
جاوا
مڈغاسکر
موزمبیق
سوفالہ
زنجبار
ماریشس
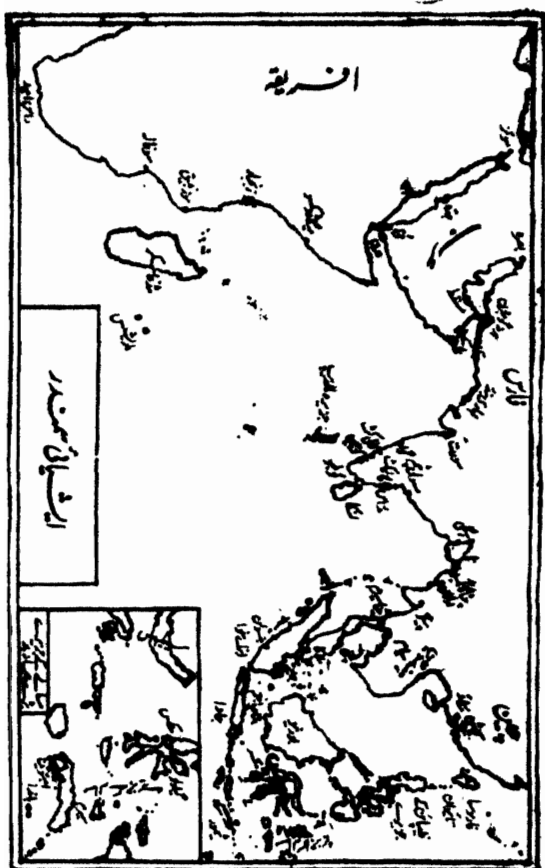
گئے۔ کمپنی کے منشور میں بے حد وسعت رکھی گئی اور اس کے سیاسی دستور کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ تقریباً قومی نوعیت کا تھا۔ نئی سند یافتہ کمپنی کا پہلا بیڑہ ماہ جون 1602ء میں روانہ ہوا۔ یہ پندرہ سمندری جہازوں پر مشتمل تھا جن کی مجموعی گنجائش اور وزن 7000 ٹن تھا[1]۔ ولندیزیوں کی ترقی کی رفتار کا اندازہ اس بیڑے کے 1000 ٹن کے ان چار جہازوں سے موازنہ کر کے کیا جا سکتا ہے جو 1595ء میں روانہ ہوئے تھے[2]۔

ولندیزیوں کا باہمی مقابلہ ہی ان کی مہم کے لئے واحد خطرہ نہ تھا بلکہ اب یورپ کی دوسری قومیں بھی مشرقی تجارت میں ترقی کے امکانات کو اچھی طرح سمجھنے لگیں تھیں اور ولندیزیوں کی شروع شروع وصول کی ہوئی زیادہ قیمتوں کو دیکھ کر وہ بھی ان کی طرح اپنی ضرورت کے سامانوں کو خود جا کر فراہم کرنے کی تیاری میں لگ گئیں۔ 1596ء میں انگلستان سے مشرق کے سفر کی دوسری کوشش سامنے آئی لیکن ان کا جہازی بیڑہ مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ تین برس بعد اس کوشش کی دوبارہ تجدید کی گئی اور "ولندیزی قوم کے سمندری سفر کی کامیابی سے متاثر ہو کر، مختلف تاجروں کے دل میں اپنے وطن کی تجارت کو ترقی دینے کا جو جذبہ پیدا ہوا وہ ولندیزیوں کے قومی جذبہ سے کچھ کم نہ تھا۔" اس کے نتیجہ میں انگریزی کمپنی کا قیام عمل میں آیا۔

لندن شہر کے سوداگروں نے 1600 میں متحد ہو کر جہازوں اور تجارتی سامانوں پر لگانے کے لیے بہتر ہزار پونڈ کا سرمایہ جمع کیا تاکہ مشرق یعنی ہندوستان میں تجارت کی دریافت کر کے اپنے ملک میں مسالے اور دیگر اشیاء کی درآمد کریں۔ انھوں نے اس سمندری سفر کے لیے چار بڑے جہاز خریدے ..... ان جہازوں کو انھوں نے بیس ماہ کے خیال سے آدمیوں، خوراک اور اسلحہ سے لیس کیا اور انھیں ستائیس ہزار پونڈ کی مالیت کا تجارتی مال اور ہسپانوی زر نقد دے کر روانہ کیا۔ بقیہ سرمایہ جہازوں اور ان

---

[1] اس میں ٹن کی اس طور پر اس لیے بحث کر رہا ہوں کہ ان دنوں جہاز کی پیمائشی اٹھائی اور موجودہ مستند ٹن میں اچھا خاصہ فرق ہے۔ ایک ٹن، تقریباً 100 مکعب فٹ جہازی رکھنے کی جگہ ظاہر کرتا ہے۔

[2] ولندیزی اور انگریزی کمپنیوں کے دستور اساسی اور ان کے طریق عمل کی کچھ تفصیلات ضمیمہ الف، میں جمع کی گئی ہیں۔

کے متعلق ضروری سامانوں پر صرف کیا گیا[1]

جہازوں کا یہ بیڑہ فروری 1601 میں جیمس لین کسٹر کی سرکردگی میں سفر پر روانہ ہو کر اگلے سال اشین پہنچا اور ایک کامیاب سفر کے بعد اگست 1603 میں واپس ہوا۔ لیکن ولندیزی کمپنی کے بالمقابل یہ ایک ادنیٰ درجہ کی کوشش تھی۔ اِن جہازوں کا مجموعی حجم 1500 ٹن سے کم تھا اور ان پر جو تجارتی مال لادا گیا تھا وہ اس قدر نہ تھا کہ اس کے عوض میں واپسی سفر کے لیے کافی بار فراہم ہو سکے۔ مجبوراً لین کسٹر کو سرمایہ حاصل کرنے کی غرض سے پرتگیزی مالِ غنیمت کی تاک میں سمندروں کا گشت لگانا پڑا۔ اس کے بعد سے انگریزی کمپنی پابندی سے جہازی مہمیں بھیجتی رہی لیکن اس کے وسائل محدود تھے اور ان ابتدائی برسوں میں ولندیزوں کو بلاشبہ برتری حاصل رہی۔

ولندیزی کمپنی کی تشکیل کے ساتھ ساتھ حکمت عملی میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی۔ پہلے گزر چکا ہے کہ شروع شروع سمندری سفر کچھ اس طور پر ترتیب دیے جاتے تھے جس میں پرتگیزیوں سے مڈبھیڑ کا موقع نہ آئے۔ لیکن ان سفروں کے سلسلہ میں دو باتیں تجربہ میں آئیں۔ پرتگیزی قوم کا ہر جگہ اور ہر موقع پر معاندانہ رویّہ اور سمندر میں ان کی کمزوری۔ پرتگیزی تاجر اور مشنری کے لوگ ہر بندر پر پہلے سے موجود تھے اور وہ ولندیزیوں کو منڈیوں اور زیر درباروں میں غیر ہر دلعزیز بنانے میں اپنی پوری حکمت عملی صرف کرتے تھے لہٰذا پرتگیزیوں کے حلقہ اثر کے باہر تجارت کرنے کے خیال کو ترک کرنا پڑا۔ ساتھ ساتھ ان کے جہازوں کے ساتھ جو مختلف معرکے پیش آئے انھوں نے جنگ میں ان کی کمزوری کو واضح کر دیا تھا۔ چنانچہ ولندیزی اب پرتگیزیوں

---

[1] 1596 کے سمندری سفر کے "مصیبت انگیز اور ہولناک انجام" کے متعلق جو کچھ تھوڑی معلومات موجود ہیں انھیں PURCHAS i) 110-111 ff میں دیکھا جا سکتا ہے یمتن میں حوالہ کی پہلی عبارت جزائر شرق الہند کے مہم بازوں کی درخواست سے جو ستمبر 1599 میں پیش کی گئی تھی ماخوذ ہے۔ اس میں ولندیزیوں کے جس بحری سفر کا ذکر آیا ہے وہ تیاسا وان نک کا سفر ہے جس کا پچھلی جون میں واپسی پر ایمسٹرڈم میں قابل دید خیر مقدم ہوا تھا حوالہ کی دوسری عبارت میں مندرجہ لین کسٹر کے بحری سفر کے احوال سے ماخوذ ہے سرمایہ کی رقم کے متعلق خیال ہے کہ اس میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے لیکن اس فرق سے نفس معاملہ پر اثر نہیں پڑتا۔

کو ان سمندروں سے بے دخل کرنے کی کوشش میں مصروف ہوئے جن میں اس کے قبل وہ صرف ان کے شریک دار بننے کی تمنا کرتے تھے اور 1603 کے بعد سے ان کے ہر بیڑے نے ان کے خلاف کوئی نہ کوئی جارحانہ عمل کیا[1] لیکن انھیں زمین پر کامیابی جلد حاصل نہ ہو سکی۔ مسالہ کے جزائر میں چند چھوٹے چھوٹے قلعوں پر ضرور قبضہ ہو گیا مگر مزمبیق، ملاکا اور مکاؤ پر میں ان کے حملوں کی مدافعت کی گئی۔ لہٰذا ولندیزیوں نے اس راہ میں کامیابی کے لیے مشرقی سمندروں میں ایک مستقر کی ضرورت کو جلد محسوس کیا۔ خالصۃً سمندری جنگوں میں وہ نسبتاً بہت زیادہ کامیاب رہے۔ پرتگیزی بیڑوں کو شکست دی گئی، تجارتی جہازوں کی کثیر تعداد میں گرفتاری ہوئی اور دشمن کو جلد مدافعت پر مجبور کر کے ان کے بحری غلبہ کو نیست و نابود کر دیا گیا۔

ولندیزیوں نے اب جو حیثیت حاصل کر لی تھی اس کی بنیاد پر انھوں نے اپنی تجارتی پالیسی تبدیل کرنے میں تاخیر نہ کی۔ اس پالیسی کا پہلا خاکہ جو مجھے دستیاب ہو سکا ہے وہ بظاہر 1605 کے ولندیزی بیڑہ کے سرکردہ میٹ لِف کی ہدایت پر مرتب کی ہوئی ایک یادداشت میں درج ہے[2]۔ مشرقی سمندروں میں ایک مستقر کی ضرورت کی اہمیت کو واضح کرنے کے بعد راقم نے

---

[1] VANDER CHIJS (P. 84) کی ایک تحریر سے واضح ہوتا ہے کہ دیں ویرہیگن کو جس نے 1599 میں سمندر کا سفر کیا تھا امبوائینا فتح کرنے کے احکام دیے گئے تھے۔ اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ کچھ قبل ہی جارحانہ پالیسی کا آغاز ہو چکا تھا۔ درحقیقت ولندیزیوں نے 1600 میں امبوائینا کے ایک قلعہ کو فتح کرنے کی کوشش کی تھی لیکن (BEGINANDE VOORTGAUGH) کے بیان (ویرہیگن کے حالات سفر ص11) کے مطابق اس موقع پر مقامی آبادی نے پیش قدمی کی تھی اور ولندیزیوں نے بار بار استدعا کے باوجود ان کو مدد پہنچانے سے انکار کیا تھا لیکن انھیں بالآخر مقامی سرداروں کی منت و سماجت پر راضی ہونا پڑا۔ بہرحال ایک دور افتادہ قلعہ پر حملہ جہاں پرتگیزی پہلے ہی سے کمزور ہو چکے تھے اور مزمبیق اور ملاکا کے ایسے مضبوط قلعوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کو ایک سطح پر نہیں رکھا جا سکتا۔

[2] یادداشت BEGINANDE VOORTGAUGH میں میٹ لِف کے بحری سفر کے جرنل کے 172 اور اس کے مابعد صفحات پر درج ہے۔ اس کا فرانسیسی ترجمہ HENNEVILLE VI, 35, 42 میں ملتا ہے۔ جرنل میں جس مقام پر یہ درج ہے اس سے غالباً یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس کا ابتدائی سال 1607 ہے۔

پانچ خصوصی عنوانوں کے تحت ایشیائی تجارت کا ایک عمومی جائزہ لیا ہے۔ (1) سیاہ مرچ (2) دیگر مسالے (3) گجرات (4) کورومنڈل (5) چین و جاپان۔ اس کی پالیسی کا بنیادی پہلو اس تجویز سے واضح ہوتا ہے کہ چونکہ باہمی مقابلہ کی صورت میں تمام شرکا کی بربادی لازمی ہے لہذا لونگ، جاوتری اور جائے پھل کی تجارت پر اجارہ داری قائم کی جائے جس کے لیے انگریزوں کو ہر حیثیت پر مسالہ کے جزائر سے باہر رکھنا ضروری تھا۔ اس امر کے پیش نظر کہ انگریز جاوا اور سماترا کی منڈیوں میں پہلے ہی سے قدم جما چلے تھے، ان کا فوری طور پر سیاہ مرچ کی تجارت سے مکمل اخراج قابل عمل نہ تھا۔ لیکن اس وقت کے حل کے لیے یہ سوچا گیا کہ چند برسوں کے لیے ولندیزی کمپنی صرف دیگر مسالوں کے منافع پر قناعت کرتے ہوئے یورپ میں سیاہ مرچ کو اس قدر سستے داموں فروخت کرے کہ انگریز خود ہی ایشیا کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو جائیں۔ ایسا ہو جانے کے بعد پرتگیزیوں پر فتح کے نتیجہ میں جملہ مسالے اور نیز چین اور جاپان کی تجارت پر اجارہ داری کا حاصل ہو جانا لازمی ہوگا۔ راقم کی نگاہ میں ہندوستانی تجارت کی حیثیت بالکل ضمنی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق گجرات کے ساتھ تجارت شروع کرنے میں انتظار کیا جا سکتا تھا لیکن کورومنڈل کی تجارت کا جلد بڑھانا ضروری تھا کیونکہ خاص طور پر یہاں کے سوتی کپڑوں کی وساطت سے مشرق البعد کی منڈیوں میں تجارتی کاروبار کیا جا سکتا تھا۔ ابتدائی منصوبہ اس طور پر تھا کہ جاوا سے مشرق کی طرف اور اگر ممکن ہو تو خود جاوا اور سماترا میں بھی اجارہ داری کے ساتھ ساتھ کمپنی کے اصل کاروبار کے ضمن میں ہندوستان کے ساتھ تجارت کو ترقی دی جائے۔ اس دور کی تاریخ کو ان خطوط پر بہ سہولیت بیان کیا جا سکتا ہے اور میں پہلے ولندیزی کوششوں کے خصوصی علاقہ یعنی مشرق البعد کے واقعات کا مختصر خاکہ پیش کرنے کے بعد ان کی ہندوستانی تجارت میں ترقی اور متعلقہ اور عرب کی مہموں کو بیان کروں گا حالانکہ ان ممالک سے ان کے بالکل ابتدائی تجارتی منصوبوں کا کوئی تعلق نہ تھا۔

دور حاضر کے قارئین کے لیے اس منصوبہ کا سب سے زیادہ حیرت انگیز پہلو مسالوں کی تجارت کو اس قدر اہمیت دینا ہوگا، جب کہ یہ فی زمانہ ایشیا میں بہت کم سننے میں آتی ہے۔ لیکن زیر مطالعہ دور میں مسالے، ایشیا اور مغربی یورپ کے درمیان تجارتی رابطہ کی خاص چیز تھی۔ سیاہ مرچ، دارچینی، لونگ، جاوتری اور جائے پھل کی مسلسل مانگ کا ایک سبب یہ

تھا کہ موسم سرما کے لیے گوشت کو محفوظ کرنے میں ان کی ضرورت ہوتی تھی اور دوسرا سبب اس زمانہ کا ذوق تھا۔ ان کی مانگ میں تدریجی کمی ایک طرف تو مغربی زراعت میں تبدیلیوں سے جس نے پورے جاڑے کے موسم میں تازہ گوشت کا ملنا ممکن کر دیا اور دوسری طرف کھانا پکانے کے طریقوں میں تبدیلیوں سے خصوصاً مسالہ دار کی جگہ میٹھے کھانوں کے استعمال سے ہوئی۔ اٹھارھویں صدی کے مصنفین نے ولندیزی کمپنی کے نفع میں تخفیف کا سبب انھیں تبدیلیوں کو بتایا ہے جس سے مسالوں کی اجارہ داری کی قدر و قیمت مسلسل گھٹتی رہی۔ لیکن زیر مطالعہ دور کی پوری مدت کے دوران بلکہ اس کے بعد بھی کچھ مدت تک یہ اجارہ داری دنیا کی تجارت کے اہم واقعات میں رہی اور اس کے حصول میں جو کثیر رقم صرف ہوئی اس کو سرمایہ کا ایک معقول مصرف تصور کیا جا سکتا ہے۔ اگلے ابواب میں ہم دیکھیں گے کہ ولندیزی ایشیائی تجارت کی جن شاخوں میں زیادہ کے شریک دار تھے ان میں سے بعض کے لیے مسالے تقریباً اتنے ہی اہم تھے اور تجارتی صورت حال پر مجموعی نظر ڈالتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یادداشت بالا میں جس پالیسی کا خاکہ معین کیا گیا ہے وہ درست تھی۔

فصل 4۔ ولندیزیوں کا عروج اور پرتگیزیوں کا زوال

ولندیزیوں کا پہلا مقصد یعنی مزید مشرق ابعد میں تجارت کی اجارہ داری، ان واقعات کے نتیجہ میں حاصل ہوئی جو خاص طور پر سترھویں صدی کی دوسری دہائی میں پیش آئے۔ 1610ء میں مسالہ کی تجارت میں ولندیزیوں کی حیثیت پہلے سے غالب پڑ رہی تھی جب کہ ہندوستان میں ان کے آڑھتیے ساحل کورومنڈل پر جم چکے تھے۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایشیا میں بھی ان کی حالت ایسی ہی قابل اطمینان تھی کیونکہ یہاں پرتگیزی ان کے علانیہ دشمن اور انگریز ان کے خطرناک حریف کی حیثیت میں تھے۔ پرتگیزیوں کی سمندری طاقت کو کمزور کر دیا گیا تھا لیکن اس کا ڈھانچہ ابھی تک درست حالت میں تھا۔ مسالہ کے جزیروں میں جو چھوٹے چھوٹے قلعے ان کے قبضہ سے نکل گئے تھے وہ ہر حال میں مضبوط ترین جہازی بیڑوں کے رحم و کرم پر تھے اور گوا اور ملاکا کے قلعوں کا استحکام برقرار رہنے کی صورت میں ان کی پچھلی صدی کی سمندری مملکت کی بحالی کے لیے مناسب کمک کے علاوہ اور کچھ نہ درکار تھا۔ انگریزوں سے مقابلہ شدید تھا اور اگر اس سے زائد وسائل،

موجود ہوتے تو یہ بالآخر غالب آجاتے۔ لیکن پرتگیزیوں کو کمک نہ پہنچی اور انگریزوں کی کوششوں میں سرمایہ کی کمی اور نیز ان کی ملکی حکومت کے رویہ سے رخنہ پڑا۔ اس طور پر عمومی صورت حال ولندیزیوں کے قطعی موافقت میں رہی۔

ان پرخطر ایام کی تاریخ میں اس امر سے پیچیدگی پیدا ہوجاتی ہے کہ یورپ کی مختلف قوموں کے سرکاری تعلقات، ایشیائی سمندروں میں جو واقعات پیش آرہے تھے ان سے ہم آہنگ نہ تھے۔ یورپ میں انگلستان کا پرتگال سے مناقشہ نہ تھا اور ۱۶۰۴ کے بعد سے اس کی ہسپانیہ سے صلح چل رہی تھی لیکن پرتگالی جہازوں کے بیڑے سورت سے تھوڑے فاصلہ پر انگریزی جہازوں پر مسلسل حملے کیا کرتے اور 1614 میں شاہ ہسپانیہ نے گوا کے وائسرائے کے نام انگریزوں کو ہندوستان سے بزور طاقت خارج کرنے کے احکام صادر کیے۔ اس کے بعد سے ہندوستانی سمندروں میں گاہے گاہے سمندری معرکے پیش آتے رہے۔ اور 1622 میں انگریزوں نے ہرمز فتح کرنے کے سلسلہ میں فارس کا ساتھ دیا۔ درحقیقت 1635 میں گوا کے پرتگالی حکام اور انگریزوں کے درمیان دوستانہ تعلقات ولیم میتھولڈ کی وساطت سے معاہدہ ہونے کے بعد ہی قائم ہوسکے۔ اسی طور پر 1652 تک انگلستان اور ہالینڈ کے درمیان کبھی علانیہ دشمنی نہ تھی لیکن 1617 کے لگ بھگ ولندیزی اور انگریزی کمپنیوں کے جہازوں کے درمیان مشرقی سمندروں میں جنگ رہا کرتی ہسپانیہ اور ہالینڈ کے درمیان جنگ کا سلسلہ ۱۶۰۹ کی بارہ سالہ عارضی صلح کی وجہ سے جو مشرق میں نظری اعتبار سے اگلے سال نافذ ہوئی بند ہوگیا تھا لیکن ایشیا میں ولندیزیوں اور پرتگیزیوں کے درمیان جنگ جاری رہی۔ چنانچہ ان حالات میں مسالہ کی تجارت کے ان تینوں حریفوں کے درمیان کسی وقت بھی جنگ چھڑ سکتی تھی۔ ہندوستان کے پچھمی حصہ کے پرتگیزیوں کی سرگرمیاں نسبتاً کم اہم تھیں اور واقعی نزاع انگریزوں اور ولندیزیوں کے درمیان تھی۔ ہمارے موجودہ مطالعہ کے لیے ان کی معرکہ آرائیوں کا بیان غیر ضروری ہے۔ ان دونوں کمپنیوں کے ایجنٹ مسالہ کے جزیروں اور مشرق البعد کی تجارت پر قابض ہونے کی کوششوں میں لگے رہتے تھے۔ سیام، ہند چین اور جاپان کی منڈیوں کی کھوج میں بے حد محنت کی گئی اور جیسا کہ ابھی ذکر آیا ہے کہ باہمی مقابلہ نے جنگ کی صورت اختیار کرلی تھی۔ یورپ کے معاہدہ 1619 کے تحت جنگ و جدل کی اس حالت کو ختم کرکے طے کیا گیا کہ متنازعہ

تجارت میں، دونوں کمپنیوں کی شرکت رہے اور وہ میل وموافقت کے ساتھ مشترکہ مفاد کا لحاظ رکھتے ہوئے کاروبار کریں۔ لیکن تعلقات کی خوشگواری جو ملکی مدبرین کے نزدیک اس قدر پسندیدہ تھی، مشرقی سمندروں میں برقرار نہ رہ سکی اور اگلے چند برسوں کے واقعات ان کے بنیادی مقاصد میں اختلاف کے شاہد ہیں، یعنی انگریز اس تجارت میں حصہ چاہتے تھے جس کی اجارہ داری کے ولندیزی متمنی تھے۔ امبوائنا میں 1623 کے المناک واقعات پیش آنے کے وقت انگریز اپنا تجارتی کاروبار شروع کر چکے تھے[1] ان واقعات سے انھیں مجبوراً مسالہ کے جزیروں اور مشرق البعد میں اپنی تجارتی کوششوں کو ترک کرنا پڑا اور مکسر کے یورپ کی ان کی جملہ ایجنسیاں بند ہوگئیں۔ اس اثناء میں ولندیزی مشرقی سمندروں میں اپنا ایک مستقل ٹھکانہ قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ جاوا میں جاکرتا کے بندر پر ان کا قبضہ ہو گیا تھا اور 1619 میں انھوں نے وہاں ایک نئے شہر بٹاویا کی بنیاد ڈالی جو ان کے ایشیائی مقبوضات کے دارالسلطنت کی حیثیت میں رہی۔

اب ولندیزی، انگریزوں کو اس تجارت سے جن کی اُن کی نگاہ میں بے حد قدر و قیمت تھی خارج کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے اور انھوں نے جلد ہی چین کے ساتھ تجارت کی غرض سے فارموسا کے ساحل پر تائیوان کی نوآبادی قائم کرکے اپنے مشرق بعید کے نظام کو مکمل کر لیا[2]۔ اب انھیں پرتگیزیوں کی رہی سہی طاقت کو ختم کرکے اس علاقہ میں

---

[1] فقرہ "امبوائنا کے قتل عام" سے جس نے انگلستان میں شہرت حاصل کر لی ہے اس معاملہ کے متعلق غلط فہمی پیدا کی گئی ہے۔ 1619 کے معاہدہ کی رو سے جو انگریز تاجر ولندیزی قلعہ میں مقیم تھے وہ اس قلعہ پر قبضہ کرنے کی سازش کے الزام میں متہم کیے گئے۔ ان کو بہ جبر حاصل کیے گئے اقبالِ جرم کی بنیاد پر سزا اور ان میں سے بیشتر کو پھانسی دی گئی۔ ولندیزیوں کو تسلیم تھا کہ یہ کاروائیاں بعض پہنچ سے بے ضابطہ تھیں اور ججوں کی نیتوں کی جو تعبیر کی جائے اس کے مطابق اس "قتل عام" کو قانون کے اعتبار سے قتل کا ایک واقعہ یا عدل کی ایک المناک کوتاہی تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس معاملہ کے متعلق بہ کثرت تحریریں موجود ہیں۔ ہم عصر دستاویزات کا CALENDAR SP, 1622-24 سے پتہ چلایا جا سکتا ہے۔

[2] مثل بیشتر دیگر اقوام کے ولندیزیوں کے لیے بھی چین کی تجارت بے حد کشش رکھتی تھی اور 1601 ہی میں جاوا سے اس سمت جہاز روانہ کیے گئے تھے۔ اس کے تین برس بعد ایک ولندیزی (باقی اگلے صفحہ پر)

اپنی اجارہ داری کو جماتا تھا چند برسوں تک تو وہ صرف ناکہ بندی کی پالیسی پر عمل پیرا رہے لیکن آخرکار 1641 میں وہ ملاکا پر قابض ہو گئے۔ اس سمندری ٹھکانہ پر قبضہ کے بعد اس کے مشرق میں تمام ممالک کی تجارت پر ان کا بلا شرکت غیرے قبضہ ہو گیا۔ پرتگیزیوں کا مکاؤ اور تیمور پر قبضہ قائم رہا لیکن ملاکا کے بغیر ان کو ان سے کوئی فائدہ نہ تھا۔ بالآخر مکسر میں ان کی تجارتی نوآبادی جو چند برسوں تک ولندیزیوں کی پریشانی کا سبب بنی ہوئی تھی، 1661 میں منتشر کر دی گئی۔

ولندیزیوں کے دوسرے منصوبہ یعنی جاوا کی سیاہ مرچ کی تجارت سے انگریزی مقابلہ کے اخراج کی تکمیل نہ ہو سکی۔ میل و موافقت کے ساتھ رہنے کی کوشش میں ناکامی کے بعد انگریزوں نے بنتم میں اپنا مشرقی مرکز اور سماترا کے ساحل پر جامبی میں اپنی تجارتی کوٹھی قائم کی تھی اور ان کے ایجنٹ دونوں جزیروں کے دیگر مقامات کے ساتھ وقتاً فوقتاً تجارتی کاروبار کرتے رہے۔ 1652 میں انگلستان اور ہالینڈ کے درمیان جنگ کا آغاز ہونے پر ولندیزی مشرق میں فریق غالب کی حیثیت میں آ گئے۔ انگریز تاجر بنتم کو چھوڑ کر مدراس چلے گئے اور ان کے بہت سے جہاز پکڑے گئے۔ ولندیزیوں نے اس موقع پر محسوس کیا ہو گا کہ سیاہ مرچ اور بیز ہندوستانی تجارت کی اجارہ داری پر اب ان کا قبضہ ہو گیا ہے۔ لیکن ان کے درمیان نزاع کا اصل فیصلہ بحر ہند میں نہیں بلکہ شمال میں ہوا اور وہاں انگریزوں کی فتح سے ان کی مشرقی تجارت دوبارہ بحال ہو گئی۔ لیکن اس اثناء میں دوسرے اسباب کی بنا پر جزیروں میں ان کی حالت کمزور

(صفحہ 39 سے آگے)

ایڈمرل چینی ساحل کے ایک بندر پر داخل ہونے کی اجازت کے لیے گفت و شنید کر رہا تھا اور اسے غیر سرکاری طور پر یہ صلاح دی گئی کہ وہ چین کے قریب ہی کسی ایسے جزیرہ پر قبضہ کر کے جو چین کا نہ ہو، وہاں سے باضابطہ تجارت کرے۔ اس صلاح پر فوری عمل نہیں کیا گیا لیکن چند برسوں بعد ولندیزیوں نے کینٹن اور فارموسا کے درمیان واقع جزائر پیسکے ڈورس میں سے کسی ایک پر اپنی چوکی قائم کی چینیوں نے اس چوکی کے قیام پر اعتراض کیا اور اس کے بجائے خود ہی فارموسا میں تائیوان کی چوکی قائم کرنے کی تجویز کی۔ ولندیزیوں نے چینیوں کی سمندری طاقت سے مرعوب ہو کر اس تبدیلی کو فوراً قبول کر لیا۔ ملاحظہ ہو SPILLBERG, DE VEEN, VAN WECK اور (MATELIFF) کے سمندری سفرنامے اور حالات چین مندرجہ BEGINANDE VOORTGAUGH

ہوتی جارہی تھی کیونکہ ولندیزی، اسپین میں سیاسی غلبہ حاصل کر رہے تھے اور پچھمی جاوا میں گنّا، سیاہ مرچ کی جگہ لے رہا تھا۔ ان جزیروں میں سیاہ مرچ کی تجارت کے بغیر، کاروبار نفع بخش نہ ہو سکتا تھا اور زیر مطالعہ عہد کے اختتام پر ان جزیروں سے انگریزوں کی دستبرداری کے متعلق پیش گوئی کی جاسکتی تھی۔[1]

انگلستان سے جنگ کے علاوہ 1624ء سے 1660ء تک کی مدت، ولندیزیوں کے تجارتی اور نظم و نسق کے فروغ کا زمانہ تھا۔ ان کے دارالسلطنت بٹاویا میں ان کے مقامی دشمنوں کے وقتاً فوقتاً حملوں کے خطرہ کے باوجود اسے وسعت اور خوشحالی حاصل ہوتی رہی۔ اس اثناء میں، مسالے کے جزیروں کی آبادی نے ان کی عائد کردہ کڑی پابندیوں کو تسلیم کر لیا جس کی وجہ سے پیداوار کا اجارہ داری کے تقاضوں کے تحت منظم کیا جانا ممکن ہو سکا۔ جاپان میں سیاسی دقتوں پر قابو پالیا گیا اور اس ملک کے ساتھ تجارت کو اصل کاروبار کی ایک نفع بخش شق کے طور پر ترقی دی گئی۔ غالباً، ولندیزی مقبوضات میں تائیوان ایسی نوآبادی تھی جس سے تمام امیدیں وابستہ تھیں اور ہمیں براعظم کے ساتھ اس کی وسیع تجارت کی اطلاع کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یہاں تاجروں کی راہنمائی میں اہم زراعتی ترقیاں عمل میں آئیں۔ 1661ء میں یہاں سے بے دخلی نے ولندیزی مہم کو بار اول شدید صدمہ پہونچایا۔ لیکن اس کے اثرات مدت زیر مطالعہ کے حدود سے جو ان کے مشرقی سمندروں میں ظہور سے شروع ہو کر ان کے مشرقی تجارت میں غلبہ پر ختم ہوتے ہیں باہر ہیں۔

زیر مطالعہ دور میں مکسّر کو جو مقام حاصل تھا اس کا کچھ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سولھویں صدی میں اس بندرگاہ کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی لیکن مسالے کے جزیروں پر پرتگیزی تسلط کے کمزور پڑ جانے کے بعد اس کی حیثیت لونگ، جاوتری اور جائے پھل کی منڈی کے طور پر نمایاں ہوئی۔ یہاں کے مقامی جہاز مسالہ کے جزیروں تک سفر کرنے پر قدرت رکھتے

---

[1] ان کی بنتم کی تجارتی کوٹھی 1683 میں ولندیزیوں کے شہر پر قبضہ ہو جانے کے بعد بند کر دی گئی۔ لیکن سماترا کے پچھمی ساحل پر بنکولن میں ایک مستحکم چوکی کے قائم ہو جانے سے انگریزی کمپنی سیاہ مرچ کی تجارت میں دخیل رہی۔

تھے اوران کی بڑی تعداد ہر موسم میں وہاں پہنچ کر جس قدر مسالے ممکن ہوتا جمع کر لیتی۔ یہاں کا بادشاہ تجارت کا سرگرم مؤید تھا اور جزیروں سے نکالے ہوئے تھوڑے پرتگیزی یہاں اس کی حفاظت میں پناہ لیے ہوتے تھے۔ ولندیزی اس تجارت کو حد درجہ ناپسند کرتے تھے کیونکہ اس سے ان کی اجارہ داری پر ضرب آتی تھی۔ مکسّر کے پرتگیزی بعض مشرقی منڈیوں کو مسالے تقسیم کیا کرتے۔ انگریز وہاں اپنی ایک تجارتی کوٹھی کے ذریعہ یورپ کے لیے مسالے حاصل کرتے اور ٹرانکوئیبار کے باشندگان ڈنمارک کا یہ ایک خصوصی کاروبار تھا۔ لہٰذا مکسّر تک مال کی فراہمی کو روکنے کی غرض سے متعدد اقدام کیے گئے۔ فراہمی کے اہم ترین سرچشموں پر مقامی قلعہ کی فوج لگائی گئی اور ساتھ ساتھ فاصلہ پر واقع جزیروں کے درختوں کو منظم طور پر برباد کیا گیا۔ جزیروں سے تھوڑی دور پر مکسّر کے جہازوں کو راستہ میں پکڑنے کی غرض سے جہازوں کے بیڑے تعینات کیے گئے اور قوقتاً فوقتاً خود مکسّر کی بھی ناکہ بندی عمل میں آئی۔ ڈنمارک کے باشندوں کو قیمت خرید سے کم پر مسالے فروخت کر کے ہندوستانی تجارت سے خارج کیا گیا اور بالآخر شاہ مکسّر سے دوستانہ روابط کے ذریعہ پرتگیزی نوآبادی کو اس کے حدود مملکت سے خارج کرا یا گیا جس سے تجارت بہت کم ہو گئی، حالانکہ زیر مطالعہ عہد میں یہاں سے مسالوں کی تھوڑی بہت مقدار مسلسل منڈیوں تک پہنچتی رہی۔[1]

باشندگان ڈنمارک کے مذکورہ بالا تذکرہ سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ مشرقی منڈیوں کی نزاع میں صرف ولندیزی اور انگریز ہی شریک نہ تھے بلکہ دوسرے مقابلہ کرنے والے بھی تھے حالانکہ ان کی زیادہ اہمیت نہ تھی۔ باشندگان ڈنمارک نے زیر مطالعہ عہد میں کچھ نہ کیا اور مکسّر میں ان کی سرگرمیوں کے علاوہ وہ خاص طور پر خلیج بنگال کی مقامی تجارت میں مصروف رہے۔ ان کے علاوہ جاوا اور سماترا سے تھوڑے فاصلہ پر فرانسیسی جہاز بھی پہنچا کرتے تھے اور مشرقی سمندروں میں ان کی آمد یہاں سے بھی کم اور ان کی کارگذاریاں قابل لحاظ نہ تھیں۔ ہندوستان میں ان کی مہم جوئی کا زمانہ ہمارے عہد کے حدود سے باہر ہے۔ اوائل صدی کے چند برسوں تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جزائر فیلیپائن کی نوآبادیوں کے

---

[1] یہ دوستانہ روابط زیادہ دن قائم نہ رہے۔ ۱۶۶۸ تک ولندیزی مکسّر میں غالب حیثیت اختیار کر چکے تھے۔

ہسپانوی باشندے مسالہ کی تجارت میں ایک اہم کردار ادا کرنے والے ہیں، لیکن ان کی کوششیں دیرپا ثابت نہ ہوئیں[1] اس دور کے تاریخی خاکہ کی تکمیل میں اب صرف پرتگیزیوں کے علاقائی نقصانات کے بیان کی کمی رہ جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے وہ سب سے اول مسالہ کے جزیرے کے مقبوضات سے بے دخل ہوئے، اس کے بعد ہُرمز سے جس کو فارس اور انگلستان کی مشترکہ فوجوں نے ان سے 1622ء میں چھینا۔ حالانکہ مسقط کا قریبی قلعہ اس کے بعد بھی پچیس برس کی مدت تک ان کے قبضہ میں رہا۔ لیکن بحر فارس میں ان کے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے یہ ناکافی ثابت ہوا۔ اس قلعہ کے عربوں کے قبضہ میں چلے جانے کے بعد پرتگیزیوں کا یہاں کے سمندروں سے تعلق ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا۔ ہُرمز کے بعد ہگلی میں ان کی تجارتی نوآبادی کو شاہجہاں کی فوجوں نے تباہ کیا اور باوجودیکہ اس نقصان کے بعد ان اطراف میں چند پرتگیزیوں کو واپس آنے کی اجازت مل گئی، لیکن تجارت میں ان کی سابقہ برتری دوبارہ بحال نہ ہوسکی۔ چٹاگانگ پران کا قبضہ اس کے بعد تک رہا۔ لیکن ہمارے عہد کے اختتام پر یہ مغلوں کے تسلط میں آگیا۔ ہگلی سے بے دخل ہونے کے نو برس بعد ملاکا پر ولندیزی قابض ہوگئے۔ اس کے بعد ایک عارضی صلح ہوئی لیکن صدی کی چھٹی دہائی میں پرتگیزیوں کا لنکا سے تدریجی اخراج عمل میں آیا اور اس کے بعد ولندیزی پہلے مشرقی ساحل پر نیگاپٹم اور اس کے بعد کوچین اور مالابار کے چھوٹے چھوٹے قلعوں پر قابض ہوگئے۔ چنانچہ بالآخر جب ایک مستحکم صلح ہوئی تو پرتگیزیوں کے مشرقی مقبوضات کم ہوکر

---

[1] باوجودیکہ 1580 کے اتحاد نے پرتگال کے جداگانہ وجود کو ختم نہ کیا تھا اور مشرق میں دونوں مملکتوں میں رسمی طور پر امتیاز برتا جاتا تھا۔ جزائر فیلیپائن کے ہسپانوی، ملکس میں ٹرنیٹ[×] کے قلعہ پر قابض ہوگئے تھے جہاں سے انھوں نے پرتگیزیوں کے چھوڑے ہوئے دیگر قلعوں کو بھی حاصل کرلیا لیکن وہ ان سب کو اپنے قبضہ میں رکھنے میں ناکام رہے۔ جزیروں پر وہ کافی دنوں تک قابض رہے اور فارموسا میں ایک قلعہ بھی ان کے پاس رہا لیکن ان مواقع سے انھوں نے کوئی خاص فائدہ نہ اٹھایا۔

DANVILLE V.235. VI.3. 424. VII.114.

306 ff., DAGH REGISTER, JUNE 10, 1640

× TERNATE

موجودہ زمانہ کے حدود پر آ گئے[1] اب ان کی سمندری طاقت زائل اور ان کی تجارت قریب قریب برائے نام ہو چکی تھی۔ مشرق بعید میں اب ان کے پاس صرف مکاؤ اور تیمور کا ایک حصّہ اور ہندوستان میں گوا کی راجدھانی اور ڈمان اور ڈیو کے بندرگاہ جو اب گجرات کے جہازی مال کے نگرانی تو ضرور کرتے تھے، مگر ان کی راہ میں مزاحم ہونے کی طاقت سے محروم ہو چکے تھے، باقی بچے۔

باب ۱ کے ماخذ

حسب ذیل یادداشت میں ماخذ کے حوالے مختصر ناموں یا کلیدی الفاظ کے ذریعہ درج کیے گئے ہیں جن کے نیچے خط لگا دیے گئے ہیں اور ان کی وضاحت ضمیمہ 'ی' میں حروف تہجی کی ترتیب سے درج کی گئی ہے۔

فصل ۱ :- ہندوستان کے سیاسی حالات کے متعلق اطلاعات ELLIOT اور تزک ایسے معیاری ماخذ سے حاصل کی گئی ہیں۔ ان کے تفصیلی حوالے غیر ضروری ہیں۔ جنوبی حالات DAGH REGISTER میں مندرج ولندیزی رپورٹوں سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ دیگر ایشیائی ممالک کے حالات بے شمار ماخذ سے حاصل کیے گئے ہیں۔ ترکی اور فارس کے مابین تعلقات ENGLISH FACTORIES اور DAGH REGISTER میں درج ہیں جن میں کہیں کہیں ان ممالک کے بھی حالات ملتے ہیں جو ہندوستان کے مشرق میں واقع ہیں۔ پیگو وغیرہ کے متعلق مزید اطلاعات VOORTGAUGH BEGINENDE SOUSA FARIAET اور دیگر عام تصانیف میں موجود ہیں۔ جزائر کے متعلق اطلاعات کے لیے آخر الذکر ولندیزی ماخذ بہترین ہیں۔

مغلوں کا سمندری طاقت کے متعلق نقطہ نگاہ SURAT IREPSTRAT خصوصاً اس کے ضمیمہ جات 5، 6، 8 اور 13 میں درج ہے، لیکن یہ پورے انگریزی مراسلات ENGLISH FACTORIES & LETTERS RECEIVED میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ملاحظہ ہو نیز

---

[1] چارلس دوئم اور شاہزادی پرتگال کے درمیان شادی کی صلح کی رو سے بمبئی کے جزائر و بندرگاہ انگلستان کے سپرد کر دیے گئے تھے۔ اٹھارویں صدی میں مرہٹوں کی فتح کے قبل تک بسین کے علاقے پرتگیزیوں کے پاس رہے۔

JOURDAIN 223 (11-45) یا MANUCI اورنگزیب کے اس فیصلے کے متعلق ایک مشرح اور غالباً مصدقہ اطلاع فراہم کرتا ہے کہ سمندری جنگ وجدل یورپ کے باشندوں ہی کے لیے موزوں ہیں۔ فارس کے نقطۂ نگاہ کے لیے ملاحظہ ہو .ENGLISH FACTORIES IX-226 ۔

فصل 2 :۔ پرتگیزیوں کی سمندری مملکت کا مطالعہ WRITE WAY اور DANVERS میں کیا جا سکتا ہے اور اس سے زیادہ تفصیلات CORREA, CASTENHEDO, COUTS BARROS اور AL BUQUARQUE کی ضخیم تصانیف میں ملتی ہیں۔ یورپ میں ان کی مہم جوئی کے لیے غالباً CAMBRIDGE MODERN HISTORY خصوصاً XV (1, 1, 111,) جن میں مفصل کتابیات درج ہے کافی ہوگی PYRARD نے ان کے سمندری تسلط کے طریق عمل کو واضح طور پر بیان کیا۔ ان میں مروجہ بدعنوانیاں 240 11 پر درج ہیں۔ اکبر کے ان کی مملکت کو تسلیم کرنے کے متعلق ملاحظہ ہو ELLIOT V, 403 اور COUTS-ix,x,441 مسٹر لانگ ورتھ ڈیمس نے جرنل رائیل ایشیاٹک سوسائٹی مورخہ جنوری 1941 میں مطبوعہ اپنے ایک مقالہ میں باشندگان ترکی کے ہندوستانی سمندروں پر قبضہ کی کوششوں کا حال درج کیا ہے "کنیل" کی معرکہ آرائیوں کے لیے ملاحظہ ہو RENNIVILLE 111, 453 HAY 837 ff, FARIA & SOUSA - 111, 44 ff اور DELLA VELLE 1625 میں پرتگیزی افواج کی بہادری کی تصدیق CALENDER SP 1513-16, NO 280 اور 11 290 اور نیز سمندری معرکوں کے متعدد تذکروں سے ہوتی ہے۔

فصل 3 :۔ ان دنوں یورپ میں ہالینڈ کی حالت CAMBRIDGE MODERN HISTORY VOLS I-IV میں بیان کی گئی ہے۔ ایڈمنسٹن نے بھی واقعات کو ایک مناسب ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مشرقی مہموں پر بے شمار ولندیزی تحریریں ملتی ہیں۔ اس موضوع پر میری تحریریں BEGINENDE VOURT- اور VENDER CHIJS, DE JONGE, ELIAS, LINSCHOTEN, GUGH (RENNEVILLE I-IV) میں مندرج ابتدائی سمندری سفر کے حالات پر مبنی ہیں۔ انگریزوں کے ابتدائی سمندری سفروں کے لیے ملاحظہ ہوں EARLY TRAVELS 1 ff.

LETTERS RECEIVED (INTRODUCTION TO VOL. 1) PURCHAS BK I &

CALENDER SP 1513-16 (NOS. 258, 268, 281 ETC.)

لزبن کے ساتھ ولندیزی تجارت کا تذکرہ VANDER CHIJS C(?) میں اور اس سلسلہ میں دِقتیں متعدد ماخذ مثلاً HOUTMAN 1 XXII میں درج ہیں۔ LINSCHOLTEN (1 99) میں جہازوں کی ضبطی کی مثالیں ملتی ہیں۔ پرتگیزیوں سے بچ کر نکلنے کی ابتدائی پالیسی کا ذکر مختلف مآخذ مثلاً HOUTMAN 1, XXXII میں آتا ہے (IV 129) CAMBRIDGE MODERN HISTORY عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ ولندیزی کمپنی کی جارحانہ پالیسی کا آغاز 1608 سے ہوا لیکن BEGI NENDE VOORTGAUGH کے تذکروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1602 کے جہازی بیڑوں سے موزمبیق اور گوا کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا جب کہ 1605 کے بیڑہ کو ملاکا پر قبضہ کرنے کی خفیہ ہدایات تھیں۔ RENNEVILLES V 1 ff 254 ff ولندیزیوں کے پورے طرزِ عمل سے واضح ہوتا ہے کہ مسالہ کے جزائر کی تجارت کی اجارہ داری کو عام طور پر ضروری تصور کیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں پہلا براہ راست حکم جو میری نظر سے گزرا ہے وہ 1609 کی ان ہدایات میں شامل ہے جو پہلے گورنر جنرل کے نام جاری کی گئیں۔ DE JONGE 111 - 153 اس کا پہلا عمل کمپنی کے لیے جزائر کی پوری پیداوار کے حصول کی غرض سے باندہ کے دفاعی استحکامات کو بہتر بنانا تھا ——— یورپ میں مسالوں کی اہمیت پر زیادہ مفصل بحث INDIA AT THE DEATH OF AKBAR میں آئی ہے

فصل 4 :۔ مشرق ابعد میں انگریزوں کی جدوجہد کے بیان کو LETTERS RECEIVED, ENGLISH FACTORIES, I, 11 CALENDER SP FROM 1611 ONWARDS, PURCHAS اور JOURDAIN (خصوصاً 318 اور صفحات مابعد) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ہمیں HAGUE, TRANSCRIPTS SERIES II, NOS 1, 2, 5, 12, 26 ETC. SERIES III 13 & 73 میں ولندیزیوں کے اہم اجزا پر ہمہ تن متوجہ ہونے کو بخوبی بیان کیا گیا ہے۔ پرتگیزیوں کی دِقتیں اس قسم کی تحریروں مثلاً LISBON TRANSCRIPTS 126 (آدمیوں، جہازوں اور سرمایہ کی کمی) 371 میں (شہتیروں کی کمی) 409 میں (بندوقوں کی کمی) وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ انگریزوں کو سورت سے خارج کرنے کا حکم تصنیف مذکورہ 444 پر اور انگریزوں اور پرتگیزیوں کے درمیان صلح کو ENGLISH FACTORIES V P. IX اور دیگر مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔

بارہ سالہ عارضی صلح کے دوران پرتگیزیوں اور ولندیزیوں کے درمیان مناقشوں کے متعدد حوالے موجود ہیں مثلاً HAGUE TRANSCRIPTS I, 69 & RENNEVILLE VII 256 میں ولندیزیوں

اور انگریزوں کے مابین نا کام معاہدے (CALENDER SP 1617-21 (e.g. NOS 115,351,425,666 ETC)
میں بہ کثرت بیان کیے گئے ہیں اور اس کے طریق عمل کو ENGLISH FACTORIES I & II
میں دی ہوئی تفصیلات سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ولندیزیوں کے پرتگیزیوں کے خلاف بعد کے اقدامات کا
DAGH REGISTER کے 1624 اور اس کے بعد کے اندراجات سے پتہ چلتا ہے۔

انگریزوں اور ولندیزیوں کی مشرقی چوکیوں کی تفصیلات ENGLISH FACTORIES IX میں درج
ہیں۔ DAGH REGISTER کی متعلقہ جلد اس موضوع پر اپنے اختصار کے سبب سے زیادہ کارآمد
نہیں ہے یورپی سمندروں میں جنگ کے لیے CAMBRIDGE MODERN HISTORY IV_XVI اور جاوا
اور سماترا میں انگریزی تجارت کے خاتمہ کے لیے ENGLISH FACTORIES X 255 & ELIAS I L 46
ہوں۔ درمیانی برسوں میں ولندیزیوں کی ترقی کے لیے DAGH REGISTER اہم ترین ماخذ ہے لیکن
ENGLISH FACTORIES میں بھی اس موضوع پر قابل قدر تبصرے ملتے ہیں۔ مکتسر کے معاملات کا
بہترین تذکرہ DAGH REGISTER میں ہے۔ e.g I 233, 264 II. 94. 100. III.P.5
HAGUE TRANSCRIPTS میں بھی اس کا کہیں کہیں تذکرہ آیا ہے۔ 1618ء کی اہمیت کے لیے
ملاحظہ ہو

مجھے باشندگان ڈنمارک کی مہم جوئی کے لیے کوئی معاصر ماخذ نہ مل سکا۔ ان کی سرگرمیوں کے
DAGH REGISTER اور ENGLISH FACTORIES میں کہیں کہیں حوالے ضرور آئے ہیں۔ ہرمز کی
فتح کے لیے ملاحظہ ہو ENGLISH FACTORIES II (دیباچہ اور دیگر مقامات)۔ انگریزی کمپنی کے معاملات
پر اس کے اثرات CALENDER SP 1622-24. NOS. 414, 448, ETC میں درج ہے۔ سقط کی
شکست کے لیے ENGLISH FACTORIES VIII, 311 ہگلی کے لیے ELLIOT VII. 24,31
چٹاگانگ کے لیے SARKARS STUDIES لنکا اور کوچین کے لیے THE DUTCH IN
MALABAR (دیباچہ اور اس کے مابعد صفحات) ملاحظہ ہوں۔

باب - 2

ہندوستان میں ولندیزی اور پرتگیزی تجارت میں ترقّی

فصل ا - ابتدائی کوششیں اور ساحل کورومنڈل کی تجارتی کوٹھیاں

ہم اب ولندیزی اور انگریزی کمپنیوں کے ہندوستان اور اس سے مزید مغرب میں واقع ممالک کے ساتھ روابط کی ترقی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اوپر گزر چکا ہے کہ بالکل ابتدائی سمندری سفروں کے منصوبہ میں ہندوستان کو بالکل شامل نہیں کیا گیا تھا لیکن مشرق کے ولندیزی تاجر جلد ہی تجربہ سے اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ ایک نفع بخش تجارت کے لیے ہندوستان کی شمولیت ضروری ہے۔ یہ ضرورت اس لیے محسوس کی گئی کہ وہ اپنی مطلوبہ سیاہ مرچ اور مسالے معمولاً ہندوستانی سوتی کپڑوں کے تبادلہ ہی میں حاصل کر سکتے تھے۔ ولندیزیوں کی ابتدائی مہمیں ان معلومات کی بنیاد پر مرتب کی گئیں جو پرتگیزیوں کے تجارتی طریقوں کے متعلق فراہم کی گئی تھیں۔ سمندری تجارت کے سلسلہ میں لزبن کا طریقہ خاص طور پر چاندی بھیجنے کا تھا۔ چنانچہ ولندیزی بھی اپنے ہمراہ بیشتر تعداد اور کچھ متفرق قسم کے تجارتی سامان لے جایا کرتے تھے۔ لیکن پرتگیزیوں کا یہ طریقہ ولندیزیوں کے لیے مناسب نہ تھا کیونکہ لزبن کی چاندی تو ہندوستان جاتی تھی جب کہ ولندیزی اپنی چاندی جاوا لے جاتے تھے۔ اس طور پر ان کو وہاں سیاہ مرچ تو مل جاتی تھی لیکن تجارتی لحاظ سے یہ کاروبار ناقص تھا۔ بنتم میں کاروبار چینی تاجروں کے ہاتھ میں تھا جو فصل پر کاشتکاروں سے سیاہ مرچ خرید کر چین بھیجنے کے لیے وہاں کے جہازوں کا انتظار کیا کرتے تھے۔ چونکہ ان تاجروں کو چینی منڈی میں مال کی کھپت کا یقین رہتا تھا لہٰذا انھیں اپنا مال کسی اور کے ہاتھ فروخت کرنے

کی کوئی خاص فکر نہ تھی۔ نتیجتہً ولندیزی منہ مانگا دام دینے پر مجبور ہوتے یا بصورت دیگر اصلی فصل تک بندرگاہ پر ٹھہر کر اپنے سفر کی کامیابی کو معرض خطر میں ڈالتے۔ دوسری صورت بڑی ہی خطرناک تھی۔ بندرگاہ پر قیام ہی کچھ کم خرچ طلب نہ ہوتا۔ پھر اس سے بہت زیادہ اہم وہ نقصان تھا جو بندرگاہ پر کیڑوں مکوڑوں کی کثرت سے جہاز کو پہنچتا۔ اور ان سب سے زیادہ ہولناک بندرگاہ پر بے قاعدہ طرز رہائش کی وجہ سے جہازی عملہ میں موت کی کثرت تھی۔ بندرگاہ پر طویل قیام کی صورت میں اس بات کا خطرہ رہتا تھا کہ جہاز یورپ واپس ہونے کے لائق بھی نہ رہ جائیں۔ یا عملہ کی کمی کے باعث دوران سفر ہی ضائع ہو جائیں۔ چنانچہ ولندیزیوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ نفع بخش کاروبار کے لیے ان کو اسی ملک کا مروجہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے یعنی کہ فصل پر کاشتکاروں سے براہ راست خریداری کرنے کے لیے ان کو وہاں اپنے آڑھتیے یا ایجنٹ مقرر کر کے انھیں پہلے ہی سے سوتی کپڑے فراہم کر دینا چاہیے۔ اس طور پر جہاز کو بندرگاہ پر صرف اس قدر ٹھہرنا ہوگا کہ خریدا ہوا مال اس پر بار کیا جا سکے۔ اشین کے حالات عام طور پر بنتم ہی جیسے تھے مگر یہاں باشندوں کی طرف سے بدامنی کے واقعات اور بادشاہ کی حرص اور اس کا ظلم مزید خطرات تھے۔ مسالہ کے جزائر میں یہاں سے بھی مشکل حالات تھے کیونکہ وہاں زر نقد کا ابھی عام رواج نہ ہوا تھا حالانکہ وہاں کے وہ باشندے جو اس کے استعمال سے واقف ہو چکے تھے اس کو قبول کر لیا کرتے تھے۔ یہاں بھی کاروبار کی کامیابی کے لیے فصل پر ہندوستانی کپڑوں کے ذخیروں کے ساتھ موجود رہنا ضروری تھا۔ اشین یا بنتم میں یہ کپڑے دلالوں کی معرفت گراں قیمت پر خریدے جا سکتے تھے لیکن ہمیں اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ ولندیزی ایسے ذہین تاجروں نے تھوڑے ہی دنوں کے تجربہ کے بعد دلالوں کے بجائے ہندوستان سے براہ راست کپڑے خرید کر اپنے کو دلالوں کے کثیر منافع سے محفوظ کر لیا ——— ہندوستانی کپڑے کے کاروبار کا پہلا تحریری حوالہ 1601 میں ملتا ہے جب دو ولندیزی آڑھتیوں نے اشین سے گجرات واپس جانے والے جہاز پر سفر کیا۔ ان کا سورت میں خیر مقدم کیا گیا اور انھوں نے وہاں سے پر امید اطلاعات روانہ کیں۔ لیکن تجارت کے دلاسوں پر انھیں ترغیب بلکہ فریب دے کر کالی کٹ بلایا گیا اور وہاں وہ پرتگیزیوں کے سپرد کر دیے گئے جنھوں نے گوا لے جا کر انھیں پھانسی دے دی۔ اگلے چند برسوں کے واقعات تحریروں میں نہیں ملتے لیکن بظاہر اس اثنا میں دوسرے آڑھتیوں کو گجرات بھیجا گیا اور معلوم ہے کہ 1606 میں سورت

میں ایک ولندیزی ایجنسی پہلے سے موجود تھی جو اگلے سال پرتگیزیوں کی سازش اور ایذارسانی کے نتیجہ میں اس کے اکیلے بچے ہوئے آڑھتیے واں ڈنسن کی خودکشی کے بعد بند ہوگئی۔ اس کے بعد ولندیزی گجرات سے کچھ دنوں کے لیے رخصت ہوگئے حالانکہ یہاں پر تجارت کے روشن امکانات کو محسوس کر لیا گیا تھا لیکن اب ان کے حکام مسالہ کے جزائر کی جدوجہد پر اپنے وسائل صرف کرنے پر تلے ہوئے تھے لہٰذا فی الوقت انھوں نے گجراتی مال کو اشین کی منڈی ہی سے خریدنے پر قناعت کر لی حقیقت میں مسالہ کی منڈیوں کے لیے سوتی سامان کی فراہمی کے نقطۂ نگاہ سے بمقابلہ کارومنڈل کے گجرات کی اہمیت کم تھی اور راس اتنا میں ولندیزی مسولیپٹم میں اپنے قدم جما چکے تھے۔ 1605 میں ان کا ایک کم درجہ کا تاجر وہاں پہلے سے مقیم تھا لیکن تجارتی کوٹھیوں کا قیام اگلے سال شاہ گولکنڈہ سے معاہدہ ہوجانے ہی پر عمل میں آیا اور اب ولندیزی تاجر مسولیپٹم اور اس کی قریبی آبادی نظام پٹم میں جو اس وقت پیٹاپولی کے نام سے زیادہ معروف تھا کاروبار میں مصروف ہوئے۔ لیکن یہاں ان کو جلد ہی معلوم ہوگیا کہ ان کی جملہ تجارتی ضروریات دریائے کسٹنا کے ڈیلٹا سے فراہم نہیں ہوسکتیں یہاں کی خاص مصنوع سادہ کپڑا یا کیلیکو تھا لیکن چونکہ بعض منڈیوں میں خصوصاً جزائر مُلکّا میں ان رنگین کپڑوں کی مانگ تھی جو معاصر تحریروں میں پنٹادوز کے نام سے موسوم تھے اور جس کی صنعت کا مرکز مزید جنوب میں پولی کٹ اور سینٹ طوم کے نواح میں واقع تھا[1] لہٰذا مزید جنوب کی طرف

---

[1] دریائے کسٹنا میں خاص خاص رنگ خاصی تعداد میں پائے جاتے تھے کیونکہ اس کے نواح میں نیل کی کاشت ہوتی تھی خود پیٹاپولی اعلیٰ قسم کے ہندوستانی مجیٹھ یا CHAY_ROOT کے لیے مشہور تھا۔ ان کے لیے ملاحظہ ہو احوال گولکنڈہ جو BEGINENDE VOORTGUGH VENDER BHOCCHES JOURNAL میں کے تحت درج ہیں RENNEVILLE VII,512 ff بظاہر GRAF کی ولندیزی شکلیں SOYE یا ZASIA, کو سمجھنے سے قاصر رہا اور اس نے ان کو 'SERGE' کے لفظ سے بدل کر ان عبارتوں کے مفہوم کو مبہم کر دیا ہے۔ پرتگالی لفظ 'پنٹاڈو' (چھپا ہوا) ان کپڑوں کا ایک معقول حد تک صحیح نام ہے جن پر ابتدا اس کا اطلاق ہوتا تھا۔ اس کی تیاری کے لیے ملاحظہ ہو FIRST LETTER BOOK 59 n انگریزوں نے اسی لفظ کو اختیار کر لیا لیکن ولندیزیوں نے اس کا ترجمہ GESCHILDRED کیا۔

گذشتہ پیوستہ:۔ یہ جلد ہی ان چھپے ہوئے کپڑوں کے وسیع مفہوم میں استعمال (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بڑھنا لازم ہوگیا۔ اگلے دو یا تین برسوں میں ٹیگناپٹم موجودہ نقشوں میں فورٹ سینٹ ڈیوڈ کے نام سے دکھایا جاتا ہے۔ کے قریب تجارتی کوٹھیاں قائم کی گئیں۔ لیکن سب سے زیادہ اہم واقعہ بادشاہ چندرگری کی طرف سے ان کو پولی کٹ میں زمین کے ایک عطیہ کا دیا جانا ہے۔ 1610 میں ولندیزیوں نے یہاں اپنے قدم جمائے اور یہاں کی تجارتی کوٹھی ان کی تمام ساحلی تجارت کے لیے بمنزلہ صدر مقام کے تھی 1612 میں سینٹ طوم کے پرتگیزیوں نے اس پر قبضہ کرلیا لیکن ان سے جلد ہی واپس لے کر اُسے زمینی حملوں کی مدافعت کے خیال سے کافی مستحکم بنایا گیا[1] اس کے بعد سے ساحلی تجارت کو مسلسل فروغ رہا۔ مشرقی تجارت کی ضروریات یہاں سے پوری ہونے لگیں۔ ایسے سامان جو یہاں فروخت ہو سکتے تھے درآمد کیے جانے لگے اور تھوڑے عرصہ بعد فارس اور یورپ سے براہ راست تجارت شروع کی گئی۔

انگریز مسولی پٹم اور پیٹاپولی میں 1611 میں سکونت پذیر ہوئے۔ لیکن ولندیزیوں کی طرح ان کی تجارت کو فروغ نہ ہوا غالباً اس لیے کہ مشرق البعید میں ان کے پاس ان کے ایسی وسیع منڈی نہ تھی یہ کورومنڈل سے مال لے کر اس کے بدلہ میں جاوا اور سماترا سے سیاہ مرچ حاصل کرتے یا اس مال کو مکسر میں فروخت کرتے اور کچھ مدت یہ مال ان کی یورپ اور فارس کے ساتھ تجارت میں معاون ثابت ہوئے۔ لیکن واضح رہے کہ زیر مطالعہ دور کی پوری مدت میں ولندیزی اپنی وسیع تجارت کی وجہ سے منڈیوں میں فریق غالب کی حیثیت میں اور انگریز عام طور پر ان سے پیچھے رہے۔ شمال میں ان کا صدر مقام مسولی پٹم تھا۔ یورپ میں کمپنیوں کے درمیان ایک معاہدہ کی رُو سے 1621 میں جنوبی نوآبادی پولی کٹ میں ان کو قیام کرنے کی اجازت مل گئی۔ لیکن دیگر مقامات کی طرح یہاں بھی ولندیزی قلعوں میں ان کے لیے قیام بے حد تکلیف دہ ثابت ہوا اور وہ مقامی نائک یا سردار کی فراہم کردہ سہولتوں کی وجہ سے پولی کٹ 1626 میں کی ساحلی جھیل

(صفحہ 50 سے آگے)
ہونے لگا جس پر نمونے موقلم سے نہیں بلکہ ٹھپّوں سے بنائے جاتے ہیں ——— بہت سے پنٹاڈوز جن کا سورت کے انگریزی خطوط میں ذکر آیا ہے غالباً چھپے ہوئے کپڑے یا چھینٹ تھے اور آگرہ کے ایک شروع شروع کے خط میں ان دونوں الفاظ کو ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ (ENGLISH FACTORIES 1, 46)

[1] پولی کٹ کے دفاعی استحکامات پر باب 8 میں بحث آئی ہے۔

کے شمالی سرے پر ارماگون کو منتقل ہو گئے۔ ارماگون سے تھوڑے عرصہ تک ان کا کام چلتا رہا لیکن بحیثیت ایک تجارتی مرکز کے اس میں بے حد خامیاں تھیں اور 1640 میں انگریز آڑھتیوں نے اس مقام پر جواب مدراس کہلاتا ہے اپنا کاروبار قائم کیا اور یہاں کے نائک سے معاہدہ کر کے ایک قلعہ تعمیر کر لیا۔ ہمارے عہد کی بقیہ مدت میں یہی انتظام چلتا رہا۔ ولندیزیوں کا صدر مقام پولی کٹ اور انگریزوں کا مدراس رہا اور دونوں کمپنیاں اپنی اپنی تجارتی کوٹھیاں مسولی پٹم اور اس کے نواح میں قائم رکھتے ہوئے ساحل کی مختلف منڈیوں میں کاروبار کرتی رہیں۔

فصل 2 پچھمی ہندوستان میں تجارتی کوٹھیاں

اُوپر گزر چکا ہے کہ ولندیزیوں کی پچھمی ساحل پر اپنا تجارتی کاروبار جمانے کی ابتدائی کوششیں 1607 میں وان ڈنسن کی موت کے ساتھ ختم ہو گئی تھیں۔ اس کے ایک برس بعد ایک انگریزی جہاز سورت سے تھوڑے فاصلہ پر لنگر انداز ہوا اور ابتدائی گفت و شنید کے مکمل ہو جانے پر گجرات میں کاروبار کو مستعدی سے بڑھایا گیا۔ اس مرحلہ پر ان کے ایک نئے مقصد کا ہمیں علم ہوتا ہے۔ جیسا پہلے ولندیزی کر چکے تھے اب انگریزوں نے بھی اپنی مشرقی تجارت کی ضرورت کے لیے گجرات سے سُوتی مال حاصل کرنا چاہا لیکن ساتھ ساتھ ان کی یہ بھی خواہش ہوئی کہ وہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان براہ راست تجارت قائم کر کے اپنی کمپنی کے کاروبار کو وسعت دیں۔ اس توسیع کی ضرورت اس قدر قبل یعنی 1603 ہی میں محسوس کی جا رہی تھی۔ یورپ میں سیاہ مرچ کی فوری مانگ تھی جو بہرحال ایسا نہ تھا کہ پوری نہ کی جا سکے۔ اور جب انگریز اور ولندیزی دونوں زیادہ مقدار میں اُسے یورپ پہنچا دیتے تو وہاں بازاروں میں اس کی افراط ہو جاتی چند برسوں بعد بنتم کے انگریزی تاجروں کو ہدایت کی گئی کہ وہ سیاہ مرچ کے بجائے کوئی بھی دوسرا سامان بھیجیں اور اگر کوئی دوسرا سامان نہ ملے تو بجائے خالی جہاز کے مجبوراً سیاہ مرچ ہی فراہم کریں۔ ظاہر ہے اس صورت میں ایسی نئی منڈیوں کو معلوم کرنے میں جہاں پر انگریزی مصنوعات فروخت ہو سکیں اور جہاں سے انگلستان کے لیے موزوں سامان حاصل ہو سکے کمپنی کا مفاد وابستہ تھا۔ ہندوستان میں تجارت کے امکانات کے متعلق کس قدر کم اطلاعات تھیں اس کا اندازہ ان ہدایات سے کیا جا سکتا ہے جو اس مقصد کے تحت 1607 میں تیسرے سمندری سفر کے کمانڈر کے نام جاری کی گئی تھیں۔ ہندوستانی منڈیوں کے بالمقابل بحر قلزم کی منڈیوں سے

زیادہ اُمیدیں وابستہ کی گئی تھیں اور صرف موسم کے سازگار ہونے کی صورت میں ہی جہازی بیڑے کو عدن میں تجارت کرنے کے بعد خلیج کھبات کے متعلق معلومات حاصل کرتے ہوئے سورت جانے کو کہا گیا تھا۔ یہ بھی ہدایت تھی کہ اگر تجارت کے لیے مناسب وقت پر عدن پہنچنا نہ ہو سکے تو پھر گجرات پہنچ کر اگر ممکن ہو تو وہاں تجارت شروع کی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کو تجارتی لحاظ سے دوسرے درجہ پر تصور کیا گیا تھا۔ بیڑے کو بحر قلزم کی تجارت کے لحاظ سے بہت دیر ہو چکی تھی اور اس سبب سے اگست 1608 میں ہاکنس ہکٹر نامی جہاز سورت سے تھوڑی دور پر لنگر انداز ہوا۔ مقامی حکام کی طرف سے اس کا خیر مقدم کیے جانے کے سبب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس وقت سورت میں پرتگیزیوں کی حیثیت کو ذہن میں رکھا جائے۔ باوجودیکہ وہاں شہر کے اندر ان کی کوئی علاقائی نو آبادی نہ تھی مگر تقریباً ایک صدی تک ان کا اس کی سمندری تجارت پر غلبہ رہا۔ دیو اور دمن میں وہ طاقت کے مالک تھے اور وہ ان ٹھکانوں سے گجرات کے تمام بندرگاہوں سے روانہ ہونے والے جہازوں سے لائسنس کی فیس وصول کیا کرتے۔ ان کے ساحلی بیڑے (قافلہ) صوبہ کی برآمدات کے زیادہ حصہ کی بار برداری کا کام کرتے اور ان کی جنگی کشتیاں ساحلی سمندروں کی، جن کی حفاظت سے مغل لاواسطہ تھے نگرانی کرتیں۔ مقامی حکام پرتگیزی کمانڈروں سے جو وقتاً فوقتاً بندرگاہ پر آتے رہتے اور اپنے مرضی کی عدم تعمیل کی صورت میں جہازی مال کو جلا دینے کی دھمکی دیتے رہتے بے حد دہشت زدہ رہتے تھے۔ ولندیزی ابھی جلد ہی سورت میں اپنے ٹھکانے بے دخل کیے گئے تھے۔ چنانچہ ہاکنس کے پہنچنے کے وقت پرتگیزیوں کی مقامی شہرت غالباً اپنی انتہائی عروج پر تھی وہ اپنی اس حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے دل وجان سے کوشاں رہتے تھے۔ مگر انگریز ان کی عداوت سے مرعوب نہ ہوئے اور مقامی حکام کے اس اعلان پر کہ وہاں تجارتی کوٹھی کا قیام بادشاہ کی منظوری پر موقوف ہے ہاکنس آگرہ جہانگیر کے دربار میں باضابطہ تجارت کا معاہدہ کرنے کی غرض سے حاضر ہوا۔ دربار میں اس کا استقبال اچھے طریقہ پر کیا گیا لیکن پرتگیزی سازشوں کے سامنے اس کی قدرے پرجوش سفارت کارگر نہ ثابت ہوئی اور وہ ایک طویل گفت وشنید کے بعد آگرہ سے ناکام واپس ہوا۔

انگریز ہاکنس کی کوششوں کے نتیجہ کے انتظار کی مدت میں بھی اپنے جہاز سورت بھیجتے

رہے۔ ۱۶۰۹ میں ان کا اسنشن نام کا جہاز ساحل سے تھوڑی دور پہنچ کر ایک پایاب مقام پر تباہ ہوگیا اور اس سانحہ کے ساتھ ساتھ بعض بچے ہوئے انگریزوں کی زمینی علاقہ پر بداعمالیوں سے ملک میں پہلے سے موجود انگریزوں کے مستقبل کو غالباً ضرر پہنچا۔ ۱۶۱۱ میں سر ہنری مڈلٹن سورت پہنچے لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ یہاں پرتگیزی بے حد اثر رکھتے ہیں۔ اگلے سال بیسٹ کا اس سے بہتر طور پر خیر مقدم ہوا اور وہ گجرات میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کا معاہدہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ مغل حکام کی طرف سے محاذ کی اس تبدیلی کی غائت تحریروں میں کہیں نہیں ملتی اور مشرقی حکمت عملی کی روشس پر قیاس آرائی کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ لیکن بظاہر اس تبدیلی کا جزوی سبب وہ صدمہ تھا جو بیسٹ کے جہازوں پر پرتگیزیوں کے حملوں کی ناکامی سے ان کی ساکھ کو پہنچا تھا۔ سمندر میں مغلوں کی خود اپنی کوئی طاقت نہ تھی اور وہ پرتگیزیوں کی سمندری فوج کو ناقابل تسخیر تصور کرتے تھے۔ انگریزوں کی ان معرکوں میں جن میں سے بعض کا خشکی سے مشاہدہ کیا گیا تھا اپنے سے کافی برتر سمندری فوج کے خلاف کامیاب مدافعت سے غالباً یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ ایک یورپی کو دوسری یورپی قوم کے خلاف جنگ پر آمادہ کر کے ملک کی تجارت پر پرتگیزیوں کی گرفت کو ڈھیلا کیا جاسکے گا۔ بحر قلزم میں مڈلٹن کی سرگرمیوں نے جس میں گجراتی جہازوں کی لدائی کے کام میں اس کی دخل اندازی بھی شامل تھی پہلے ہی ظاہر کر دیا تھا کہ انگریز بھی سمندر میں طاقت کے مالک ہیں۔ علاوہ اس کے مشرقی سمندروں میں ولندیزیوں کی کامیابی کی ذخیروں سے بھی غالباً مغل حکام کو محسوس ہوا ہوگا کہ پرتگیزی طاقت اب ناقابل تسخیر نہیں رہ گئی ہے۔ بہرحال مغلوں کے رویہ میں تبدیلی کا جو بھی سبب رہا ہو، ایک واضح حقیقت ہے کہ بیسٹ کی مدافعت کے بعد ہی ایک شاہی فرمان یا منشور شاہی کے ذریعہ گجرات کے مغلیہ حکام اور انگریزوں کے درمیان عارضی معاہدہ کے شرائط کی توثیق کی گئی۔

اس فرمان کے اجرا سے انگریزوں کو گجرات میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کا جواز پیدا ہوگیا اور انھوں نے اس کے مطابق عمل درآمد کیا۔ لیکن یہ واضح ہے کہ مغل مدبرین نے جو قیاساً فی الوقت تو انگریزی تجارت کی موافقت میں تھے لیکن مستقبل کے لیے کوئی پابندی قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ انھوں نے اپنے بہترین مفاد میں معاملہ کیا تھا اور مفروضہ فرمان کچھ زیادہ مفید ثابت نہ ہوا۔ فوری طور پر تو اس سے کام چل گیا اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ سورت

ASCENSION x

میں انگریزی تجارت 1613 سے شروع ہوگئی[۱]۔ اس طور پر ان کو جو غیر مستقل رعائتیں حاصل ہوئی تھیں ان میں مغلوں اور پرتگیزیوں کے درمیان جنگ چھڑ جانے سے بھی کم از کم عارضی طور پر صحیح اضافہ کیا گیا۔ یہ جنگ دو برس تک چلتی رہی۔ مغلوں نے دمن کا براہ خشکی محاصرہ کرلیا اور پرتگیزی گجرات میں جہازوں کی لدائی کے کام کو شدید نقصان پہنچاتے رہے۔ بالآخر آپس میں ایک غیر فیصلہ کن صلح ہوئی۔ لیکن یہ واقعہ خود اپنی جگہ اس امر کا قطعی ثبوت تھا کہ پرتگیزی شہرت تیزی سے زوال پذیر ہو رہی ہے۔ دوسری طرف ظاہر ہے کہ دوران جنگ دوسری یورپی قوموں کے تاجروں کا بمقابلہ ان دنوں کے جب پرتگیزی پورے ملک میں مصروف کار تھے اغلباً زیادہ خیر مقدم کیا جاتا تھا۔

ولندیزیوں کی سورت میں دوبارہ آمد غالباً ان حالات میں ہوئی۔ 1614 میں بندرگاہ کے مقامی حکام نے مسولی پٹم کی ولندیزی تجارت کی کوٹھی کو تحریر بھیجی کہ وین ڈینیسن کا چھوڑا ہوا تجارتی مال ان کے پاس موجود ہے اور وہ اس کو آکر لے لیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی یہ بھی تجویز تھی کہ وہ دئیو اور دمان سے پرتگیزیوں کو بیدخل کر کے ان پر قبضہ کرنے کی فکر کریں۔ مجھے اس میں شک نہیں کہ یہ خط اصلاً ولندیزیوں کے نام پرتگیزیوں کے خلاف ایک جہازی بیڑہ بھیجنے کی نیم سرکاری دعوت تھی۔ جہاں تک چھوڑے ہوتے مال کی واپسی کا تعلق ہے یہ صرف ایک رسمی پیش کش تھی[۲] لیکن ولندیزیوں نے اس پیش کش کو لفظی معنوں میں لیا اور اگلے سال ان کا ایک گماشتہ وان رلوشٹین[*] ایک مختصر جماعت کے ساتھ براہ خشکی سورت پہنچا۔ جیسا کہ توقع تھی اس کو بہت تھوڑا سا مال مل سکا لیکن اس نے وہاں

---

[۱] فرمان کی خامیاں LETTERS RECEIVED II , XXIX, 103, 180, IV-XX/X-311 میں واضح طور پر درج ہیں۔ سورت میں تجارتی کوٹھی کے قیام کا سہرا عام طور پر بیسٹ کے سر باندھا جاتا ہے۔ لیکن بقول مسٹر فاسٹر ہمعصر تحریریں مظہر ہیں کہ یہ ایک تاجر طامس الڈورتھ (THOMAS ALDWORTH) کی مستقل مزاجی کے نتیجہ میں وجود میں آئی تھی۔ (LETTERS RECEIVED II- 137, 157)

[۲] مغل حکام کی واقعی نیت کے متعلق اس خیال کی نیکولس ڈاؤن ٹن (Nicholas Downton) کے نومبر 1614 میں سورت سے لکھے ہوئے ایک مراسلہ سے تصدیق ہوئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ گورنر نے دو ولندیزیوں کے مسولی پٹم سے ہالینڈ آنے کی دعوت بھیجی ہے اور وعدہ کیا ہے کہ پرتگیزیوں سے خالی ہونے کے بعد وہ دمان انھیں دے دے گا۔

[*] VAN RAVESTEYN

سیاست اور نیز تجارت کے بارے میں خصوصاً پرتگیزیوں کی سمندری طاقت سے مغلوں کے خوف کے متعلق بہت سی باتیں سنیں۔ مغل دمن پر خشکی سے حملہ آور ہو کر قبضہ کر سکتے تھے لیکن سمندری راہ سے وہ ان کے قلعہ کی فوج تک رسد کو پہنچنے سے روکنے کا مقدور نہ رکھتے تھے۔ اس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ مغل سمندری جنگ کے اہل نہ تھے اور شاہی حکومت سمندری معاملات سے بالکل ناواقف تھی۔ علاوہ اس کے چونکہ حال ہی میں پرتگیزیوں سے عارضی صلح ہو چکی تھی لہٰذا قرین قیاس تھا کہ وہ شاہی دربار میں دوبارہ رسوخ حاصل کر لیں گے۔ وان ریوسٹین گجرات میں تجارت کے وسیع امکانات کو بخوبی سمجھتا تھا لیکن ساتھ ساتھ وہ اس راہ کی دقتوں سے بھی واقف تھا۔ لہٰذا اس کا اصرار تھا کہ یہاں ولندیزی کامیابی کی اُمید کے ساتھ اس صورت میں کاروبار کی ابتدا کر سکتے ہیں جب ایک ایسا معاہدہ جو ہر پہلو پر حاوی ہو پہلے سے ہو جائے۔

اس کے پیش نظر وہ پریشانیاں تھیں جن میں انگریز 1615 کے آخری زمانہ میں مبتلا تھے اور جن کا تفصیلی حال سر طامس رو نے اپنے 'جرنل' میں بیان کیا ہے۔ وہ وان ریوسٹین کی موجودگی میں سورت پہنچا تھا۔ مقامی حکام کا رویہ کافی معاندانہ تھا اور اس کو تبدیل کیے بغیر باضابطہ تجارت کا سلسلہ قائم ہونے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ جہانگیر کے دربار میں طامس رو کی سفارت کو پوری کامیابی حاصل نہ ہو سکی مگر پھر بھی اس کے رسوخ سے حالات میں قطعی بہتری پیدا ہوئی۔ انگریز آڑھتیوں نے وہاں قیام کر کے کاروباری خرید فروخت کا کام شروع کیا۔ اور تھوڑے بہت ناخوشگوار و... کے باوجود ان کے مقاصد پورے ہوئے اور بنتم کی ضروریات کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ سورت اور لندن کی براہ راست تجارت میں بھی اضافہ ہوا۔

وان ریوسٹین کے سفر کے بعد جلد ہی ولندیزی مستعدی کے ساتھ سورت پہونچے۔ اشیین میں ان کا گجراتی مال خریدنے کا منصوبہ 1616 میں وہاں ان کی تجارتی کوٹھی کے بند ہو جانے پر ختم ہو گیا۔ اور جاوا میں ان کے گورنر جنرل نے ساحل کورومنڈل کے آڑھتیوں کی مخالفت کے باوجود سورت سے براہ راست تجارت قائم کیے جانے کا فیصلہ کر کے اس مقصد کے تحت گفت و شنید کرنے کے لیے پیٹر وان ڈین بروییک کو مامور کیا۔ مشرقی سمندروں میں ولندیزیوں کی بڑھتی ہوئی شہرت کی وجہ سے گجراتی حکام کے ساتھ معقول شرائط پر معاملہ بہ سہولت طے ہو گیا اور دربار شاہی سے

×

بعد میں اس کی توثیق بھی ہوگئی۔اس کے نتیجہ میں 1617 میں ایک تجارتی کوٹھی کا قیام عمل میں آیا۔لیکن ابتدا سرمایہ کی کمی تھی اور 1621 میں وان ڈین بروئیک کی بحیثیت مقامی ڈائرکٹر کے واپسی پر اس کوٹھی کو اہمیت حاصل ہوئی اس نے ولندیزی تجارت کو مستعدی اور کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا۔زیر مطالعہ دور کی باقی ماندہ مدت کے دوران انگریز اور ولندیزی شورت اور گجرات کے دیگر شہروں میں ساتھ ساتھ تجارت کرتے رہے۔اس علاقہ میں ان کمپنیوں میں سے کسی کے پاس بھی ساحل کورومنڈل کے قلعوں کی طرح کوئی مضبوضات نہ تھے بلکہ یہاں آکر قیمے غیر ملکی تاجروں کی طرح شاہی دربار کی عطا کردہ اجازت کے تحت رہا کرتے تھے۔

وان ڈین بروئیک کے زیر انتظام فارس اور بحر قلزم کی تجارت بھی تھی جن کا گجرات کی منڈیوں سے بہت گہرا تعلق تھا۔ان دنوں بحر قلزم کی تجارت کا مرکز بندرگاہ مخا تھا۔یہاں ہندوستانی اور دیگر مشرقی ممالک کے مال مصر اور بحر روم کی منڈیوں کو بھیجے جانے کی غرض سے فروخت ہوا کرتے تھے۔ولندیزی اور انگریز دونوں ہی اس کاروبار میں شرکت کے خواہش مند تھے کیونکہ یہاں پر بیشتر فروخت شدہ سامان کی قیمت سونے اور چاندی میں وصول ہوتی تھی اور یہ وہ اشیاء تھیں جن کی ہندوستان میں سب سے زیادہ مانگ تھی۔لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جو نتائج سامنے آئے وہ ان کی توقع کے مطابق تھے۔

مخا میں وقتاً فوقتاً سیاسی اور انتظامی دشواریاں پیدا ہوتی رہتی تھیں جن سے عارضی طور پر کاروبار رک جایا کرتا تھا۔علاوہ اس کے منڈی کی حالت بھی غیر یقینی تھی۔ہمارے عہد کے بیشتر حصہ میں یہاں کی تجارت تھوڑے بہت خلل کے ساتھ چلتی رہی اور ہم اسے دونوں کمپنیوں میں سے کسی ایک کا بھی سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار نہیں شمار کر سکتے۔

خلیج فارس میں دونوں کمپنیوں کی مہموں کے واقعات مختلف ہیں۔صدی کے آغاز میں خلیج فارس کی ہندوستان کے ساتھ تجارت پر پرتگیزیوں کا پورا قبضہ تھا اور وہ اُسے سب سے زیادہ نفع بخش تصور کرتے تھے۔فارس گھوڑے،خشک میوے،عرق گلاب اور مختلف اقسام کی نفیس اشیاء کی برآمد کیا کرتا تھا اور وہاں کی درآمدات میں خاص طور پر مسالے اور سوتی کپڑے شامل تھے اور کاروبار کے فرق کو ہندوستان سے چاندی بھیج کر پورا

کیا جاتا تھا۔ فارس کی سب سے اہم تجارتی پیداوار ریشم اس کاروبار کے دائرہ سے باہر تھی کیونکہ اس کی تقریباً تمام فاضل پیداوار براہ خشکی روم کی منڈیوں میں بھیج دی جاتی تھی اور ہمارے عہد میں اس میں جو کچھ بھی ترقی ہوئی وہ اس کے کاروبار کے خشکی سے سمندر کو منتقل ہونے کے نتیجہ میں تھی۔ شاہ عباس کو یہ گوارا نہ تھا کہ اس کے دشمن ترکوں کو ان کے علاقہ سے اس کے ملک کا ریشم گزرنے کی وجہ سے نفع پہنچے اور اس نے یہ کوشش کی کہ یورپی اقوام کے جہاز خلیج فارس پہنچ کر اس کو وہاں بار کر لیا کریں۔ بالآخر انگریز تاجر اس بات پر آمادہ ہو گئے اور انھوں نے 1618ء کے اواخر میں بار اول ریشم کو جاسک بندر سے جہاز پر لادا۔ پرتگیزی قدرتی طور پر انگریزوں کے اس علاقہ میں دست اندازی پر جسے وہ اپنا مخصوص میدان عمل تصور کرتے تھے برافروختہ ہوئے اور انھوں نے اپنا حق جتانے کی غرض سے وہاں ایک جنگی بیڑا روانہ کیا مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے اور 1622ء میں انگریزوں نے فارس کی فوج کا ہرمز کے پرتگیزی قلعہ پران کے کامیاب حملہ میں ساتھ دیا۔ اس کاروائی کے نتیجہ میں ہرمز کا ایک بندرگاہ اور منڈی کی حیثیت سے وجود ختم ہو گیا اور اب یہاں کی تجارت گومبروں کو جسے بندر عباس بھی کہتے ہیں منتقل ہو گئی۔ ولندیزیوں نے ہرمز پر حملہ میں شرکت سے انکار کر دیا تھا لیکن قلعہ سے پرتگیزیوں کی بیدخلی کے بعد وہ ریشم کی تجارت میں بہ عجلت شریک ہو گئے اور تقریباً 1623ء کے بعد سے دونوں قومیں اس کو یورپ برآمد کرنے میں سرگرمی سے مصروف رہیں ایک لحاظ سے اس کی تجارت آسان تھی کیونکہ اس پر شاہی اجارہ داری کا تسلط تھا اور دربار میں اس کے تاجروں کا رسوخ قائم رہنے کی صورت میں توقع کی جاسکتی تھی کہ ان کے ساتھ معقول معاملہ ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ فی الجملہ ولندیزیوں کے ایجنٹ شاہی دربار میں ان کے مفاد کے بہتر نگراں تھے۔ علاوہ اس کے یہ بھی تھا کہ ان کو انگریزوں کے بالمقابل بہتر کاروباری سہولیت حاصل تھی کیونکہ وہ فارس کی منڈیوں کو مسالہ جس کی یہاں پر سب سے زیادہ مانگ تھی فراہم کر سکتے تھے۔

انگریز چونکہ مسالے فراہم نہیں کر سکتے تھے لہٰذا وہ اکثر مناسب مقدار میں دیگر قابل فروخت سامان فراہم کرنے میں دقت محسوس کرتے تھے۔ ان حالات میں ولندیزیوں کا ریشم کے کاروبار کے حصہ پر قابض ہو جانا امر لازم تھا۔

کچھ دنوں تک یہ کاروبار بیحد نفع بخش ثابت ہوا لیکن ہمارے عہد کے اختتام پر یورپ میں اس کی مانگ میں کمی کے ساتھ ساتھ منڈی میں بنگال کی پیداوار بھی آنا شروع ہو چکی تھی اور 1655 تک انگریزی کمپنی نے فارس میں ریشم کی خریداری کو بند کر دیا۔

سورت ایک مرکزی مقام تھا جہاں سے ہندوستان کے ایک بیشتر حصہ اور زیر مغرب البعد کے ممالک تک تجارت کو پھیلایا جا سکتا تھا جو اس شہر کی پیداوار کوئی زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی اور تاجروں نے وہاں جمنے کے فوراً بعد ہی نیل اور سوتی سامان کے پیدا کرنے والوں سے قریبی ربط قائم کرنے کی غرض سے پورے گجرات نیز احمدآباد بڑودہ، بڑودہ اور وقتاً فوقتاً دوسری جگہوں پر بھی اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ شروع شروع میں یورپ سے تجارت کے لیے نیل کو "اہم ترین شے" تصور کیا گیا اور انگریز خریدار بہ عجلت بیانہ کے نواح سے جہاں کی پیداوار دور دور کی منڈیوں میں متعارف ہو چکی تھی اور بہ اعتبار خالص ہونے کے گجرات کی پیداوار سے بہتر تھی نیل فراہم کرنے کی غرض سے بہ سمت شمال آگرہ بھیجے گئے۔ ولندیزیوں نے بھی سورت میں اپنے انتظامات مکمل کرنے کے بعد آگرہ میں قیام کر کے فوراً ہی نیل کے کاروبار میں غلبہ حاصل کر لیا۔ ان خریداروں نے اپنی توجہ کو ایک ہی چیز تک محدود نہ رکھا بلکہ جب ان کے علم میں یہ بات آگئی کہ یورپ میں سوتی کپڑوں کی بھی مانگ ہے تو انھوں نے شمالی ہند میں اس کی فراہمی کے امکانات کی کھوج لگائی چنانچہ 1620 میں ہی انگریز آڑھتیوں کی سمانہ (جو اب ریاست پٹیالہ میں واقع ہے) اور پٹنہ (بہار) میں موجودگی ہمارے علم میں آتی ہے۔ مذکورہ تجارتی کوٹھیاں زیادہ دنوں تک قائم نہ رکھی گئیں کیونکہ تجربہ سے معلوم ہو گیا تھا کہ گجرات ہی سے یورپی منڈیوں کی مانگ کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن 1630 کے قحط سے وہاں کے پیداواری وسائل کے عارضی طور پر تباہ ہونے کے بعد جس کا آگے ذکر آئے گا شمال کی طرف بڑھنا ضروری ہو گیا اور آگرہ کے نواح میں زیادہ مقدار میں کپڑے خریدے گئے اور اودھ کی مصنوعات کو جمع کرنے کی غرض سے لکھنؤ میں ایک انگریزی کوٹھی قائم کی گئی۔ انگریز آڑھتیے سورت اور آگرہ کے درمیانی علاقوں سے بخوبی واقف تھے اور وہ اپنے تجارتی مال کے ساتھ ان سے ہو کر اکثر گزرے بھی تھے۔ اس حقیقت سے کہ انھوں نے ان علاقوں میں کوئی کاروبار نہیں کیا یہ تصور کرنا چاہیے کہ یہاں کے لیے کوئی کشش نہ رکھتے تھے۔ اس علاقہ میں ان کی صرف ایک تجارتی کوٹھی برہانپور میں تھی۔ یہ کوٹھی وقتی طور پر سلطنت احمد نگر کو فتح کرنے کی غرض سے وہاں مغلوں کی کثیر فوج کا جو اجتماع تھا اس کے ہاتھ باہر کا سامان فروخت کرنے کی

غرض سے قائم کی گئی تھی۔ لیکن یہ کاروبار اتنا اہم نہ تھا کہ اس کے لیے کوئی مستقل انتظام ضروری ہو۔
انگریز تاجروں کے بالکل ابتدائی مقاصد میں سندھ کی تجارت میں شریک ہونا شامل تھا۔
اس کا تجارتی مرکز شہر ٹھٹھہ اور بندرگاہ لہاری بندر تھا۔ ان جگہوں سے مال خاص طور پر خلیج فارس کو برآمد ہوتا تھا یا جنوب میں سمندر کے کنارے کنارے گجرات اور گوا کو بھیجا جاتا تھا۔ سوتی کپڑوں کے لیے جو یہاں کی برامدات کا بیشتر حصّہ تھا بصرہ خاص غیر ملکی منڈی تھی ان دنوں بڑی جسامت کے جہاز لہاری بندر میں جس کا وجود اب ختم ہو چکا ہے لنگر انداز نہ ہو سکتے تھے کیونکہ وہاں پانی زیادہ گہرا نہ تھا۔ مقامی لوگوں کے پاس جہاز بہت ہی کم تھے اور تقریباً پورا تجارتی کاروبار پرتگیزیوں کے ساحلی جہازوں کے ذریعہ جو ان دنوں فریگیٹ کہلاتے تھے ہوا کرتا تھا۔ زیر مطالعہ دور کے ابتدائی ایام میں اس علاقہ کی تجارت پر پرتگیزی حاوی تھے اور انھوں نے مغل حکام کے یہاں اپنے رسوخ کو استعمال کر کے 1613 میں اس بندر میں کاروبار کرنے کے متعلق انگریزوں کی پہلی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا یہاں پران کے غلبہ کا سبب ان کی سمندری یا فوجی طاقت نہیں بلکہ انگریزوں کے داخل ہونے کے صورت میں بندرگاہ چھوڑ کر جانے کی دھمکی تھی اور صوبیدار جو حاصل درآمد کا اجارہ دار بھی تھا اپنے مالی نقصان کا خطرہ مول نہ لے سکتا تھا۔ ان دنوں کی تجارت کی مقدار کو بظاہر مبالغہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ سرطامس رو کی 1618 میں رپورٹ تھی کہ "یہ اس قدر زیادہ نہیں ہے جس قدر دعویٰ کیا جاتا ہے اور پرتگیزیوں کا منافع ایک بٹہ دس بھی نہیں" اس کا یہ بیان تھا کہ پرتگیزیوں کی جبری وصولیوں کی وجہ سے تجارت کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ اِس کا بعد کے ایک خط میں یہ بیان ہے کہ منڈی میں ہاتھی دانت کے علاوہ اور کسی چیز کی مانگ نہیں اور یہاں سے "اچھے کپڑوں اور افراط کھلونوں" کے علاوہ اور کچھ فراہم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہاں غیر ملکی تاجروں کے لیے کشش کی بہت کم چیزیں تھیں۔ ولندیزیوں نے 1631 میں اپنی تجارت شروع کی لیکن اسے جاری نہ رکھا اور پرتگیزیوں کی اجارہ داری عملاً 1635 تک قائم رہی میتھوولڈ کی کوششوں سے ہندوستان میں انگریزوں اور پرتگیزیوں کے درمیان جو صلح ہوئی اس کے نتیجہ میں یہ اجارہ داری ختم ہو گئی۔ اسی سال کے نومبر میں انگریز تاجروں کا ایک جہاز لہاری بندر پہنچ کر لنگر انداز ہوا۔ حکام نے ان تاجروں

کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے وہاں اپنی ایک تجارتی کوٹھی قائم کی اور تجارت کا یہ سلسلہ ہمارے عہد کی بقیہ مدت تک چلتا رہا۔ ولندیزی چند برسوں بعد سندھ واپس آکر تقریباً 1652 سے باضابطہ تجارت میں مصروف رہے۔ لیکن میرے علم کی حد تک ان کا کاروبار زیادہ بڑے پیمانہ پر نہ تھا۔ حقیقت میں سندھ کی ولندیزیوں کے مقابلہ میں انگریزوں کے لیے زیادہ اہمیت تھی کیونکہ خلیج فارس کی تجارت کے سلسلہ میں ان کو یہاں سے فارس سامان پہنچانا ہوتا تھا جس سے وہاں کا ریشم برآمد کرنے کے لیے ان کو سرمایہ مل جاتا تھا۔ اوپر گزر چکا ہے کہ ولندیزی مسالے فروخت کر کے فارس میں قوت خرید حاصل کر سکتے تھے لیکن انگریزوں کی رسائی مسالوں کی بڑی منڈیوں تک نہ تھی لہٰذا وہ اس کمی کو دوسرے قسم کے تجارتی کاروباروں سے پورا کرنے پر مجبور تھے۔ ان میں سندھ کے کیلیکو کی تجارت کا اہم مقام تھا خواہ یہ فارس کی منڈیوں ہی میں یا بصرہ میں نقد داموں پر فروخت ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریز بڑی محنت کے ساتھ سندھ کا سامان لندن کی منڈی میں پہنچاتے تھے۔ جیسا کہ ابھی گذر چکا ہے یہ 1603 کے بعد سے گجرات سے پورا نہ ہو پاتا تھا اور وہاں زیادہ مقدار میں کیلیکو فروخت ہوتا تھا لیکن فی الجملہ اس علاقہ کی تجارت کی مقدار کو واقعتہً زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔ ملک مفلس اور ایک جابرانہ نظام حکومت کے تحت پس رہا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاز رانی کی دقتیں بھی بڑھ رہی تھیں۔ ان حالات میں زیادہ سے زیادہ سندھ کی تجارت کو سورت کے مرکزی نظام کے ایک نفع بخش تمہ کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔

تجارت کو جنوب میں ساحل کونکن کے کنارے کنارے وسعت دینے کی کوششیں سندھ سے بھی کم کامیاب رہیں۔ اس ساحل پر تجارت کے امکانات کی بخوبی جانچ پڑتال کی گئی اور انگریزی کمپنیوں کے آڑھتیوں کے مختلف اوقات میں ڈنڈا راجپور، دھول اور راجاپور کے بندرگاہوں پر قیام کی اطلاعات ہمارے علم میں آتی ہیں۔ مزید جنوب میں بمشکل کچھ دنوں تک انگریزی کمپنی کے مدمقابل 1636 میں قائم شدہ کورٹینس ایسوسیشین کا صدر مقام رہا[1] ولندیزیوں نے گوا کو وقتی

---

[1] کورٹینس ایسوسیشین کی 1636 سے 1646 تک کی سرگرمیوں کے تذکرے انگریزی ———

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

CALICO ×

ناکہ بندی کے دوران اپنے جہازوں کی رسد رسانی کی غرض سے ون گرلا میں ایک تجارتی کوٹھی قائم کرلی تھی۔ وقت وقت پر بندرگاہوں سے اچھی خاصی تجارت ہوا کرتی تھی لیکن امر واقعہ یہ تھا کہ زیرِ مطالعہ دور کی تقریباً پوری مُدت میں سلطنت بیجاپور جس کی ضروریات ان بندرگاہوں سے پوری ہوتی تھیں خود کوئی اچھی منڈی نہ تھی۔ یہاں سوائے قیمتی دھاتوں کے اور کسی چیز کی کھپت نہ تھی۔ علاوہ اس کے یہاں ایسے تجارتی سامانوں کی مقدار جو ان کے معاوضہ میں مل سکیں بہت کم تھی۔ 1639 کے لگ بھگ انگریزی کمپنی نے ساحل کے اس حصہ پر اپنی تجارت کو فروغ دینے کی بھرپور کوشش کی۔ لیکن اس کے نتائج ہمارے عہد کے ختم ہونے پر ظاہر ہوئے۔ یہاں سب سے زیادہ تجارتی کشش کا موضوع سیاہ مرچ کی فراہمی تھی بتم یا اشیین سے اس کو حاصل کرنے کی دقتوں کی وجہ سے اس وقت اس کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ لیکن جب ہندوستانی مرچ کی طلب بڑھی تو تاجروں نے قدرتی طور پر اس کو مزید جنوب میں کوچین اور کالی کٹ کے قریب و جوار میں تلاش کیا۔

ولندیزیوں نے اہل پرتگال کے مدمقابل آنے کا فیصلہ کرلینے کے بعد کالی کٹ پر قبضہ کرنے کو اپنے اولین مقاصد میں شامل کرلیا تھا۔ 1604 میں انھوں نے زمورن سے پرتگیزیوں کو ہندوستان سے خارج کرنے کی غرض سے معاہدہ کیا اور اس کے بعد بھی انھوں نے معاہدے کیے لیکن اس کے باوجود اس وقت باضابطہ تجارت شروع نہ ہوسکی۔ دوسری طرف انگریزوں نے اپنے 1620 کے تجربات کی بنا پر مزید تجارت نہ کرنے کا فیصلہ کیا بہرحال چند برسوں بعد ان دونوں قوموں کے تاجر اس ساحل کی تجارت میں داخل ہوگئے جس کا بیان تیسرے باب میں آئے گا۔ ولندیزیوں کی کوچین کی فتح کے بعد سیاہ مرچ کی تجارت کی از سر تو تنظیم عہد

(صفحہ 61 سے آگے)

مراسلات میں بہ افراط ملتے ہیں۔ لیکن اس ایسوسیشین کی سرگرمیاں ہندوستانی تجارت پر کوئی قابل لحاظ مقدار میں اثرانداز نہ ہوسکیں سوائے اس کے کہ اس کے مدمقابل آجانے سے پرانی کمپنی کے ممبروں کو کسی نفع بخش نہج پر تجارت کو ترقی دینے کی غرض سے سرمایہ لگانے میں تذبذب محسوس ہونے لگا۔ ایسوسیشین کے حالات کو ENGLISH FACTORIES (V, XXX ff VI XXI, VII, XX ff, VII, X ff), اور COURT MINUTES کے جابجا حوالوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

زیر مطالعہ کے حدود کے باہر ہے۔

فصل 3۔ بنگال کی طرف توسیع

ہم اب مشرقی ساحل کی طرف واپس ہوتے ہیں جہاں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے ابتدائی نوآبادی مسولی پٹم سے ٹیگنا پٹم کے نواح تک پھیلی ہوئی تھی۔ انگریزوں کی آمد کے چند برسوں بعد ایک دوسری قوم کے افراد یعنی اہل ڈنمارک اس اطراف میں آئے اور انھوں نے بندر ٹرانکوئیبار کی معافی حاصل کرکے زیر مطالعہ دور کے بقیہ حصہ میں اس کو اپنا صدر مقام بنائے رکھا۔ مجھے ان کی تجارتی سرگرمیوں کے متعلق کوئی باضابطہ تحریر دستیاب نہ ہو سکی لیکن ولندیزی اور انگریزی تاجروں کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پاس سرمایہ کی مستقل کمی رہا کرتی تھی اور ہندوستان کی تجارت میں ان کا حصہ تھوڑا تھا۔ ولندیزیوں اور انگریزوں کی سرگرمیاں اپنی تجارتی کوٹھیوں تک ہی جن کا ذکر پہلے آیا ہے محدود نہ تھیں بلکہ ساحل کے کنارے کنارے ہر اس مقام پر پھیلی ہوئی تھیں جہاں ان کو معقول شرائط پر سامان مل سکے۔ ولندیزی اندرون ملک گولکنڈہ کے نواح میں بھی خریداریاں کیا کرتے تھے اور انگریزوں کا بھی ایسا ہی عمل تھا۔ لیکن مزید جنوب میں ملک کے اندر مسلسل بدامنی کی وجہ سے تجارت کی کوشش کرنا کار فضول تھا بلکہ ساحلی علاقوں پر بھی جنگ یا بدامنی کے واقعات تجارتی ٹھیکوں میں خلل انداز ہوتے تھے۔ ہمارے عہد کی بیشتر مدت میں جنوب کے آخری حصہ میں کچھ نہیں کیا گیا لیکن 1645 میں ولندیزیوں کے ٹوٹی کورن[x] کے جنوب کیال میں ایک تجارتی کوٹھی قائم کی اور تقریباً انھیں دنوں اس نواح میں انگریز سوتی سامان اور سیاہ مرچ خرید رہے تھے۔ بعد میں انگریزوں نے بھی بظاہر ولندیزیوں کے مقابلہ میں یہاں ایک تجارتی کوٹھی قائم کرلی۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد ولندیزیوں نے پرتگیزیوں سے اس سے زیادہ اہم شہر نیگا پٹم چھین لیا۔

اس طور پر مسولی پٹم سے جنوب کی طرف ساحلی تجارت اچھی خاصی ترقی پر تھی لیکن دلچسپ ترین واقعات یہاں سے دور شمال کی طرف پیش آئے۔ شروع ہی سے ولندیزی پیگو، اراکان اور بنگال کے ساتھ نفع بخش کاروبار کی امید لگائے ہوئے تھے پیگو کے متعلق شروع ہی

---

x TUTICORIN

میں بتادیا جائے کہ یہاں ناکامی ہوئی۔ یہاں کے تجارتی اور انتظامی حالات تقریباً ناقابل برداشت تھے اور یہاں ولندیزی یا انگریز کوئی بھی بڑے پیمانہ پر تجارت کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ وہاں کی انگریزی کوٹھی وقتاً فوقتاً کم وبیش اُمید افزا اطلاعات بھیجتی رہی لیکن 1655 میں اس کو "غیر ضروری" بتایا گیا لہٰذا اگلے سال یہ بند کردی گئی۔ تقریباً اسی وقت ایک ولندیزی اطلاع نے وہاں کی تجارت کو مردہ قرار دے دیا۔

زیرِ مطالعہ دور کے بیشتر حصہ میں ولندیزیوں نے اراکان کے ساتھ تعلقات قائم رکھے حالانکہ تجارت میں وقتی جنگیں خلل انداز ہوا کرتی تھیں۔ تجارت بہ اعتبار مالیت مختصر تھی لیکن یہاں سے خاص طور پر چاول اور غلام فراہم ہوا کرتے تھے۔ جیسا آگے ذکر آئے گا ان دنوں چیزوں کی بٹاویا میں شدید ضرورت تھی اور ہمارے لیے اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ چیزیں بیشتر چٹاگانگ سے حاصل کی جاتی تھیں۔

بنگال میں تاجروں کے لیے اس قدر واضح کشش کے سامان کی موجودگی کے باوجود سمجھ میں نہیں آتا کہ ساحل پر پہنچنے کے بعد اتنے دنوں تک ولندیزی اور انگریز دونوں ہی ادھر کیوں متوجہ نہ ہوئے۔ اس کا سبب مقامی حالات کی ناسازگاری تھی۔ یہاں پُرسکون تجارت کے لیے ضروری امن مفقود تھا اور سمندری بندروں تک پہنچنے میں جو دشواری تھی اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ یہ بندر پرتگیزیوں کے قبضہ میں تھے۔ ہندوستانی وقائع نگار عہد جہانگیری میں بنگال کے اندرونی حالات کی ہمیں بہت کم اطلاع فراہم کرتے ہیں۔ انگریزی مراسلات صرف ان منصوبوں کا ذکر کرتے ہیں جن پر عمل درآمد نہیں ہوا لیکن ولندیزی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالانکہ پولی کٹ اور مسولی پٹم کے تاجر یہاں کے تجارتی امکانات سے باخبر تھے لیکن وہ ان خبروں کی وجہ سے جو انھیں وہاں سے ملا کرتی تھیں کوئی قدم نہ اُٹھاتے تھے۔ ان خبروں کا خلاصہ 1627 میں بٹاویا کے گورنر جنرل کے فیصلہ کے مطابق اس طور پر ہے کہ مسلسل جنگوں اور بغاوتوں اور انتظام حکومت میں اکثر تبدیلیوں کی وجہ سے یہاں نفع بخش تجارت کی کوئی اُمید نہیں پائی جاتی۔ ساحل کورومنڈل کے ہندوستانی تاجروں کے رویہ سے بھی واضح ہوتا ہے کہ اس وقت بنگال کی تجارتی حالت واقعتہً مایوس کن تھی۔ وقتاً فوقتاً ہمارے علم میں آتا ہے کہ ولندیزی ان ہندوستانی تاجروں سے بنگالی مال کو مسولی پٹم لانے کی توقع رکھتے تھے لیکن ان کی یہ توقع پوری نہ ہوئی اور ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہندوستانی

تاجر اسے کوئی سود مند کام تصور نہ کرتے تھے۔ یہاں کے بڑے سمندری بندرگاہوں میں جو حالات تھے ان کے پیش نظر تاجروں کا یہاں کی تجارت میں تردد محسوس کرنا بالکل حق بجانب تھا۔ بنگال میں داخلہ میگھنا اور ہگلی دریاؤں کے دہانوں سے ہوتا تھا[1] ان میں سے میگھنا میں چٹاگانگ کے سمندری قزاقوں کا غلبہ تھا۔ ان میں سے کچھ تو مقامی باشندے اور بقیہ نوآباد پرتگیزی تھے جن کا ذریعہ معاش تجارتی مال کی لوٹ مار تھا۔ اراکان کا بادشاہ (عارضی اختلافات کے باوجود) ان کی حفاظت کرتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ وہ بادشاہ کو اپنے اس کاروبار کی مجموعی یافت کا کچھ فیصد ادا کرتے تھے[2]۔ ظاہر ہے کہ ان کی کاروائیوں سے جائز تجارتی کاروبار کو نقصان پہنچنا لازمی تھا اس لیے اور بھی کہ اشخاص اور نیز تجارتی سامان کو مال غنیمت تصور کیا جاتا تھا اور قیدی غلام بنا کر فروخت کیے جاتے تھے۔ مجھے کوئی ایسی شہادت دستیاب نہ ہو سکی جس سے ظاہر ہو کہ ان دنوں میگھنا اور غیر ممالک کے درمیان معتدبہ تجارتی کاروبار ہوتا

---

[1] میں نے اپنی تصنیف (INDIA AT THE DEATH OF AKBAR) میں سولہویں صدی کے دوران بنگال کے حوالوں کے سلسلہ میں پرتگیزی لفظ PORTO کا SEAPORT نہیں بلکہ ESTUARY ترجمہ کرنے کے کچھ اسباب بیان کیے ہیں۔ ایک ولندیزی گماشتہ جس نے اراکان کا سفر کیا تھا کی 1608 کی رپورٹ میں اس لفظ کے اس طور پر استعمال کیے جانے کی ایک اچھی مثال ملتی ہے۔ وہ چٹاگانگ کو PORTO GRANDE کا HOOF STADT یا بڑا شہر کہتا ہے اور PORTO GRANDE سے اس کا مفہوم دہانۂ میگھنا کا تھا (DE JOUGE iii 287) یہاں یہ بھی لکھنا مناسب ہوگا کہ ولندیزی بعض اوقات خود چٹاگانگ کو LITTLE BENGALA کے نام سے موسوم کرتے ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم وہ اس کو "بنگال کا بڑا شہر" تصور نہ کرتے تھے۔

[2] مسٹر کیمپوس (MR. CAMPOS) نے بنگال میں پرتگیزیوں کے متعلق اپنی دلچسپ تحریر میں 1607 کو ان کی سمندری قزاقی کی ابتدا کا سال تصور کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے قبل بھی انفرادی طور پر قزاقوں کا وجود پایا جاتا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ سترھویں صدی کے ابتدائی برسوں سے تجارت کے لیے اس کا خطرہ بے حد بڑھ کر مغل فوجوں کے چٹاگانگ پر قابض ہونے تک قائم رہا۔ (CAMPOS 81, 187 ff, 155, 167) یہ قول کہ قزاق اپنی لوٹ مار کا ایک جزو بادشاہ اراکان کو ادا کرتے تھے شہاب الدین کے لکھے ہوئے حالات سے جس کا ترجمہ SARKARS STUDIES میں ملتا ہے ماخوذ ہے۔

رہا ہو۔ دہانۂ ہگلی میں بھی قزاقوں کا خطرہ رہا کرتا تھا مگر کم درجے میں۔ اس دہانہ میں جہاز رانی کے خطرات مستزاد تھے[1] ان حالات میں مذکورہ خطرات میں اپنے کو ڈال کر ایک ایسے بندرگاہ پر پہنچنا جس کی تجارت تقریباً پوری طور پر پرتگیزیوں کے ہاتھ میں ہو کوئی کشش نہ رکھتا تھا۔ انگریزوں کو تجارت پر پرتگیزیوں کے قبضہ کا بخوبی اندازہ تھا۔ 1618 میں سر طامس رو نے ہندوستان کے تمام بھیدوں کو معلوم کرنے کے بعد واضح طور پر بیان کیا ہے کہ بنگال میں پرتگالیوں کے بندروں کے علاوہ جن پر وہ مختصر جہازوں کی لدائی کا کام کرتے ہیں اور بندر نہیں ہیں اور اس کے دس برس بعد انگریزی آڑھتیوں نے جو آگرہ سے پٹنہ آئے تھے مطلع کیا کہ "پچھلے برسوں سے پرتگیزی پٹنہ میں تجارتی کاروبار کرتے آئے ہیں۔ وہ بنگال کے نچلے سرے سے جہاں ان کے دو بندرگاہ ہیں ایک گولی (ہگلی)[2] اور ایک دوسرا پپلی اپنے چھوٹے چھوٹے جنگی جہازوں کے ساتھ اوپر کی طرف آتے ہیں۔ اس بادشاہ نے ان کو وہاں قیام کی اجازت دے رکھی ہے۔ گولی ان کا سب سے بڑا بندر ہے جہاں وہ کثیر تعداد میں ہیں۔

زیر مطالعہ عہد کی پوری مدت میں دریائے میگھنا کی تجارت میں رکاوٹیں قائم رہیں۔ ولندیزی تاجر وقتاً فوقتاً اراکان سے چٹاگانگ آتے رہے اور ان کی ضمنی تحریریں شاہد ہیں کہ یہاں کے باشندوں کا خاص پیشہ تجارت نہیں بلکہ بحری قزاقی تھا۔ جہازی مال کی جو فہرست ان کو دستیاب ہوئی اس میں بھی تجارتی ترقی کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی دریائے ہگلی کی تجارتی صورت حال میں 1632 میں پرتگیزی نوآبادی کی تباہی کے بعد سے دفعتاً ایک تبدیلی رونما ہوئی اور پرتگیزی خطرہ سے فارغ ہو کر ساحل کورومنڈل کے ہندوستانی تاجر دوبارہ تجارت شروع کرنے کی غرض سے وہاں کے لیے روانہ ہوئے۔ ساتھ ساتھ ولندیزی

---

[1] METHWOLD 1620 کے لگ بھگ برسوں کے متعلق لکھتا ہے کہ بنگال میں "ہم بالکل اجنبی ہیں ساحل بے حد خطرناک اور ہمارے جہاز اس قدر بڑے ہیں کہ ان کو اس قدر کثیر تعداد میں ابھرے ہوئے چٹانوں کے بیچ سے گزرنا جوکھم کا کام ہے 1004 METHWOLD۔

[2] ہمعصر تحریروں میں ہگلی کا نام مختلف شکلوں میں ملتا ہے۔ CAMPOS (63-65) نے اس نام کے اشتقاق پر جو مباحثے ہوئے ہیں انھیں بیان کیا ہے۔

PIPLI ×.

اور انگریزی جہازوں نے بھی شمال کا رُخ کیا۔

شمال میں تجارت کا اضافہ رفتہ رفتہ ہوا۔ پہلی تجارتی مہمیں جو ہمارے علم میں آتی ہیں وہ کٹک کے نواح میں ساحل کے قریب جہازوں کے لنگرانداز ہونے کی جگہوں تک محدود رہیں۔ اس کے بعد جہاز زیادہ شمال میں پپلی اور بالاسور کے بندرون تک پہنچائے گئے اور 1634 میں بٹاویا سے خود ہگلی میں تجارتی کوشش کرنے کی ہدایت جاری کی گئی۔ اس بندر پر ولندیزیوں کی ابتدائی کوشش حوصلہ افزا نہ ثابت ہوئی۔۔ وہاں پر مسلم تجارت کی اجارہ داری دو مقامی تاجروں کو دے دی گئی تھی اور حکام کا رویہ ہمدردانہ نہ تھا۔ حالانکہ ڈھاکہ میں متعین بنگال کے صوبے دار کے ساتھ ایک اچھا خاصہ معقول معاہدہ ہوگیا تھا تاہم مقامی دشواریوں کے حل کرنے میں یہ کارگر ثابت نہ ہوا اور 1636 میں ولندیزی آڑھتیوں نے پیچھے کی طرف منتقل ہونے کا فیصلہ کیا کیونکہ یہاں تجارتی کاروبار ہگلی کے ایسے مظالم اور جبری وصولیوں سے محفوظ تھا۔ چند برسوں تک ولندیزیوں اور انگریزوں نے اس طریقۂ کار پر عمل کیا کہ وہ پپلی اور بالاسور کے مقام پر دریا سے تھوڑے فاصلہ پر گراں ٹھکانوں سے خریداروں کو اندرون ملک بھیجا کرتے تھے۔ انگریزوں کی سرگرمیوں کے متعلق اطلاعات بہت کم ملتی ہیں۔ لیکن جو اطلاعات ہیں وہ یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں کہ تاجروں کو بمقابلہ کمپنی کے اپنا مفاد زیادہ عزیز تھا اور یہ کہ اس علاقہ میں تجارت کے لیے راہ ہموار کرنے کا کام واقعتہً صرف ولندیزیوں ہی نے انجام دیا اور اگلی دہائی کے شروع ہوتے ہوتے ان کے آڑھتیے پٹنہ اور قاسم بازار تک پہنچ گئے۔ میں نے ولندیزیوں کے ہگلی واپس ہونے کے صحیح زمانہ کا پتہ نہیں چلایا ہے لیکن یہ 1645 اور 1650 کے درمیان میں واقع ہے[1] 1645 میں ان کا کاروبار ابھی پپلی ہی میں تھا اور 1650 میں ان انگریز آڑھتیوں کو جنھیں ہگلی میں تجارت قائم کرنے کی غرض سے روانہ کیا گیا تھا یہ ہدایت تھی کہ وہ ولندیزیوں کے طریقوں پر عمل کریں اور ان کی نوآبادی کے قریب زمین حاصل کریں۔

---

[1] DAGH REGISTER کا یہ سلسلہ بدقسمتی سے نامکمل ہے۔ 1645 اور 1653 کی مدت کے متعلق اس کی واحد موجود جلد میں 1648 کے متعلق تحریر ایک انتہائی مختصر خلاصہ کی شکل میں ملتی ہے جس میں ہندوستان سے موصولہ اطلاعات کے اقتباسات شامل نہیں ہیں۔ میرے علم میں اس کمی کو کسی اور تحریر میں پورا نہیں کیا گیا ہے۔

چنانچہ انگریزوں نے اپنی تجارتی کوٹھی 1657 کے اوائل میں قائم کی اور دونوں کمپنیاں پہلو بہ پہلو تجارت میں مصروف رہیں۔ لیکن ہمارے عہد کی بقیہ مُدت میں منڈیوں پر ولندیزی حاوی رہے۔ ان کی خریداری کا خام مال قاسم بازار سے کچا ریشم اور پٹنہ سے شورہ تھا۔ کچے ریشم کی تجارت کو ترقی پر پہنچانا ان کا اہم ترین کارنامہ تھا۔ یہ تھوڑی مقدار میں نسبتاً نفیس بُناوٹ کا سوتی مال بھی برآمد کرتے تھے لیکن مغربی ممالک کی منڈیاں ابھی تک بنگال کے ململ یا تن زیب سے آشنا نہ ہوئی تھیں۔ دریائے ہگلی میں جہاز رانی کی دشواریوں کا ذکر پہلے آچکا ہے اور ہمارے عہد کے اختتام تک سامان کو چھوٹی چھوٹی ناؤں کے ذریعہ لاکر پپلی یا بالا سور میں جہازوں پر لادا جاتا تھا۔ یہ طریقہ بیحد گراں پڑتا تھا اور 1660 میں انگریزی کمپنی نے سمندری جہازوں کو دریا کے مخالف دھارے پر تجرباتی سفر کرنے کا اختیار دیا۔ اس تجرباتی سفر کے نتائج ہمارے عہد کے حدود سے باہر ہیں ——— پچھلے باب میں ذکر آیا تھا کہ اہل ڈنمارک خاص طور پر خلیج بنگال میں مصروف عمل تھے مجھے ان کی سرگرمیوں کے متعلق ہمعصر شہادتیں دستیاب نہ ہوسکیں لیکن بقول طامس[x] باوری جوان سمندروں میں 1669 سے بعد تک رہ چکا تھا یہ لوگ بنگال کے ساتھ تیس برس سے زائد مُدت تک جنگ میں مصروف رہے لہٰذا یہ تصور کرنا چاہیے کہ ان کی وجہ سے یہاں تجارت کی ترقی میں رُکاوٹ پیدا ہوئی۔ باوری کے قول کا مفہوم یہ ہے کہ اہل ڈنمارک نے بالاسور میں اپنی نوآبادی قائم کرلی تھی لیکن تقریباً 1642 میں جب ڈنمارک سے جہاز نہ آئے تو مقامی صوبے دار نے ان کی نوآبادی میں رہنے والوں کو زہر دے کر اُن کا سامان چھین لیا اور ان کی تجارتی کوٹھی مسمار کردی گئی۔ اس کے بعد ڈنمارک نے جو جہازی بیڑہ آیا اس نے نوآبادی کو ویران پایا اور اس کا کمانڈر ایک معقول بُنیاد پر جنگ کا اعلان کرنے پر مجبور ہوا۔ لیکن جنگی کاروائیاں جو اس علاقہ کی سمندری تجارت کو تباہ کرسکتی تھیں مؤثر پیمانے پر نہیں کی گئیں۔ 1674 میں صلح کی بات چیت شروع ہوچکی تھی اور جلد ہی ان لوگوں کو دریائے ہگلی پر سیرام پور کی ایک نوآبادی میں جگہ مل گئی۔ مجھے اس جھگڑے کی بنیاد کے متعلق کوئی دوسری تحریر دستیاب نہ ہوسکی اور زہر دینے کا قصہ خود اپنی جگہ پر مشتبہ ہے۔ لیکن بہرحال حقیقت جو بھی رہی ہو ولندیزیوں کے بنگالی جہازوں پر حملوں کے متعدد ضمنی حوالوں

THOMAS BOWRY x

سے یہ امر مسلم ہوتا ہے کہ یہاں جنگ کے حالات پائے جاتے تھے اور ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ان حالات میں پرتگیزی تسلط کے خاتمہ کے نتیجہ میں تجارتی کاروبار میں جو بحالی ہوئی اس سے مقامی مالکان جہاز کے لیے پورے طور پر استفادہ کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ ان واقعات سے جن کا خلاصہ اس باب میں بیان کیا گیا ہے ظاہر ہوتا ہے کہ زیر مطالعہ عہد کے ختم ہوتے ہوتے ہندوستان کا بیشتر حصہ یورپی تاجروں کے زیر اثر آچکا تھا۔ سندھ سے بنگال تک کے ساحلی علاقے پر جہاں کہیں بھی معقول تجارت کے امکانات تھے ولندیزی اور انگریز موجود تھے اور شمال میں وہ ان علاقوں کے بیشتر حصہ میں جو اب بہار اور صوبہ متحدہ کے نام سے موسوم ہیں، سرگرم عمل تھے اور وہ ان سڑکوں پر بھی جو آگرہ سے سمندری بندرگاہوں کو جاتی تھیں دیکھے جا سکتے تھے۔ جنوب میں ملک کے اندر وہ زیادہ نہ گھسے تھے لیکن اس علاقہ کی تجارتی منڈیاں ساحل سے اس قدر قریب واقع تھیں کہ وہ سمندری تجارت سے متاثر ہوا کرتی تھیں اور یہ قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ پنجاب کو چھوڑ کر ہندوستان کا دیگر تمام علاقہ نئے حالات سے متاثر تھا۔ اب ہم اپنی تحقیقات کے دوسرے مرحلہ میں ان تجارتی تبدیلیوں کی نوعیت اور مقدار کو متعین کرنے کی کوشش کریں گے جو واقع ہوئیں۔

باب 2. کے ماخذ

فصل 1: مختلف مسالہ کی منڈیوں کے طریق کا اور ان کے ہندوستانی سوتی مال پر انحصار کے سلسلہ میں خاص طور پر ولندیزیوں اور انگریزوں کے بالکل ابتدائی سفروں کے حالات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ایک یا دو سفروں کے بعد اس قسم کے معاملات کو معمولاً بطور امر مسلم تصور کر لیتے تھے۔ اس ضمن میں حسب ذیل عبارتوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

(MOLUCCAS) 11, HOUTMAN 1,72-122 RENNEVILLE 1-3- DE JONG II-448 369 ff (BANTAM) 11 16 JAVA) 11,220 ff TERPESTRAS 158 ff(ACHIN) 11,371 ff (AMBOINA), PURCHAS I 111-153 ff (ADIN) III 149, TERPESTRAS KAROMANDEL, 161 ff (BANTAM) 194 ff (PARIMAN); FIRST LETTER SURAT 3,35; 111,139- BOOK, 73 74,77,84,131,148 427, LETTERS RECEIVED.

1,18, 68 ff 77ff 11,275,324,336,

مشرقی بندرگاہوں میں جہازوں کے لیے خطرات کی موجودگی ان سب کا ایک مشترک موضوع ہے۔ ملاحظہ ہو مثلاً JOURDAIN, 234 236, 303, PURCHAS I 11,179,180, iv 522 LETTERS RECEIVED 111,22. اور بیماری اور بدانتظامیوں سے نقصانات کے لیے ملاحظہ ہو۔ RENEVILLE I,101,

SCOTTS DISCOURSE IN PURCHAS I & IDEM I,111, 186, MIDDLETON 19ff

ولندیزیوں کے سورت کے پہلے سفر کا حال TERPESTRAS SURAT 17ff میں درج ہے۔ اس کے متعلق کچھ تحریریں DE JONGE 491 ff میں بھی ملتی ہیں۔ ولندیزیوں کا ضروری باتوں پر اپنی توجہ کا مرکوز رکھنا اور اس کے نتیجے میں گجراتی تجارت کی طرف سے ان کی عارضی عدم توجہی HAGUE TRANSCRIPTS E G 11,6,5 میں واضح کی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو نیز TERPSTRAS KOROMANDEL(34 ff مشرقی ساحل کی ابتدائی نوآبادیوں کا ذکر VAN DIJK29 میں آیا ہے۔ پرتگیزیوں کے پولی کٹ پر قبضہ کے لئے ملاحظہ ہو HAGUE TRANSCRIPTS 1,69 LISBON TRANSCRIPT I 424; & VAN DIJK 20 ff مشرقی ساحل پر انگریزوں کی آمد کا حال PURCHAS I-111,315,320ff میں ہے انگریزوں کے پولی کٹ کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو ENGLISH FACTORIES 1 PX1111 اور ماگون کے حالات کے لیے تصنیف مذکورہ 111, PX 1 111ff دیگر مقامات پر مدراس کے حالات کے لیے تصنیف مذکورہ vi PP xxx vii,153 ff ,

فصل 2 : انگریزوں کے سورت کے پہلے سمندری سفر کا مقصد FIRST LETTER BOOK, 38,144 ff 291 میں معلوم کیا جاسکتا ہے۔ یہ امر کہ ولندیزیوں کو بھی سیاہ مرچ کی افراط کا تجربہ ہوا تھا DE JONGE III,12 سے واضح ہوتا ہے۔ پرتگیزیوں کی سورت سے دوسری یورپی قوموں کے اخراج کی کوشش LISBON TRANSCRIPTS I,58,444 میں بصراحت مذکور ہیں۔ ہاکنس کا لکھا ہوا تذکرہ PURCHAS I 111, 206ff نیز EARLY TRAVELS 70 ff میں درج ہے۔ اسنشن نامی جہاز کی تباہی کے حالات کے لیے PURCHAS,I 111 & JOURDAIN 124 ff 230 ملاحظہ ہو۔ MIDDLE TON کے سفر کے لیے ملاحظہ ہو

PURCHAS 1,111 اور BEST کے سفر کے لیے مذکورہ تصنیف IV 458 ff I مغلوں اور پرتگیزیوں کے درمیان جنگ کے حوالے انگریزی تحریروں میں اکثر ملتے ہیں مثلاً LETTERS RECEIVED 111 Pxxx پرتگیزیوں کا نقطۂ نگاہ 111, 195 FARIA Y SOUSA میں درج ہے۔ ولندیزیوں کی گجرات میں دوبارہ آمد کے لیے ملاحظہ ہو TERPESTRAS SURAT خاص طور پر اس کے ضمیمے 5 و 6۔ انگریزوں کے اس وقت کے حالات کے لیے ROE خاص ماخذ ہے VANDEN BROECK کا لکھا ہوا تذکرہ (BEGINENGE VOORTGANGH (RENNEVILLE vii, میں ہے۔

بحر قلزم کے تجارتی حالات کو JOURDAIN 77,103 میں واضح کیا گیا ہے اور یہ MIDDLETON اور DOWNTON کے تذکرہ میں بھی جو PURCHAS I 111 میں درج ہیں۔ انگریزوں کی سرگرمیاں ENGLISH FACTORIES 1 PXI سے شروع ہوتی ہیں اور ولندیزیوں کی SURAT 106 ff TERPESTRAS میں اور DAGH REGISTER میں 1664 اور اس سے بعد تک تجارت کی غیر اطمینانی نوعیت کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو ENGLISH FACTORIES VI,59 اہل فارس کی ریشم کی تجارت کا راستہ تبدیل کرنے کی کوشش کا ذکر CALENDER S P EG,NO 486 OF 1513-1616 & 16,210 OF 1617,21, میں جا بجا ملتا ہے۔ فارس میں انگریزی مہم کی ابتدا کے لیے ملاحظہ ہو ROE PASSISM, ENGLISH FACTORIES 11,PP vii ff&1xxv اور ولندیزی مہم کی ابتدا کے لیے TERPESTRAS SURAT 137 ff انگریزوں کی ریشم کی تجارت کے بند ہونے کا ذکر ENGLISH FACTOREES x,2446,119 میں آتا ہے۔

شمالی ہند میں پھیلاؤ کے لیے ملاحظہ ہو LETTERS RECEIVED of ENGLISH FACTORIES & DAGH REGISTER میں جا بجا اور TERPESTRAS SURAT 74,75 وغیرہ میں بھی۔ سندھ میں انگریزوں کی پہلی کوشش PURCHASE I iv 497 میں درج ہے اور تجارت کی مقدار پر ENGLISH FACTORIES 1 12,14 میں بحث کی گئی ہے۔ 1631 کے ولندیزی سفر کا مذکورہ تصنیف iv,207 اور HAGUE TRANSCRIPT I,318 میں اور 1635 کے انگریزوں کے نظم کا ENGLISH FACTORIES V 177ff میں ذکر آیا ہے۔ علاقوں کے نقائص ENGLISH FACTORIES کی بعد کی جلدوں میں ملتے ہیں۔

ولندیزیوں کی نوآبادیاں مذکورہ تصنیف IX. 116 میں اور TAVERNIOR 1- 313.
اور A UCUI 1-57. میں بیان کی گئی ہیں۔ لندن میں سندھ کے مال کی فروختگی کے لیے
ملاحظہ ہو COURT MINUTE میں جابجا مثلاً 19 مئی 1643 اور 11 جون 1658 کچھی
ساحل کے بارے میں انگریز کمپنی کی تجارتی مہموں کو ENGLISH FACTORIES کی جلد ایک
اور اس کے بعد کی جلدوں میں اور COURTIENS ASSOCIATION کی مہموں کو جلد ۵ میں
دیکھا جا سکتا ہے۔ ولندیزیوں کے ونگرلا کے حالات سے متعلق ملاحظہ ہو 1637 اور اس
کے بعد کے DAGH REGISTER ۔ انگریزوں کی از سر نو کوششوں کا ENGLISH
FACTORIES X 233 ff میں ذکر آیا ہے۔ کالی کٹ سے ولندیزیوں کی ابتدائی خط و کتابت
DEGINLNOE VO AFDANGH (RENNEVILLE V 20.VII-57ff) میں درج
کی گئی ہیں۔ پہلوں کو de jouge iii 204,278 میں بیان کیا گیا ہے۔ مشرقی ساحل سے
بعد کے تعلقات کے لیے ملاحظہ ہو TERPESTRAS KOROMANDEL 146 کالی کٹ
میں انگریزوں کے قیام کے لیے ملاحظہ ہو LETTERS RECEIVED VOLS iv-vi &ENGLISH
FACTORIES 1-76

فصل 3 :۔ اس مدت میں اہل ڈنمارک کی سرگرمیوں کا وقتاً فوقتاً تذکرہ ENGLISH FAC-
TORIES x 1 iv اور DAGH REGISTER میں ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو خاص طور پر کیپال اور
ٹوٹیکورن کے لیے ملاحظہ ہو DAGH REGISTER (CORMANDEL) 17 ستمبر 1648
اور ENGLISH FACTORIES vii,252, viii 15 وغیرہ۔ ولندیزی اور انگریزی
تحریروں میں پیگو کا اکثر حوالہ آتا ہے۔ ملاحظہ ہو خاص طور پر ENGLISH FACTORIES
IX-19 اور DAGH REGISTER 16 مئی 1641 ۔ اراکان کے متعلق پہلا ولندیزی تذکرہ
DE JONGE III- میں ملتا ہے۔ DAGH REGISTER میں اکثر بعد کی رپورٹیں ملتی ہیں۔
139,246,270 بنگال کے متعلق ابتدائی ولندیزی تحقیقات کے لیے ملاحظہ ہو
HAGUE TRANSCRIPTS 1,63 111 L3P40 اور انگریزوں کے منصوبے کے لیے
ENGLISH FACTORIES 1 اور LETTERS RECEIVED IV- چاٹگانگ کے بحری قزاق
ان سب کا ایک مشترک موضوع ہے۔ SARKAR'S STUDIES 118- 152 میں ان
کا ایک دلچسپ تذکرہ اور DAGH REGISTER میں ضمنی حوالے ملتے ہیں ہگلی میں پرتگیزیوں

کے تسلط کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو ENGLISH FACTORIES 1,14,213 ۔ ہگلی پر قابو پانے کے بعد ہندوستانی مہموں کے لیے ملاحظہ ہو HAGUE TRANSCRIPTS 1-318 ۔ انگریزوں کی پہلی مہم ENGLISH FACTORIES اور VP xxx VI, VI, PX/IV. میں اور ولندیزوں کی DAGH REGISTER IV-P xxx & PASSIM ابتدا 1634 میں (ملاحظہ ہو خاص طور پر 8 / فروری اور 12 / جولائی 1634، 10 / جون 1636 اور 14 / مارچ 1637 میں)۔ ہگلی میں انگریزی نظم ENGLISH FACTORIES viii-334 & IX میں ملتا ہے۔ سمندری جہازوں کے دریا پر چلنے کے بارے میں ملاحظہ ہو تصنیف مذکورہ X, 408 ۔

اہل ڈنمارک اور بنگال کے درمیان جنگ ملاحظہ ہو ff 181 BOWREY اور نیز ENGLISH FACTORIES vii, 156 میں اس کا تھوڑا حال MASTER 1,318 DAGH REGISTER (COROMENDEL) & VIII اور 6 / مئی اور 29 / دسمبر 1645 میں بھی ملے گا۔

باب۔ 3

ہندوستان کی بدیسی تجارت میں تبدیلیاں

فصل ۱۔ سترھویں صدی کے آغاز پر ہندوستان کی تجارتی حیثیت

پچھلے باب میں ولندیزیوں اور انگریزوں کی ہندوستان میں تدریجی توسیع بیان کی گئی ہے۔ ان کے تجارتی مشاغل کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان مخصوص کاروباری حالات کا ایک عمومی تصور ذہن میں موجود ہو جن میں داخل ہونے کے لیے یہ کوشاں رہے۔ زیرِ مطالعہ دور کے آغاز پر ہندوستانی سامان کی مغربی یورپ میں زیادہ مانگ نہ تھی یہاں سے براہِ راست تجارت کی خاص مد مالابار کی سیاہ مرچ تھی جو ملک کے ایک بہت مختصر حصہ میں پیدا ہوتی تھی۔ یورپ سیاہ مرچ کا خواہاں تھا لیکن یہ کوئی ضروری نہ تھا کہ مرچ مالابار ہی کی ہو۔ اس علاقہ سے اس کا زیادہ مقدار میں برآمد ہونا پرتگیزی تنظیم کی نوعیت پر منحصر تھا نہ کہ اس قدرے امتیازی سہولیت پر جو ہندوستانی مرچ پیدا کرنے والوں کو حاصل تھی[۱] نیل

---

[۱] لندن میں فروختگی کے کاغذات سے پتہ چلتا ہے کہ مالابار کی سیاہ مرچ کی قیمت فروخت بمقابلہ سماترا کی مرچ کے ایک یا دو پینس فی پاؤنڈ زیادہ تھی ملاحظہ ہو 'COURT MINUTES' 18/ دسمبر 1646 و 20/ دسمبر 1648 اور اس میں جابجا۔ پرتگال تک سیاہ مرچ کی باربرداری کا کام شاہی اجارہ داری میں تھا جس کا سولھویں صدی کے اواخر میں ٹھیکہ دے دیا گیا تھا۔ ٹھیکہ داروں کے ایجنٹ گوا میں رہا کرتے اور جاوا اور سماترا سے سیاہ مرچ گوا لے جا کر ان ایجنٹوں کے ہاتھ اجارہ داری (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بحر روم کے علاقہ میں استعمال کی چیز تھی لیکن پچھمی یورپ میں اس کا استعمال بہت ہی کم تھا۔ روئی کی تجارت زیادہ سے زیادہ خردہ فروشی تک محدود تھی اور دیگر تجارتی سامان جو پچھمی یورپ کو برآمد ہوتے ان کا بھی یہی عالم تھا۔ ہندوستان میں یورپی سامان کی مانگ اس سے بھی کم تھی اور عام طور پر پچھمی یورپ اور ہندوستان ایک دوسرے کی ضروریات رفع کرنے کا کوئی بڑے پیمانے پر دھندا نہ کرتے تھے۔ ایشیا میں حالات اس سے بیحد مختلف تھے کیونکہ وہاں کے لیے ہندوستان کا سوتی مال ناگزیر تھا جنوبی ایشیا میں ہندوستانی کپڑے کی مانگ گجرات اور مشرقی ساحل کے کپڑا بننے والے کو روزگار فراہم کرنے کا ذریعہ تھی اور یہ بھی ضروری تھا کہ مشرقی سمندروں میں نفع بخش تجارت کرنے کے لیے ہندوستان سے رابطہ رکھا جائے۔

ہندوستان کی غیر ملکی تجارت کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہاں قیمتی دھاتوں کی کھپت تھی۔ یہ کوئی عارضی مسئلہ نہ تھا بلکہ اس وقت مملکتِ روم کے سرمایہ داروں میں اس صورت حال سے اتنا ہی فکرمندی محسوس کی جارہی تھی جتنا کہ ان دنوں بھی بعض حلقوں میں محسوس کی جاتی ہے اور بے شک سر طامس رو کا یہ مقولہ کہ "یورپ اپنے خون سے ایشیا کی دولت میں اضافہ کر رہا ہے" ہمعصر مغربی نکتۂ نگاہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ حالانکہ ملکی قانون ہندوستان میں سونے اور چاندی کی کھپت کے موافقت میں تھے لیکن اس کا اصل سبب یہاں کے معاشی حالات تھے۔ ہندوستان کے پیدا کرنے والے اپنے سامان کو فروخت کرنے کے خواہاں رہتے تھے اور بعض مخصوص صورتوں کے علاوہ برآمدات پر کوئی سرکاری پابندی نہ تھی۔ دوسری طرف ہندوستانی صارفین کی کثیر تعداد اپنی انتہائی غربت کی وجہ سے غیر ملکی سامان کی خریداری سے معذور تھی۔ اس سامان کی کھپت صرف امراء تک محدود تھی جو تعداد میں بہت کم تھے۔ غیر ملکی سامان کی درآمد حالانکہ بالکل ناقابل لحاظ نہ تھی تاہم یہ اس سامان کے بالمقابل جو یہاں سے برآمد ہوتا تھا بہت کم تھی۔ پس بقول ولیم ہاکنس صورت حال یہ تھی کہ "ہندوستان چاندی کے معاملہ میں دولتمند ہے کیونکہ دوسری قومیں یہاں سکہ لاکر اس کے بدلے میں سامان لے جاتی ہیں اور یہ سکہ باہر نہیں جاتا بلکہ یہیں دفن ہو جاتا ہے۔"

(صفحہ 74 سے آگے)
کی معینہ قیمت پر فروخت کی جاتی تھی۔ اس طور پر جو زائد اخراجات ہوتے تھے وہ اس کاروبار کو غیر نفع بخش کرنے کے لیے کافی تھے۔ (HOU TMAN I- 105)

خاص درآمدی اشیاء کا ہندوستانی منڈی کی محدود کی تنگی کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے۔
مسالے، رنگ پیدا کرنے والی لکڑیاں، گھوڑے، ہاتھی، کچا ریشم، ہاتھی دانت، مونگا اور چند دیگر سامان۔
تانبہ، جست، ٹین، سیسہ اور پارہ اس قدر کم مقدار میں جس کی قلت فی زمانہ مضحکہ خیز معلوم
ہو مع پر تکلف سامان اور متفرق اشیاء کے جن کی قدر و قیمت کا سبب صرف ان کی ندرت
ہوا کرتی، یہ ہیں وہ اشیاء جن کی خاص مانگ تھی اور ہندوستانی سامان کے خواہشمند تاجر
اگر مذکورہ چیزیں فراہم کرنے سے قاصر رہتے تو انھیں چاندی یا سونا ادا کرنا پڑتا۔ ہمارے
فوری مقصد کے لیے یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ان میں سے بہت کم چیزیں یہاں
یورپ سے درآمد ہوتی تھیں۔ تھوڑی تعداد میں پارہ لزبن سے براہِ بحرِ قلزم ہندوستان پہنچتا
تھا حالانکہ یہ یہاں چین سے بھی آتا تھا۔ سیسہ یورپ سے لایا جاتا تھا اور مونگا، اعلیٰ
قسم کے اونی کپڑے، ریشم، مخمل، اور دیگر بُنے ہوئے کپڑے، پھلوں سے تیار کی ہوئی اور تیز
شرابیں، شیشے اور آئینے اور پرتگیزی باشندوں کے لیے نفیس اشیاء اور متفرق اقسام کے
دیگر سامان بھی لیکن ان میں سے بیشتر چیزیں ایشیائی سے درآمد ہوتی تھیں لہٰذا ہندوستان
سے تجارت کرنے کے خواہشمند یورپی تاجروں کو ابتدائی دقت یہ پیش آتی تھی کہ انھیں
اپنے یہاں سے ہندوستان لے جانے کے لیے نفع بخش تجارتی مال تلاش کرنا پڑتا تھا۔

فی الجملہ ہندوستان کے برآمدات میں سوتی مال اہم ترین چیز تھی حالانکہ بعض بندرگاہوں
کی برآمدی تجارت کا انحصار جزوی طور پر دوسری اشیاء پر بھی تھا۔ مثلاً مالابار کے ہندو
سیاہ مرچ کثیر تعداد میں اور دوسری چیزیں بہت کم برآمد کیا کرتے۔ کھمبات[1] اور اس کے
قریبی بندر نیل اور زیادہ تعداد میں دوسرے تجارتی سامان بھیجتے۔ چاول اور شکر بنگال سے
باہر بھیجی جاتی تھی۔ پیگو کورومنڈل سے رنگے ہوئے سوت منگاتا تھا۔ دیگر برآمدات میں
مسالے مثلاً ادرک، الائچی اور ہلدی، متعدد مفرد ادویات، لاکھ، موتی اور ہیرے قابل ذکر
ہیں۔ مالابار اور بنگال کو چھوڑ کر، برآمد کرنے والے بقیہ تمام خطوں میں تجارت کی بنیادی چیز

---

[1] کھمبات صحیح معنوں میں سمندری بندر نہ تھا کیونکہ سمندری جہاز یہاں تک نہ پہنچ پاتے تھے۔
یہاں کے برآمدات کو ساحلی کشتیوں سے یا لو گوالے جاتے تھے یا پھر بندرگاہ کی ناؤں کے ذریعہ
گھوگھا یا ڈیوبے جاکر جہازوں پر بار کرتے تھے۔

سوتی سامان تھے اور اس کی تجارت جن حالات میں کی جاتی تھی ان کو سمجھنے کے لیے تھوڑی سی تفصیل میں جانا ضروری ہے۔ بیشتر کھپت کی منڈیوں کو لکیر کا فقیر قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ صرف اس قسم کا مال چاہتی تھیں جس سے وہ پہلے سے مانوس ہوں اور نئے قسم کے مال کو وہ نہ خرید اکرتیں اور ہندوستان کے پیدا کرنے والے خطوں نے ان منڈیوں کی ضروریات پوری کرنے میں جن سے ان کا میل جول تھا اختصاص حاصل کر لیا تھا۔ سوتی برآمدات حد درجہ متنوع ہوا کرتے اور چونکہ ان کے مروجہ اقسام کے نام متعدد زبانوں سے ماخوذ تھے لہٰذا ان کے تجارتی ناموں سے دورِ حاضر کے قارئین غیر معمولی الجھن محسوس کرتے ہیں۔ بہرحال ان کو ایک مختصر قسم وار ترتیب قائم کر کے ان ناموں کی کثرت کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے چنانچہ میں ان کی برآمدات کو کیلیکوز+، مسلن (ململ اور تنزیب۔ مترجم) اور پوشاک یا پر تکلف سامان کے ناموں سے موسوم کروں گا۔

"کیلیکوز"، تقریباً پورے ملک میں تیار ہوتے تھے اور وہ اولاً تو ہندوستانی پہناوے کے لیے مخصوص تھے لیکن ساتھ ساتھ ان کی زیادہ مقدار برآمد بھی ہوا کرتی۔ یہ سوت کے بُنے ہوئے سادے کپڑے سفید، کورے یا مختلف رنگوں میں ملا کرتے تھے۔ عام طور پر یہ ۱۲ سے ۱۵ گز کی لمبائی اور $\frac{3}{4}$ گز کی چوڑائی کے تھانوں میں تیار کیے جاتے تھے اور ان کو گجرات کے بازاروں میں "دتیاں"[1] یا بافتے کہتے تھے لیکن اس صنعت کے بعض مراکز پر اس سے چوڑے تھان بھی جن کو تاجر چوڑے بافتے کہتے ہل سکتے تھے۔ معمولاً یہ تھانوں میں یا بیس تھانوں کی ایک "کوڑی"+ میں فروخت کیے جاتے تھے لیکن کچھ علاقوں میں "کیلیکوز" اس سے زیادہ تھانوں میں بُنے جاتے اور لمبائی کے حساب سے فروخت ہونے تھے۔ کورومنڈل ساحل کا 'لانگ کلاتھ'، سب سے زیادہ مشہور تھا لیکن شمالی ہندوستان میں بھی لمبے تھان جن کو

---

[1] "دتیاں" بلاشک ہندی لفظ دھوتی کا مرادف ہے ———— بافتہ ایک فارسی لفظ ہے جس کے معنی بُنا ہوا ہے لیکن گجرات کی بازاروں میں یہ مخصوص طور پر دتیوں سے بہتر بناوٹ کے 'کیلیکوز' کے مفہوم میں مستعمل تھا۔

CALICOES ×

CORGE +

تاجر گزتی (یہ بلاشبہ، ہندوستانی لفز سے ماخوذ ہے) کہتے تھے چُنے جاتے تھے۔ کیلیکوز کی ایشیا کے مختلف حصوں میں برآمد زمانہ قدیم سے تھی۔ لیکن پرتگیزیوں نے اس کی تجارت کو پچھمی افریقہ اور نیز برازیل میں اپنے مقبوضات تک پہنچا دیا تھا۔ ان دونوں منڈیوں کی مانگ ایک دوسرے کے تقریباً مماثل تھی کیونکہ ساحل برازیل کی نوآبادیات میں بیشتر افریقی غلام آباد تھے۔ وہاں بھیجے جانے والے "کیلیکوز" کو معمولاً گنی کلاتھ کہتے تھے لیکن وہاں کے لوگ تھوڑے پرتکلف کپڑے بھی استعمال کرتے تھے جو تجارتی مراسلات میں "گنی اسٹفس، سلیو کلاؤٹس" یا نیگرو کلاتھ کے ناموں سے موسوم تھے۔

'کیلیکو' اور مسلن میں فرق صرف ایک درجہ کا تھا اور بعض صورتوں میں شبہ ہوتا ہے کہ ایک مخصوص کپڑے کو نفیس قسم کا کیلیکو کہا جائے یا موٹے قسم کا 'مسلن'۔ عام طور پر بمقابلہ کیلیکو کے مسلن کی بناوٹ باریک اور وزن ہلکا ہوتا تھا۔ یہ گرم ممالک میں استعمال کے لیے ایک موزوں کپڑا تھا۔ اور اس کی برآمد خاص طور پر فارس، عرب اور مصر کو ہوا کرتی تھی۔ پرتگیزیوں نے اس کی تجارت کو شمالی مغربی افریقہ تک پہنچایا جہاں بطور کمر کے پٹکوں اور صافوں کے اس کی ضرورت رہا کرتی۔ مگر میں یہ نہ سمجھ سکا کہ اس کی تجارت کا یہ پھیلاؤ کس حد تک ہندوستان کے لیے نئے کاروبار کا درجہ رکھتا تھا اور کس حد تک یہ محض وہ کاروبار تھا جو مصر کے پرانے راستہ سے موڑ کر نئے راستہ پر لگایا گیا تھا۔ 'مسلن' کی صنعت ایک درجہ میں خاص طور پر بنگال اور دکن میں مرکوز تھی حالانکہ باریک کپڑے بعض دیگر خطوں میں بھی دستیاب ہو سکتے تھے۔

مشرقی منڈیوں میں پوشاک اور پُرتکلف سامان بشمول 'پنٹاڈوز'[۲۴]، چھینٹ، رومال، رنگے ہوئے کیلیکو کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، نقش و نگار سے مزین اور ریشم ملے جُلے کپڑے زیادہ مطلوب تھے۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا مخصوص طرز یا فیشن ہوا کرتا۔ ولیم فنچ نے سورت سے انگلستان بھیجی گئی اپنی پہلی تجارتی رپورٹ میں قلم بند کیا ہے کہ[۲۵] "پریامن (سماترا) اور بنتم اور جزائر ملکس کے کپڑوں کا کیا حال بیان ہو۔ ان کا شمار لامحدود، اقسام

---

[۲۴] پنٹاڈوز کے لیے ملاحظہ ہو صفحہ 25

[۲۵] LETTERS RECEIVED میں مندرجہ رپورٹ پر لکھنے والے کی دستخط نہیں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حدود اور بیس مختلف ہیں "۔ ڈاکٹر ڑپسٹرا بیالیس مختلف اقسام کے سامان کا شمار کرتا ہے جس کا ولندیزی ساحل کورو منڈل پر بالکل اوائل میں کاروبار ہوا کرتا تھا۔ 1619 میں سورت سے جاوا جانے والے ایک انگریزی جہاز کے بیجک میں 30 مختلف اندراجات ملتے ہیں اور انگلش فیکٹریز کی دس شروع کی جلدوں میں سوتی مال کے 150 ناموں کے اشارے درج ہیں۔ بہرحال ہمارے موجودہ مقصد کے لیے ان تمام سامانوں کو شناخت کرنے کی کوشش غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ صرف اس قدر جان لینا کافی ہوگا کہ مختلف منڈیوں کے گوناگوں مذاق کی چیزوں میں بعض گجرات سے، بعض کورومنڈل سے اور بعض ہندوستان کے دوسری جانب سے فراہم ہوا کرتیں اور یہ بھی کہ ممکن ہے مخصوص اقسام کی اشیاء کی مانگ کم رہی ہو لیکن پوشاک اور نفیس اشیاء کا مجموعی کاروبار ملک کے لئے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

اشیاء جن کی برآمد میں بعض علاقوں نے جزوی طور پر خصوصیت حاصل کرلی تھی انھیں بہترین طریقہ پر ایک جدول کی شکل میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ میں نے مندرجہ ذیل گوشوارہ میں ہر مشہور ساحلی خطّہ کے خاص خاص بندرگاہوں کے نام، وہاں سے برآمد ہونے والے مخصوص سامان اور ان کی منزل مقصود کے نام قلم بند کیے ہیں۔ یہ اطلاعات نامکمل ہیں اور اغلب ہے کہ تقریباً ہر جہاز مذکورہ ذیل سامانوں کے علاوہ دیگر مختلف قسم کے سامان بھی لے جایا کرتے تھے اور یہ کہ ان بندرگاہوں سے وقتاً فوقتاً دوسری سمتوں میں بھی جہاز روانہ ہوا کرتے تھے۔ لیکن تجارت کی عام روش حسب ذیل طریقہ پر چلتی رہی یہاں تک کہ ولندیزی اور انگریزی تاجروں نے اپنی سرگرمیوں سے اس کو تبدیل کیا۔

(صفحہ 78 سے آگے)
ہے لیکن مسٹر فوسٹر کا اس کا فنچ سے منسوب کرنا بلاشبہ درست ہے۔

GUINESS STUFFS, (i)

SLAVE CLOUTS, (ii)

NEGRO CLOTH, (iii)

WILLIAM FINCH (iv)

DR. JERPESTRA (v)

ENGLISH FACTORIES, (vi)

سترھویں صدی کے آغاز پر ہندوستان کی برآمدی تجارت کا جدول

ساحلی خطے اور اہم بندرگاہ	خاص برآمدات	منزلِ مقصود
سندھ۔ لہاری بندر	کیلیکو،	خلیج فارس سمندر کے کنارے کنارے گوا کو
گجرات۔ کھمبات۔ گوگھا۔ ڈیو اور سورت	سوتی مال۔ سوت۔ نیل (زائرین کی تجارت بھی)	بحر قلزم۔ خلیج فارس۔ اسپین۔ سمندر کے کنارے کنارے گوا کو
کونکن۔ چول۔ دبھول۔ راجہ پور	خاص طور پر کیلیکو اور نفیس سامان تھوڑی مقدار میں سیاہ مرچ (زائرین کی تجارت بھی)	بحر قلزم۔ خلیج فارس۔ سمندر کے کنارے کنارے گوا کو
گوا۔ گوا (بٹھکل کے ختم ہونے کے بعد)	تجارتی مال کی کسی سواری یا جہاز سے دوسرے جہاز پر منتقلی کچھ مقامی برآمدات بھی	خلیج فارس۔ مشرقی افریقہ۔ لزبن۔ ملکا اور اس کے آگے۔ لنکا
مالابار۔ کالی کٹ کوچین متعدد چھوٹے بندر	سیاہ مرچ	کوچین سے لزبن، لنکا اور ملکا کو
جنوبی ساحل۔ کوتسلون۔ ٹوٹیکوزہ۔ نیگاپٹم	کیلیکو۔ سیاہ مرچ	خاص طور پر سمندر کے کنارے کنارے نیگاپٹم سے ملکا کو اور اس کے آگے
ساحل کورومنڈل۔ (جنوب) سینٹ ٹوم۔ پولی کٹ	نفیس اشیاء۔ کیلیکو اور مسلن، شوت	ملکا اور اس کے آگے۔ اچین۔ پیگو اور ٹناسرم سمندر کے کنارے کنارے

		گوا اور مالابار
شمال۔ مسولی پٹم	کیلیکو اور مسلن، نفیس اشیا، سوت	ملاکا اور اس کے آگے آگے، اشین، ٹیناسیرم، خلیج فارس۔ سمندر کے کنارے کنارے، شمال اور جنوب
ساحل جنجیلی وزاگا پٹم۔ مچھلی پٹم۔	سامان خورونوش (چاول اور تلہن)	خاص طور پر سمندر کے کنارے کنارے
بنگال۔ ہگلی پپلی، بالاسور، چٹاگانگ	سامان خورونوش (چاول اور شکر) مسلن	پیگو اور ٹیناسیرم۔ ملاکا اور اس کے آگے اشین۔ سمندر کے کنارے کنارے وسیع کاروبار

سمندری برآمدات کے علاوہ، براہِ کابل اور قندھار مغرب کی طرف جانے والے زمینی راستہ پر بھی تھوڑی سی بہت تجارت ہوتی تھی۔ یورپی تاجر اس تجارت میں براہِ راست شریک نہیں تھے لیکن غالباً ان کے جہاز، کی لدائی کے کام میں باہمی مقابلہ اس پر اثر انداز ہوتا تھا۔ چنانچہ اس نیل کا جو آگرہ سے براہِ خشکی یا گجرات سے براہِ سمندر اور خشکی لیوانٹ[x] جاتی، بحرِ روم کی منڈیوں میں اس نیل سے مقابلہ ہوتا جو وہاں براہِ سورت اور لندن یا ایمسٹرڈم پہنچتی اور اغلب ہے کہ زیرِ مطالعہ دور میں زمینی تجارت کی مقدار کم ہوئی ہو حالانکہ یہ بالکل ختم ہرگز نہیں ہوئی تھی۔ قندھار کا راستہ وقتاً فوقتاً سیاسی حالت سے متاثر ہوا کرتا تھا۔ صدی کے اوائل میں اس راہ سے گزرنے والے اونٹوں کی تعداد 3000 سالانہ بتائی جاتی تھی۔ جن کے ذریعہ 500 ٹن یا اس سے تھوڑا زیادہ مال برآمد ہوتا تھا لیکن 1651 کے لگ بھگ جب پرتگیزیوں اور مغلوں کی باہمی نزاع نے گجرات سے براہِ سمندر

LEVANT x

فارس تک آمد و رفت میں رخنہ پیدا کر دیا تو ان کا شمار بڑھ کر چار گنا ہو گیا۔ اس سے تیس سال بعد ہم دیکھتے ہیں کہ قندھار پر قبضہ کے سلسلہ میں مغلوں اور اہلِ فارس کی جنگ کے نتیجہ میں تجارت کا رُخ خشکی سے سمندر کی طرف بڑھا۔ ملک فارس کے آڑھتیوں کے مراسلات میں مندرج چند اقوال سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ فارس کی اندرونی منڈیوں کے لیے ان دونوں راستوں میں کم و بیش مقابلہ رہا تھا اور باہمی نزاعوں کے باعث عارضی نشیب و فراز سے قطع نظر انگریزی اور ولندیزی سرگرمیوں کے نتیجہ میں شمالی تجارت کا تھوڑا سا حصہ سمندر کے راستہ کی طرف منتقل ہوا ہوگا۔ بہرحال یہ مسئلہ واضح نہیں ہے اور متعلقہ تجارت کی مقدار بھی اس قدر کم ہے کہ اس کا تفصیلی جائزہ ضروری نہیں معلوم ہوتا۔ چونکہ ہندوستانی تجارت نے سمندر پر زیادہ اہم ترقی کی تھی لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی توجہ صرف ساحلی تجارت ہی تک محدود رکھیں۔

فصل 2 قوت خرید کی فراہمی

ہندوستان کی غیر ملکی تجارت کے مذکورہ بالا خاکہ سے یہ بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ ان یورپی تاجروں کے لیے جو ہندوستانی پیداوار خریدنے کے خواہاں رہتے، شروع ہی سے گجرات اور کورومنڈل کی منڈیوں میں قوتِ خرید کی فراہمی کا مسئلہ درپیش تھا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، ولندیزوں نے جلد ہی محسوس کر لیا تھا کہ وہ مشرق میں جس مسالے کی تجارت کے خواہاں تھے اس کے لیے ہندوستان کا سُوتی مال درکار تھا، لیکن وہ ابھی تک یہ نہ معلوم کر سکتے تھے کہ وہ اس مال کی قیمت کیوں کر ادا کریں۔ اسی طور پر جب یہاں انگریز یورپ کے لیے نیل اور کیلیکو خریدنے آئے تو ان کے سامنے بھی یہی مسئلہ درپیش ہوا۔ فارس میں ریشم کی تجارت کے ساتھ بھی یہ مسئلہ اٹھا کیونکہ اس کی قیمت کے عوض ہندوستانی مال یا کوئی دوسرا مال از قسم مسالہ فراہم کرنا ضروری تھا جس کو حاصل کرنے کے لیے بھی ہندوستانی پیداوار کی ضرورت تھی۔ اسی طور پر مشرق بعید سے یورپی ضرورت کی کم اہمیت والی چیزیں بھی بیشتر ہندوستانی سامانوں ہی کے عوض خریدی جا سکتی تھیں اور عام طور پر ان تمام سامانوں کی خریداری کے لیے جن کی یورپ کو صرف ہندوستان ہی سے نہیں بلکہ پورے ایشیائی سمندروں سے ضرورت رہا کرتی انھیں ہندوستان ہی سے قوت خرید بہم پہنچانا

تھا۔ اس کے لیے واضح تدبیر یورپی مال کو ہندوستان میں فروختگی کے لیے پہنچانا تھا۔ لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ یورپ کی ضروریات کی قیمت کے بالمقابل ہندوستان میں یورپی مال کی کھپت بہت کم ہے تو تین دوسری صورتیں زیر بحث آئیں۔ قیمتی دھاتوں کا ہندوستان پہنچانا، ہندوستانی منڈیوں میں قرض لے کر سرمایہ کی فراہمی، یا ایشیائی تجارت میں سرمایہ لگا کر اس کے منافع کو مسالہ یا دیگر مشرقی پیداواروں کی شکل میں یورپ بھیجنا۔ یہ تینوں صورتیں کم وبیش کامیابی کے ساتھ اختیار کی گئیں اور زیر مطالعہ دور میں تجارتی کاروبار کو جو نشو ونما حاصل ہوئی وہ انھیں تدابیر کے اتحاد کا نتیجہ تھا۔ یہ بات کہ ہندوستان میں غیر ملکی اشیاء کی مانگ ناکافی تھی جلد ہی سمجھ لی گئی۔ ولندیزی اور انگریز تاجر تقریباً ہر اس چیز کو جو مغربی یورپ میں زیادہ تعداد میں پیدا کی جاتی تھی، ہندوستان لے جاتے لیکن نتیجہ بار بار مایوس کن رہا اور تھوڑے ہی تجربہ کے بعد ہندوستان سے جانے والے سامانوں کی فہرست سے کافی چیزوں کو خارج کرنا پڑا یہ بھی پریشانی تھی کہ جو مال یہاں قابلِ فروخت ہوتا اس کی کھپت بہت محدود رہتی۔ مثلاً لوہے کی تجارت میں اتفاق ہی سے نفع ہو سکتا تھا۔ یورپ کی ٹین جزیرہ نما ملایا کی ٹین سے معمولاً مقابلہ نہ کر سکتی تھی اور کپاس پیدا کرنے والے مرکزوں کو سوتی کا کپڑا بھیجنا بظاہر خسارہ کا کاروبار تھا۔ تجربہ ہو جانے کے بعد یورپ سے بھیجے جانے والے تجارتی مال کی فہرست تقریباً ایک ہی ڈھرے پر چلتی رہی۔ فرق مخصوص اشیاء کی صرف مقدار میں ہوا کرتا۔ مال و دولت کے علاوہ، جہاز صرف اونی کپڑوں کے چند ٹکڑے، تھوڑا سا سیسہ تھوڑا سا پارہ اور شنگرف، بحرۂ روم سے مونگا اور افریقہ کے ساحل سے ہاتھی دانت، تلوار کے چند پھل، چھری، چاقو اور دیگر قابلِ فروخت تکلف کے سامان لے جاتے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے ان کی مجموعی قیمت ان سامانوں کی خریداری کے لیے جن کی یورپ کو ایشیا سے ضرورت رہا کرتی مثلاً مسالے، کیلیکو، نیل، ریشم اور دیگر تجارتی اشیاء بالکل ہی ناکافی تھی۔

ابتدائی تجربہ سے جہاں یہ مسلم ہو گیا تھا کہ یورپ کا کافی مقدار میں اپنا سامان فروخت کرنا ممکن نہیں وہیں یہ بھی واضح ہو گیا تھا کہ چونکہ ہندوستان اپنا سامان نقد فروخت کرنے پر تیار رہتا تھا لہٰذا ان تمام دقتوں پر بیش قیمت دھاتیں فراہم کر کے قابو پایا جا سکتا ہے۔ لیکن

MALAY PENINSULA x

سونے وچاندی کی برآمد کو مغربی یورپ کے مدبّرین اور سرمایہ داروں کے نظریات کی بنیاد پر قابلِ مذمّت تصور کیا جاتا تھا۔ یہ نظریات وقت کے حالات کے تحت کافی معقولیت پر مبنی تھے اور ان کو عوام کی حمایت بھی حاصل تھی جو اس برآمد کے بیحد مخالف تھے۔ سونے چاندی کے برآمد کرنے کے خواہشمند تاجر، طامسؒ من کے سامنے واقعتاً یہ دلیل لا سکتے تھے کہ اگر ان برآمدات کے نتیجہ میں اس سے زیادہ مقدار ملک کے اندر آجاتی ہے تو یہ سودمند ثابت ہوگی۔ لیکن ان دلائل سے عوامی مخالفت ختم نہ ہوسکی اور اس کا پورا لحاظ کرنا پڑا۔ انگریزی کمپنی اسی حد کے اندر سونا یا چاندی برآمد کرسکتی تھی جس کی وہ اپنے چارٹر کی رو سے یا وقتاً فوقتاً پریوی کونسل کی جانب سے مجاز کی گئی تھی اور وہ اپنے تجارتی کاروبار کو اس طور سے چلانے کی پابند کی گئی تھی کہ دیگر یورپی ممالک میں مشرقی سامان فروخت کرکے برآمدات کی کمی پوری کرے۔ لیکن یہ بندشیں کمپنی کو نکتہ چینی سے محفوظ رکھنے کے لیے کافی ثابت نہ ہوئیں۔ 1618 میں ٹاور+ کے سرکاری سکّے سازوں نے چاندی کی کمی کی شکایت کی۔ انھوں نے اس کمی کا سبب کمپنی کی برآمدات کو قرار دیا۔ پریوی کونسل نے 1620 میں اس شکایت کی جانچ کی۔ اگلے برس کمپنی کے نام مملکت میں زیادہ مقدار میں چاندی لائے جانے کی تدابیر پر غور کرنے کے احکام صادر ہوئے 1621 میں اس سلسلہ میں پمفلٹ بازی بھی ہوئی۔ 1624 میں دارالعوام میں اس موضوع پر بحث چھڑ جانے کے سبب سے باہر جانے والے جہازوں کو سفر سے روک دیا گیا۔ بحث میں ممبروں کے احساسات کی شدّت نے ایسی صورت حال پیدا کردی تھی جس کو موجودہ زمانہ کی زبان میں "منظر تراسین" پیش کرنا کہتے ہیں۔ ان حالات میں ہمیں اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ کمپنی نے بیش قیمت دھاتوں کی برآمدگی کی ضرورت کو کم کرنے کے سلسلے میں ہر امکانی اقدامات اختیار کیے۔ حقیقت یہ ہے کہ کمپنی کی ابتدائی تاریخ کا ایک بڑا حصہ انگریزی سامانوں کو ایشیا کے دیگر ممالک میں فروخت کرنے کی کوششوں سے متعلق ہے کیونکہ ہندوستانی منڈیوں میں اُن کی کھپت نہ تھی۔ 10-1609 میں جاوا کے آڑھتیوں کے نام جو ہدایت جاری کی گئیں ان میں خاص طور پر اونی سامانوں اور دیگر انگریزی پیداواروں کی فروختگی کو بڑھانے پر زور

THOMAS MUN ×

TOWER +

دیا گیا تاکہ "ہم بغیر زرِ نقد برآمد کیے ہوئے تجارت کر سکیں اور ہماری خواہش کا یہی لبِّ لباب ہے۔"[1] 1628 میں سورت کے آڑھتیوں نے ہاتھی دانت کے منافع کو ناکافی قرار دیتے ہوئے لکھا کہ "چونکہ آپ کی طرف سے مسلسل یہ خواہش ظاہر کی جا رہی ہے کہ انگلستان سے سِکّہ نہ منگوایا جائے لہٰذا ہمیں مجبوراً ایسی اشیاء منگوانا پڑتی ہیں جن سے بس قیمت نکل آئے۔" ان کوششوں میں کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی اور بجز اس کے کوئی چارۂ کار نہ رہ گیا کہ جس قدر بھی سونا اور چاندی قانوناً باہر جا سکتا تھا اس کا مناسب ترین مصرف کیا جائے۔

اس معاملہ میں بظاہر ولندیزی کمپنی کی حالت فی الجملہ کچھ بہتر تھی۔ کم از کم انگریز تاجروں نے دارالعوام کے نام اپنی عرضداشت میں اس امر پر زور دیا کہ "ولندیزی، اہلِ وینس اور اہلِ جنیوا زرِ نقد کو باہر نہ لے جانے پر اس قدر اصرار نہیں کرتے۔" اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ایسا امرِ واقعہ نہ ہوتا تو عرضداشت کنندگان یہ تحریر کرنے کی جرأت نہ کرتے۔ غالباً ولندیزی کمپنی کو اس معاملہ میں اپنے وسیع اثرات سے فائدہ پہنچا کیونکہ اس کے تاجر اپنے ملک کی حکومت پر حاوی تھے اور ان کو اُمید تھی کہ وہ اپنے منصوبوں کے لیے منظوری حاصل کر لیں گے۔ برخلاف اس کے لندن کی پارلیمنٹ میں انگریز تاجروں کا رسوخ بہت کم تھا۔ لیکن یاد رہے کہ دونوں کمپنیوں کی حالت میں فرق صرف درجہ کا تھا اور ولندیزی کمپنی کے کاروبار پر بھی زرِ نقد کے نظریہ یا اس کی برآمدگی کی مخالفت کے اثرات کو ان ایام کی تحریروں میں دیکھا جا سکتا ہے، مثلاً سورت میں ایک تاجر کی جانب سے آگرہ میں تجارتی کاروبار پھیلانے پر خاص طور سے اس بناء پر کہ وہاں زرِ نقد کی ضرورت نہ ہوگی زور دیا جانا یا اس امر پر اصرار کہ مُخا کی تجارت سے وصول ہونے والا زرِ نقد ان کی ہندوستانی تجارت کی ترقی کے لیے لازمی ہے۔ اس کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں کمپنیوں کی تجارتی سرگرمیوں کی حد بندی کی گئی اور جیسا کہ مُخا میں ہوا، اس حد بندی سے تجاوز کرنے کی صورت میں زائد وسائل کی فراہمی کا بار خود کمپنی پر ڈالا گیا۔ منجملہ مذکورہ بالا صورتوں کے ہندوستان میں قرض لے کر سرمایہ کی فراہمی کو ولندیزیوں نے کبھی کبھی اور انگریزوں نے ان سے زیادہ اختیار کیا مگر اس طور پر قابلِ حصول رقم کی مقدار بہت محدود تھی لہٰذا زیادہ شرحِ سود ادا کرنا ہوتا تھا۔[1] 1620 سے

---

[1] مذکورہ اعلان DAGH REGISTER اور ENGLISH FACTORIES میں مندرج ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

1650ء کے درمیان ادا کیے ہوئے سود کی شرح تقریباً 12 فیصدی تھی۔ اگلی دہائی میں شرح گھٹی اور تحریروں میں 6 فیصدی تک کا ذکر آتا ہے لیکن یہ کمی عارضی ثابت ہوئی اور 1659ء میں 9 فیصدی کی شرح ادا کرنے پر بھی بہت کم سرمایہ فراہم ہو سکا۔ مشرقی ساحل پر مروجہ شرح 18 فیصدی کے زیادہ قریب تھی لیکن 1630 سے 1640 کے دوران جب انگریزی تاجروں کی ساکھ گھٹی ہوئی تھی ان کو 24 سے 36 فیصدی تک ادا کرنا پڑا۔ آگرہ میں 9 اور 24 کے درمیان، سندھ میں 15، بنگال میں 36 اور ساحل کونکن پر ½13 فیصدی کی شرحوں کی اطلاع ملتی ہے۔ یہ شرحیں تجارتی کاروبار کے لیے تباہ کن تھیں اور ہمیں اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ دونوں کمپنیوں نے تجربہ کے بعد ہندوستان میں قرض لے کر تجارت کرنے کے خلاف فیصلہ کیا۔ ولندیزیوں نے تو اپنے وسیع ذرائع کے بل پر اس طریقہ کو کافی عرصہ تک کلیتہً ترک کر دیا لیکن لندن میں سرمایہ کی فراہمی میں مسلسل دقتوں سے مجبور ہو کر انگریزی کمپنی نے کڑی پابندیوں کے تحت ہندوستان میں قرض لینے کی اجازت دی اور انھوں نے اپنے آڑھتیوں کو اس کا بھی مجاز کر دیا کہ وہ مخصوص حالات میں اپنی تجارت کی بقا کے پیشِ نظر ان حدود سے تجاوز کر سکتے ہیں۔ بہرحال سرمایہ کی ضرورت مسلسل تکلیف دہ ثابت ہوتی رہی اور قوت خرید کے حصول کا یہ طریقہ درحقیقت اس قدر گراں تھا کہ بجز ہنگامی صورتوں کے اس کو اختیار نہ کیا جا سکتا تھا۔

فصل 3۔ کمپنیوں کی ایشیائی تجارت

اب یورپ کے تجارتی سامانوں کی برآمدات اور بیش قیمت دھاتوں میں اضافہ کا

(ص 85 سے آگے)
ماہانہ شرحوں کی بنیاد پر نکالی ہوئی سالانہ شرحیں ہیں۔ یہ نتیجہ کہ یہ عام بازاری شرحوں سے زائد نہ تھی ایک ولندیزی آڑھتیے کے اس بیان سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ گولکنڈہ کے اعلیٰ افسران 4 فیصدی ماہانہ کی شرح پر قرض دیتے تھے لیکن پریشان حال لوگوں سے 5 فیصدی وصول کرتے تھے (ACCOUNT OF GOLCONDA IN BEGINENDE VOORTGAUGH, RENNIVILLE VII, 510)۔ 1641 کے BATAVIA JOURNAL کا مولف یہ لکھتے ہوئے کہ ساحل کارومنڈل پر کوئی سودی قرضہ واجب الادا نہیں رہ گیا ہے یہ دعا کرتا ہے کہ "خدا! مستقبل میں کمپنی کو اپنے سرمایہ سے تجارت کرنے کا موقع عطا فرما دے!"

صرف ایک ذریعہ رہ گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ موجود سرمایہ کے ایک جزو کو پابندی کے ساتھ ایشیائی تجارت میں لگا کر اس سے ہندوستان میں ضرورت کے لیے قوت خرید حاصل کی جائے اور راصل سرمایہ کو نہیں بلکہ صرف کمائے ہوئے نفع کو یورپ بھیجا جائے۔ اس طریقہ سے حاصل ہونے والے فوائد کو سرطامس رونے بہت زور دے کر بیان کیا ہے۔ اس نے ڈائرکٹروں کو مطلع کیا کہ ان کے بھیجے ہوئے تجارتی مال سے "یہ کاروبار نہیں بڑھ سکتا۔ ان کو اسے تبدیل کرکے امداد بہم پہنچانا چاہیئے" اور اس نے اس کے فوراً بعد اس امر پر اصرار کیا کہ بحر قلزم کی تجارت، کمپنی کی کل ہندوستانی تجارت کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کو کافی ہوگی۔ اس طریقہ کو ولندیزیوں نے زیادہ اور انگریزوں نے اپنے کمتر مواقع اور وسائل کی حد تک اختیار کیا جس کے نتیجہ میں ایک ایسی صورت حال پیش آئی جس سے بادی النظر میں حیرت محسوس ہوتی ہے یعنی یہ کہ یورپ سے مشرقی سامان خریدنے کی غرض سے آنے والے تاجروں نے اپنے کو خالصتہً ایشیائی کاروبار اور ہر قسم کے تجارتی مال کو ایشیا کے ایک بندر سے دوسرے بندر تک ڈھونے میں مصروف کر لیا اور بیشتر ان منڈیوں میں کام سے لگ گئے جہاں یورپ لے جانے والا مال بہت کم دستیاب ہوتا تھا۔

واضح رہے کہ اس طریقہ کار میں اس نظام کے جراثیم پوشیدہ تھے جن کو بعد میں نظام نوآبادیات کے نام سے موسوم کیا گیا۔ لیکن اگر ممتاز ولندیزی گورنر جنرل "کوئن" کی رائے پر عمل کیا گیا ہوتا تو مذکورہ نظام اپنی پوری ترقی یافتہ شکل میں شروع ہی سے رائج ہو گیا ہوتا۔ 1633 میں اپنے جانشین کے نام چھوڑے ہوئے ہدایت نامہ میں کوئن نے صرف تجارتی کاروبار ہی پر زور نہیں دیا بلکہ یہ بھی تاکید کی کہ تمام موجود سرمایہ کو پیداوار کے خاص وسیلہ ("کئی ہزار" غلاموں) اور کمپنی کے مقبوضات کی ترقی پر لگا دیا جائے "تاکہ ملک کی اندرونی تجارت اور عام محصولوں سے ہمارے وطن کو منافع حاصل ہو اور سرمایہ کی سالانہ درآمد کی ضرورت ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔"[1] ولندیزیوں نے ملکس، جاوا اور فارموسا میں ان خطوط پر پیداوار کو ترقی دینے کے کچھ کام واقعتاً

---

[1] یہ حوالہ CALENDER SP 1622-24ء، No. 243، میں مندرج ہدایات کے انگریزی خلاصہ سے منقول ہے۔ ولندیزی لفظ جس کا یہاں " INLAND " ترجمہ کیا گیا ہے ہمعصر تحریروں میں اکثر اس تجارت کے مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے جس کو میں نے ایشیائی تجارت کہا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

COHN X

کیے لیکن ولندیزی کمپنی نے کوئن کے زیادہ حوصلہ مندانہ منصوبوں کو مسترد کر دیا اور زیرِ مطالعہ عہد کے دوران کمپنی کے مشرقی ایجنٹوں کا خاص انحصار ایشیائی تجارت کے منافع پر رہا۔ چونکہ اس وقت انگریزوں کے پاس ایشیائی سمندروں میں کوئی علاقائی مقبوضات نہ تھے لہٰذا ان کے لیے نوآبادی سے متعلق کسی واضح پالیسی کا سوال نہ تھا۔

یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ایشیا میں تجارتی کاروبار کرنے کا خاص مقصد ہندوستان میں استعمال کے لیے سونے و چاندی کی زیادہ مقدار میں فراہمی تھی، ولندیزیوں اور انگریزوں دونوں نے قدرتی طور پر وہ راہ منتخب کی جس سے یہ دھاتیں بہ سہولت حاصل ہو سکیں بعض جزیروں مثلاً سماترا اور بورنیو میں سونے کی پیداوار کم تھی اور ہم ان میں تجارتی آڑھتیوں کو ہندوستانی سامان کے بدلے میں سونا خریدتے ہوئے پاتے ہیں۔ ہندوستان پہنچنے پر اس سونے کی قیمت سے مال کی ابتدائی قیمت مہیا کر دینے پر دو سمندری سفروں کا منافع بچ رہتا تھا۔ اس طور پر حاصل کی ہوئی بیش قیمت دھاتوں کی مقدار ناقابل لحاظ نہ تھی لیکن پھر بھی وہ اس مقدار سے جو بحرِ قلزم، چین اور جاپان سے حاصل ہو سکتی تھی بہت کم تھی۔ پہلے گذر چکا ہے کہ بحرِ قلزم یورپی تاجروں کے لیے اس لیے پُرکشش تھا کہ وہاں کی تجارت میں زرِ نقد زیادہ حاصل ہوتا تھا۔ مُخا میں بیچے گئے مسالوں اور ہندوستانی سامانوں کے بدلے ڈیوکٹ اور دوسرے سکّے ملتے تھے جن کا ہندوستان میں مصرف تھا اور باوجود شدید دشواریوں کے تاجروں کا یہاں لگا رہنا اس امر کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ اپنے کاروبار کے اس حصّہ کو کس قدر اہم تصوّر کرتے تھے لیکن ان دھاتوں کی سب سے زیادہ فراہمی جاپان اور چین سے تھی اور ولندیزیوں کو ان ممالک کے ساتھ تجارت کی جو عملی اجارہ داری حاصل تھی وہ ان کے مسالے کے جزائر پر قبضہ کے بعد تجارتی نقطۂ نگاہ سے ان کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب تھا۔ اُن دنوں جاپان میں چاندی کی پیداوار زیادہ مقدار میں تھی اور اس سے ملک کی ضروریات کی چیزیں فراہم کر کے بہ سہولت حاصل کیا جا سکتا تھا۔ پرتگیزی سولھویں صدی کے دوران اس حقیقت سے

(صفحہ 87 سے آگے)
ہے اور یہ کمپنی کی یورپ سامان لے جانے والی ابتدائی تجارت سے مختلف ہے۔ کوئن کی جانب سے نوآبادیاتی پالیسی کی وکالت کا بیان DE JOUGE 111269 میں دیکھا جا سکتا ہے۔

واقف ہو چکے تھے اور ۱۶۱۱ میں ولیم ایڈمس نے اپنے "نامعلوم دوستوں اور اہلِ وطن" کے نام خط میں اس حقیقت پر زور دیتے ہوئے لکھا کہ "آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہاں ولندیزیوں کے قبضہ میں زرِ نقد کا ایک انڈیز ہے لہٰذا انھیں ہالینڈ سے ایسٹ انڈیز (جزائر شرق الہند) چاندی لانے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ جاپان میں بہ افراط سونا چاندی موجود ہے جس کو وہ جزائر شرق الہند میں جہاں کہیں بھی ضرورت ہو استعمال کر سکتے ہیں[1] کم از کم چاندی کے معاملے میں اس بیان کی صداقت تجربہ سے ثابت ہو گئی[2] اور ولندیزی اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ اگر جاپانی منڈیوں

---

[1] ایڈمس اس دور کی ایک اہم شخصیت ہے خود اس کے قول کے مطابق بحرۂ روم کی تجارت میں متعدد برسوں تک ملازمت کرنے کے بعد اس کو مشرق میں ولندیزی تجارت کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور 1598 میں اس نے ایک جہازی بیڑے پر جو جنوبی امریکہ کے راستہ سے انڈیز کے لیے روانہ ہوا ایک جہاز راں کی حیثیت سے ولندیزیوں کی ملازمت اختیار کر لی۔ اثنائے سفر میں بڑا سانحہ سے دوچار ہوا اور وہ بالآخر جاپان میں جہاز سے اُترا۔ تھوڑے عرصہ تک قید میں رہنے کے بعد بادشاہ اس پر مہربان ہو گیا، اس کو وظیفہ ملا اور وہ وہیں ملک میں آباد ہو گیا۔ جب تقریباً 1610 میں ولندیزی تاجر جاپان پہنچے تو ایڈمس ہی نے دربار میں ان کی وکالت کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد اس نے انگریزوں کی وکالت کے فرائض انجام دیے اور بالآخر اس نے ایسٹ انڈیا کی ملازمت اختیار کر لی۔ خط جس کا متن میں حوالہ آیا ہے LETTERS RECEIVED 42 اور نیز PURCHAS I. III میں شائع ہوا ہے۔ ولندیزیوں کے ساتھ اس کے تعاون کے متعلق ملاحظہ ہو RENNEVILLE VII, 149.

[2] زیرِ مطالعہ دور میں جاپان سے ہندوستان زیادہ مقدار میں سونے کی آمد کے متعلق مجھے کوئی تحریر نہیں مل سکی۔ معلوم ہوتا ہے کہ تائیوان نکل جانے پر جب اصل ملک سے فراہمی کا نظم بگڑ گیا تو 1665 سے اس کی برآمد شروع ہوئی۔ اسی سال 25 اپریل DAGH REGISTER میں درج ہے کہ شاہ جاپان نے سونا برآمد کرنے کی منظوری دے دی تھی اور اس کے بعد ہم کو کم و بیش پابندی کے ساتھ اس کے ساحل کورومنڈل کو برآمد کیے جانے کی اطلاع ملتی ہے۔ 1640 کے اواخر کی ایک تحریر میں سورت کے آڑھتیے ولندیزیوں کی "جاپانی چاندی اور چینی سونے کا حوالہ دیتے ہیں (ENGLISH FACTORIES VI. 276)"

میں فروخت کرنے کے لیے ان کو مناسب سامان مل جائے تو ان کی ضروریات پوری ہوسکتی ہیں۔ منڈیوں کا اپنا مخصوص مذاق تھا۔ صورت حال یہ تھی کہ یہاں یورپی مال کی کھپت تھوڑی مقدار میں تھی اور ہندوستان کے سوتی کپڑے محض اپنی ندرت کی خاطر خریدے جاتے تھے اور مسالوں کی مانگ بھی بہت زیادہ نہ تھی۔ جاپان سے چاندی حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ وہاں کچا ریشم، کمائے ہوئے اور نیز کچے چمڑے پہنچائے جائیں۔ چمڑے خاص طور پر سیام میں ملتے تھے جہاں ہندوستان کے سوتی مال کی بہت کھپت تھی چنانچہ ان خطوط کے تحت وسیع پیمانہ پر تجارتی کاروبار کو ترقی دی گئی۔ ہندوستان سے سوتی مال سیام کو اور وہاں سے کچے چمڑے اور تھوڑی مقدار میں کمائے ہوئے چمڑے بھی جاپان کو اور جاپان سے چاندی ہندوستان کو پہنچائی جانے لگی۔ جیساکہ بعد میں ذکر آئے گا ہندوستان سے بھی تھوڑے کچے چمڑے حاصل کیے گئے لیکن جاپانی منڈیوں کے لیے بیشتر فراہمی سیام ہی سے رہی۔ لیکن جاپان میں خصوصی مانگ کچے ریشم کی تھی جس کو پہلے چینی سوداگر فراہم کیا کرتے تھے۔ ولندیزیوں کو جلد معلوم ہوگیا کہ چین سے براہِ راست تجارت سیاسی وجوہ کی بنا پر شاہ چین کی حفاظت میں تھی۔ لہٰذا وہ چین سے تو علانیہ ریشم نہ لاسکتے تھے لیکن وہ اسے ہندچین سے ہندوستان کے سوتی مال اور مسالے یا دیگر چیزوں کے عوض جنھیں وہ سابق میں انھیں اشیاء سے خرید چکے تھے، لاسکتے تھے جیساکہ انھوں نے واقعتہً کیا۔ فارس کا ریشم بھی دستیاب ہوا لیکن اس کا کاروبار آگے نہ بڑھ سکا اور اس سلسلہ میں ولندیزیوں کا نمایاں ترین کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے بنگال کے ریشم کے لیے جاپانی منڈی میں راہ ہموار کی۔ میں ان کے اس کارنامے کے تفصیلی حالات معلوم کرنے سے قاصر رہا کیونکہ بعض برسوں کے بٹاویا جرنل" لا پتہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ 1641 ہی میں بنگال کے ریشم کا نمونہ وہاں بھیجا گیا تھا کیونکہ اس سال آڑھتیوں کی رپورٹ کے مطابق بنگال کا ریشم بیحد کھردرا، ناہموار اور گراں ہونے کے باعث جاپانی منڈیوں کے لیے ناموزوں تھا اس کے بعد 1646 تک کے جرنل میں اس کی تجارت کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی لیکن 1653 سے جب جرنل کا دوبارہ سلسلہ شروع ہوجاتا ہے تو ہم اس کی تجارت کو پورے شباب پر پاتے ہیں۔ اس سال ایک جہاز جس پر سامان کا بیشتر حصہ بنگالی ریشم کا تھا جاپان بھیجا گیا اور اس کے بعد کے اندراجات بھی ایسی ہی اطلاعات فراہم کرتے ہیں سولھویں صدی کے دوران اس قسم کی کسی تجارت کا پتہ نہیں چلتا۔ لہٰذا بنگالی ریشم کو اس نئی منڈی میں

روشناس کرانے کا سہرا ولندیزیوں ہی کے سر رہتا ہے۔ اس طور پر جاپان چاندی اور ہند چین سونا فراہم کرتا تھا اور ان ممالک کے تاجران دھاتوں کو سیاہ مرچ، صندل کی لکڑی، رنگ بنانے کی لکڑی اور دیگر ایشیائی پیداواروں کے عوض خریدتے تھے۔ فارموسا میں ولندیزیوں کی نوآبادی تائیوان اس تجارت کا مرکز تھا اور جاپان میں ان کی تجارتی کوٹھی ایک گورنر کے زیرِ انتظام تھی اور وہی ہندوستانی منڈیوں میں سونے و چاندی کی بیشتر فراہمی کا ذمہ دار تھا۔ زیرِ مطالعہ دور کے نصف آخر میں ہندوستان میں ولندیزیوں کی سونے چاندی کی ضرورت کا بیشتر حصہ تائیوان سے براہِ راست جہازوں کے ذریعہ فراہم ہوتا تھا۔ سونا ساحل کورومنڈل اور چاندی گجرات و بنگال جاتی تھی۔ چنانچہ یورپ سے اب زرِ نقد منگانے کی ضرورت مناسب طور پر کم ہو گئی[1] اس طور پر ولندیزیوں کے تجارتی کاروبار کی اب ہیئت بالکل تبدیل ہو گئی۔ وہ یورپ کے لیے براہِ راست مسالہ کی خریداری سے شروع کر کے دھیرے دھیرے پورے ایشیائی سمندروں کی تقریباً ہر اہم تجارت میں لگ گئے اور چونکہ کافی مقدار میں ہندوستانی مال صرف چاندی اور سونے ہی کے بدلے میں مل سکتا تھا لہٰذا ان کی تجارت کے مشاغل کا خاص مقصد ہندوستان میں ان بیش قیمت دھاتوں کا پہنچانا تھا۔ انگریز تاجروں نے بھی اپنے امکان کی حد تک یہی راہ اختیار کی لیکن مشرق البعد سے ان کی بے تعلقی نے ان کو ان مواقع سے محروم کر دیا جن سے ولندیزیوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور پورے زیرِ مطالعہ عہد کے دوران ایشیائی تجارت میں ان کا حصہ نسبتاً بہت کم رہا۔ ان کا خاص کاروبار ہندوستان اور یورپ کے درمیان براہِ راست تجارت کو فروغ دینا تھا جب کہ ان کے حریف جہاں ایک طرف تو اس کاروبار میں کم از کم ان کے برابر تھے وہاں دوسری طرف ہندوستانی سامان کی تقسیم کے کام میں ان سے بہت آگے بڑھے ہوئے

---

[1] مثلاً 1640 میں تائیوان کو سورت اور کورومنڈل کے لیے 29,00,000 گلڈرس (ہالینڈ کا نقرئی سکہ) اور اس کے اگلے برس صرف سورت کے لیے 10,00,000 گلڈر اس فراہم کرنے کی فرمائش تھی DAGH REGISTER DECEMBER 6, 1640, JULY 31, 1641. اب ہالینڈ کو مشرق میں جملہ ولندیزی ضروریات کے لیے صرف تقریباً اسی قدر رقم فراہم کرنے کی فرمائش کی گئی جس قدر تنہا سورت نے تائیوان سے طلب کیا تھا

تھے اس طور پر وہ پورے جنوبی ایشیا کی تجارت پر حاوی ہو گئے تھے[1]

فصل 4 ۔ درآمدی تجارت کی روش میں تبدیلیاں

ہندوستانی نقطۂ نگاہ سے زیر تحقیقات سرگرمیوں کے نتائج دو زمروں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ اوّل یہ کہ ولندیزی اور انگریزی تاجروں نے ہندوستان اور پچھمی یورپ کے درمیان براہِ راست ایک نئی تجارت قائم کی اور دوسرے یہ کہ انھوں نے ہندوستان کی ایشیا کے دیگر ممالک اور افریقہ کے مشرقی ساحل کے ساتھ قدیم تجارت کی روش میں کچھ ترمیمیں کیں۔ اس باب کی بقیہ فصلوں میں اوّلاً ہر جگہ کی برآمدی تجارت میں تبدیلیوں، ثانیاً ان تبدیلیوں کے جہازی صنعت پر اثرات کے متعلق بحث کی جائے گی پچھمی یورپ کے ساتھ برآمدی تجارت کا موضوع اس قدر اہم ہے کہ اس کے لیے ایک علیحدہ باب درکار ہوگا۔ درآمدات میں بہت تھوڑی تبدیلیاں قابلِ ذکر ہیں۔ اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ کوئی اہم نئی ضرورت وجود میں آئی یا غیر ملکی مال کی کھپت میں کوئی زیادہ اضافہ عمل میں آیا۔ یہ بھی مشتبہ ہے کہ فی الجملہ صارفین کی بڑی تعداد کی ضروریات بمقابلہ پہلے کے اب بہتر طور پر پوری ہونے لگی ہوں[2]۔ بڑھے ہوئے برآمدات کی قیمتیں تقریباً کُل کی کُل چاندی و سونے کی شکل میں وصول ہوتی تھیں۔ جاپان سے شمالی ہندوستان کو تانبہ واحد نئی درآمد تھی۔ یہ درآمد اس کے یہاں استعمال میں اضافے کے باعث نہیں بلکہ مقامی ذرائع سے اس کی فراہمی میں جو کمی واقع ہو گئی تھی بظاہر اس کو پورا کرنے کی غرض سے عمل میں آئی تھی۔ اس درآمد کا خصوصی تعلق نظامِ سکّہ سے ہے

---

[1] 1650 میں انگریزی کمپنی نے، گنی کمپنی کو خرید کر بیش قیمت دھاتوں کی فراہمی کا نیا کام شروع کیا کمپنی کا مقصد افریقی سونے کی گرد اور نیز ہاتھی دانت کو براہِ راست بذریعہ جہاز ہندوستان پہنچانا تھا۔ لیکن اس کے اس اقدام کے واقعات زیرِ مطالعہ دور کے حدود کے باہر ہیں۔

[2] اس بیان کی وضاحت باب 5 میں منڈیوں کی روش پر بحث کے سلسلہ میں آئے گی۔ پارچہ یا رنگ کے اقسام کی چیزوں کی قیمتیں بہت زیادہ گھٹتی بڑھتی رہتی تھیں۔ بعض اوقات صارفین نفع میں اور بعض اوقات نقصان میں رہا کرتے تھے۔ نفع اور نقصان کی میزان نکالنا ممکن نہیں۔

جس پر بحث کو فی الحال ہم ملتوی کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس دور کے تجارتی مراسلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی پرانی ضروریات بعض صورتوں میں زیادہ سستے داموں اور بعض صورتوں میں تھوڑی بہت گراں، بعض اوقات نئے ذرائع سے لیکن معمولاً پرانے ہی ذرائع سے پوری ہوتی رہیں اور یہ کہ اونچے طبقے کے افراد کو مروجہ مذاق کے مطابق کم و بیش قیمتی نوادرات حاصل کرنے کی مزید سہولیت حاصل رہی۔ انگریزی تاجر ان نوادرات کو "کھلونے" کہتے تھے۔ ان کے کاروبار کی اس شق کے لیے یہ ایک موزوں محاورہ ہے۔ "کھلونوں" کی یہ تجارت ہمارے لیے قابل توجہ ہے کیونکہ یہ وسیع اور زیادہ نفع بخش نہ ہونے کے باوجود، اس دور میں ایک کاروباری حیثیت رکھتی تھی۔ غیر ملکی تاجر حکام کی خوشنودی حاصل کیے بغیر کچھ نہ کرسکتے تھے اور ان سے کسی بات کی استدعا کوئی معقول تحفہ پیش کیے بغیر نہ کی جا سکتی تھی اور زمانہ کے رواج کا تقاضا تھا کہ تحفہ میں بیشتر یہی "کھلونے" ہوں لہٰذا یورپ کی کمپنیوں کو اپنے تاجروں کو اس مقصد کے لیے مناسب اشیاء فراہم کرنا ہوتا تھا۔ اس کے لیے مشرق بعید کی منڈیوں تک کو بخوبی ٹٹولنا پڑتا تھا اور اس دور کے تجارتی مراسلات میں اس موضوع پر مسلسل تذکرے ملتے ہیں۔ بعض درآمد کیے ہوئے "کھلونے" بطور تحفہ استعمال کیے جانے کی غرض سے فروخت کیے جاتے تھے اور بعض کو تاجر خود تحفہ میں پیش کرتے تھے۔ لیکن ضروری تھا کہ وہ ہر صورت میں ہندوستانی حکمرانوں اور ان کے درباریوں کے مذاق کے مطابق ہوں۔ اس ضرورت کی نوعیت کو واضح کرنے کے لیے صرف چند مثالیں کافی ہوں گی۔ مغلیہ ہندوستان کی تجارت کے متعلق 1609ء میں مرتب کی ہوئی پہلی انگریزی رپورٹ میں اوّل معینہ برآمدات یعنی اونی سامان، پارہ و شنگرف، جستہ، ٹین، ہاتھی دانت، مونگا اور تلوار کے پھلوں کے شمار کے بعد حسب ذیل تحریر ملتی ہے۔

"شراب کے نئے پیالے، مٹھائی کی رکابیاں لیکن خاص طور پر ہر قسم اور مختلف قیمتوں کے آئینوں (لیکن چھوٹے نمائشی زیور نہیں) کی ایک معقول تعداد اچھے منافع پر فروخت ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ چند خوبصورت بڑے آئینے اس بادشاہ (جہانگیر) کے لیے بیحد قابل قبول ہوں گے کیونکہ وہ کسی چیز کی بھی قیمت سے نہیں بلکہ ہر چیز کی ندرت سے متاثر ہوتا ہے۔ حد یہ ہے کہ چند خوبصورت اور ٹھاٹ دار کھلونوں سے وہ حد درجہ راضی ہوگا خواہ ان کی قیمت کم ہی کیوں نہ ہو کیونکہ وہ دنیاوی دولت اور خزانے کا خواہاں نہیں۔ اس کے پاس یہ خود بے حساب ہیں۔"

تزک جہانگیری سے قارئین تسلیم کریں گے کہ مذکورہ تحریر اچھّی خاصی صداقت پر مبنی ہے۔
پھر بھی بادشاہ چیزوں کی اصل قیمت پر جس قدر اُوپر درج کیا گیا ہے اس سے زائد توجّہ دیتا تھا لیکن چیزوں کی ندرت اس کے لیے سب سے زیادہ کشش رکھتی تھی۔ ولندیزی آڑھتیے وانؔ ریوسٹین نے چند برسوں بعد یہی بات دُہرائی ہے۔ اس کی رپورٹ ہے کہ "ہر قسم کی نادر چیزیں یعنی زمینی مناظر اور اعلیٰ شخصیتوں کی تصویریں" قدآدم آئینے جن کے چوکھٹے نقش و نگار سے مزین ہوں،، "خوبصورت تازی کتّے اور چیتوں کو زیر کرنے والے مضبوط کتّے،، وغیرہ" خاص طور پر مغل اعظم کے لیے بھیجے جانے چاہئیں"، اس لیے بادشاہ کو "جملہ نوادرات اور آثارِ قدیمہ کا شائق،، قرار دیا گیا ہے۔
تاجر قدرتی طور پر بادشاہ کا شوق پورا کرنے کی بےحد کوشش کیا کرتے کیونکہ ان کے کاروبار کی کامیابی اس کی خوشنودی پر موقوف رہتی۔ لیکن انھوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ اس راہ میں کچھ دقّتیں بھی ہیں۔ شاہزادے اور نیز سُورت کے حکام بادشاہ کو اس کی پسند کے تحفے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنے کی خواہش مند رہا کرتے۔ وہ اس مقصد کے تحت درآمد کیے ہوئے سامانوں کی تلاشی لیتے اور اپنی پسند کی چیزوں پر من مانی قیمت ادا کر کے قبضہ کر لیتے۔ بادشاہ کو نادر ترین تحائف پیش کرنے کے سلسلے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے متعلق حکام اور تاجروں کے درمیان اکثر تنازعات کا ذکر آیا ہے۔ سرطامس رو کا تفصیلی بیان ہے کہ 1617 میں ہندوستان بھیجے ہوئے تحفوں پر کیوں کر شاہزادہ خرم (شاہ جہاں) نے قبضہ کر کے انھیں خود اپنے نام سے بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ اس کے دو برس بعد خود انگریز تاجر شاہزادہ کی لاعلمی میں جس کے حدودِ اختیار میں اس وقت سورت واقع تھا ایک تصویر دربارِ شاہی میں بھیجنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ معاملہ کا انکشاف ہونے پر شاہزادہ اس بات پر برافروختہ ہوا کہ یہاں (سورت) کے کاغذات سے اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ اس نے اس تحفہ کے لے جانے والے حدی کو چیلکت کی سزا دی (شاہی قاصد کو گھوڑے کے چابک لگوائے) اور اس نے "ایک خصوصی فرمان کے ذریعہ یہ حکم دیا کہ بندرگاہ کے گورنر (متعدّی۔ مترجم) جمل خاں

VAN RAVESTEYN ×

(جمال خاں ۔ مترجم) اسائے بیگ (اسحاق بیگ ۔ مترجم) اور درآمدی و برآمدی محصول کے نگراں (صاحب تحصیل مترجم) کو بھی سزا دی جائے ۔ یہ سزا نا منظور ہونے کی صورت میں وہ فی کس ایک ہزار روپیہ جرمانہ ادا کریں لہ ،، خط کا راقم یہ بھی لکھتا ہے کہ حکام نے اس کا الزام انگریزوں کے سر رکھا ۔ اور آئندہ اس طور پر تحفوں کو غائب کرنے کے سدِ باب کے لیے سخت تلاشی کی دھمکی دی گئی ۔ اس نے اپنے خط میں یہ بھی پیش بینی کی ہے کہ اس عمل سے کاروبار کو جو نقصان ہوگا وہ اس قسم کی بیس تصویروں کو فروخت کرنے یا تحفہ میں دینے کے فوائد سے بھی زائد ہوگا ۔ اس معاملہ میں ذرا شبہ نہیں کہ شاہزادہ خرم خود اس تصویر کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا تھا لیکن اس سلسلے میں اس کا ذوق اس وقت منظرِ عام پر آیا جب وہ خود تخت نشین ہوا ۔ اس کے عہدِ حکومت میں بیش قیمت اور نادر تحائف مقبول تھے ۔ 1643 کے بٹاویا جنرل ، میں ولندیزیوں کے دربار شاہی میں خاموشی کے ساتھ ایک بڑی تانبے کی لالٹین کے پہنچانے کا ایک دلچسپ واقعہ ، اس پر شاہزادہ دارا شکوہ کا غضبناک طرزِ عمل اور بالآخر اس کے پیش کیے جانے پر شاہجہاں کا اظہارِ مسرت ، یہ سب باتیں درج ہیں ۔ اس کے فوری نتیجہ کے طور پر ان کو نمایاں طور پر موافق تجارتی سہولتیں منظور کی گئیں اور بادشاہ نے ان سے جاپان کی چند روغن لگی ہوئی پالکیوں کی فرمائش کی چنانچہ زیرِ مطالعہ دور کی پوری مدت کے دوران مملکتِ مغلیہ میں ان ،، کھلونوں ،، کی مسلسل ضرورت قائم رہی شاہ گولکنڈہ کے مطالبات بھی کچھ کم شدید نہ تھے ۔ انگریزوں کو وہ سہولتیں حاصل کرنے کے لیے جنھیں ،، سنہرا فرمان ،، کہتے ہیں جو تحائف پیش کرنا پڑے اُن کی مالیت ... ۲۰،۰۰۰ پگوڈا یا ... ۸۰،۰۰۰ روپیہ لگائی جاتی ہے اور فرمان کے بعض نسخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سہولتیوں کو منظور کرنے میں نوادرات

لہ حدی سے مراد اَحدی ہے جو مغلوں کے محافظ دستہ کا نام تھا (AIN TRANSLATION i:249)

جلیسا کہ متعدد تحریروں مثلاً FRYER کے لکھے ہوئے سورت کے درآمدی محصول گھر کے حالات (1.47) شاہد ہیں کہ مغل منتظمین چابک کا قدرے استعمال کیا کرتے تھے ۔ پھبتی بدیہی طور پر چابک سے ماخوذ ہے ۔

CUSTOMER ×

کے ملنے کی توقع کا جزوی طور پر لحاظ رکھا گیا تھا[1] ولندیزیوں کو بھی اس کی ضرورت کا
احساس تھا اور کہا جاتا ہے کہ 1643 میں ان کے تحفوں کی قیمت 10,000 ہزار رکس ڈالر
(یعنی 22,800 روپیہ) تھی جن میں ہاتھی، گھوڑے تقریباً پانچ ہنڈرویٹ وزنی تانبے کے
فرشی جھاڑ اور صندل کی لکڑی اور افراط مسالے شامل تھے۔ مگر بادشاہ کا ذوق اس فہرست
کے دائرہ کے اندر محدود نہ تھا اور 1639 میں انگریز آڑھتیوں نے لکھا کہ وہ ایسے تحفوں کو
جو بہت زیادہ قیمتی نہ ہوں مثلاً فارس کے گھوڑے۔ انگریزی ماسٹف نسل کے کتے، آئرلینڈ
کے تازی کتے اور پانی میں تیرنے والے اسپینل نسل کے کتے، صاف وشفاف آئینے نفیس قرمزی
کپڑے کا ٹکڑا، گہرا سرخ اور بنفشئی اطلس اور پارلیامنٹ کی پوشاک میں ہمارے ملک
معظم کی بڑی تصویر، ایک اچھی پوستین، دوربین کا ایک شیشہ، ایک چوڑے لیمپ کا بڑا گلوب۔
نفیس اور ہلکے زرہ بکتر کا ایک سوٹ اور اگر ممکن ہو تو بندوق کے گولوں کو روکنے کا اسلحہ
پیش کرکے ہر واجب چیز حاصل کی جا سکتی تھی۔ خطوط کے راقمین یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ
ممکن ہے کہ یہ تجویز معقول نہ معلوم ہو لیکن ان کو اس امر پر اصرار تھا کہ روپیہ زیادہ خرچ ہو
یا کم لیکن تحفوں کو پیش کرنا لازمی ہے " ورنہ ان لوگوں کے درمیان گذر نہیں ہو سکتا"۔ جنوب
کے ہندو حکام کا ذوق، مسلمانوں کے ذوق سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھا۔ وہ نائک جس نے
انگریزوں کو ارماگون میں جگہ دی تھی توپ ایسی چیز کے ساتھ ساتھ کچھ قیمتی کھلونوں کا بھی
خواہشمند تھا۔ مثلاً مخمل، مشجّر اور تافتہ، ایک جاپانی لکھنے کا ڈسک اور کوئی بھی " انگریزی
کھلونے" جو دستیاب ہو سکیں۔ انگریزوں کو مدراس میں دی گئیں فیاضانہ سہولتوں کا
عطا کنندہ نے ایک سبب یہ بتایا کہ وہ فارس کے نفیس گھوڑوں کا خواہشمند تھا اور

---

[1] سنہرے فرمان کی اصل عبارت اب موجود نہیں ہے اور اس کے تینوں ترجموں میں کچھ
اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس کے ہمعصر ترجمے میں "نوادرات" کا بادشاہ کے لیے لایا جانا درج ہے۔ 1670
کے ترجمہ میں بھی "نوادرات" کا ذکر آیا ہے لیکن 1676 کے ترجمہ میں "سامان" یا "اچھی چیزیں" درج ہیں۔
ان میں سب سے پہلے ترجمہ کی عبارت سے قیاس ہوتا ہے کہ غالباً اصل متن میں "تحفہ" کا لفظ آیا ہے جو
اُن دونوں "نوادرات" یا "کھلونوں" کا مفہوم رکھتا تھا۔ تینوں ترجمے ENGLISH FACTORIES V. 1667
میں چھپے ہوئے ہیں۔

دوسرا یہ کہ وہ یہ توقع رکھتا تھا کہ اس کو بنگال سے "باز، بے دُما بندر، طوطے اور اس قسم کے کھلونے،، خریدنے کی سہولت فراہم ہوگی۔ اس طور پر پورے ہندوستان بلکہ پورے مشرقی سمندروں میں "نوادرات،، کا یہ شوق ایک ایسا مسئلہ تھا جو پوری توجّہ کا مستحق تھا اور غیر ملکی تاجروں کی کاروباری سرگرمیوں کا اندازہ لگاتے وقت ہمیں اس ضرورت کی گنجائش رکھنی چاہیے۔ سترھویں صدی کے دوران کافی تعداد میں چیدہ "کھلونوں،، کی فراہمی کی حیثیت رہی تھی جو دورِ حاضر میں سُوجھ بُوجھ کے ساتھ کی گئی نشر و اشاعت کو حاصل ہے جو براہِ راست تو کوئی سود مند چیز نہیں لیکن نفع بخش کاروبار کے حصول کے لیے ناگزیر ہوتی ہے۔

فصل 5۔ ایشیا کی برآمدی تجارت میں تبدیلیاں

ہندوستان کی ایشیا کے دیگر حصول اور مشرقی افریقہ کے ساتھ برآمدی تجارت کے سلسلہ میں پہلے سے موجود تجارت کی توسیع اور نئے اقسام کے کاروبار کی ابتداء کے متعلق علی الترتیب دو مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ مسئلہ تحقیقات طلب ہے کہ آیا یورپی تاجروں کی کاروباری سرگرمیوں کے نتیجہ میں اوّلاً پہلے سے کھلی ہوئی منڈیوں میں فروخت کی مقدار بڑھی اور ثانیاً یہ کہ آیا ان خطوں کی مقدارِ فروخت میں اضافہ ہوا جہاں پہلے سے کسی قابل لحاظ مقدار میں ہندوستانی مال برآمد نہیں کیا جاتا تھا۔ پہلے سوال کا جواب آسان نہیں ہے ایک جدید مُصنّف[1] جس نے صرف انگریزی کاروبار کے متعلق تحریر کیا ہے اور جس کی تحقیقات زیادہ لمبی مُدّت پر حاوی ہے، کے خیال کے مطابق ایشیائی منڈیوں کو زیادہ مقدار میں سوتی مال پہنچائے گئے ہوں گے لیکن ہمارے عہد کے دوران اس قسم کے کسی اضافہ کی کوئی مثبت شہادت مجھے نہ مل سکی اور عمومی حالات کا بظاہر یہ تقاضا ہے کہ اس سوال کے سلسلہ میں احتیاط برتی جائے۔

اوّلاً ان منڈیوں کی اہم ترین منزلوں پر جہاں ملاکا اور جاوا کے بندرگاہوں سے مال پہنچایا جاتا تھا غور کرنے سے اس امر میں ذرا شبہ نہیں رہتا کہ ولندیزیوں کے سُوتی مال کے کاروبار میں تدریجی اضافہ ہوا۔ بدقسمتی سے موجود شماریات نامکمل ہیں کیونکہ بٹاویا جرنل، کا منشا ہندوستان سے روانہ کیے گئے ہر جہاز کے مال کی تفصیل و مقدار کی فراہمی ہونے کا باوجود

---

[1] C. J. HAMILTON THE TRADE RELATIONS BETWEN INDIA & ENGLAND

اس کی تحریروں میں متعدد خلا پائے جاتے ہیں جن کا بعض صورتوں میں سبب تو خود جنرل کا لاپتہ ہونا، اور بعض صورتوں میں ان کے مولفین کی غفلت، شعاری ہے۔ ان برسوں میں جن کے بیشتر اعداد محفوظ ہیں اور غیر موجود مدات کے لیے ایک سرسری گنجائش رکھتے ہوئے ولندیزیوں کی سوتی مال کی بٹاویا پہنچائی ہوئی گانٹھوں کی تعداد غالباً حسب ذیل تھی:۔

سالانہ برآمد کی ہوئی گانٹھوں کی تعداد

مُدّت	کورومنڈل سے	گجرات سے	بنگال سے	میزان
1625	1700	800	—	2,500
1644-41	2500	1,0.00	صرف نمونے	3,500
1661-57	4000	1,200	500	5,700

ان اعداد پر اس سبب سے کہ ان میں متعدد قیاسی اجزا شامل ہیں زیادہ اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان سے ایک عمومی اندازہ یہ ضرور ملتا ہے کہ ولندیزیوں نے دیگر یورپی اقوام کے مشرق بعید کے اخراج کے بعد سے زیرِ مطالعہ دور کے اختتام تک کورومنڈل سے اپنے برآمدات کو دُگنا اور گجرات سے ڈیڑھ گنا کر لیا تھا اور ساتھ ساتھ ان کی بنگال سے بھی برآمدات شروع ہو گئی تھیں۔ ان منڈیوں میں انگریزی تجارت میں اس قسم کے اضافہ کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ علاوہ اس کے اس وقت جیسے حالات چل رہے تھے ان میں ان کی تجارت میں کسی معتدبہ اضافہ کے امکانات بھی نہیں نظر آتے۔ لہٰذا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ولندیزیوں کی بڑھی ہوئی برآمدات کوئی نئی تجارت تھی یا پُرانی ہی تجارت کی باربرداری کا کام اب یہ کرنے لگے تھے۔ اس مسئلہ پر براہِ راست شہادتیں نہیں ملتیں۔ لیکن حسب ذیل امور قابلِ لحاظ ہیں۔ اوّل تو مذکورہ اعداد میں اُن سامانوں کا ایک بڑا حصہ شامل ہے جو ولندیزی بٹاویا کے راستہ سے یورپ، امریکہ اور افریقہ کو بھیجتے تھے۔ لہٰذا لازم ہوا کہ ایشیائی تجارت میں مذکورہ اعداد سے جس قدر اضافہ ظاہر ہوتا ہے، واقعی اضافہ اس سے اچھا خاصہ کم رہا ہوگا۔

دوسرے یہ کہ اگر پرتگیزیوں[1] کے جہازوں کو ہندوستانی تصور کر لیا جائے تو ان برسوں میں ہندوستانی باربرداری کی تجارت یقیناً گھٹ رہی تھی۔ ایسی صورت میں یہ لازمی ہے کہ مذکورہ اعداد جس اضافہ کی نشاندہی کرتے ہیں اس کا ہندوستان کی نئی تجارت سے بالکل ہی تعلق نہ ہو اور بہت ممکن ہے کہ یہ سب کا سب محض باربرداری کے واسطہ میں تبدیلی ہی کو ظاہر کرتا ہو۔ تیسرے یہ کہ مجھے اس میں شک ہے کہ زیر بحث منڈیوں میں سوتی سامانوں کے ایک بڑے متناسب اضافہ کی کھپت تھی۔ اس سلسلہ میں کسی نئی تبدیلی کی اطلاع نہیں ملتی کیونکہ ولندیزی انھیں منڈیوں کو سامان فراہم کرتے تھے جہاں پہلے سے ہندوستانی مال جایا کرتا تھا اور جہاں پہلے سے عرب تاجر اور بعد میں پرتگیزی کافی تعداد میں سامان پہنچایا کرتے تھے۔ یہ منڈیاں نوعیت کے اعتبار سے لکیر کی فقیر تھیں۔ صارفین کی ایک بڑی تعداد مفلس تھی۔ لہٰذا یہ ثابت کرنے کے لیے کہ کھپت میں زیادہ اضافہ ہوا پہلے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ یا تو آبادی بڑھی یا معیارِ زندگی بہتر ہوا۔ اس مسئلہ کا کہ آیا ہمارے عہد میں اس قسم کی کوئی تبدیلی واقع ہوئی۔ میں نے تفصیلی مطالعہ کرنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ لیکن جب تک اس پر تحقیقات نہ ہو جائے، میرے نزدیک یہ بھروسہ کر لینا کہ ولندیزیوں کی مشرق بعید کی کاروباری سرگرمیوں کے نتیجہ میں سوتی مال کے برآمد میں کوئی زیادہ اضافہ ہوا مناسب نہ ہوگا۔ ممکن ہے تھوڑا بہت اضافہ ہوا ہو لیکن جو اطلاعات موجود ہیں وہ منڈیوں کا غیر متغیر ہونا ظاہر کرتی ہیں، جن میں سوائے باربرداروں کی قومیت کے اور کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ حقیقت میں تو اضافہ کی طرح تخفیف کے امکانات کی موافقت میں بھی دلائل پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اوپر گذر چکا ہے کہ بعض مشرقی منڈیوں میں سوتی مال تبادلہ کے واسطے کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے اور اس بات کی بھی کچھ شہادت ملتی ہے کہ سولھویں صدی میں ان کو بطور ایک قیمتی شئے کے جمع کیا جاتا ہے، حالانکہ وہ صریحی طور پر اس مقصد کے لیے ناموزوں شئے تھی کیونکہ ان کا جلد خراب ہو جانا لازمی تھا[2]۔ ولندیزی تجارتی تحریروں سے ظاہر

---

[1] جہازی باربرداری کے کاروبار پر اس باب کی اگلی فصل میں بحث آئے گی۔

[2] BARBOSA (II-144) میں ذکر آیا ہے کہ انبوٹینا میں ہر شخص کھمبات کے کپڑوں کا اس قدر ذخیرہ جمع کر لیتا تھا کہ اگر انھیں لپیٹ کر ان کے گٹھر زمین پر ایک کے اوپر ایک رکھ دیے جائیں تو ان کی اونچائی خود ان کے برابر ہو جاتی تھی۔

ہوتا ہے کہ زیرِ مطالعہ عہد کے دوران ان منڈیوں میں سکّوں کا استعمال اضافہ پذیر تھا اور سونے یا چاندی کے جمع کرنے کے رواج میں اضافہ کے ساتھ سُوتی مال کی مانگ میں کمی کا امکان تھا۔

دیگر ایشیائی منڈیوں میں، سوتی سامانوں کی یہ کیفیت تھی کہ پیگو میں ولندیزی اور انگریز جس ناکامی سے دوچار ہو چکے تھے اور جس کا پہلے ذکر آچکا ہے وہ اس امر کی قوی شہادت فراہم کرتی ہے کہ اس علاقہ میں اس کی تجارت بڑھ نہیں رہی تھی اور اراکان یقیناً ایک غیر ترقی یافتہ علاقہ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھ کو اس امر کی کوئی سند نہ مل سکی کہ زیرِ مطالعہ دور میں بحرِ قلزم کی تجارت کو کوئی خاص ترقی حاصل ہوئی۔ یہ ممکن ہے کہ ریشم کی تجارت کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کی غرض سے خلیج فارس کو جہازوں کے ذریعہ بار برداری کے کام میں کچھ اضافہ ہوا ہو لیکن اگر یہ کل اضافہ انگریزی برآمدات سے متعلق نہ تھا تو اس کا بیشتر حصّہ غالباً بار برداری کے واسطہ میں صرف تبدیلی یا کاروبار کی زمینی راستہ سے سمندری راستہ کو منتقلی ظاہر کرتا ہے اور فی الجملہ تمام ایشیائی منڈیوں کے متعلق ہمارے موجودہ علم کی بُنیاد پر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ برآمدات کی کمی کے تو کوئی آثار نہیں ملتے لیکن ساتھ ساتھ اس دعوے کی بھی کوئی بنیاد نہیں پائی جاتی کہ ہندوستان کے سُوتی سامان کی برآمد میں کوئی متناسب اضافہ ہوا۔

ہم اپنے اس عارضی نتیجہ کا اطلاق ان دوسرے سامانوں پر بھی کر سکتے ہیں جو ہندوستان سے ایشیائے دیگر ممالک کو فراہم ہوتے تھے کیونکہ ان میں سے کسی ایک کے متعلق بھی میں کسی ایسی سند کی نشاندہی نہیں کر سکتا جس سے یہ ثابت ہو یا یہ قیاس کیا جا سکے کہ اس میں برآمد میں اضافہ ہوا۔ لیکن جہاں تک نئی اشیاء کی تجارت کے شروع کرنے کا سوال ہے، صورت حال مختلف ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں بنگالی ریشم اور غالباً کورومنڈل کے کچے چمڑوں کو جاپان میں فروخت کرنے اور نیز غلاموں، سامان خورونوش اور اپنی ایشیائی نوآبادیوں میں ضرورت کی دوسری چیزیں برآمد کرنے کے سلسلے میں ولندیزیوں کی کوششوں کے واضح نتائج برآمد ہوئے۔

جیسا کہ کسی پچھلی فصل میں گذر چکا ہے، جاپان کو ریشم کی برآمدی تجارت 1650 کے لگ بھگ شروع ہوئی تھی، حالانکہ اس کے قیام کی تفصیلات پر پردہ پڑا ہوا ہے مئی 1653

میں 300 گانٹھوں کے بھیجے جانے کی ایک تحریر ملتی ہے اور اس کے دو ماہ بعد ایک جہاز بٹاویا
سے روانہ ہوا جس پر بیشتر بنگال کا ریشم بار تھا۔ اگلے تین سال کے جرنل لاپتہ ہیں لیکن 1657
میں 452 گانٹھوں کے ایک بار اور صرف ریشم سے لدے ہوئے ایک چھوٹے جہاز کے اندراجات
ملتے ہیں۔ 1689 میں 562 گانٹھوں کی ایک کھیپ بھیجی گئی تھی، مگر اس کا ایک حصہ بندر چین
کی پیداوار تھی اور دوسرے دو جہازوں پر بیشتر بنگال کا ریشم تھا۔ 1661 میں 1010 گانٹھوں کی
ایک واحد کھیپ کا اندراج ملتا ہے۔ اس وقت ولندیزی ریشم کی جن گانٹھوں کی بار برداری
کرتے تھے اس کا اوسط وزن 150 ایل بی سے تھوڑا ہی کم ہوتا تھا جبکہ 1659 میں انگریزی
کمپنی کی منظور شدہ قیمت 90 سے 100 روپیہ تک فی من (غالباً 74 ایل بی کا) تھی۔ ان اعداد
کی رو سے اس کے پیدا کرنے والوں کو 1000 گانٹھوں کے عوض میں تقریباً دو لاکھ روپیہ
سالانہ وصول ہو جاتے تھے جو اس وقت کے کاروباری معیار سے اچھی خاصی رقم تھی۔
مجھے ہندوستانی تاجروں کی جانب سے اس برآمد کی مخالفت کا کوئی پتہ نہیں چل سکا مگر
چونکہ [illegible] کی طرف سے بعض دیگر خام مال کی برآمد کے خلاف آواز اٹھائی گئی تھی[1] لہذا
یہ سوچا جا سکتا ہے کہ نئی مانگ کو پورا کرنے کی غرض سے پیداوار کا اضافہ عمل میں
آیا ہوگا۔

مجھے 1643 تک ساحل کورومنڈل سے جاپان کو کھال بھیجے جانے کے متعلق کوئی
تحریری شہادت نہیں ملی، حالانکہ تھوڑی مقدار میں کھالیں مقامی استعمال کے لیے
بٹاویا بھیجی جاتی تھیں۔ [illegible] میں ایک جاپانی تاجر نے جس کا سیام میں کاروبار تھا
وہاں پر بھیجی گئی کھالوں کے نمونے کی تعریف کی ہے اور اس کے بعد سے ولندیزیوں نے
پابندی کے ساتھ جاپان کھالیں بھیجنا شروع کیں۔ مگر زیر مطالعہ دور میں اس کی تجارت
کی اہمیت بمقابلہ ریشم کے بہت کم تھی۔ مجھے اس کے کاروباری مقدار کے اعداد دستیاب
نہیں ہو سکے لیکن گمان غالب ہے کہ اگر اس کی مالیت کا تعین روپیوں کی رقم میں کیا
جائے تو یہ لاکھوں میں نہیں بلکہ ہزاروں تک محدود رہے گا۔

ریشم اور کچی کھالوں کے علاوہ ہندوستان سے دیگر ایشیائی ممالک کو برآمدات کے

---

[1] گجرات سے سوت کی برآمد کی مخالفت کا حوالہ (باب 4 فصل 6) میں آیا ہے۔

جو تحریری اندراجات ملتے ہیں وہ بیشتر ولندیزیوں کی جاوا اور مسالے کے جزائر میں کاروباری سرگرمیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ولندیزی، بٹاویا کے ایک نئے شہر کو بطور اپنے ایشیائی دارالسلطنت کے آباد کرنے میں مصروف تھے اور ساتھ ساتھ وہ مسالے کے جزیروں کی معاشی تنظیم کو بھی از سرِ نو مرتب کرنا چاہتے تھے۔ ان کاموں کے لیے ضروری سامانوں کی فراہمی کا بیشتر انحصار ہندوستان ہی پر تھا اور خاص طور پر کورومنڈل کے بندروں سے انواع و اقسام کے سامان جو جاوا میں سہل الحصول نہ تھے مثلاً لوہا، فولاد، بورے ٹاٹ، پکے ہوئے چمڑے، نمک اور یہاں تک کہ چھتوں کی کھپریل کے بھی وہاں بھیجے جانے کی اطلاع ملتی ہے۔ لیکن ان کی اہم ترین ضرورت، آبادی اور غذائی سامان کی فراہمی تھی۔ لہٰذا ہم اپنے مطالعہ کے دائرہ کو انھیں دو چیزوں کی تجارت تک محدود رکھتے تھے۔

ابتدا میں بٹاویا بغیر آبادی کا ایک دارالسلطنت رہا۔ خود ولندیزی یہاں بہت کم تعداد میں تھے اور پڑوسیوں کی مخالفت، قرب و جوار کے لوگوں کے زیادہ تعداد میں یہاں آکر آباد ہونے میں مانع رہی۔ 1626 میں بٹاویا سے لکھے ہوئے ایک خط میں درج ہے کہ وہاں سے دیسی باشندوں نے مکمل طور پر ترکِ سکونت کر کے ایک گلزار علاقہ کو ویرانہ میں تبدیل کر دیا۔ لہٰذا وہاں نئی آبادی کے بسانے کا انتظام ضروری تصور کیا گیا اور اس وقت کے حالات میں جیسا متوقع تھا، ہنرمند دستکار، دوکان دار۔ بازاری سبزی اُگانے والے اور اس قسم کے دیگر پیشہ ور چین سے اور عام مزدور اور گھریلو خدمت گار ہندوستان کے مشرقی ساحل سے لائے گئے چینیوں نے تو خود اپنی مرضی سے بٹاویا پہنچ کر اپنی ہی قوم کے ایک سربراہ "کیپٹن" کے زیرِ نگرانی آزاد شہریوں کی طرح بود و باش اختیار کی لیکن ہندوستانیوں کو ساحل پر انھیں کی قوم کے تاجروں کے ہاتھوں سے خرید کر ولندیزی جہازوں پر مثل اشیاء کے درآمد کیا گیا۔

مسالے کے جزائر میں بھی آبادی کا مسئلہ بہت اہم تھا۔ بعض جزیرے طویل بدامنی سے بے حد متاثر ہوئے تھے وہاں شورشوں کو فرو کرنے کی غرض سے ان جزائر کے آخری فاتحین کے اختیار کیے ہوئے تشدد آمیز اقدامات کے نتیجہ میں مخالف آبادی کلیتہً تارکِ وطن ہونے پر مجبور ہو گئی تھی اور آبادی اس قدر گھٹ گئی تھی کہ دنیا کی منڈیوں میں مسالوں کی فراہمی میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ آبادی کی کمی کو اس طور پر پورا کیا گیا کہ

جزیروں میں چند ولندیزی کُنبے آباد کر کے انھیں بیشتر ہندوستانی نسل کے کافی تعداد میں غلام فراہم کیے گئے اور ان کے ذمّہ مطلوبہ مقدار میں مسالے پیدا کرنے کا کام سپرد کیا گیا۔ اس نئے نظم کے مکمّل ہونے کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ 1636ء میں باندہ کے جزیروں کی 3842 کی کل آبادی میں دیسی باشندوں کی تعداد صرف 560 تھی اور بقیہ 539 ولندیزیوں، 834 آزاد غیر ملکیوں اور 1912 درآمد کیے ہوئے بیشتر ہندوستانی النسل کے غلاموں پر مشتمل تھی۔

لہٰذا تقریباً 1620ء کے بعد سے، ولندیزیوں کی اوّل ضرورت یہ تھی کہ وہ پہلے ہندوستان سے غلام فراہم کریں اور اس کے بعد ان کی ضائع شدہ تعداد کو جو قرینِ قیاس ہے کہ زیادہ رہتی ہوگی مسلسل پورا کرتے رہیں۔ حقیقت میں جس مردم شماری کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے وہ ظاہر کرتی ہے کہ آب و ہوا کی تبدیلی کی وجہ سے یہ غلام "بنگالڈرس، اراکانڈس، الابارس[x] وغیرہ" جزیروں میں پہنچ کر زیادہ بیمار پڑ جاتے تھے۔ غلاموں کو عام تجارتی طریقوں کے تحت حاصل کیا جاتا تھا اس امر کی کوئی سند نہیں ملتی کہ اس سلسلہ میں ولندیزی تاجر فریب یا زور و زبردستی سے کام لیتے تھے بلکہ وہ انھیں ہندوستانی غلام فروشوں سے حکام کی باضابطہ اجازت کے بعد خریدتے تھے[1]۔ ان غلاموں کے جہازوں کے ذریعہ لائے جانے کی تعداد کے اندراجات بالکل نامکمّل ہیں لیکن بٹاویا جرنل سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً 1625ء میں ان کی سالانہ تعداد 1000 سے زائد ہی ہوگی۔ لیکن

---

[1] اس ضمن میں ENGLISH FACTORIES II_1024 ff میں مندرج پولی کٹ سے لکھے ہوئے ایک خط کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ خط کے لکھنے والوں سے ولندیزیوں کے ناخوشگوار تعلقات تھے اور وہ ان کے غلاموں کے کاروبار کی خرابیوں پر زور دیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ ان کو یہ بھی اعتراف ہے کہ ان خرابیوں کو کم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ غلاموں کی قیمت کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو ایضاً 10-111 جس میں انگریز آڑھتیوں کو عام مزدوروں کے لیے بقدر "20 ریال اور اس سے زاید" یا 40 سے 50 روپیہ تک ادا کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ اس کے قبل کے حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ولندیزیوں کی مانگ کی وجہ سے ان کی 15 روپیہ سے 20 روپیہ تک کی سابقہ قیمت بڑھ کر اس سطح پر پہنچ گئی تھی۔

[x] MALABARS

بٹاویا جرنل سے پتہ چلتا ہے کہ تقریباً 1625 میں ان کی سالانہ تعداد 1000 سے زائد رہی ہو گی۔ لیکن میں یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ کس قدر زیادہ تھی۔ 1640 سے 1660 تک یہ تقریباً 500 رہی ہوگی۔ اگر ایک کارگزار غلام کی قیمت کو اس قدر زیادہ یعنی پچاس روپیہ بھی تصور کرلیا جائے تو تجارتی نقطۂ نگاہ سے اس کاروبار کی کوئی خاص اہمیت نہیں معلوم ہوتی، لیکن اس کاروبار کی واقعی اہمیت اس اعتبار سے ضرور ہے کہ اس سے اس وقت کے ہندوستان کے معاشی حالات کے نشیب و فراز کا اندازہ ملتا ہے۔ چنانچہ 1618 کے قحط کے زمانہ میں پولی کٹ میں غلاموں کی افراط تھی لیکن 1662 تک چاول کا نرخ سستا ہو جانے کی وجہ سے وقتی طور پر غلاموں کا ملنا دشوار ہوگیا۔ اس کے بعد ان کی فراہمی پھر شروع ہوئی لیکن 1630 کے بڑے قحط کے فوراً بعد یہ کاروبار بالکل رُک گیا اور اب اس کی تجارت بیشتر اراکان کو منتقل ہوگئی۔ 1634 میں پولی کٹ سے آڑھتیوں نے اطلاع دی کہ زیادہ موتیں ہو جانے کی وجہ سے غلام نہیں مل رہے ہیں۔ اس کے دس برس بعد بھی پولی کٹ سے ان کی کمیابی ہی کی اطلاعات آتی رہیں۔ کمیابی کی جو وجہ بتائی گئی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قحط کے دوران فاضل آبادی موت کی نذر ہوگئی یا خود اپنی مرضی سے غلام بن گئی جس کے نتیجہ میں باہر بھیجے جانے کے لیے رضاکارانہ طور پر غلام ملنا بند ہوگئے اور اب ہندوستانی تاجر صرف وقتاً فوقتاً اغوا ہی کرکے غلام حاصل کرسکتے تھے۔ اراکان میں اس کا کاروبار کم و بیش لگ بھگ 1635 سے شروع ہوکر زیر مطالعہ دور کے تقریباً خاتمہ تک مسلسل قائم رہا۔ ان برسوں میں بنگال میں کوئی سنگین قحط واقع نہ ہوا اور اس علاقہ سے بیوپاریوں اور نیز سمندری ڈاکوؤں کے لائے ہوئے غلاموں کی تعداد معمولاً اچھی خاصی معلوم ہوتی ہے حالانکہ بادشاہ اور اس کے وزیروں کی من مانی مداخلت کی وجہ سے اراکان میں ہر چیز کی طرح تجارت میں بھی رخنہ پڑنا معمولات میں داخل تھا۔ وہاں کبھی تو ناگہانی طور پر سرکاری اجارہ داری قائم کردی جاتی، کبھی کسی بھی باہر دستکار کو اپنے تصرف میں لے لیا جاتا اور کبھی بلا کوئی سبب ظاہر کیے ہوئے اس کاروبار ہی کو روک دیا جاتا۔ لیکن اراکان میں متعینہ آڑھتیوں کے لیے یہ خلل اندازیاں غیر متوقع نہ تھیں اور ان کے باوجود کاروبار چلتا رہتا تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ اس کی مقدار ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی نہ تھی۔ زیر مطالعہ دور کے ختم ہوتے ہوتے کورومنڈل سے غلاموں

ں تجارت کے دوبارہ شروع ہونے کا پتہ چلتا ہے کیونکہ درمیانی مدت میں بٹاویا جنرل کے ترتیبی سلسلہ میں ایک خلا کے بعد ہمیں 1661 میں یہ اطلاع ملتی ہے کہ نیگا پٹم میں غلاموں کی افراط میں کمی ہونا شروع ہوگئی ہے اور تنجور علاقہ میں حالیہ قحط سالی نے ان اطراف میں ان کی فراہمی کو متاثر کیا ہے۔ دوسری طرف ان دنوں اراکان کی منڈی کی حالت اموات کی کثرت اور جنگی حالات کی بنا پر بنگال کی سرحد بند ہو جانے کے باعث ناقابل اطمینان ہوگئی تھی۔

اراکان میں غلام فروشوں کی عارضی ممانعتوں کے علاوہ جس کا اصل محرک بہرحال انسان دوستی کا جذبہ نہ تھا، میری نظر سے ہندوستانی حکام کی جانب سے غلاموں کی خریداری کی ممانعت کی صرف ایک مثال گذری ہے۔ ایسا اُس وقت ہوا جب 1643 میں ایک نائک یا سردار نے ولندیزیوں کی سالانہ 1000 غلام تک خریدنے کی استدعا کو اس بنا پر رد کر دیا کہ انسانوں کا فروخت کرنا صرف ایک شرمناک عمل ہی نہیں بلکہ گناہ بھی تھا مگر انسان دوستی کا یہ جذبہ عام نہ تھا کیونکہ بٹاویا جرنل کے اسی اندراج میں بتایا گیا ہے کہ ٹھیک انھیں دنوں ایک دوسرے نائک کا ملازم دو ولندیزی جہازوں کے مفرور خدمت گاروں کو فروخت کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو اس کے مالک کے ہاتھ لگ گئے تھے۔ 1661 میں شاہ گولکنڈہ کے ایک جہاز پر 300 غلام اشین پہنچائے گئے اور اس موضوع کی مسلسل اطلاعات مظہر ہیں کہ اس کاروبار کو ہندوستانی اور نیز ولندیزی اپنی دیگر تجارتوں کے ایک شعبہ کے طور پر تصور کرتے تھے۔ اس میں انگریز آڑھتیوں کی شرکت قدرتی طور پر کم تھی کیونکہ ان کے مالکوں کے قبضہ میں کوئی ایشیائی علاقہ نہ تھا جس کی ترقی کے لیے وہ کوشاں رہتے۔ بہتم ضرور کبھی کبھی ہندوستان سے تھوڑی تعداد میں گھریلو قسم کے خدمت گار طلب کیا کرتا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا انگریزوں کی یہ ضرورت بیشتر مدغاسکر اور دوسرے جزیروں سے پوری ہونے لگی۔ اس کاروبار میں بھی پرتگیزیوں نے زیادہ مستعدی دکھلائی اور ان کے ہندوستان کے دونوں ساحلوں سے وقتاً فوقتاً غلاموں کے لے جانے کے متعلق اطلاعیں ملتی ہیں۔ لیکن یہ زیر مطالعہ عہد کی کوئی نئی چیز نہ تھی کیونکہ ہم سولھویں صدی

میں ان کی تجارت سے پہلے ہی متعارف ہو چکے ہیں اب جو نئی صورتِ حال پیدا ہوئی اس کا تعلق ولندیزیوں کی بٹاویا اور مسالے کے جزیروں میں خصوصی ضروریات سے تھا۔

غذائی اجناس کی برآمد میں اضافہ کا بھی یہی سبب تھا۔ نئی آبادی کے لیے غذائی سامان کی ضرورت تھی اور مقامی ذرائع سے ضرورت کے مطابق فراہمی نہ ہونے کی صورت میں بدیہی طور پر ہندوستان ہی اس کمی کو پورا کر سکتا تھا۔ یہ امر واضح نہیں ہے کہ سولھویں صدی میں مسالے کے جزیرے فی الجملہ غذائی سامان کے معاملہ میں خود کفیل تھے یا نہیں لیکن اگر ایسا تھا بھی تو یہ بیشتر ساگو دانہ تک محدود تھا اور ولندیزیوں نے وہاں جو جدید نظم قائم کیا اس کے پیشِ نظر نئی آبادی اور درآمد کیے ہوئے غلاموں کے لیے زیادہ مقدار میں چاول اور کچھ گیہوں اور دالوں کی ضرورت رہا کرتی۔ یہ اشیاء پابندی کے ساتھ بٹاویا سے جہازوں کے ذریعہ لائی جاتی تھیں۔ لیکن پڑوسیوں کی مخالفت کی وجہ سے اس شہر کی مقامی پیداوار پر بھروسہ نہ کیا جا سکتا تھا۔ اس طور پر ہندوستان اور دیگر مقامات سے خود بٹاویا اور اس کے متعلقات کی غذائی ضروریات کو پورا کرنے کی غرض سے جو درآمدات کیے جاتے تھے اس نے اُسے غلّہ کی تجارت کی ایک منڈی بنا دیا۔ درآمدات کی مقدار کا صحیح تعین ممکن نہیں۔ حالانکہ یہ موضوع اہمیت کے لحاظ سے ایسا تھا کہ اس کی تفصیلات جرنلوں میں درج ہونا چاہئیں تھیں۔ درآمدات اندراجات مختلف اور غیر واضح اکائیوں میں ملتے ہیں۔ مثلاً چاول سے بھرا ہوا ایک چینی جہاز اور اتنے ہزار دھان کی ٹوکریاں وغیرہ۔ لیکن 1633 میں درآمدات کی میزان 2000 'لاسٹ' سے جو تقریباً 312.5 ٹن کے وزن کے مساوی ہوتا ہے کم نہ رہا ہوگا[1] اور یہ ہندوستان سے بذریعہ جہاز برآمد کیے گئے مجموعی سامان کا ایک اچھا خاصہ حصّہ تھا لیکن اس سال کی تجارت میں ہندوستان کا حصّہ کم رہا اور عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ غلاموں کی تجارت کی طرح غلّہ کی تجارت بھی ملک کے معاشی حالات کی مظہر ہے۔ عام دنوں میں بٹاویا کے لیے سامان کا بیشتر حصّہ کورومنڈل کے ساحل سے اور براہِ اراکان بنگال سے آتا تھا۔ لیکن اس میں سیام، ہندچین اور نیز جاپان کا بھی حصّہ ہوا کرتا تھا اور چونکہ وقتی رکاوٹیں

---

[1] چاول کے ایک لاسٹ ' LAST ' کے وزن کے لیے ضمیمہ ملاحظہ ہو۔

کبھی ایک علاقہ پر اور کبھی دوسرے علاقہ پر اثر انداز ہو سکتی تھیں، لہٰذا سامان کی فراہمی کا مسئلہ دشوار تھا۔ ابتدائی برسوں میں قحط کے خطرات بھی رہا کرتے تھے۔ کورومنڈل کے ساحل سے 1630 تک پابندی کے ساتھ سامان فراہم ہوتا رہا لیکن اس سال کی ہولناک سنک سالی نے حصول کے اس ذریعہ کو منقطع کر دیا اور اس کے بعد 1634 تک یہاں سے تجارت شروع نہ ہو سکی۔ اس اثنار میں اراکان سے سامان کی فراہمی کا انتظام کر لیا گیا تھا اور اس کے بعد کی مدت میں کورومنڈل اور بنگال سے چاول پابندی کے ساتھ اور وقتاً فوقتاً تھوڑی مقدار میں گیہوں اور دالیں بھی آنی شروع ہو گئیں۔ ہم اس تجارت کو مشرقی ہندوستان کے لیے نفع بخش تصور کر سکتے ہیں، کیونکہ اس طور پر فاضل پیداوار کی باہر نکاسی ہو جاتی تھی۔ لیکن پیداوار کے فاضل نہ ہونے کی صورت میں حکام برآمد کو فی الفور بند کر دیتے تھے۔ یہاں اس بات کا بھی ذکر کر دینا مناسب ہوگا کہ تقریباً 1660 سے لنکا کو ولندیزی برآمدات کا کچھ سلسلہ بڑھا۔ مگر ہندوستان کی تجارت کے لیے یہ کوئی خاص بات نہ تھی کیونکہ غذائی معاملہ میں لنکا کا ہندوستان پر انحصار پہلے سے چلا آرہا تھا۔

ایشیائی منڈیوں کے موضوع سے رخصت ہونے کے قبل، تمباکو کی تجارت میں ترقی کو مختصراً بیان کر دینا مناسب ہوگا۔ میرے علم میں یہ واحد شے ہے جس کے کاروبار کی ابتدار یورپی تاجروں کی دلچسپی کی رہین منت نہ تھی۔ سولھویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے، گجرات کی آب و ہوا اس کو راس آچکی تھی اور 1623 میں سورت کے برآمدات کی فہرست میں اس کا اندراج ملتا ہے۔ لیکن اس کے خشک پتیوں کے گٹھروں کی زیادہ جسامت ہونے کی وجہ سے اس کی جہازوں پر باربرداری دشوار تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بیشتر کاروبار مقامی تاجر نجی طور پر کیا کرتے تھے۔ اس کی پیداوار کورومنڈل کے ساحل پر بھی پہنچ گئی تھی اور تقریباً 1620 میں میتھولڈ اپنی اطلاعات کی بنار پر اس کے مُخا اور اراکان برآمد کیے جانے کے بارے میں لکھتا ہے جب کہ چند برسوں کے بعد ہی ہم یہ سنتے ہیں کہ اس کی خشک پتیاں بنگال اور پیگو بھی بھیجی جا رہی ہیں۔

METHWOLD x

فصل 6۔ ہندوستان میں جہازی بار برداری کا کاروبار

پہلے گذر چکا ہے کہ ایشیائی تجارت میں سرگرم حصہ لینے کی ضرورت کے تحت ولندیزی اور انگریزی جہازوں کو ہندوستان کے اہم برآمدی راستوں پر چلایا جاتا تھا اور اگرچہ اس طور پر ہندوستانی پیدا کرنے والوں کے لیے کچھ نیا کاروبار ضرور فراہم ہوگیا لیکن ان زائد جہازوں پر بیشتر سابقہ تجارتی مالوں ہی کی آمدورفت ہوتی رہی۔ اس سے یہ بدیہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ نئے جہازوں کے میدان میں آجانے سے پہلے سے موجود باربرداری کے وسائل کو ضرور نقصان پہنچا ہوگا اور پرتگیزی مالکان جہاز کے معاملہ میں تو ایسا قطعاً ہوا۔ ہگلی سے بے دخل ہوجانے پر بنگال میں ان کی تجارت عملی طور پر ختم ہوچکی تھی۔ اس کے علاوہ دیگر ہندوستانی مقبوضات میں بھی ان کے کاروبار میں روز افزوں تنزل کی اطلاعات ملتی ہیں۔ صدی کے شروع میں، برآمدی تجارت میں پرتگیزیوں کا حصہ قطعاً زیادہ تھا اور حالانکہ اس کی مقدار کو صحیح طور پر متعین نہیں کیا جاسکتا لیکن غالباً یہ ایک حقیقت ہے کہ ایشیا میں جہازی باربرداری کا جو کام ولندیزی اور انگریز اب کر رہے تھے وہ پہلے بھی بیشتر پرتگیزیوں ہی کے قبضہ میں تھا۔ مغربی ساحل پر سورت کو ترقی اور گوا کو زوال ہوا۔ کورومنڈل میں پولی کٹ اور مدراس نے سینٹ طوم اور نیگا پٹم کو بے دخل کیا اور ہگلی میں جس تجارت سے پرتگیزی بے دخل ہوئے تھے اس کا بیشتر حصہ بالآخر ولندیزیوں کے ہاتھ آیا۔

ہندوستانی مالکان جہاز کا معاملہ ذرا الجھا ہوا ہے کیونکہ اس صورت حال کے ان پر ہر جگہ ایک سے اثرات مرتب نہ ہوئے۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ گجرات، کورومنڈل اور بنگال کے حالات کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیا جائے۔ گجرات میں سب سے زیادہ نمایاں تبدیلی گوا کے ساتھ اس ساحلی تجارت میں کمی کی صورت میں واقع ہوئی جو بیشتر پرتگیزیوں کے زیرِ حفاظت ہندوستانی جہاز کیا کرتے تھے۔ صدی کے شروع میں جہازوں کے دو یا تین بڑے ساحلی جہازی بیڑوں (جن کو قافلہ کہتے تھے) کی ہر موسم میں آمدورفت ہوا کرتی تھی۔ ہر بیڑے میں 200 سے لے کر 300 تک جہاز ہوا کرتے، جو چھوٹے چھوٹے جنگی جہازوں کی حفاظت میں چلا کرتے

تھے۔ مال بردار کشتیوں میں 40 سے 50 "ٹنس"× تک کی سمائی ہوئی تھی۔ ان میں کچھ پر گوا سے برآمد ہونے کی غرض سے سوتی سامان، نیل، اور دیگر تجارتی اشیا اور کچھ مغربی ساحل پر مصرف میں آنے والے غلّے اور دیگر سامان لدے ہوتے تھے۔ مگر اس کاروبار کا زوال بڑی تیزی سے ہوا۔ 1621 میں وان ڈین بروک+ نے سورت سے مطلع کیا کہ پرتگیزیوں کی ساحلی تجارت پہلے ہی سے برباد ہو چکی تھی اور اس سال کے دوران صرف دو بیڑوں نے جن میں سے ہر ایک 40۔ سے 50 جہازوں پر مشتمل تھا کام کیا تھا جن میں سوائے غذائی رسد کے اور کچھ نہ تھا۔ اس کے اگلے برس وہ پورے موسم میں چلنے والے جہازوں کی تعداد کو 60 سے 80 تک بتاتا ہے۔ بقول مینارٹ 1626 میں گوا سے کھمبات صرف 40 جہاز پہنچے اور ان پر جو مال بار تھا بہت کم قیمت کا تھا۔ اس کے بعد سے ساحلوں پر باضابطہ سامان ڈھونے والے بڑے بڑے بیڑوں کی کوئی خبر نہیں ملتی۔ بعض اوقات تو پرتگیزی، حفاظت کے لیے جنگی جہاز بھی فراہم کرنے سے معذور رہتے تھے۔ ولندیزیوں کی جانب سے گوا کی موسمی ناکہ بندی نے جو کئی سال تک قائم رہی اس نظم میں تبدیلی کو ضروری کر دیا اور ہم سنتے ہیں کہ ایک وقت صرف چند کشتیاں ناکہ بندی سے بچ کر اشد ضرورت کے سامان رسد کے ساتھ گوا پہنچ سکیں۔ کچھ تو ان کی ناکہ بندی سے اور کچھ پرتگیزیوں کی کمزوری کے باعث مغربی ساحل پر مال کی کھپت کم ہو گئی تھی جس نے گجرات کے کاروبار کو ضرور متاثر کیا ہوگا۔ لیکن جہاں تک بیرونی برآمدات کا تعلق تھا جو تبدیلی واقع ہوئی وہ مفید ہی ثابت ہوئی کیونکہ پہلے برآمد کرنے کے لیے جو سامان گوا پہنچتا تھا اس کو اب ولندیزی اور انگریزی جہاز براہِ راست یورپ یا مشرقی منڈیوں کو لے جانے لگے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس تبدیلی سے ساحلی کشتیوں کے مالکوں کو تو ضرور نقصان پہنچا لیکن پیدا کرنے والے یا تاجر اس سے بالکل متاثر نہ ہوئے۔ کیونکہ گوا کے تجارتی کاروبار میں نقصان کا ازالہ اس نئی تجارت سے ہو گیا جو اب براہِ راست ہونے لگی۔

TUNS ×

VANDEN BROECKE +

ساحلی کاروبار کے علاوہ گجرات کے لیے سب سے زیادہ اہمیت اشین٭، فارس اور بحر قلزم کے راستوں کی تھی۔ اشین کی اہمیت خاص طور پر سوتی مال کے تقسیم کرنے کے ایک مرکزی کی حیثیت سے تھی۔ لہٰذا، بٹاویا میں ولندیزیوں اور بنتم میں انگریزوں سے اشین کا مقابلہ رہا کرتا تھا۔ ساتھ ساتھ یہاں وقتاً فوقتاً ان دونوں قوموں کے جہاز بھی پہنچا کرتے تھے۔ لہٰذا وہاں بغیر زیادہ مال پہنچائے ہوئے گجراتی جہازوں کے مالکوں کے لیے اس راستہ پر مقابلہ کی وجہ سے نقصان کا خطرہ تھا ان کا کاروبار بہر حال بالکل ختم نہ ہوا کیونکہ زیر مطالعہ دور کی پوری مدّت کے دوران بندرگاہ میں ان کے جہازوں کی موجودگی کی اطلاع ملتی ہے اور اس قدر بعد یعنی 1661 میں ان کے جہاز بازار کو سامانوں سے بھر دینے کے لیے کافی تھے۔ ولندیزیوں کے لیے بھی یہ تجارت کافی مدّت تک غیر سود مند رہی۔ 1633 کے قبل بمقابلہ ہندوستانی تاجروں کے ان سے زیادہ سرکاری محاصل وصول کیے جاتے تھے۔ لیکن اسی سال ان کے ساتھ معقول شرائط طے ہو گئے اور ان کو برابری کا درجہ دے دیا گیا۔ اگلی دہائی کے دوران دوستانہ تعلقات قائم رہے لیکن ولندیزیوں کے ملکا پر قبضہ حاصل کرلینے کے بعد انھوں نے اشین کے کاروبار کو یہاں منتقل کرنے کی کوشش کی۔ ان کی کوششوں کے نتائج واضح نہیں ہیں لیکن ان کوششوں کا ولندیزیوں اور اشین کے تعلقات پر برا اثر ظاہر ہوا کیونکہ صدی کی چھٹی میں جنگ کی صورت پیدا ہو گئی تھی اور اس وقت کاروبار بیشتر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن زیر مطالعہ دور کے خاتمہ پر ولندیزیوں نے بالآخر سیاہ مرچ کی مقامی تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے میں کامیابی حاصل کرنا شروع کر دیا تھا جس سے قدرتی طور پر ان کا اشین کی پوری تجارت پر غلبہ حاصل کرنا لازمی ہو گیا بس جہاں تک زیر مطالعہ دور کا تعلق ہے ہم تحریری شہادتوں کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ گجراتی مالکان جہاز کے کاروباری مقابلہ سے اثر پذیر ہونے کے باوجود وہ اشین کے راستہ کی سمندری تجارت کے اچھے خاصے حصہ پر قابض رہے۔ یہ امر بہر حال بخوبی طور پر واضح

٭ ACHIN

ہے کہ زیرِ مطالعہ دور کے شروع میں فارس کے سمندری راستہ پر گجرات کا بیشتر مال پرتگیزی جہازوں پر لادا جاتا تھا کیونکہ مغربی ہندوستان سے ہُرمز بندر کو پہنچنے والا بیشتر مال یا تو خود گوا سے براہِ راست یا پھر لہاری بندر چول اور دیو کے بندرگاہوں سے آتا تھا جہاں سامان کی بار برداری کا بیشتر کام پرتگیزی جہاز ہی انجام دیتے تھے۔ ہُرمز بندر کے پرتگیزیوں کے قبضہ سے نکل جانے کے بعد اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی جہازوں کے مالک ہُرمز کے جانشین گامبرون بندر کی طرف متوجہ ہو گئے کیونکہ سورت کے جہازوں کے وہاں وقتاً فوقتاً پہنچنے کے اندراجات ملتے ہیں۔ لیکن ہندوستانیوں کے لیے وہاں یہ پریشانی تھی کہ مسقط میں پرتگیزی اب بھی ہندوستانی جہازوں سے انھیں محاصل کو وصول کرنے کی کوشش کرتے تھے جو وہ پہلے ہُرمز میں وصول کیا کرتے تھے۔ لیکن اس مقصد کے لیے ان کے متعینہ نگراں جہاز، ولندیزیوں اور انگریزوں کے جہازوں سے مزاحمت نہ کر سکتے تھے۔ لہٰذا ہندوستانی تاجروں نے اب ان کے جہازوں پر اپنے سامان خلیج فارس کو بھیجنا شروع کر دیا۔ پرتگیزیوں کے قبضہ سے مسقط کے نکل جانے کے بعد یہ زحمت بھی رفع ہو گئی اور غالباً زیرِ مطالعہ دور کے ختم ہوتے ہوتے ہندوستانی جہازوں پر گامبرون، اور اس کے آگے تک جہازی باربرداری کا کام کم از کم اسی قدر وسیع پیمانہ پر پہنچ گیا تھا، جس قدر کہ پہلے پرتگیزی تسلط کے دنوں میں تھا۔

سورت کے لیے بہرحال بحرِ قلزم کا راستہ سب سے اہم تھا یہیں پر تجارتی مقابلہ ہر جگہ سے زیادہ محسوس کیا جاتا تھا یا کم از کم یہاں اس کی سب سے زیادہ شکایت کی جاتی تھی۔ صرف اس تجویز ہی پر کہ ایک انگریزی جہاز مُخا بھیجا جائے، مخالفت شروع ہو گئی اور 1618 میں جب اس تجویز پر عمل درآمد ہوا تو سورت میں مخالفت نے انگریزی تاجروں کے ساتھ مقاطعہ کی شکل اختیار کر لی اور اس وقت گجرات کے نظم و نسق کے نگراں شاہزادہ خُرّم سے استدعا کی گئی کہ بحرِ قلزم کی تجارت کو ہندوستانیوں کے لیے مخصوص کر کے بقیہ تمام سمندری راستوں پر انگریزوں کو کاروبار کرنے کی اجازت دے دے۔ شاہزادہ نے مقامی باشندوں کی موافقت میں انگریزوں کو حکم دیا کہ وہ بحرِ مُخا کے علاوہ بقیہ ہر جگہ پر بلا کسی

قید کے تجارت کر سکتے ہیں اور اگر وہ اس پر رضامند نہ ہوں تو ملک چھوڑ کر چلے جائیں۔ اس حکم سے یہ مسئلہ وقتی طور پر ختم ہوگیا۔ اس عرصہ میں ولندیزیوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ جہازی بار برداری کا کام نفع بخش ہے۔ چنانچہ بٹاویا سے موصولہ احکام کے تحت وہ اس کام میں مستعدی سے مصروف ہوگئے۔ انگریزوں کے لیے یہ مسئلہ سورت کے حکّام کے ساتھ ان کی ایک دوسری بڑی نزاع میں ضم ہوگیا۔ اس نزاع نے 1622 میں نازک صورت اختیار کرلی اور بالآخر 1624 تک طے ہوسکی[1] اس وقت جو معاہدہ ہوا، اس کے تحت بحرِ قلزم کے ساتھ تجارت پر کوئی پابندی عائد نہ کی گئی۔ اس کے بعد سے کسی مؤثر مخالفت کی کوئی تحریری اطلاع نہیں ملتی۔ مگر میرا خیال ہے کہ اس سے یہ سوچنا کہ اب سورت کے مالکانِ جہاز مطمئن ہوگئے ہوں گے، درست نہ ہوگا۔ زیادہ امکان اس کا ہے کہ انھوں نے اب یہ بخوبی سمجھ لیا کہ ولندیزیوں اور انگریزوں نے اس کاروبار میں لگے رہنے کا عزم کر لیا ہے۔ چنانچہ انھیں اسے اب ایک ناگزیر حقیقت تصوّر کرتے ہوئے تسلیم کرنا پڑا۔ بہرحال حقیقت جو کچھ بھی ہو اس کے بعد سے ہم اس راستہ پر یورپی اور نیز ہندوستانی جہازوں کو چلتا ہوا پاتے ہیں۔ مگر ہمیں کاروبار کی مقدار میں کسی اضافہ کی اطلاع نہیں ملتی اور یہ سوچا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی مالکان جہاز کے سابقہ کاروبار میں کچھ نہ کچھ کمی واقع ہوئی گی۔

پس، بظاہر حالات یہ ثابت کرتے ہیں کہ تین خاص برآمدی راستوں میں سے دو راستوں پر اور نیز گوا کے ساتھ ساحلی تجارت کے سلسلہ میں سورت کے مالکان جہاز کو کچھ نقصان پہنچا لیکن اس نقصان کو مائل باضافہ تصوّر کرنا غلط ہوگا۔ کاروباری مقابلہ کے اثرات درحقیقت 1620 اور 1630 کی درمیانی مدّت میں محسوس کیے گئے تھے جس کی شدّت میں آخر الذکر برس کے قحط کے بعد جب برآمدی سامان کی فراہمی وقتی طور پر تقریباً بالکل ختم ہوگئی تھی، اضافہ ہوا ہوگا۔ لیکن پھر حالات سنبھل گئے اور 1644 میں انگریز تاجروں کی اطلاع ہے کہ مُسلمان مالکوں کے جہازوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہوگئی ہے "کہ کاروبار حاصل کرنے کی غرض سے جہازوں کے کرائے خواہ وہ کتنے ہی تھوڑے کیوں نہ ہوں

---

[1] سلطنت زیرِ بحث کے حوالے باب 8 میں آئے ہیں۔

قبول کرنا پڑتا ہے"۔ اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ منافع میں تو نہیں لیکن جہازوں پر مال لادنے کی جگہ میں ضرور اضافہ ہو رہا تھا۔ 1660 کی پھر اطلاع ہے کہ ہندوستانی جہازوں کی تعداد اس تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی کہ "حالانکہ دس برس قبل سورت میں تقریباً 15 جہاز تھے جو اب بڑھ کر 80 ہو گئے ہیں جن میں سے بیشتر کے وزن بہت زیادہ تھے"۔ ہو سکتا ہے کہ اس اضافہ کا جزوی سبب ایک بندر پر زیادہ جہازوں کا اکٹھا ہو جانا رہا ہو۔ لیکن بہرحال تعداد میں بحالی کی شہادتیں ناقابل تردید ہیں۔

کورومنڈل کے جنوبی حصہ کے متعلق مجھے کوئی ایسی شہادت نہ مل سکی جس سے یہ ظاہر ہو کہ زیر مطالعہ دور کے شروع میں یہاں ہندوستانی مالکوں کے جہازوں کی مال برداری کا کام کوئی خاص اہمیت رکھتا تھا۔ یہاں کے اہم مراکز نیگاپٹم اور سینٹ طوم قطعی طور پر پرتگیزیوں کے قبضہ میں تھے اور اس خطہ میں جو خاص تبدیلی ہوئی وہ برآمدات کی ان بندروں سے پولی کٹ اور مدراس کو منتقلی تھی۔ کوچین اور اس کے آگے تک کی ساحلی تجارت اس وقت پرتگیزیوں کے ہاتھ میں رہی جب تک کہ ان کی طاقت کو ولندیزیوں نے اپنی سرگرمیوں سے ختم نہ کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ کاروبار ہندوستانی مالکان جہاز کی طرف منتقل ہو گیا۔ لیکن منڈیوں میں مانگ کی کمی ظاہر کرتی ہے کہ یہ کاروبار زیادہ نفع بخش ثابت نہ ہوا ہوگا۔ اس کے مزید شمال کی صورت حال بالکل غیر واضح ہے لیکن کم از کم مسولی پٹم میں شروع شروع جہاز کی مال برداری کے کام کا بیشتر حصہ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں تھا اور حالانکہ سورت کے ایسی شکایات یہاں سننے میں نہیں آتیں تاہم میرا خیال ہے کہ غالباً مقامی مالکان جہاز کچھ دنوں تک خسارہ میں رہے۔ تقریباً 1640 سے گولکنڈہ کے اعلیٰ حکام نے اپنے جہازوں کے ساتھ ترجیحی سلوک کا معاملہ شروع کیا جس سے صورت حال تبدیل ہو گئی۔ بعد میں اس ترجیحی سلوک نے اجارہ داری کی شکل اختیار کر لی اور تقریباً 1647 میں ہم سنتے ہیں کہ فارس، بصرہ، مُخا اور (تھوڑے عرصہ کے بعد) پیگو کو بھی مال صرف انھیں جہازوں پر جو بیشتر ان دنوں گولکنڈہ کے معروف وزیر اعلیٰ 'میر جملہ' کی ملکیت میں تھے بھیجا جا سکتا تھا۔ لیکن میر جملہ کے مملکت مغلیہ کی اطاعت قبول کر لینے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اجارہ داری ختم ہو گئی۔ کیونکہ 1661 میں ولندیزیوں اور انگریزوں نے دوبارہ فارس کے لیے مال لادنے کے سلسلہ

میں کاروباری مقابلہ شروع کردیا۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ زیرِمطالعہ دور کے نصف آخر میں اس خطہ کی برآمدات کا سب سے زیادہ نفع بخش حصہ ہندوستانی جہازوں کے قبضہ میں رہا۔

بنگال میں جن شہادتوں کے خلاصے اوپر بیان کیے جاچکے ہیں ان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تقریباً 1635ء تک وہاں کی مختصر برآمدی تجارت کا بیشتر حصہ پرتگیزیوں کے قبضہ میں رہا۔ یہ برآمدی تجارت فوراً ولندیزیوں اور انگریزوں کو منتقل نہ ہوئی۔ یہ لوگ ابتدار میں اپنی جدید قائم کردہ منڈیوں کے لیے ضروری سامانوں کے علاوہ دیگر سامانوں کا بہت تھوڑی مقدار میں کاروبار کرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی جہاز کے مالکوں نے پپلی اور بالاسور میں تھوڑے عرصہ کے لیے اپنے لیے جگہ بنالی تھی اور 43-1644ء کے موسم میں ان بندروں سے 26 جہازوں کے دوسرے ممالک جانے کے اندراجات ملتے ہیں۔ اس سال کے بعد یہ تعداد یکایک کم ہوگئی جس کا خاص سبب ڈنمارک کے باشندوں کے وہ حملے تھے جو انھوں نے بنگال کے خلاف اپنی جنگ کے سلسلہ میں کیے۔ اس اثنار میں ولندیزیوں کو ہگلی میں اپنے قیام کی وجہ سے ایشیائی منڈیوں میں اپنی برآمدات کو بڑھانے کا موقع ملا اور زیرِمطالعہ دور کے ختم ہوتے ہوتے تجارت میں ان کا اچھا خاصا دخل ہوگیا تھا۔

لہٰذا ہندوستان کے پرتگیزی جہازوں کے باشندوں کو علیحدہ کرکے، اگر ہم صرف ہندوستانی مالکوں کے جہازی بار برداری کے کام کا مجموعی جائزہ لیں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کام گجرات میں ضرور کم ہوا مگر کمی اضافہ پذیر نہ تھی۔ بنگال میں اس نے اپنے لیے جگہ بنائی مگر اس کو برقرار نہ رکھ سکی اور غالباً کورومنڈل کے بندروں پر یہ فی الجملہ کم ہوا۔ ولندیزی اپنی جدید قائم کی ہوئی کل یا تقریباً کل ایشیائی تجارت پر اور ولندیزی اور انگریز دونوں مل کر اپنے ہندوستان آنے کے قبل یہاں جو تجارت چل رہی تھی اس کے ایک غیر معین مگر اچھے خاصے حصہ پر قابض رہے۔ ان حالات میں یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب ہوگا کہ اس تبدیلی سے وہ ہندوستانی تاجر جو جہازوں کے مالک بھی تھے، خسارہ میں رہے۔ لیکن ہم اس نتیجہ کا اطلاق ہندوستانی تاجروں پر فی الجملہ یا جہاز سازوں کے علاوہ دیگر پیدا کرنے والوں کے کسی ایک طبقہ

پر نہیں کر سکتے[1] اس کے برخلاف ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہندوستانی تاجروں کے لیے ولندیزی اور انگریزی جہاز جو بیک وقت ارزاں اور بہتر تھے مفید ثابت ہوئے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ نفع کا کچھ حصہ ضمنی طور پر پیدا کرنے والوں کو بھی پہنچا ہو۔ ملک کے اندرونی شہروں کے تاجروں کی حالت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک طرف تو سورت میں انگریزی جہازوں کے بحرِ قلزم میں داخل ہونے کی سرگرم مخالفت ہو رہی تھی اور دوسری طرف احمدآباد کے تاجروں کی خواہش تھی کہ ان کے مال کو انگریز جہاز مخا، فارس اور دیگر مقامات پر لے جائیں اور بیس برس سے زائد کے کاروباری تجربہ کے بعد سورت کے انگریزوں کی اطلاع ہے کہ ہندوستانی تاجر ولندیزی یا انگریزی جہازوں کو ہندوستانی جہازوں کے مقابلہ میں ترجیح دیتے تھے۔ اس اطلاع میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کاروباری مقابلہ کے تحت محصول کی شرح کم کر دی گئی تھی۔ ہندوستانی مالکانِ جہاز نے ان دنوں صرف اپنی شرحوں ہی کو کم نہیں کیا بلکہ درآمدی محاصل یا دیگر ضمنی اخراجات کی جزوی ادائیگی کو بھی اپنے ذمہ لے لیا اور زیرِ مطالعہ دور کی پوری مدت کے دوران ولندیزیوں کی انگریزوں پر سبقت لے جانے کی کوششوں نے جہازوں کے محصول کو زیادہ بڑھنے سے روکا۔ جہازوں پر ضرورت سے زیادہ جگہ کی موجودگی کے باعث ہندوستانی تاجر اکثر اپنی مرضی سے جہاز منتخب کیا کرتے۔ مثلاً

---

[1] متن میں مندرج واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی بمقابلہ سولھویں صدی کے اختتام کے زیرِ مطالعہ دور میں مشرقی ساحل پر تو نہیں مگر مغربی ساحل پر نسبتاً کم تعداد میں جہاز بناتے تھے۔ اس کمی سے بظاہر پرتگیزی کاروبار خاص طور پر متاثر ہوا تھا۔ ایشیائی سمندروں کے لیے ان کے تقریباً تمام تجارتی جہاز ہندوستان ہی میں تیار ہوا کرتے تھے۔ ولندیزی اور انگریز صرف کبھی کبھی ہندوستانی جہاز خریدا کرتے تھے (ملاحظہ ہو مثلاً ENGLISH FACTORIES VI.443 & VII 91) اور وہ اپنے لیے بڑے جہاز یورپ ہی سے لاتے تھے اور دورِ زیرِ مطالعہ میں انھوں نے ہندوستان میں عام طور پر جہاز سازی کا کام نہ شروع کیا تھا۔ ممکن ہے کہ گوداوری دریا کے ڈیلٹا کے بارے میں صورت حال "BOMBAY" نے صفحہ ۱۵۱ پر درج کی ہے وہ ہمارے عہد میں شروع ہوئی ہو۔ لیکن مجھے اس کی کوئی اطلاع نہیں مل سکی ہے کہ ان کی کوئی اہمیت تھی۔

1647 میں سورت کے انگریز شاکی تھے کہ ولندیزیوں سے مقابلہ کی وجہ سے ان کے جہازوں کے لیے مال دستیاب نہ ہوسکا اور ولندیزیوں کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے جہازوں کو نصف لاد کر یا ان پر توازن قائم رکھنے کی غرض سے کوئی بھی بھرتی کی چیز لے کر چلا کرتے تھے حالات کے تقاضہ کے تحت یورپی جہازوں میں حفاظت کا زیادہ انتظام رہتا تھا۔ ہندوستانی جہازوں کی یہ مجبوری تھی کہ وہ موافق موسم ہی میں چل سکتے تھے اور انھیں ناموافق موسم کو بچانا ہوتا تھا۔ ان کے جہاز کمزور بنے ہوتے تھے اور ان کے چلانے والے اکثر ہنگامی حالات کا مقابلہ کرنے کا تجربہ نہ رکھتے تھے۔ ولندیزی اور انگریزی جہاز اس لحاظ سے بنائے جاتے تھے کہ وہ ناموافق موسم سے عہدہ برآ ہوسکیں۔ ان کے چلانے والے شمالی سمندر اور خلیج انگلستان کے طوفانوں کا تجربہ رکھتے تھے اور راس اُمید کے گرد حفاظت کے ساتھ جہازوں کے چلا لینے والوں پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ ہندوستانی سمندروں کے بڑے بڑے طوفان کا مقابلہ کر لیں گے[1]۔ اس کے علاوہ یورپی جہاز معمولاً بہتر طور پر مسلح رہتے اور ان میں سمندری قزاقوں کے حملوں کا مقابلہ کرنے کی جن کے آگے ہندوستانی جہاز بے بس ہوا کرتے، صلاحیت ہوا کرتی تھی۔ علاوہ اس کے جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے درآمدی محصول وصول کرنے والی پرتگیزی کشتیاں ولندیزی اور انگریزی جہازوں سے مزاحمت نہ کرتی تھیں۔ ان حالات میں ہندوستانی تاجر، یورپی جہازوں کو ترجیح دینے میں حق بجانب تھے۔ لہٰذا وہ ہندوستانی تاجر جو جہازوں کے مالک بھی تھے ان کو محصول میں تخفیف اور قیاساً مال کی کمی سے بھی ضرور خسارہ ہوا ہوگا۔ لیکن ان میں کی اکثریت کے لیے جن کا کاروبار صرف مال برداری تھا، یورپی جہازوں کے ذریعہ کم محصول میں اور زیادہ حفاظت کے ساتھ اپنا کاروبار کرنا ممکن ہوگیا۔

---

[1] ہندوستانی مالکوں کے جہازوں پر یورپی جہاز چلانے والوں کا بکثرت ملازم رکھا جانا، ان کی عملی برتری کی بہترین شہادت ہے۔ ولندیزی جہاز رانوں کی خاص طور پر زیادہ مانگ رہا کرتی تھی حالانکہ انگریز بھی مقبول تھے۔

باب 3 کے ماخذ

فصل 1 :۔ اس فصل کا بیشتر حصہ کتاب INDIA AT THE DEATH OF AKBAR کے باب 6 میں مندرج ہندوستان کی غیر ملکی تجارت کے حالات کا خلاصہ ہے۔ تفصیلی حوالوں کے لیے اصل کتاب ملاحظہ ہو۔ یورپ میں ہندوستانی سامانوں کی مانگ کے متعلق باب 4 میں زیادہ تفصیل سے بحث آئی ہے۔ سوتی سامانوں کے اقسام کو ولندیزی اور انگریزی تحریروں سے اخذ کیا گیا ہے۔ لیکن میرے علم کی حد تک وہ ان تحریروں میں کہیں واضح طور پر درج نہیں ہیں۔ نفیس سامانوں کے نام کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو TERPESTRA'S KOROMANDEL اور ENGLISH FACTORIES سامانوں کی ایک طویل فہرست HOBSON-JOBSON (کپڑے کے تھانوں کے سلسلے میں) ملتی ہے۔ لیکن یہ بعد کے ماخذ سے ترتیب دی ہوئی ہے اور اس میں بہت سے وہ نام جو ہمارے عہد میں زیر استعمال تھے نہیں ملتے۔ زمینی تجارت میں تبدیلیوں کے سلسلے میں ملاحظہ ہو COURT MINUTES مورخہ 7 اپریل 1624 اور 29 دسمبر 1643 اور ENGLISH FACTORIES VIII, 207, 26 ff

فصل 2 :۔ درآمدی تجارت کا بیان ان کثیر التعداد اندراجات سے ماخوذ ہے جو انگریزی اور ولندیزی تجارتی تحریروں میں جا بجا ملتے ہیں۔ بیش قیمت دھاتوں کی برآمد پر تفصیلی بحث CUNNINGHAM (THE MERCANTILE SYSTEM) میں ملتی ہے اور طامس من[1] کا رسالہ PURCHAS I میں موجود ہے۔ انگلستان میں جو پابندیاں نافذ تھیں وہ CALENDER S P میں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی جو مخالفت ہوئی COURT MINUTES (DATED JUNE, 12, 1618 JANUARY 12, 1612 AND MARCH 8, 1624 میں درج ہے۔ ہدایات جو 1609 اور 1610 میں جاری کی گئیں FIRST LETTER BOOK 319 میں اور 1621 کی رپورٹ ENGLISH FACTORIES 111 196 میں درج ہیں۔ ولندیزیوں کو جو زیادہ آزادی حاصل تھی اس پر 16 اپریل 1624 کی COURT MINUTES میں زور دیا گیا ہے۔ VAN LEUR کے باب 9 میں ہالینڈ کی ابتدائی برسوں

---

(1) THOMAS MUN'S TREATISE

کی حالت بیان کی گئی ہے۔ ولندیزی تاجروں کی عائد شدہ پابندیوں کو محسوس کرنے کی مثالیں TERPESTRAS SIRAT کے ضمیمہ جات 11 اور 13 سے ماخوذ ہیں۔

فصل 3 :۔ ایشیائی تجارت پر طامس رو کے خیالات اس کے جرنل صفحہ 346، 348، 89 پر ملیں گے۔ ولندیزی گورنر جنرل کوئن کی ہدایات کا خلاصہ CALENDER S P نمبر 243 پر درج ہے اور ELIAS 11, 38 میں ان کی اہمیت کا بیان ہے۔ سماترا کی سونے کی تجارت کے لیے LETTERS RECEIVED 1-74 اور بورنیو کی سونے کی تجارت کے لیے ایضاً 219 ملاحظہ ہوں۔ ولندیزی مقبوضات میں زراعتی ترقیوں کا DAGH REGISTER میں بکثرت ذکر آیا ہے۔ DAGH REGISTER میں مندرج جہازی سامانوں کے مسلسل خلاصوں سے جاپان کے مطلوبہ سامانوں کا اندازہ ملتا ہے۔ جاپانی منڈیوں کے لیے ان سامانوں کی ناموزونیت پر LETTERS RECEIVED 111, 238 ff میں زور دیا گیا ہے۔
فارس کے ریشم کی پیشکش ENGLISH FACTORIES VI میں درج ہے۔ جاپان میں ہندوستانی کچے چمڑے کے لیے (DAGH REGISTER (SIAM مورخہ 14 نومبر 1629 اور اس کے بعد کے جاپان کو بھیجے گئے جہازی سامانوں کے خلاصے ملاحظہ ہوں اور ریشمی سامانوں کے حوالے LETTERS RECEIVED 111 اور DAGH REGISTER میں جابجا ملیں گے۔ بنگال سے جاپان کو ریشم کی تجارت کا سب سے پہلا مذکورہ تصنیف مورخہ 21 اپریل 1641 میں درج ہے۔

فصل 4 :۔ کھلونوں سے تجارت کی جو مثالیں درج کی گئی ہیں LETTERS RECEIVED 1, 23, ENGLISH FACTORIES, ROE 383, TERPESTRAS SIRAT 49, - APPENDIX VI & I, III, 111, 134 اور DAGH REGISTER (گجرات) مورخہ 27 اپریل 1643 سے ماخوذ ہیں۔ ان مثالوں کے ماخذ کی فہرست میں مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

فصل 5 :۔ بذریعہ جہاز جاپان بھیجے جانے والے ریشمی سامانوں کی فہرست DAGH REGISTER سے ماخوذ ہے جس کا پہلا اندراج 21 مئی 1653 کا ہے اس کی مالیت ENGLISH FACTORIES X میں درج ہے۔ کچے چمڑے کی برآمد کے ابتدائی حوالے DAGH REGISTER مورخہ

29 نومبر 1640ء، 23 اپریل 1642 (کورومنڈل) اور 14 نومبر 1644 (سیام) میں ملتے ہیں
بٹاویا اور مسالہ کے جزائر میں ولندیزیوں کی ضرورت کی اشیاء کے تذکرے DACH
CALENDER میں مسلسل درج ہیں۔ بٹاویا کے نواحی علاقوں کی ویرانی کی اطلاع REGISTER
P 's 29-625 نمبر 255 سے حاصل کی گئی ہے۔ جزیرہ پر قابو پانے کے سلسلے میں مذکورالصدر
تصنیف 2-1617 نمبر 108 اور 24-62 نمبران HAGUE TRANSCRIPTS 111, 243, 193
اور نیز DAGH REGISTER کے متعدد حوالے جس میں جزیرہ باندہ کی مردم شماری تاریخ
6 اکتوبر 1636 کے ذیل میں درج ہے ملاحظہ ہو۔
غلاموں کی تجارت کے متعلق معلومات DAGH REGISTER کے متعدد اندراجات سے
ماخوذ ہیں جن میں HAGUE TRANSCRIPTS, 1-162 اور ENGLISH FACTORIES 11,
85, V.326; VI, 226 & VIII, 54n سے اضافہ کیا گیا ہے۔ غذائی اجناس کی
آمدورفت DAGH REGISTER میں مسلسل درج کی گئی ہے۔ ممانعت کی ایک مثال کو
6 جنوری 1645 (اراکان) کے اندراج میں دیکھا جا سکتا ہے۔ تمباکو کی تجارت کے حوالے
ENGLISH FACTORIES 1-271, 111, 286 FATHWOLD 1004 اور DAGH REGISTER
مثلاً مورخہ 6 اکتوبر 1636 اور 27 نومبر 1640 اور 26 اپریل 1643 (کورومنڈل)
میں آئے ہیں۔

فصل 6 :- پرتگیزی نوآبادیات کا افلاس ان دنوں کی، تحریروں کا عام موضوع ہے
ملاحظہ ہو مثلاً PYRARD (TRANSLATION) 11-203, DELLA VALLE 1-157
اور MASTER 11-8 اور چند برسوں بعد ENGLISH FACTORIES V-221, VI 230 ETC
قافلہ کا ذکر متعدد مصنفین نے مثلاً BOWREY, 191 (ترجمہ) یا PYRARD 11 - JOURD
IAN-178 نے کیا ہے۔ اس کے انحطاط کے لیے ملاحظہ ہوں وہ خطوط جو TERPESTRA'S
nat کے ضمیمہ جات 11، 13 اور 77-72 PELSART میں نقل کیے گئے ہیں۔ اشین میں جہاز
پر مال برداری کے حالات کا بہترین مطالعہ 29 اکتوبر 1625 اور اس کے بعد کے
DAGH REGISTER میں کیا جا سکتا ہے۔ ہرمز میں جہاز پر مال برداری کے لیے ملاحظہ ہو
SURAT TERPESTRAS ضمیمہ DAGH REGISTER میں جا بجا مثلاً 17 ستمبر 1645

(سورت) اور ENGLISH FACTORIES V-118 بحر قلزم کے راستہ کے واقعات ولندیزی اور انگریزی تحریروں میں مختلف مقامات پر ملتے ہیں۔ ابتدائی مخالفت کا بیان LETTERS RECEIVED VI-227 اور ENGLISH FACTORIES iii PP 1 ff, 22 ff میں آیا ہے ولندیزیوں کی تجارت میں شرکت کا حال TERPESTRAS SURAT C-X میں مفصل بیان کیا گیا ہے۔ سورت میں جہازوں پر مال لادنے کے کام کی دوبارہ بحالی کے لیے ملاحظہ ہو ENGLISH FACTORIES Vii, 142, 208, viii, 27 کورومنڈل کی ساحلی تجارت میں تبدیلی RENNEVILLE Vii میں بیان کی گئی ہے۔ شمالی بندروں کی ابتدائی حالت کا ذکر SCHORER ff 3-6 میں اور مسولی پٹم میں بعد کی اجارہ داری کا ذکر ENGLISH FACTORIES IX-12, 19 & vii میں آیا ہے۔ اجارہ داری کا خاتمہ [illegible] مورخہ 11/اور 16/مئی 1661 میں مذکور ہے۔ پہلی میں جہاز پر مال برادری کی مقدار کے لیے ملاحظہ ہو مذکورالصدر تصنیف مورخہ 3/اپریل اور یکم جون 1644 (کورومنڈل)۔ ولندیزیوں اور انگریزوں کے درمیان جہازی بار برداری کے کاروبار کے سلسلہ میں زبردست مقابلہ آرائی کے لیے ملاحظہ ہو ENGLISH FACTORIES viii ہندوستانیوں کے یورپی جہازوں کو ترجیح دینے کا ذکر مذکورالصدر تصنیف 1-301, vii-162 میں آیا ہے۔ علاوہ دیگر مصنفین کے VAN TWIST (C-x/iv) I. ہندوستانی جہازوں کی کمزور بناوٹ اور ان کے فوجی ساز و سامان کے نقائص کا ذکر کرتا ہے۔

باب 4
پچھمی یورپ میں نئی منڈیوں کا قیام

فصل ۱ — سترھویں صدی کے آغاز پر پچھمی یورپ کے ساتھ تجارت

اب ہم زیر مطالعہ دور کی تجارت کی ایک اہم صورت حال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یعنی ہندوستانی سامانوں کے لیے انگلستان، فرانس اور ہالینڈ میں نئی منڈیوں کا قیام۔ اگر یورپ کو روس، بحیرۂ روم اور اٹلانٹک تین تجارتی خطوں پر مشتمل تصور کر لیا جائے تو ہمیں سترھویں صدی کی ابتدائی صورت حال کو سمجھنے میں سہولت ہوگی۔ ان میں اول سے ہمارا تعلق برائے نام ہی ہے۔ کیونکہ ہندوستانی تجارت کی ایک محدود مقدار اتر، پچھم میں بحر خضر اور بحر اسود کے سامنے سے گذرتی تھی اور مشرقی تجارتی اشیا کو بالٹک کے بندروں سے لندن پہنچانے کے لیے دریائے والگا پر سامانوں کی آمدورفت کے ایک منصوبہ کی تیاری کی ہمیں اطلاع ملتی ہے لیکن اس آمدورفت کے منصوبے کو کوئی عملی اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔ ساتھ ساتھ مجھے خود روس کے ساتھ تجارت کی مقدار میں کسی قابل لحاظ تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا۔ بحیرۂ روم کا علاقہ عرصہ سے ایشیائی سامانوں کو بحر قلزم اور بحر فارس کے راستہ سے حاصل کر رہا تھا۔ پندرھویں صدی کے آخر تک اٹلانٹک خطہ کا کام انھیں راستوں سے چلتا رہا لیکن چونکہ اس میں آمدورفت کا صرفہ زیادہ آتا تھا لہٰذا تجارت کم ہو گئی تھی۔ اور بحر اٹلانٹک کے ساحلی علاقوں تک پہنچنے والے سامان صرف مسالوں، منفرد اشیا اور نوادرات ہی تک محدود رہے۔ لزبن کے لیے سمندری راستہ کے کھل جانے کے لازمی نتیجہ کے طور پر تجارت کی اس تنظیم میں تبدیلی واقع ہوئی۔ اب اٹلانٹک ممالک کی ضروریات اس نئے راستہ کے ذریعہ نسبتاً ارزاں اور بہتر طریقہ پر پوری ہونے لگیں اور اس راستہ کی تجارت کا مقابلہ علاقہ بحر روم کی منڈیوں کی تجارت سے بھی ہوا۔ حالانکہ مشرقی

سامانوں کی تقسیم تو لیوانٹ ہی سے ہوتی رہی لیکن اب خشکی کے راستوں کے تاجروں کی اجارہ داری ختم ہوگئی۔ سولھویں صدی کے دوران اشیاء کے تھوک فروش، لزبن اور نیز طلب یا اسکندریہ پر مال کے حصول کے لیے بھروسہ کر سکتے تھے۔ اور پانی کے راستہ سے مال کی آمدورفت میں جو فوائد تھے وہ لزبن کی قریبی منڈیوں کے لیے معمولاً فیصلہ کن ثابت ہوتے تھے۔ پرتگیزیوں کو اس طور پر جو تجارتی حیثیت حاصل ہوگئی تھی ان میں نسبتاً ان کی کارگذاری کو بہت کم دخل تھا۔ جیساکہ پچھلے باب میں ذکر آچکا ہے، یہ درست ہے کہ برازیل کے ساتھ کاروبار شروع کر دیا گیا تھا لیکن اس بات کا بالکل پتہ نہیں چلتا کہ وہ یورپ کے اتلانتیکی خطوں کی تھوک منڈیوں میں کوئی نیا ہندوستانی سامان لائے۔ لزبن سے شمالی بندرگاہوں کو جانے والے جہازوں پر بیشتر مسالے اور مفرداودیات یا مشرق ابعد کی دیگر پیداواریں ہوا کرتی تھیں۔ اور سولھویں صدی کے دوران نیل، شورہ، اور کیلیکو* کی زیادہ کھپت، جو ہمارے عہد کی نمایاں خصوصیت ہے کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ موجودہ تحریروں کے مطابق پرتگیزیوں کی مداخلت کا کل ماحاصل یہ تھا کہ اب بھی مالک کی منڈیوں میں وہ تمام سامان جن کی پہلے سے مانگ چلی آرہی تھی نسبتاً ارزاں اور زیادہ مقدار میں پہنچنا شروع ہو گئے۔ بہرحال لزبن کی تجارت کی صحیح تفصیلات بتانا ممکن نہیں کیونکہ انھیں صیغۂ راز رکھنے میں بڑی احتیاط برتی جاتی تھی اور مجھے درآمد کیے ہوئے مال کی مقدار یا مالیت یا ان کی مختلف منڈیوں میں تقسیم کے متعلق کوئی سرکاری اعداد و شمار دستیاب نہ ہو سکے تقسیم مال کے متعلق عمومی انداز میں صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ سوتی سامانوں کی بیشتر مقدار مراقش، برازیل یا افریقہ، ملک گنی× کے ساحل کو اور سیاہ مرچ اور دیگر مسالوں کی بیشتر مقدار بذریعہ ولندیزی جہازوں کے اینٹورپ، ایمسٹرڈم یا اتری یورپ کے دیگر بندروں کو پہنچا ئی جاتی تھی۔

سترھویں صدی کے آغاز پر لزبن سے لائے ہوئے مال کی مقدار کا ایک تخمینی اندازہ لندن کے پبلک ریکارڈ آفس میں محفوظ دو فہرستوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ ان فہرستوں میں بظاہر 1602ء اور 1603ء میں یا ولندیزیوں اور انگریزوں کے ہندوستان میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کے

CALICO *

GUINEA ×

کچھ قبل بھیجے والے مال درج ہیں۔ ان میں مندرج اعداد کا ماخذ ظاہر نہیں کیا گیا ہے لیکن ایسا قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کو خفیہ طور پر حاصل کیا گیا تھا اور ان کی تفصیلات میں غلطیوں کا اچھا خاصا امکان پایا جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ اس فہرست کے اندراجات عام طور پر تجارت کے ہمعصر تذکروں سے مطابقت رکھتے ہیں اور ان کے حسب ذیل خلاصہ سے جو رائے قائم ہوتی ہے وہ غالباً فی الجملہ حقیقت سے زیادہ بعید نہیں ہے۔

گوا سے لزبن بذریعہ جہاز بھیجے گئے مال

اشیاء	اکائی	1602 (دو بڑے وزن کے جنگی جہاز)	1603 (چار بڑے وزن کے جنگی جہاز)
مسالے	کونیٹل = 130 ال بی	9851 ½	26,582 ½
نیل	"	17 ½	[illegible]
دیگر سامان جو وزن میں ظاہر کیے گئے ہیں	"	889	×
ریشم کے سامان	پیٹیاں	303	931
کیلیکو	بڑی گانٹھیں	86	"
"	چھوٹی گانٹھیں	273	989
"		146	5,314

معہ مشک، عنبر، جواہرات اور چینی طشتریاں جو مختلف اکائیوں میں ظاہر کی گئی ہیں :-

ان میں ہر سامان کی مندرجہ مقدار اس کے پورے سال کی تجارت کی میزان کو ظاہر کرتی ہے اور اس میں ہندوستان سے مزید مشرق کے علاقوں سے آئے ہوئے سامانوں کا بیشتر حصہ شامل ہے۔

---

[1] ان فہرستوں کو STATE PAPERS, FOREIGN PORTUGAL" VOL. 3, NOS 7 کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اور یہ CALENDERS. P. 1513 - 1616ء میں نمبران 309 اور 327 پر درج ہیں۔ میں ان کے نقول کے لیے مس ای سیلیبری کا ممنون ہوں۔

ان سامانوں کو جو بظاہر غیر ملک کے معلوم ہوتے ہیں خارج کرنے کے بعد ہندوستان کی تجارتی اشیا کو اس طور پر ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

اشیاء	اکائی	1602ء	1603ء	امکانی مقام حصول
سیاہ مرچ	کونیٹل	7598	21,349	ساحل مالا بار
ادرک *	"	؟	—	
الائچی	"	82	—	جنوبی ہندوستان
نیل	"	$17\frac{1}{2}$	809	گجرات یا آگرہ
عقیق	"	27	—	گجرات
آبنوس	"	255	—	غالباً جنوبی ہندوستان
کیلیکوز	پیٹیاں اور گانٹھیں	کل	کل	اغلباً پوربی افریقہ ہندوستان کے جملہ سواحل لامعلوم:
جواہرات		؟	؟	غالباً کچھ ہیرے اور موتی ہندوستان سے۔

ان اعداد سے تخمینی طور پر یہ بھی اندازہ کرنا کہ ان میں سوتی سامان کا کیا تناسب تھا انتہائی دشوار طلب کام ہے۔ 1602ء کی فہرست میں ان سامانوں کو علیحدہ سے "کیلیکوز" کے نام کے تحت دکھایا گیا ہے۔ لیکن گٹھروں اور پیٹیوں کی جسامت کو متعین کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں اور یہ صرف قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس مال کا بیشتر حصہ برازیل یا پچھمی افریقہ کے لیے موٹے کپڑوں کا رہا ہوگا اور باوجودیکہ پیٹیوں کے سامنے کیلیکوز درج ہے لیکن ان میں غالباً زیادہ قیمتی سامان مثلاً پرتگیزیوں کے استعمال یا خوردہ فروشی کے لیے تن زیب یا رنگین کپڑے رہے ہوں گے۔[لہ] 1603ء کی

---

* 1602ء میں لائی ہوئی 1277 کونیٹل ادرک کے متعلق یہ تعین نہیں کیا جا سکتا کہ یہ کہاں سے حاصل کی گئی تھی۔ یورپی منڈیاں بمقابلہ ہندوستان کے چین کی ادرک کو ترجیح دیتی تھیں اور اگر سب نہیں تو غالباً اس کا کچھ حصہ چین کا تھا۔

لہ ایسا سوچا جا سکتا ہے کہ پرتگیزیوں کے کاروبار میں استعمال ہونے والی گانٹھیں مختلف جسامتوں کی ہوا کرتی تھیں لیکن وہ فی الجملہ ولندیزیوں اور انگریزوں کے بعد کی معیاری گانٹھوں سے چھوٹی بلکہ غالباً بہت چھوٹی تھیں۔ LINSCHOTEN (C.92) کے بیان کے مطابق بڑے وزن کے (باقی صفحہ 125 پر

فہرست اس لحاظ سے مایوس کن ہے۔کیونکہ پیٹیوں کی زیادہ اور گٹھروں کی بہت زیادہ تعداد کو یکجائی طور پر "کیلیکو کپڑا، موٹے کپڑے، ریشمی سامان وغیرہ" کے ذیل میں درج کیا گیا ہے۔ اگر ہم ان اعداد کو صحیح تصور کرلیں تو ان سب کا ایک غیر مفید حصہ مشرقِ ابعد کے ریشمی سامانوں یا پیٹیوں یا گٹھروں میں بند ہوئے متفرق سامانوں پر مشتمل رہا ہوگا۔ ان غیر واضح امور کو مدنظر رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان دنوں لزبن، ہندوستان سے کثیر مقدار میں سیاہ مرچیں جن کا بیشتر حصہ شمال کی طرف بھیج دیا جاتا تھا، زیادہ مقدار میں سوتی سامان جن کا بیشتر حصہ شمال کی طرف بھیج دیا جاتا تھا، زیادہ مقدار میں سوتی سامان جن کا بیشتر حصہ غالباً افریقہ اور جنوبی امریکہ میں مطلوب موٹا کپڑا ہوا کرتا تھا اور تھوڑی مقدار میں نیل عقیق، الائچی اور غالباً آبنوس، ادرک اور تھوڑے سے موتی اور ہیرے بھی حاصل کیا کرتا تھا۔

زیر مطالعہ دور میں بھی یورپ کے تجارتی کاروبار کی ایک بڑی مقدار پرتگیزیوں کے قبضہ سے ولندیزیوں اور انگریزوں کو منتقل ہوئی۔ لیکن ایک مد کو چھوڑ کر قبضہ کی یہ تبدیلی ہندوستان کے مفاد پر اثر انداز نہ ہوئی۔ یہ مد مالابار سے سیاہ مرچ کی برآمدی تجارت کی تھی۔ سولھویں صدی میں لزبن لائی جانے والی کل سیاہ مرچ اسی خطہ کی پیداوار ہوتی تھی جسے کوچین کے بندر پر یا مختلف مقامی حکاموں کے تعاون سے پرتگیزی اسی بندر کے قریبی لنگرگاہوں پر جہازوں میں لادا کرتے تھے۔ ساترا جاوا اور مشرقِ ابعد کے دیگر علاقوں میں پیدا ہونے والی سیاہ مرچ کا کاروبار پرتگیزیوں کی سرکاری اجارہ داری کے گماشتے خود نہ کیا کرتے تھے لیکن جب تک جہاز پر باربرداری کا کام تنہا پرتگیزیوں کے قبضہ میں رہا ان کی لاعلمی میں انھیں بھی یورپ لانا ممکن نہ تھا۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔ ولندیزی اور انگریز سیاہ مرچ بیشتر جاوا اور ساترا سے لاتے تھے۔ مالابار کی منڈیوں میں داخل ہونے کی

(بقیہ ص۱۲۴) جن کے جہازوں کی لدائی کے طریقہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ 'بارسل'، کہہ سکتے ہیں DE VALLE (p. 60) نے بحیثیت ایک پرتگیزی کے ولندیزیوں اور انگریزوں کی گانٹھوں کی کلانی پر تنقید کرتے ہوئے انھیں "روئی گاڑی کی جسامت کے برابر" قرار دیا ہے۔ لہٰذا بڑے وزن کے جنگی جہازوں پر جو گانٹھیں لادی جاتی تھیں ان کو ان گانٹھوں پر محمول نہ کرنا چاہیے جن پر ضمیمہ د میں بحث آئی ہے۔ بلکہ ان کی صحیح جسامت تخمینہ پر مبنی ہے۔

۵ ولندیزیوں کے پہلے سمندری سفر کے 'جرنل'، (HOUTMAN I - 105) میں ایک عجیب و غریب قصہ اس طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ ان دنوں پرتگیزیوں نے جاوا کی سیاہ مرچ کی (بقیہ ص۱۲۶ پر)

ابتدائی کوششیں ناکام رہیں لیکن ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے پرتگیزی وہاں سے جو برآمدات کیا کرتے اس میں مزاحمت پیدا ہوئی۔ اس طور پر ہندوستان کی بھی یورپ کے ساتھ تجارت کچھ عرصہ کے لیے جزوی طور پر ختم ہوگئی۔ چونکہ سیاہ مرچ بوئے جانے کے تین یا چار برس بعد تیار ہوتی ہے۔ لہٰذا اس ترتیب کو بہ عجلت درست کیا جا سکتا تھا۔ جاوا اور سماترا کی پیداوار زیادہ مانگ کی وجہ سے بڑھی اور غالباً ہندوستانی پیداوار میں اسی نسبت سے کمی ہوئی۔ لیکن کوئی تحریر جس میں اس کا تذکرہ قدرتی طور پر ہونا چاہیے تھا نہیں ملتی۔

مالابار سے برآمد کی عارضی کمی اس وجہ سے نہ تھی کہ ولندیزی اور انگریز یہاں کی پیداوار کا کاروبار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ولندیزیوں کی کالی کٹ میں تجارت شروع کرنے میں ناکامی کا پہلے ذکر آچکا ہے اور یہ امر قابل توجہ ہے کہ کالی کٹ میں ناکام ہو جانے کے بعد انھوں نے پوربی ساحل سے مالابار کی سیاہ مرچ برآمد کرنے کی کوشش کی لیکن زیادہ خرچ کی وجہ سے یہ کام آگے نہ بڑھ سکا۔ اس طور پر انگریزوں نے کالی کٹ میں اپنی ابتدائی ناکامی کے بعد یورپ کے لیے سیاہ مرچ فراہم کرنے کی غرض سے سورت میں اپنی منڈی قائم کرنے کی جدوجہد کی لیکن اس میں بے حد دقتیں محسوس ہوئیں اور اخراجات بمقابلہ بنتم کے جسے 30ء1ء میں انگلستان کے لیے سیاہ مرچ فراہم کرنے کے لیے خصوصی مرکز کے طور پر منتخب کیا گیا تھا دوگنے تھے۔ بہرحال اس کے پانچ برس بعد پرتگیزیوں سے خوشگوار تعلقات قائم ہو جانے کی وجہ سے گوا میں مال کا ایک بڑا ذخیرہ خریدا گیا اور مالابار کی تجارت تک بتدریج رسائی حاصل کی گئی۔ ۱۶۴۰ء اور اس کے بعد سے ولندیزیوں اور نیز انگریزوں کے مالابار کے ساحل اور کونکن کے بندروں پر خریداری کی اطلاعات ملتی ہیں۔ زیر مطالعہ عہد کے ختم ہوتے ہوتے کالی کٹ میں ایک انگریزی تجارتی کوٹھی قائم کر لی گئی تھی اور

(بقیہ ص۱۲۵) خریداری کا ارادہ کیا تھا لیکن چین کے بادشاہ نے ان کو روپیہ پیسہ دے کر اس تجارت کو اپنی رعایا کے لیے محفوظ کر لیا۔ 'جرنل' کے مولفین اس قصہ کو ایک مذاق تصور کرتے ہیں۔ لیکن اس میں کچھ اصلیت معلوم ہوتی ہے۔ مکاؤ کے پرتگیزی باشندوں اور چینی حکام کے درمیان کبھی کبھی مناقشہ رہا کرتا تھا اور بہت ممکن ہے کہ جاوا کی سیاہ مرچ کو بہ سمت مغرب منتقل کر کے یہاں اس کی فراہمی کے سلسلہ کو منقطع کر دینے کی دھمکی کو کیپٹن کے ساتھ گفت و شنید میں ایک سیاسی حربہ کے طور پر استعمال کیا گیا ہو۔ مگر امر مسلم صرف اس قدر ہے کہ ولندیزیوں کے جاوا پہنچنے کے قبل تک اس جزیرہ کی پیداوار خاص طور پر چین جایا کرتی تھی۔

اس کے چند برسوں بعد ولندیزیوں نے کوچین پر قبضہ حاصل کر لیا جن کے باعث تجارت میں ترقی کے امکانات پھر بہتر ہو گئے لیکن ان میں ذرا شبہ نہیں کہ ہندوستانی پیدا کرنے والے فراہمی مال کے متبادل ذرائع کے وجود میں آجانے کی وجہ سے کچھ دنوں خسارہ میں رہے۔ ملک کی آمدنی کے اس عارضی خسارہ کے بالمقابل نیل، شورہ، کیلیکو اور دیگر سامانوں کی تجارت سے پہنچنے والے نفع کو جن کا بیان اس باب کی بقیہ فصلوں میں آئے گا پیش کیا جا سکتا ہے۔

فصل ۲۔ پچھمی یورپ کو برآمدی تجارت کی مقدار

پچھمی یورپ کو نئی برآمدی تجارت کی مقدار کا صحیح تخمینہ لگانا کوئی آسان کام نہیں جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔ اس تجارت میں انگریزوں کے حصہ کی مقدار کے متعلق گاہے گاہے غیر قطعیت پائی جاتی ہے لیکن خاص دقت جہازوں پر باربرداری کے اس تعلق سے جو ولندیزیوں نے اختیار کیا تھا اور نیز اس کی تفصیلات کو جس شکل میں تحریروں میں پیش کیا گیا ہے ان سے پیدا ہوتی ہے۔ اجمالی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ولندیزی اپنی تجارت کو ایک مقام پر مرتکز رکھنے کو ترجیح دیتے تھے اور ہندوستان کی دونوں سمتوں اور نیز جزیروں چین اور جاپان سے سامان لاکر پہلے بٹاویا میں جمع کر لیا کرتے تھے اور پھر وہاں سے سال میں ایک بار انھیں جہازی بیڑوں کے ذریعہ یورپ بھیجا کرتے تھے۔ زیر مطالعہ دور میں ان جہازی بیڑوں کے ذریعہ بھیجے ہوئے سامانوں کو 'بٹاویا جرنل' میں بالعموم درج نہیں کیا جاتا ہے اور سوائے اس کے کہ ان جہازوں پر لادے ہوئے سامانوں کی تفصیلات ایسی تحریروں میں جواب تک غیر مطبوعہ ہیں محفوظ ہوں، کسی اور طور پر یہ حساب لگانا کہ ان میں ہندوستانی سامانوں کی مقدار یا مالیت کیا تھی، ممکن نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مذکورہ 'جرنلو' میں ہندوستان سے بٹاویا بھیجے جانے والے بیشتر سامان درج کیے گئے ہیں۔ اور ان اندراجات سے نیل یا شورہ کے قسم کی اشیاء کی جو صرف یورپ کو برآمد کی جاتی تھیں تخمینی مقدار کو معلوم کیا جا سکتا ہے لیکن سوتی سامان کی مقدار کے تعین میں ہمیں اس طریق کار سے کامیابی نہیں ہوتی کیونکہ یورپ کے لیے مخصوص گانٹھوں اور نسبتاً ان سے زیادہ بڑی مقدار میں اُن سامانوں کے درمیان جو ایشیائی تجارت کے لیے برآمد کیے گئے امتیاز قائم کرنا ناممکن ہے۔ مثلاً نومبر 1642ء میں مسولی پٹم سے بٹاویا بھیجے گئے ایک جہاز پر 597 گانٹھیں سوتی سامان کی۔ 297 گانٹھیں نیل کی۔

498 گانٹھیں کچے اور 530 بورے صاف کیے ہوئے شورے کی مع تھوڑے سے سوت، گیہوں، لوہے اور بارود کے بار کیے گئے تھے۔ آخری تینوں اشیأ واضح طور پر بٹاویا یا ایشیا کے دیگر مقامات کے لیے مخصوص تھیں۔ سوت کی منزل مقصود مشتبہ ہے لیکن اس کے اقسام کو بیان کرنے کے سلسلہ میں جو الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ان کے دیکھنے سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ سوت کو بٹاویا کی گودی پر استعمال کرنے کی غرض سے لایا گیا تھا۔ نیل اور شورہ تو قطعاً یورپ کے لیے مخصوص تھے لیکن جہاں تک سوتی سامانوں کا تعلق ہے ان کی اس قدر بڑی مقدار کی منزل مقصود کے متعلق صرف قیاس آرائی ہی کی جاسکتی ہے۔ اس طور پر تجارت کی مجموعی میزان کا تو نہیں لیکن بعض مخصوص سامانوں کی برآمدی مقدار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک اور پیچیدگی یہ تھی کہ ہرچند کہ بٹاویا میں تجارتی سامانوں کو اکٹھا کرنے کا طریقہ معمولات میں داخل تھا مگر پھر بھی اس طریقہ کو اختیار نہ کرتے ہوئے کبھی کبھی ولندیزی جہاز ہندوستان کی دونوں سمتوں میں سامان لادکر براہ راست یورپ کے لیے روانہ ہوجاتے اور ایسی صورت میں یہ 'بٹاویا جنرل' میں درج نہ ہوا کرتے تھے۔ 1615 اور اس کے بعد سے وقفہ وقفہ پر کورومنڈل کے ساحلوں سے اور تقریباً 1623ء سے سورت سے جہازوں کی براہ راست روانگی کی اطلاعات ملتی ہیں[1]۔ 1620 میں کمپنی نے سورت سے جہازوں کی براہ راست روانگی کی اجازت دی اور 1626 میں کورومنڈل کے بندروں پر اس طریقہ کو منع کردیا گیا۔ اس کے دو برس بعد اس ممانعت کو عارضی طور پر سورت میں نافذ کیا گیا۔ بعد میں سورت سے جہازوں کی براہ راست روانگی دوبارہ شروع ہوئی۔ لیکن مجھے ان پر بار کیے ہوئے سامانوں کی مقدار کے مکمل اندراجات دستیاب نہ ہوسکے۔ لہذا براہ بٹاویا یورپ بھیجے جانے والے سامانوں کا صحیح حساب لگانے پر بھی مجموعی تجارت میں سامانوں کی اس غیر مندرج مقدار کی کمی کا امکان رہ جاتا ہے جو یورپ براہ راست بھیج دی جاتی تھی۔ ان امور کے پیش نظر مناسب ہوگا کہ ہم اس مسئلہ کو انگریزی تجارت کے حوالہ سے جس میں اس قدر سنگین پیچیدگیاں نہیں پائی جاتیں حل کرنے کی کوشش کریں۔ انگریزوں نے اپنے سامانوں کو مشرقی ساحل سے

---

[1] میں نے ضمیمہ ب میں ولندیزی تحریروں میں مندرج اصل بیجکوں سے اخذ کرکے ہندوستان سے بالکل شروع شروع میں یورپ کو بذریعہ جہازوں کے برآمد کیے ہوئے کچھ سامانوں کے خلاصے درج کیے ہیں۔

براہ راست برآمد کرنے کا سلسلہ زیرِ مطالعہ دور میں دیر سے شروع کیا[1] اور 1648ء تک ہم سورت سے مرسلہ سامانوں کو انگریزی تجارت کی تخمینی میزان تصور کر سکتے ہیں۔ حالانکہ ہو سکتا ہے کہ اس اثنا میں کسی نہ کسی سبب سے کچھ مخصوص سامان کورومنڈل سے براہ بٹاویا بھی روانہ کیے گئے ہوں۔

انگریزی تجارت کے سلسلہ میں یاد رکھنا چاہیے کہ لندن پہنچنے والے سامانوں کا زیادہ حصہ یورپی منڈیوں کو دوبارہ برآمد کر دیا جاتا تھا۔ موجودہ معیار سے اُس وقت انگلستان کی آبادی اس وقت سے بہت کم تھی جس کے نتیجہ میں اندرون ملک ان سامانوں کی کھپت بھی محدود تھی لیکن پڑوسی ممالک خصوصاً فرانس جہاں آبادی نسبتاً زیادہ تھی، اپنی ضروریات کے لیے لندن پر بھروسہ کیا کرتے اور جیساکہ آگے ذکر آئے گا خاص طور پر 'کیلیکو' کے سلسلہ میں فرانس کی مانگ لندن کے ہندوستان سے فرمائشی سامانوں کی نوعیت پر کافی حد تک اثر انداز ہوتی تھی۔ لہٰذا جب ہم انگریزی تجارت کا ذکر کرتے ہیں تو یہ تصور کرنا چاہیے کہ اس کا ایک بڑا حصہ ان سامانوں پر مشتمل ہوگا جو پورے مغربی یورپ میں صرف ہوتا تھا۔

انگریزوں کی سورت سے برآمدی تجارت مختلف ادوار سے گذری۔ 1620ء تک نیل اور متفرق سامان برآمد کیے جاتے رہے۔ اگلی دہائی میں کیلیکو کی تجارت میں حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ترقی ہوئی۔ 1630ء سے 1637ء کے دوران مرسلہ سامانوں پر بڑے قحط کے آثار دیکھے جا سکتے تھے۔ لیکن 1638ء سے تقریباً 1653ء تک برآمدات کی مقدار اضافہ پذیر تو نہیں پھر بھی اچھی خاصی رہی۔ کیلیکو، نیل اور سوت خاص برآمدی اشیا تھیں۔ لیکن شورہ، سیاہ مرچ، تنکر، ادرک، لاکھ اور کچھ دوسری چیزوں کے بھی تذکرے ملتے ہیں۔ 1653ء کے بعد سے انگریزی کمپنی کی تجارت تھوڑے عرصہ کے لیے تقریباً ختم ہوگئی۔ اس اثنا میں نجی جہازوں کے لیے تجارت کے دروازے کھل چکے تھے اور ان کے ذریعہ لے جائے جانے والے سامانوں کی مقدار کا تخمینہ لگانا بظاہر ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ بالآخر 1657ء اور اس کے بعد کے برسوں میں لندن سے نئے سرمایہ کی فراہمی کے نتیجہ میں کمپنی کی سرگرمیوں میں معتدبہ اضافہ ظاہر ہوا۔ زیرِ مطالعہ عہد کی آخری دہائی میں مشرقی اور پچھمی

---

[1] بونیٹو نامی جہاز 1649ء میں روانہ ہوا۔ یہ مدراس سے "بظاہر براہ راست وطن جانے والا پہلا جہاز تھا۔ (ENGLISH FACTORIES VIII, P XXX) مدراس بندر کے قائم ہونے کے قبل مشرقی ساحل سے جہازوں کی براہ راست روانگی کی تجاویز تھیں لیکن اس منصوبہ کے نفاذ کے متعلق مجھے کوئی اطلاع نہ مل سکی۔

ساحلوں کی اضافی اہمیت میں ایک تیز رفتار تبدیلی رونما ہوئی ۔ بنگال میں تجارت کے قیام کی ابتدا، اس امر کا انکشاف کہ بمقابلہ گجراتی کیلیکو کے مدراسی کیلیکو یورپی منڈیوں کے لیے زیادہ موزوں تھے، نیل کی تجارت کا زوال جس کے لیے سورت خصوصی بندر تھا اور گجرات کے نظم و نسق کی خرابیاں، یہ وہ اسباب تھے جن کی بنیاد پر مشرقی ساحل کو نمایاں حیثیت حاصل ہوئی اور یہ صورت حال کافی عرصہ تک قائم رہی ۔ انگریزی تجارت کے پہلے دور کو "رائل اینے"* نامی جہاز کے بیجک میں مندرج ۱۹-1618ء کے موسم تجارت کی برآمد سے واضح کیا جا سکتا ہے ۔ یہ جہاز 720,000 محمودی (روپیہ 288,000) کی مالیت کے حسب ذیل سامانوں کو لاد کر فروری میں روانہ ہوا تھا۔[ل]

نیل : سرکھیج	351,600 محمودی	محمودی
بیانہ	278,700 محمودی	630,300
کیلیکو		77,000
سوت کے نفیس سامان اور نمونے		7,600
گوند کی لاکھ		3,000
مہر لگانے کی موم		200
ہلدی		150
جواہرات اور متفرق سامان		1,750
		720,000

ان کے علاوہ غیر معینہ قیمت کی تھوڑی نیل کی گرد اور تھوڑا پرتگیزیوں سے چھینا ہوا دیسی سامان بھی تھا۔

مندرجہ بالا اعداد سے واضح ہوتا ہے کہ نیل کی قیمت کل کا 7/8 حصہ اور اس کی مقدار کا وزن

---

* ROYAL ANNE

ل متن میں مندرج اعداد ENGLISH FACTORIES, i.61 میں مطبوعہ بیجکوں سے جمع کیے گئے ہیں ۔ یہاں اور دیگر مقامات پر بھی میں نے ان اعداد کو جو اصل میں پیسوں کے کسر میں ظاہر کیے گئے ہیں پورے ہندسوں میں لکھا ہے ۔ ان دنوں محمودی کی قیمت پورے روپیہ کے 2/5 کے مساوی تھی ۔ ہندوستانی تجارت پر جنتری کے سالوں کے بجائے کاروباری موسم کے اعتبار سے غور کرنا مناسب ہوگا کیونکہ یہ تجارت حقیقت میں موسمی ہوا کرتی تھی ۔ سورت سے پورے سال کا برآمدی سامان حالات کے لحاظ سے دسمبر یا جنوری میں روانہ کیا جاتا تھا ۔ ENGLISH FACTORIES, III, P.XXXIV &

(باقی ص131 پر)

300 ٹن سے زاید تھا[۱]۔ نیل کی مانگ اس دور کی انگریزی تجارت کی نمایاں خصوصیت تھی اور ولندیزی تاجر بھی اس معاملہ میں انگریزوں کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ کیونکہ انھوں نے پہلے ہی سے مشرقی ساحل پر نیل کی زیادہ خریداری شروع کر دی تھی اور 1622ء میں انھوں نے سورت سے جو سامان بٹا دیا بھیجا اس کا بیشتر حصہ نیل تھا۔ یہ امران کے گورنر جنرل کی ناراضگی کا سبب ہوا کیونکہ وہ اس وقت مشرق بعید کی مسالہ کی تجارت کے مفاد میں سوتی سامانوں کا زیادہ خواہش مند تھا۔ 19-1618ء کے کاروباری موسم میں کوئی دوسرا انگریزی جہاز نہ بھیجا گیا اور 20-1619ء میں پھر صرف ایک ہی جہاز اسی نوعیت کا سامان لے کر روانہ ہوا جس کی مالیت 560000 محمودی یا ½2 لاکھ روپیہ تھی۔ لہذا ½2 لاکھ روپیہ کو ہم اس دور کی انگریزی تجارت کا تخمینی معیار قرار دے سکتے ہیں۔

مگر نیل کی اہمیت زیادہ عرصہ تک برقرار نہ رہ سکی۔ یہ بات جلد ہی معلوم کر لی گئی کہ مغربی یورپ میں 'کیلیکوز' کی زیادہ مانگ ہے اور اگلی دہائی کے وسط تک ان کی حیثیت نیل کے پہلو بہ پہلو اس وقت کی تجارت کے دو اہم ستونوں میں سے ایک کی ہوگی۔ اس دہائی کے تجارتی سامانوں کے بیجک اب بظاہر موجود نہیں ہیں لیکن 1625ء میں سورت کے تاجر تقریباً 500000 محمودی (2 لاکھ روپیہ) یعنی 'رایل آین' نامی جہاز کے سامانوں کی دوگنی مالیت کے ہندوستانی سامانوں کی فراہمی کا انتظام کر رہے تھے۔ اس فہرست کی نمایاں ترین خصوصیت اس میں کیلیکو کے 200000 تھانوں کے اندراج کی ہے جو چھ سال قبل کی فراہم شدہ مقدار کا تقریباً 15 گنا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی خاص باتیں ہیں کہ ان میں شورہ کے اندراج اور سیاہ مرچ حاصل کرنے کی کوشش کا پتہ چلتا ہے جس کا حوالہ پہلے گزر چکا ہے۔ اس نسبتاً زیادہ بڑے پیمانہ کے کاروبار کو

(بقیہ ص 130)

VII, p. XIX) میں مندرج جہاز کی روانگیوں کی فہرست کے جنتری کے برسوں کے مطابق ہونے کے باعث تجارت جس قدر بے ترتیب معلوم ہوتی ہے واقعتاً اس قدر تھی نہیں۔ چنانچہ اس فہرست میں 1639 میں تین اور 1640 میں دو جہاز درج ہیں اور 1641 میں ایک بھی جہاز نہیں ملتا۔ حالانکہ حقیقتاً 39-1638 میں 40-1639 میں دو اور 41-1640ء میں ایک جہاز روانہ ہوئے تھے۔

۱ نیل کی چار کھیپوں میں سے تین کے وزن اور چوتھے کے بنڈلوں کی صرف تعداد درج ہے۔ میں نے ان کے وزن کا حساب اس مفروضہ پر لگایا ہے کہ ان کی قیمت ادا کردہ فی من تقریباً وہی رہی ہوگی جو دیے ہوئے وزن کے مماثل کھیپوں کی تھی۔

قایم رکھتے ہوئے 28-1627ء کے کاروباری موسم میں اس کی مزید توسیع کی گئی۔ اس وقت
چار جہازوں پر 160،000 پونڈ مالیت کے سامان بھیجے گئے اور اس میں کیلیکو کی مقدار بمقابلہ
پچھلے برسوں کے زیادہ تھی اور 29 - 1628ء میں روانہ کیے جانے والے چھ جہازوں پر سامانوں
کی مالیت 154،500 پونڈ رہی۔ ان دو کاروباری موسموں کے اعداد میں فارس سے بذریعہ
جہاز بھیجے گئے ریشم اور چند دیگر دوبارہ برآمد کیے ہوئے سامانوں کی قیمتیں بھی شامل ہیں۔ لہٰذا
ان اعداد کو ہندوستانی تجارت کا معیار تصور کرنا درست نہ ہوگا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم یہ
کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اس دہائی کے دوران تجارت کا معیار چھ لاکھ روپیہ کی مالیت
پر پہنچ گیا تھا۔

برآمدی تجارت کا یہ دور 1630ء کے قحط کی وجہ سے دفعتہً ختم ہو گیا اور اس بدنظمی کی
مدت میں جو اس کے بعد گجرات میں رونما ہوئی، جہازوں کے لیے ہندوستان کے دیگر حصوں میں بھی
خریداریاں کر کے بدقت سامان فراہم کیے جا سکے۔ پھر گجرات کے معاشی حالات تقریباً 1637ء
تک معمول پر آسکے۔ اور اس کے بعد آنے والے برسوں کی تجارت کی عام روش کو تین مسلسل کاروباری
موسم میں جہازوں سے بھیجے گئے سامانوں کے بیجکوں سے جو انڈیا آفس کی تحریروں میں محفوظ ہیں سمجھا
جاسکتا ہے۔[1] ان دستاویزات کا خلاصہ جو بے حد طویل ہیں ذیل میں پیش کیا جاتا ہے :-

سورت سے جہاز پر لندن بھیجے گئے سامانوں کی مالیت محمودیوں میں۔

	1638ء — 39 رائل میری اور سوان	1639ء - 40 ڈسکوری	1640ء - 41 کرسپین
جہازی بار کی مجموعی مالیت	1,405,200	816,200	1,189,100
منجملہ جس کے ہندوستانی سامان	959,500	398,300	419,000

[1] یہ بیجک انڈیا آفس کے (ORIGINAL CORRESPONDENCE) نمبران 1656، 1723 اور 1761 کے ساتھ منسلک نہیں ہیں۔ میں مس ال۔ ایم۔ انیسٹی - (MISC. M. L. ANS-TEY) کا ان کی نقل کے لیے شکر گزار ہوں۔ متن میں اعداد کو پورے ہندسوں میں لکھا گیا ہے۔

	رائل میری اور سوان 1638 ـــ 39ء	ڈسکوری 1639 ـ 40ء	کرسپین 1640 ـ 41ء
مجملہ دوبارہ برآمدات	445,700	417,900	770,100
ہندوستانی سامانوں کی تفصیل			
سوتی سامان	412,400	198,300	205,200
سوت	53,800	20,200	2,100
نیل	362,300	118,900	206,200
شورہ	17,000	5,500	—
سیاہ مرچ	101,200	—	—
شکر	8,000	46,700	—
ادرک	3,300	8,700	—
متفرقات	1,500	—	5,500
دوبارہ برآمدات کی تفصیل:			
فارس کا ریشم	409,900	417,900	728,200
بنتم کی شکر	3100	—	—
بنتم کی سیاہ مرچ	—	—	39,900
عود، مُر+، وغیرہ	2,700	—	2,000
غیر فروخت شدہ انگریزی سامان جو واپس ہوا۔	30,000	— —	—

1638 ـ 39ء کے کاروباری موسم کے جملہ برآمدات 'رائل میری' اور 'سوان' نامی جہازوں پر بھیجے گئے اور 41-1640ء میں کرسپین نام کا واحد جہاز روانہ ہوا لیکن ان برسوں کے درمیانی موسم میں 'ڈسکوری' کے علاوہ 'لندن' نامی جہاز بھی گیا تھا۔ لندن جہاز کا بیچک

MYRRH +

اب موجود نہیں ہے اور نہ ہی اس پر بار کیے ہوئے سامانوں کی مالیت کے اعداد واضح ہیں لیکن ان کو تقریباً 368,000 محمودی پڑھا گیا ہے اس میں شامل فارس کے ریشم کی مقدار مایوس کن حد تک کم ہے اور 'ڈسکوری' پر بار کیے ہوئے ہندوستانی سامانوں میں قیاساً 250,000 محمودی کا اضافہ کرنے کے بعد اس کاروباری موسم میں ہندوستانی برآمد کی مالیت 650,000 محمودی آتی ہے۔
اس طور پر ہم ان کاروباری موسموں میں تجارت کی مالیت کو $3\frac{3}{4}$، $2\frac{1}{2}$ اور $1\frac{3}{4}$ لاکھ روپیہ قرار دے سکتے ہیں۔ بیجک کی تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ 39-1638 میں سامان غیر معمولی طور پر گراں خریدے گئے تھے اور ان برسوں کا معیار $2\frac{1}{2}$ سے 3 لاکھ روپیہ تک یعنی قحط کے قبل نصف سے زائد نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔ تجارتی سامانوں کی یہ تخفیف شدہ مقدار ایک زیادہ پھیلے ہوئے علاقہ سے حاصل کی گئی تھی۔ گجرات کی معاشی زندگی بحال ہو چکی تھی لیکن قحط نے آبادی اور اس کی فنی صلاحیتوں کو گھٹا دیا تھا اور باوجودیکہ کپڑے کی بنائی کی مقامی دستکاری سنبھل رہی تھی لیکن یورپ کے لیے خریدے ہوئے کیلیکو کا بہت بڑا حصہ سندھ اور اتری ہندوستان کا تیار شدہ مال تھا۔
اگلے سولہ برسوں کے دوران مجھے سورت سے کمپنی کی برآمدات میں کسی خاص اضافہ کا پتہ نہ چل سکا۔ 43-1642 - 44-1643ء کے کاروباری موسموں میں یہاں سے مجموعی برآمدات کی مالیت علی الترتیب تقریباً 1,200000 اور 920,000 محمودی تھی اور 48-1647ء میں 1,100,000 محمودی۔ 49-1648ء میں بھی تقریباً اسی قدر مالیت کی اطلاع ہے مگر اب چونکہ فارس کے ریشم کی مقدار کم ہو گئی تھی لہذا ممکن ہے کہ ان اعداد میں بمقابلہ 40-1638ء کے ہندوستان کے مجموعی سامان کا حصہ نسبتاً زیادہ رہا ہو لیکن کاروبار کی یہ سطح قائم نہ رہ سکی۔ کیونکہ اس کے بعد کے کاروباری موسموں سے لے کر 53-1652 تک کی مالیت علی الترتیب صرف 574,000، 530,000، 740,000 اور 57000 محمودی تھی اور ان میں دوبارہ برآمدات کا بظاہر کوئی خاص تناسب نہ تھا۔ 54-1653ء سے 58-1657ء تک کمپنی کی تجارت کی مالیت بہت کم ہو گئی تھی۔ اور نجی جہازوں کے اعداد دستیاب نہ ہو سکے۔ لیکن ہم ایسا سوچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ مجموعی برآمدات میں اضافہ ہوا کیونکہ خریداروں کے کاروباری مقابلہ کی وجہ سے ہندوستانی منڈیوں میں عارضی طور پر بدنظمی پیدا ہو گئی تھی۔ 1658ء میں جب کمپنی کے لیے بالآخر کافی سرمایہ جمع ہو گیا اور اس کی اجارہ داری کی تجدید ہو گئی تو یہ حالات ختم ہوئے۔ زیر مطالعہ

عہد کے آخر میں تین کاروباری موسموں کے دوران کمپنی کے برآمدات کی مالیت علی الترتیب تقریباً 150,000، 1,05,000 اور 450,000 محمودی تھی اور چونکہ اب بھی دوبارہ برآمدات کی مقدار نسبتاً کم تھی لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت تک 40 - 1638ء کے معیار میں اچھا خاصہ اضافہ ہوچکا تھا لیکن پھر بھی 1630ء کے قحط کے قبل کے برسوں کا معیار مکمل طور پر بحال نہ ہوسکا۔

کورٹینس* اسوسیشن کے 1635ء اور 1647ء کی درمیانی مدت کے برآمدات کا ذکر کیے بغیر بھی ساحل پر انگریزی تجارت کا جائزہ نامکمل رہے گا۔ لیکن اسوسیشن کے برآمدات کی وجہ سے ان برسوں کے اعداد میں زیادہ اضافہ نہ ہوسکا۔ کیوں کہ اول تو اس کے سمندری سفر نسبتاً کم کامیاب ہوسکے اور دوسرے ان کا انگلستان بھیجے گئے سامانوں کا زیادہ حصہ ہندوستان کے باہر سے حاصل کیا ہوا تھا۔ اس کے ہندوستانی برآمدات خاص طور پر سیاہ مرچ اور شورہ پر مشتمل تھے جن سے مالیت میں نہیں لیکن سامان کے وزن میں زیادہ اضافہ ہوا۔

پوربی ساحل اور خلیج بنگال سے یورپ کو انگریزی برآمدات کی اہمیت 1649ء کے بعد شروع ہوتی ہے۔ 50 - 1649ء اور اس کے بعد تین کاروباری موسموں کی مالیت کو 50,000، 96,000، 85,000 اور 1,30,000 روپے یعنی ایک لاکھ روپیہ سالانہ کے معیار پر قرار دیا جاسکتا ہے جس میں دوبارہ برآمدات کا تناسب بہت تھوڑا تھا۔ 1654ء سے 1657ء تک جب کہ تجارت عملی طور پر کھلی ہوئی تھی کوئی تخمینہ نہیں لگایا جاسکتا۔ مگر اس میں ذرا شک نہیں کہ برآمدات میں خاصہ اضافہ ہوا کیونکہ اس مدّت کے دوران انفرادی تاجروں کی سرگرمیاں ہندوستان کے اس سمت کو مرکوز رہیں۔ زیرِ مطالعہ عہد کے باقی چند برسوں کی تجارت کے مکمل اعداد مجھے نہ حاصل ہوسکے لیکن اس اثنا میں کمپنی کی تجارت میں زیادہ اضافہ ہوا۔ 1658ء میں فرمائشی سامانوں کی مالیت 35,000 پونڈ یا تقریباً تین لاکھ روپیہ تھی اور اس کے بعد کے کاروباری موسم کے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس معیار کو برقرار رکھا گیا حالانکہ مجموعی راس المال کے اندراجات نہیں ملتے۔ اس طور پر جو مختلف تخمینے موجود ہیں ان کو یکجا کرنے کے بعد انگریزی جہازوں کے ذریعہ یورپ کو برآمد کیے گئے ہندوستانی سامانوں کی جو مجموعی مالیت آتی ہے انھیں ذیل کے گوشوارہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ تخمینے بالکل صحیح نہیں ہیں اور ان سے زیرِ مطالعہ عہد کی مدّت میں جو تجارت وجود میں آئی اس کی مقدار کو محض انتہائی عمومی انداز میں ظاہر کرنا مقصود ہے۔

* COURTEEN'S ASSOCIATION

انگریزی جہازوں کے ذریعہ ہندوستان سے یورپ کو سالانہ برآمدات

(مالیت لاکھ روپیہ میں)

مدت	پچھمی ساحل سے	پوربی ساحل اور بنگال سے	میزان
تقریباً 1620ء	$2\frac{1}{2}$	—	$2\frac{1}{2}$
1628ء 〃	6	—	6
1640ء 〃	$3 - 2\frac{1}{2}$	—	$3 - 2\frac{1}{2}$
1643-49ء 〃	$3\frac{1}{2}$	—	$3\frac{1}{2}$
1649-53ء 〃	2	1	3
1658-60ء 〃	5	3	8

ولندیزی تجارت کا اس نہج پر کوئی تخمینہ نہیں لگایا جا سکتا اور یقین کے ساتھ صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تجارت بہرحال تقریباً 1625ء اور اس کے بعد سے انگریزی تجارت سے زیادہ تھی۔ تقریباً 1615ء یا انگریزوں کی تجارت کے اس شعبہ میں پیش قدمی کے زائد از تیس سال قبل سے پوربی ساحل کی پیداوار کے براہ راست یا بٹاویا کے راستہ سے ہالینڈ جانے کا سلسلہ چل رہا تھا۔ سورت میں ولندیزیوں نے انگریزوں کو جو وہاں پہلے سے تجارت میں لگے ہوئے تھے جلد ہی پکڑ لیا اور پھر ان سے آگے بھی بڑھ گئے۔ اور ونگورلا سے ان کی برآمدات بہرحال کورٹینیس ایسوسیشن کی برآمدات سے زائد تھے۔ بنگال میں تو ان کا تسلط شروع ہی سے مسلم ہے۔ ان کی کاروباری برتری، ہندوستانی تاریخ کی معمولی درسی کتابوں کے پڑھنے والوں کے لیے تو باعث حیرت ہو سکتی ہے لیکن جن لوگوں نے اس دور کی تحریروں کا بغور مطالعہ کیا ہے ان کے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ ایک طرف ولندیزی رپورٹوں اور سمندری جہازوں کے روزناچوں میں ان کے انگریز حریفوں کے افلاس اور نااہلی کا طعنہ دیا گیا ہے تو دوسری طرف انگریزی مراسلات ولندیزیوں کی کینہ اور حسد کے ملے جلے جذبات کے ساتھ توصیف کرتے ہیں۔ ہمارے موجودہ مقصد

× VENGURLA

کے لیے انگریزی مراسلات سے چند اہم مثالیں قلم بند کرنا کافی ہوگا۔ 1622ء میں ہی پولی کٹ کے سربراہ انگریز آڑھتئے نے تحریر کیا کہ "ولندیزی اپنے عروج کی حالت میں ہمارے موجودہ حال زار پر چپکے چپکے ہنستے ہیں اور مسٹر ڈیوک کی اہلیت کا اور سولیٹیم اور نیز یہاں پر ہمارے وسائل کی قلت کا حقارت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور یہ ان کی گپ شپ کا ایک عام موضوع ہے یہ باتیں بالکل درست ہیں اور ہم ان کے دسویں حصے کے بھی برابر نہیں ہیں۔ یہ بات ان لوگوں کی بے حد توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔" دس برس بعد اس سے نسبتاً زیادہ وسیع علاقہ کے بارے میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ اور مسٹر فوسٹر[×] کے 1630-33ء کی تحریروں کے خلاصہ میں درج ہے کہ "ہم انگریز تاجروں کو ولندیزیوں کے کاروباری مقابلہ کا شاکی پاتے ہیں جنھیں ان کی ہوشیاری اور ہوشمندی کے ساتھ ساتھ ان کے افراط وسائل کی وجہ سے مشرقی تجارت میں مسلمہ برتری حاصل ہوگئی ہے ...... ہم انھیں ہندوستان اور فارس میں انگریز کمپنی کے ملازمین کا مد مقابل پاتے ہیں اور یہ بمقابلہ انگریزوں کے ریشم، نیل اور کپڑوں کے زیادہ دام لگاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یورپ اور دیگر سامانوں کی فروختگی میں بھی ان پر سبقت لے جاتے ہیں۔" اس طور پر مسٹر فوسٹر کا 1637-41ء کے متعلق بیان ہے کہ "ہمارے پاس ولندیزیوں کے غلبہ کی افراط شہادتیں موجود ہیں۔ اور ان کا یہ غلبہ سمندری اور فوجی طاقت کے علاوہ عام تجارتی کاروباروں پر بھی مسلم ہے۔ پرتگیزیوں سے جنگ اور اپنے متعدد قلعوں کو مسلح کرنے پر کثیر رقمیں صرف کرنے کے باوجود ان کے پاس اس قدر سرمایہ ہے کہ وہ فارس اور ہندوستان میں بھی اپنے انگریز حریفوں پر سبقت لے جاتے ہیں۔" زیر مطالعہ دور کی بقیہ مدت کے متعلق بھی ایسے ہی حالات بتائے جاتے ہیں۔ 1644ء میں سورت کی ایک خبر کے مطابق ان علاقوں میں صرف ولندیزی خوشحال ہیں۔ وہ اپنی جفاکشی، استقلال اور پیہم محنت اور مستقل مزاجی سے جو چاہتے ہیں حاصل کر لیتے ہیں اور اسی سال مدراس کی اطلاع ہے کہ "ولندیزیوں نے اس قدر طاقت حاصل کر لی ہے کہ ان کا تقریباً پوری ساحلی تجارت پر قبضہ ہو گیا ہے۔" اس کے دس برس بعد بنگال کے بھی یہی حالات بتائے جاتے ہیں۔ انگریزوں کے پاس سرمایہ کی کمی ہے اور وہ "کوئی بھی ایسی تجارت جو کسی درجہ میں بھی ولندیزیوں کی وسیع اور پھیلی ہوئی تجارت سے کوئی نسبت رکھتی ہو" کرنے سے معذور تھے اور یہ قول زیر مطالعہ

[×] Mr. FOSTER

دور کے اختتامی برسوں میں گجرات، کورومنڈل کے ساحل اور بنگال کے متعلق بھی اچھی خاصی حد تک درست ہے۔

ولندیزی غلبہ کے وجوہ کی تفصیل بحث سے ہم اپنے اصل موضوع سے بہت دور ہٹ جائیں گے۔[1] لیکن ہم خود انگریزوں کے اس اعتراف پر کہ ان کے حریف ولندیزی کاروباری صلاحیت اور نیز مادّی وسائل میں ان سے برتر تھے بھروسہ کر سکتے ہیں۔ ان کا نسبتاً زیادہ سرمایہ پر قبضہ مسلم ہے۔ زیر مطالعہ دور کی تقریباً پوری مدّت میں سرمایہ کی کمی انگریزی کمپنی کے تاجر حیثیتوں کی راہ میں مزاحم تھی۔ برخلاف اس کے ولندیزیوں کے پاس ضرورت کے مطابق سرمایہ فراہم رہتا تھا اور کبھی کبھی وہ اپنے سرمایہ کو سودی قرض پر بھی اٹھایا کرتے تھے۔ علاوہ اس کے جیساکہ پہلے ذکر آیا ہے ' مسالہ کے کاروبار اور چین اور جاپان کی منڈیوں پر ان کی اجارہ داری کی وجہ سے وہ اپنے سرمایہ کا بہترین مصرف کر سکتے تھے۔ وہ ہندوستان اور فارس میں لونگ، جاوتری اور جائفل کی زیادہ مانگ کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور ساتھ ساتھ چین اور جاپان سے ہندوستان کے جس حصہ میں بھی نفع بخش تجارت کی توقع ہوتی وہاں سونے اور چاندی کو کثیر مقدار میں پہنچا سکتے تھے۔ وہ اس سلسلہ میں اپنے معقول تجارتی نظم ونسق سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ ان کا بٹاویا میں متعینہ گورنر جنرل اپنی کونسل کے ساتھ پورے مشرقی علاقہ میں وسیع اختیارات کا مالک ہونے کے علاوہ ان کے پورے نظم کی روح رواں کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے برخلاف زیر مطالعہ دور کی بیشتر مدّت کے دوران مختلف انگریزی پریسیڈنسیوں[+] اور ایجنسیوں کے درمیان کم وبیش برابر آن بن رہا کرتی تھی۔ ان کے درمیان اختلاف رائے کے فیصلے ان کے وطن سے صادر ہوا کرتے تھے۔ اس کا امکان رہتا تھا کہ نقصان ہو جانے کے کافی بعد وہاں سے فیصلے موصول ہوں۔ ان حالات میں ہمعصر تحریروں کا کوئی بھی مطالعہ کرنے والا ولندیزیوں کے تجارتی نظم کی اعلیٰ کارکردگی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان میں ولندیزی سرمایہ کی مجموعی مقدار کا کچھ اندازہ 'بٹاویا جرنلوں' میں وقتاً فوقتاً مندرج ان جہازی سامانوں (سونا، چاندی اور اشیا) کی مالیت سے لگایا جا سکتا ہے جو بٹاویا اور زنائیوان سے اپنے ملک کو روانہ کیے گئے تھے۔ 1635ء کے قریبی برسوں میں گجرات کے قحط کے فوری اثرات سے بحال ہونے کے قبل ان کا سالانہ سرمایہ دس لاکھ گلڈرس یعنی مروجہ

---

[1] اس موضوع پر کچھ اور تفصیلات ضمیمہ 'الف' میں دی گئی ہیں۔

[+] PRESIDENCIES

شرح مبادلہ کی رو سے ½ 9 لاکھ روپے سے زائد تھا۔ 1641ء اور 1645ء کے دوران یہ مالیت پہلے کی دوگنی یعنی تقریباً 18 لاکھ روپیہ ہو گئی۔ زیر مطالعہ دور کے ختم ہوتے ہوتے یہ بڑھکر تقریباً 30 لاکھ پر پہنچ گئی تھی۔ یہ اعداد بٹاویا کے حساب میں مندرج جہازی سامانوں کی مالیت کے ہیں۔ اور ہم ان کا انگریزی زر سرمایہ کے اعداد سے براہ راست موازنہ نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ہندوستانی ساحل پر مروجہ قیمتوں میں دیے گئے ہیں لیکن انگریزی سرمایہ کا حوالہ اس لحاظ سے مناسب ہوگا کہ ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ولندیزی تجارتی کاروبار صرف وسیع ہی نہیں بلکہ بتدریج اضافہ پذیر بھی تھا۔ اس سلسلے میں اس امر کی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ یہ تفصیلی اعداد بنگال اور مشرقی ساحل کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے مظہر ہیں۔ شروع کے برسوں میں سرمایہ سورت اور کورومنڈل کے درمیان تقریباً برابر طور پر منقسم تھا لیکن زیر مطالعہ دور کے ختم ہوتے ہوتے سورت میں لگے ہوئے سرمایہ کی مقدار مشکل سے کل کی چوتھائی رہ گئی۔ واضح ہو کہ یہ ایشیائی اور یورپی تجارت میں لگے ہوئے سرمایہ کی میزان کے اعداد ہیں۔ ولندیزیوں کی یورپی برآمدی تجارت کے متعلق موجود معلومات اس قدر مبہم ہیں کہ ہم یہ اندازہ لگانے سے معذور رہیں کہ اس میزان کو کس تناسب میں تقسیم کیا جائے۔ لیکن چند مخصوص اشیا کے متعلق معلومات کے پیش نظر جن کا تفصیلی جائزہ آنے والی فصلوں میں آئے گا۔ ہم یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ زیر مطالعہ دور کے ختم ہوتے ہوتے یورپی تجارت میں انگریزوں کے مقابلہ ولندیزیوں کا حصہ زیادہ تھا۔ لہٰذا اگر انگریزوں کی یورپ کے لیے خریداری سالانہ آٹھ لاکھ روپیہ کی مالیت معہ ان تمام اخراجات کے جو سامانوں کو جہاز پر لادنے میں ہوتے تھے صحیح ہے تو ان دونوں اقوام کی یورپی برآمدات کی مجموعی مالیت اس دور کے سکوں کے اعتبار سے غالباً 18 سے 20 لاکھ یا بمقدار موجودہ قوت خرید کے 80 سے 90 لاکھ تھی۔[1] ڈنمارک اور پرتگال کے تاجروں کی برآمدات

---

[1] یہاں اور دیگر مقامات پر بھی جہاں جہاں "موجودہ قوت خرید" کی اصطلاح استعمال میں آئی ہے اس سے مراد روپیہ کی وہ قیمت ہے جو 14-1910ء کی پنجسالہ مدت کی سرکاری شماریات سے منکشف ہوتی ہے۔ اس کی مدت کے آخری حصہ میں قحط سالی کے ایام بھی شامل ہیں اور زرعی پیداواروں کے لیے 1910ء سے 1912ء تک دونوں سالوں سمیت کی مدت استعمال میں لائی گئی ہے۔ ابھی مابعد جنگ کے روپیہ کی عام قیمت کے قطعی تخمینہ کی کوشش بہت قبل از وقت ہوگی۔ تطبیق کے عمل کا بہرحال سست رفتار ہونا امر لازم تھا اور خراب موسموں کی تکرار نے بغیر واضح مدت کو طویل کر دیا تھا۔
(باقی ص 140 پر)

کی بنیاد پر مذکورہ اعداد میں کسی خاص اضافہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ زیر مطالعہ دور میں ڈنمارک کی برآمدات زیادہ تھیں۔ اور پرتگیزی برآمدات ہمارے عہد کے ختم ہوتے ہوتے تقریباً برائے نام رہ گئی تھی۔ اس طور پر کمپنی کے جہازوں کے ذریعہ ہونے والی انفرادی مالکوں کے سامان کی تجارت جسے نجی تجارت کہتے تھے کی مالیت بھی کوئی زیادہ نہ تھی۔ انگریزی تحریروں میں اس کے بہت زیادہ اندراجات ملتے ہیں لیکن مذکورہ تخمینوں میں غالباً ۵ سے ۱۰ فیصدی تک کا اضافہ جملہ دیگر اقسام کی تجارت کی مد میں کافی ہوگا۔

فصل ۵ نیل

برآمدی تجارت کی ترقی کے مجموعی جائزہ کے بعد اب ہم مخصوص اشیاء کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جن میں نیل کو بجا طور پر اولیت حاصل ہے۔ میں یہ پتہ لگانے سے قاصر رہا کہ یہ پیداوار پہلے پہل مغربی یورپ کیونکر پہنچ تھی۔ اون کی صنعت کے لیے جس کی اس علاقہ میں بے حد اہمیت تھی نیلے رنگ کی ضرورت تھی اور شروع شروع میں یہ ضرورت ووڈ نامی نیلا رنگ پیدا کرنے والے ایک درخت سے پوری ہوتی تھی لیکن سولھویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ووڈ کی جگہ نیل کا استعمال شروع ہو گیا اور ان دونوں رنگوں کے درمیان انتخاب کا فیصلہ اس امر پر بھی منحصر ہوتا تھا کہ نیل کس قیمت پر حاصل کی جا سکے گی۔ پرتگیزی اچھی خاصی مقدار میں نیل لزبن لے جاتے تھے اور اس کی تجارت میں ترقی کے امکانات نے 1587ء میں شاہ اسپین کو اسے اپنی اجارہ داری میں لینے پر راغب کیا۔ اس عمل کے نتائج تحریروں میں نہیں ملتے۔ لیکن موجود اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1602ء میں اس کی برآمدات صرف بقدر ۲۰۰ ہنڈرویٹ تھی جو اگلے سال ۹۴۰ ہنڈرویٹ پر پہنچ گئی۔ مجھے ان پرتگیزی برآمدات کی آخری منزل مقصود کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ میرا گمان ہے کہ یہ بیشتر بحیرۂ روم کے پچھلے علاقہ میں صرف ہوتی تھی اور اگر یہ شمالی علاقوں تک پہنچتی بھی تھی تو لندن کی منڈی میں اس کی قیمت اور معیار لزبن کے بجائے حلب سے متعین ہوتے تھے۔ انگریزوں کے ابتدائی دور کی مراسلات میں حلب کو معیار تصور کیے جانے کے رجحان کو واضح

(بقیہ صفحہ)

میں نے جس پیمانہ کو استعمال کیا ہے اسے آگرہ اور لاہور کے درمیانی علاقہ میں ½12 سیر گیہوں فی روپیہ کے حساب سے واضح کیا جا سکتا ہے۔

طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ ۱۶۰۹ء میں کمپنی نے "نیل، ریشم، اور دیگر ترکی اشیا کے ایک ماہر کو اپنا آڑھتیہ منتخب کیا۔ اس کے چند برسوں بعد ایک دوسرے آڑھتیے نے اطلاع دی کہ ہندوستان میں اس کے خریدے ہوئے سامان اتنے ہی اچھے ہیں جتنے میں نے کبھی حلب میں دیکھے تھے"۔ جب طامس من نے کمپنی کی ہندوستانی تجارت کی مالیت کا حساب لگانا شروع کیا تو اس نے حلب ہی کی مروجہ قیمتوں کو اپنے تخمینوں کی بنیاد قرار دیا۔ اس کی استعمال کی ہوئی ۴ شلنگ ۴ پنس فی پونڈ (ال۔ بی) کی عود لندن میں تقریباً ۵ شلنگ کے برابر تھی اور ۱۶۰۹ء میں شمالی ہندوستان کی نیل کی واقعتاً قیمت مروجہ یہی تھی۔[1]

نیل حاصل کرنے کا ابتدائی مقام جو بھی رہا ہو، یہ امر واضح ہے کہ شروع کے یورپی خریداروں کے لیے ہندوستان سے مطلوبہ اشیائیں اسے ایک اہم مقام حاصل تھا۔ ۱۶۰۱ء میں سورت پہنچنے والے ولندیزی آڑھتیوں نے اس کو اہم ترین مقامی پیداوار قرار دیا تھا۔ ۱۶۰۷ء میں ان کا جانشین وان ڈینین[x] نیل کی خریداری کا انتظام کر رہا تھا۔ ۱۶۰۹ء میں سورت سے ولیم فنچ[*] کی اپنے وطن بھیجی گئی۔ رپورٹ میں مندرج امکانی برآمدات کے ضمن میں نیل کو ایک ممتاز مقام حاصل تھا۔ اور انگلستان سے جہازی بیڑوں نے یکے بعد دیگرے جو ہدایات جاری کیں وہ اس امر پہ شاہد ہیں کہ ان دنوں کمپنی اپنی ہندوستانی تجارت کی ترقی کے لیے دیگر جملہ اشیاء کے بالمقابل نیل پر زیادہ زور دیتی تھی۔ سر طامس رو نے اس کو "اہم ترین شے" قرار دیا ہے۔

+ THOMAS MUNN

[1] مجھے اس عام خیال کا کہ سترھویں صدی کے نصف اول کے دوران انگلستان میں نیل کا استعمال ممنوع تھا کوئی ماخذ نہ مل سکا۔ اس خیال کی بظاہر اس بات ہی سے تردید ہوتی ہے کہ انھیں ایام میں اس کے استعمال کے طریقوں کے حقوق اجارہ عطا کیے جا رہے تھے۔ مسٹر ولیم فوسٹر کا قیاس ہے کہ اس خیال کی بنیاد وہ غلط فہمی ہو سکتی ہے جو نیل اور رنگ کے ایک دوسرے درخت "لاگ وڈ" (LOG WOOD) جس کو پارلیمان نے واقعتاً ممنوع قرار دیا تھا کے درمیان پیدا ہو گئی تھی۔

(JOURNAL ROYAL SOCIETY ARTS L, XXVI, 362.)

[x] VAN DEYNSEN

[#] WILLIAM FINCH

اس دور میں اس کی فصل ہندوستان کے ایک وسیع علاقہ میں پیدا کی جاتی تھی اور گنگا کے میدانی علاقہ میں مختلف مقامات پر، سندھ، گجرات اور دکن کے علاوہ مشرقی ساحل پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کے پیدا ہونے کی اطلاعات ہیں۔ عام طور پر یہ مقامی مصرف کی غرض سے پیدا کی جاتی تھی اور برآمد کرنے والے شروع شروع میں صرف سرکھیج اور لاہوری نیل کو قبول کرتے تھے۔ سرکھیج، گجرات کی خاص تجارتی منڈی احمد آباد سے چند میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ یہ ان دنوں اس کی پیداوار کا ایک اہم مرکز تھا۔ اور یہاں کی پیداوار کا زیادہ حصہ خلیج فارس کو برآمد ہوتا تھا۔ لاہوری نیل گنگا کے دوآبہ سے حاصل کی جاتی تھی لیکن اس کا بیشتر حصہ بیانہ یا بیانہ کے قریبی دیہاتوں کے ایک چھوٹے سے علاقہ میں جو آگرہ سے بہ سمت جنوب ومغرب ٥٠ میل کے فاصلہ پر اب ریاست بھرت پور کے حدود میں واقع ہے، پیدا ہوتا تھا۔ یہ نیل عرصہ سے براہ خشکی برآمد کی جارہی تھی۔ اور اس سبب سے اس کو لے جانے والے کارواں لاہور میں ترتیب دیے جاتے تھے۔ یہ حلب کی منڈی میں "لاہوری" نیل کے نام سے موسوم تھی۔ بیانہ کے نواحی علاقہ میں پیدا ہونے والی نیل کو اس سبب سے کہ یہ نسبتاً خالص ہوتی تھی خشکی کے راستہ بھیجنے کے لائق بنایا گیا تھا۔ اور چونکہ یہ گولوں کی شکل میں تیار کی جاتی تھی لہذا یہ اکثر "گول" کے نام سے بھی موسوم تھی۔ سرکھیج کی نیل چپاتی کی شکل میں تیار کی جاتی تھی اور یہ "چپٹی" کہی جاتی تھی۔ اس کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ریت کی آمیزش تھی۔ چنانچہ تقریباً تین پونڈ سرکھیج، دو پونڈ لاہوری کے برابر ہوتی تھی۔ "کورٹ منٹس" سے کچھ ایسا پتہ چلتا ہے کہ انگلستان میں "گول" نیل کو استعمال کرنے میں بعض اوقات تکنیکی دشواریاں محسوس ہوئیں۔ ان دشواریوں اور نیز بیانہ کے سمندری ساحل سے فاصلہ پر واقع ہونے کے باعث سمندری باربرداری کے نقطۂ نگاہ سے دونوں قسم کی نیلوں کو تقریباً پورے طور پر ایک دوسرے کے برابر تصور کیا جاتا تھا۔۔ لاہوری نیل کے یورپ میں زیادہ دام لگتے تھے لیکن اس کو منڈی تک پہنچانے میں زیادہ صرفہ آتا تھا اور یہ امر کہ کس قسم کی نیل کس مقدار میں سالانہ برآمد کی جائے، خاص طور سے اس بات پر منحصر ہوتی تھی کہ ہندوستان میں ان کی قیمتوں کا کیا فرق ہے۔

لہذا نیل کے غیر ملکی خریداروں کی نگاہ پہلے احمد آباد یا بیانہ کی طرف اٹھتی تھی۔ ہم ١٦١٥ء

میں فیچ کو بیانہ کی منڈیوں میں اور اس کے تین برس بعد وتھنگٹن کو احمد آباد میں اس کی خریداری کرتے ہوئے پاتے ہیں ۔ ولندیزی 1616ء میں سورت پہنچے اور انھوں نے 1618ء میں آگرہ میں نیل کی تلاش شروع کر دی اس کے بعد سے دونوں قوموں کے آڑھتیے ان دونوں منڈیوں سے مانوس ہو گئے۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ 1619ء میں جہازوں کے ذریعہ لندن بھیجے ہوئے سامان کا بیشتر حصہ نیل پر مشتمل تھا جس کا (بہ اعتبار وزن) $\frac{3}{5}$ حصہ سرکھیج سے $\frac{2}{5}$ بیانہ سے خریدا گیا تھا۔ زیر مطالعہ دور کی بقیہ مدت کے دوران ان دونوں مقامات سے برآمدات کا سلسلہ چلتا رہا۔ ساتھ ساتھ دیگر مختلف مرکزوں پر بھی اس رنگ کی خریداری کی جاتی تھی۔ ولندیزی خاص طور پر اس فکر میں رہا کرتے تھے کہ یہ اور کہاں کہاں سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ 1626ء کے بعد کی مدت میں انگریزوں نے تھوڑی سی نیل سندھ میں خریدی اور 1645ء میں ولندیزی دکن میں ونگورلا کے بالائی علاقہ سے خریداریاں کر رہے تھے۔ ساتھ ساتھ انھوں نے اسے چٹاگانگ سے بھی حاصل کرنے کی ناکام کوشش کی۔ لیکن ان کی خاص جدوجہد مشرقی ساحل سے برآمدات کو بڑھانے پر مرکوز رہی۔ 1613ء ہی میں جبکہ ابھی ولندیزی گجرات اور بیانہ میں پہنچے بھی نہ تھے کہ مسولی پٹم کی اہمیت نیل کی فراہمی کے ایک مرکز کے طور پر مسلم ہو چکی تھی۔ اس بندر سے روانہ ہونے والے جہازوں کے سامان میں جو ضمیمہ ب میں درج کیے گئے ہیں۔ 650 سے لے کر 1000 ہنڈرڈ ویٹ تک نیل شامل تھی اور برآمدات کی تقریباً یہی مقدار بہت دنوں تک قائم رہی۔ لیکن زیر مطالعہ دور کے پوری مدت کے دوران سورت برآمدات کا خاص بندر رہا۔ اس زمانہ میں مشرقی ساحل پر برآمدات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اوپر گزر چکا ہے کہ بھی پیداوار میں نیل کی کھپت بیشتر اس کے نرخ پر منحصر رہا کرتی تھی۔ حسب ذیل اعداد سے اس تبدیلی کا اندازہ ملتا ہے جو براہ راست درآمد کے نتیجہ میں ظاہر ہوئی [1]

---

[1] یہ اعداد JOURNAL ROYAL SOCIETY OF ARTS L. XVI. 362-3. میں مندرج مسٹر فوسٹر کے مقالہ سے ماخوذ ہیں۔ کورومنڈل کے نیل کی انتہائی ارزانی قابل توجہ ہے۔ اس امر کا کہ اس قدر ادنیٰ درجے کی پیداوار قابل تجارت تھی۔ یہ سبب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمینی بار برداری کے اخراجات بہت زیادہ نہ تھے۔ کیونکہ یہ مشرقی ساحل کے قریبی مواضعات میں پیدا کی جاتی تھی۔

لندن کی منڈیوں میں نیل کی (فی پونڈ) قیمت

مدت	بیانہ	سرکھیج	سندھ	کارومنڈل
	شلنگ۔پنس	شلنگ۔پنس	شلنگ۔پنس	شلنگ۔پنس
تقریباً 1609ء	8 — 0	5 — 0	منڈی میں غیر موجود	منڈی میں غیر موجود
1620-30ء	5 — 6 سے 6 — 0 تک	4 — 0 سے 4 — 6 تک	"	"
تقریباً 1646ء	4 — 0	5 — 4	3 — 4	1 — 3
تقریباً 1655ء	6 — 0	4 — 0	—	1 — 5½

تقریباً 1646ء میں قیمتوں کی تخفیف کو اس بدنظمی سے منسوب کیا جا سکتا ہے جو انگلستان کی منڈی میں وہاں کی خانہ جنگی کے باعث رونما ہوئی۔ اس کے علاوہ بقیہ برسوں میں براہ راست تجارت کی وجہ سے بیانہ کے نیل کی قیمت میں 25 فیصدی یا اس سے زائد اور سرکھیج کی قیمت میں اس سے قدرے نسبتاً کم تخفیف واقع ہوئی اور یہ تخفیف اس کی کھپت میں زیادہ اضافہ کی سبب ہوئی۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ 1602ء اور 1603ء میں لزبن کو براہ راست علی الترتیب 20 اور 940 ہنڈرویٹ تھی۔ 1619ء میں لندن کی درآمدی مقدار 4000 ہنڈرویٹ سے زائد اور مشرقی ساحل سے ایمسٹرڈم پہنچنے والی مقدار 1000 ہنڈرویٹ سے اوپر تھی۔ اگلی دہائی میں انگریزی جہاز کم سامان لے جا سکے۔ 1625-28ء کا معیار 2000 سے 2000 ہنڈرویٹ تک تھا۔ لیکن ان دنوں ولندیزی سورت نیز مسولی پٹم میں مصروف رہے حالانکہ ان کے تجارتی اعداد موجود نہیں ہیں، لیکن قیاس ہے کہ مجموعی طور پر ان کی برآمدات کی کل مقدار میں کمی نہیں بلکہ اضافہ ہوا ہوگا۔ ان برسوں پر سے صرف نظر کرتے ہوئے جن کے دوران گجرات کی تجارت کا نظم قحط سالی کی وجہ سے بے ترتیب ہو گیا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اگلے دہائی کے خاتمہ پر انگریزی برآمدات میں مزید کمی واقع ہوئی۔ ان کے وہ بیجک جن کے خلاصے اب تک مرتب کیے جا چکے ہیں۔ 1638-39ء میں برآمدی مقدار کو 1480 اور 1640-41ء میں بمشکل 1000 ہنڈرویٹ بتاتے ہیں لیکن یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی تجارت میں کمی کے مقابلہ میں

ولندیزی تجارت میں جو اضافہ ہوا وہ زیادہ تھا۔ ان کاروباری موسموں کے لیے ولندیزی تجارت کے اعداد موجود نہیں ہیں لیکن 1629ء میں ان کے فرمائشی سامانوں کا وزن 3400 ہنڈرویٹ تھا۔ 1641ء میں ان کی بتادیا کو برآمدات 4200 ہنڈرویٹ سے زیادہ تھیں اور 1642ء میں انھوں نے 9000 ہنڈرویٹ زاید وزن کی غیر معمولی مقدار کی برآمدات کیں جسے ہم اس کی تجارت کا انتہائی عروج قرار دے سکتے ہیں۔

اس دور کے انگریزی بیجکوں سے ماخوذ چند اعداد ذیل میں اس غرض سے پیش کیے جاتے ہیں کہ نیل کے مقامات حصول پر اس کی قیمتوں کے فرق کو واضح کیا جا سکے[1]۔

مقام حصول	برآمدات ہنڈرویٹ میں			زیر بیں موقع پر ادا کردہ اوسط قیمت فی ہنڈرویٹ		
	1638-39ء	1639-40ء	1640-41ء	1638-39ء	1639-40ء	1640-41ء
بیانہ	385	70	927	3.106	3.93	4.76
سرکھیج	1,060	661	75	6.90	1.58	6.56

یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ پہلے برس سرکھیج کے نیل کی قیمت بہت زیادہ یعنی قسم اعلیٰ سے تھوڑی ہی کم تھی۔ پس اس کاروباری موسم کے دوران بیانہ میں خریداری قابل ترجیح تھی۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آڑھتیوں کو گجرات میں قیمت کی زیادتی پر تعجب تھا کیونکہ اب تک جو انتظامات کیے جا چکے تھے انھیں تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگلے برس سرکھیج کے نیل کی قیمت زیادہ گر گئی لہذا بیشتر مال کی خریداری یہیں سے کی گئی۔ 1640ء میں بیانہ میں بھی قیمتیں گھٹیں جس سے کمپنی کی خواہش کے مطابق آڑھتیوں کے لیے زیادہ مقدار میں اعلیٰ قسم کی نیل بھیجنا ممکن ہو گیا۔

زیر مطالعہ عہد کی آخری دہائی میں نیل کی برآمدی مقدار بہت گھٹ گئی۔ مجھے ان برسوں کے لیے ولندیزی تجارت کے مکمل اعداد نہ مل سکے لیکن منفرد کھیپوں کی مقدار بمقابلہ پہلے کے کم ہو گئی تھی اور جہازوں کے ذریعہ بھیجے گئے سامانوں کی نسبتاً کم فہرستوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔

---

[1] 1638-39ء کے برآمدات میں مشرقی ساحل کی تقریباً 35 ہنڈرویٹ شامل تھی۔ جس کو گوشوارہ کے اعداد میں جوڑنے پر اس کاروباری موسم کی مذکورہ بالا 1480 ہنڈرویٹ کی میزان آتی ہے۔ اگلے دو کاروباری موسموں میں مشرقی ساحل سے انگریزوں نے نیل بالکل برآمد نہ کیا۔

میرا خیال ہے کہ اس میں ذرا شک نہیں کہ ان کی برآمدات میں اچھی خاصی کمی ہوئی۔ جہاں تک انگریزی تجارت کا تعلق ہے، تقریباً 1649ء میں ہم دیکھتے ہیں کہ نیل کی "نرخیں حقیر" تھیں۔ 1651ء میں کمپنی اس کی فراہمی کو ناپسند کر رہی تھی اور 1653ء میں صرف 200 گانٹھوں کی فرمائش کی گئی۔ مگر 1658ء میں زیادہ سرمایہ فراہم ہو جانے کے بعد اس کی فرمائش کو بڑھا کر 800 گانٹھیں کر دیا گیا۔ لیکن 1660ء میں مطلوبہ مقدار تھوڑی اور قیمت انتہائی کم رہی۔ [1] اس کمی کا سبب یورپی مانگ میں تخفیف نہ تھی بلکہ ہندوستانی مال کا امریکی ذخیرہ سے مقابلہ تھا۔ جس نے بالآخر ہندوستانی نیل کی تجارت کو ختم کر دیا۔ 1587ء ہی سے امریکہ کی نیل اسپین پہنچنا شروع ہو چکی تھی اور 1628ء میں ایک بڑے کھیپ کے فراہم ہونے کا اندراج ملتا ہے۔ اس کے پانچ برس بعد اس کے ایک ذخیرہ کی گوا تمالا سے لندن پہنچنے کی اطلاع ملتی ہے اور 1645ء میں ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی کمپنی نے اس بنا پر کہ جزائر غرب الہند میں رنگوں کی کثیر مقدار پیدا ہو رہی ہے۔ سورت سے اس کی برآمد میں تخفیف کے احکام صادر کیے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جزائر میں تیار کیے ہوئے رنگ ہندوستانی رنگوں سے بہتر ہوتے تھے۔ لہٰذا یہاں کی تجارت کو فاصلہ کی کمی اور مال کی بہتری کی بنا پر برتری حاصل رہی۔ ہندوستانی تجارت کو فاصلہ کی کمی اور مال کی بہتری کی بنا پر برتری حاصل رہی۔ ہندوستانی تجارت کی مقدار تھوڑے دنوں کے نشیب و فراز کے بعد بہت مختصر رہ گئی اور 1729ء میں یہ ایک بار ختم ہونے کے بعد ملک کے دوسرے حصوں میں دوبارہ شروع ہوئی۔ [2]

---

[1] بیانہ کے نیل کی گانٹھ کا وزن خالص 220 ۔ ال ۔ بی ۔ اور سرکھیج کی گانٹھ کا 150، ال۔ بی۔ تھا۔ 1650ء کی فرمائشوں میں نصف لاہوری اور نصف سرکھیج کی نیل تھی۔ اس طور پر میزان 1300 ہنڈرویٹ سے تھوڑی زائد ہوتی۔

[2] غالباً یہ ایک قابل ذکر امر ہے کہ ولندیزی پہلے ہی سے ایشیا کے دیگر حصوں کے علاوہ سیام، فارموسا اور جاوا سے نیل فراہم کرنے کی انتھک کوششیں شروع کر چکے تھے۔ DAGH REGISTER کے مختلف اندراجات (مثلاً مورخہ 20 مئی 1641ء، 4 نومبر 1644ء، یکم دسمبر 1646ء) سے ظاہر ہوتا ہے کہ اول الذکر دو ملکوں میں انھیں ناکامیابی ہوئی۔ مجھے زیر مطالعہ عہد کے دوران جاوا میں ان کی کامیابی کی کوئی تحریر نہیں مل سکی لیکن ولندیزیوں کے پہلے سمندری سفر کے وقت اس جزیرہ میں یہ رنگ تیار ہو رہا تھا۔

اپنے زمانۂ عروج میں بھی نیل کا کاروبار دقتوں اور پریشانیوں سے خالی نہ تھا۔ یورپ میں قیمتوں کی کمی کا مسئلہ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اور ہندوستان میں موسم کی بے ضابطگیاں، حکام کی دخل اندازی اور ملاوٹ یہ اہم مسائل تھے۔ موسم کی بے ضابطگی کے سلسلے میں صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ 1613ء میں بڑے قحط کے بعد گجرات سے مال کی فراہمی بالکل بند ہو گئی تھی۔ 1621ء اور نیز 1624ء میں بارش کی کثرت سے بیانہ کی فصل کو نقصان پہنچا اور 1625ء کی قریبی مدت میں ٹڈیوں نے تین فصلوں کو برباد کر ڈالا اور پھر 1646ء میں خشک سالی سے بھی ضرر پہنچا۔ ساتھ ساتھ سرکاری دخل اندازی کی عام شکایت تھی۔ 1618ء میں ایک ولندیزی آڑھتیے کی اطلاع کے مطابق احمد آباد کے صوبہ دار نے سالانہ نیل سازی کی اجازت دینے کے قبل ایک لاکھ روپیہ طلب کیا۔ 1632ء میں شاہجہاں نے اپنی پوری مملکت میں اس کی اجارہ داری کی منظوری دے دی جس کے باعث اس کا کاروبار عارضی طور پر معطل ہو گیا۔ 1644ء میں سندھ کی جابرانہ حکومت نے لوگوں کے اندر اس کی فصل اگانے کی مقدرت اور نہ ہی حوصلہ باقی رہنے دیا۔ 1647ء میں احمد آباد میں ایک نئے رواج کے شروع ہونے کی اطلاع ملتی ہے جس کے تحت "نیل کے تاجر..... اپنا مال بیچنے کی اجازت خریدا کرتے تھے"۔ علاوہ ان کے اور بھی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نیل کی کاشت اور فروختگی کو سرکاری استحصال کا ایک ذریعہ تصور کیا جاتا تھا۔ آخر میں ملاوٹ کا طریقہ عام طور پر گجرات میں خاص طور سے رائج تھا[1]۔ یہاں آمیزش کی مقدار بظاہر اس کی مانگ کی نسبت سے کم و بیش ہوا کرتی تھی۔ 1640ء میں سورت کے آڑھتیوں نے لکھا کہ ایک پوری کھیپ میں "گھٹیا ملاوٹ" کر دی گئی تھی اور اس خرابی کا سدّباب خریداروں کے درمیان شدید مقابلہ کی صورت میں دشوار تھا۔ اس پر احمد آباد کے صوبہ دار نے معاملہ کی تحقیقات کے بعد ملاوٹ میں ماخوذ ملزم کو سزائے موت دی۔ اس کے بعد عارضی طور پر حالات بہتر ہو گئے لیکن 1645ء میں دوبارہ ملاوٹ میں اضافہ ہونے کے باعث سرکاری مداخلت ضروری ہو گئی جس نے پیداوار کو بے حد کم کر دیا حالانکہ 1650ء میں ولندیزیوں کی خریداری میں اضافہ کی وجہ سے

---

[1] ایسا نہ تھا کہ بیانہ ملاوٹ کی لعنت سے محفوظ ہو کیونکہ پلسارٹ ورق 4 پر ان احتیاطی تدابیر کی جزوی تفصیلات بیان کرتا ہے جو خریداروں کے لیے لازمی تھیں۔ لیکن یہ یہاں گجرات کی طرح علانیہ طور پر رائج نہ تھی۔

ملاوٹ کا کام غیر معمولی طور پر بڑھ گیا۔ یورپی منڈیوں میں اس طریقہ پر اظہار ناپسندیدگی کی معقولیت کو اس امر کے پیش نظر بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ باربرداری پر قیمت خرید کے دوگنے سے زیادہ خرچ آتا تھا لیکن حکومت کی جانب سے اس طریقہ پر قابو پانے کی کارروائی کبھی کبھی کی جاتی تھی اور اس میں ذرا شک نہیں کہ اس گراں قدر تجارت کے بالآخر بند ہو جانے میں جو اسباب ممد ہوئے ان میں سے ایک ملاوٹ بھی تھی۔

مغربی یورپ میں نیل کی کھپت میں اضافہ سے ہندوستان کو نفع پہنچا۔ اس کا اندازہ لگانے کے لیے مناسب ہوگا کہ یہاں اس کی مجموعی پیداوار برآمدی مقدار کے درمیانی تناسب کو متعین کر لیا جائے۔ نیل کے آڑھتیوں کے وقتاً فوقتاً فراہم کردہ تخمینوں سے، خاص برآمدی علاقہ کی پیداوار کا ایک سرسری اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ 1628ء میں جو بظاہر ایک نا موافق سال تھا۔ سرکھیج کی پیداوار کا (33 ال۔ بی کے من سے) 8000 من تخمینہ لگایا گیا تھا اور 1634ء میں متوقع پیداوار 9000 من تھی۔ 39-1638ء میں ایک آڑھتیا 40,000 من کی عام اطلاع کی خبر دیتا ہے جس کو میں غلط اور مبالغہ آمیز تصور کرتا ہوں[1]۔ 1641ء میں 12000 من (37۔ ال۔ بی) کا ولندیزی تخمینہ تھا اور 1644ء میں انگریزوں کے 6000 من کے تخمینہ کا ½ حصہ مقامی ضرورت کے لیے مطلوب تھا۔ اس سال ولندیزیوں اور انگریزوں کی ضروریات 5500 من سے کم تھیں اور پچھلے سال کی ناسازگار منڈی کے باعث اس سال اس کی فراہمی کے متعلق بتایا گیا ہے کہ یہ افراط نہ تھی۔ ان اعداد کی بنیاد پر اس کی پیداوار کے معیار کو تقریباً 10,000 گجراتی من یا 3000 ہنڈرویٹ قرار دیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ کسی مخصوص موافق موسم میں قیمتوں کی گرانی کے باعث بہتر فصل پیدا کیے جانے کا امکان رہتا تھا۔ 1626ء میں شمالی ہندوستان کی عام پیداوار کا تخمینہ (55 ال۔ بی۔ کے) تقریباً 16000 من پر رکھا گیا تھا حالانکہ یہ فی الوقت مذکورہ آفات کے باعث صرف 10,000 من یا اس سے بھی

---

[1] یہ ایک آڑھتیے کا اپنی صفائی میں پیش کیا ہوا تخمینہ ہے ENGLISH FACTORIES VI,91 بعض پچھلے کاروبار کے سلسلے میں اپنی صفائی پیش کرنے کے بعد وہ مستقبل کے لیے بہتر توقع کا اطمینان دلاتا ہے اور اپنے خط کو اس عام اطلاع پر ختم کرتا ہے کہ 40,000 من نیل فراہم ہو جائے گی لیکن اس قسم کے تخمینوں کو کتاب کے متن میں مندرجہ عام کاروباری تخمینوں کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔

کم تھی۔[1] 1633ء میں پیداوار بحال ہونے کے بعد بہ مشکل 15,000 من تھی۔ اس کا ایک تہائی حصہ خالص بیانہ کی اور بقیہ ہنڈون اور دیگر علاقہ کی تھی۔ لیکن اس کی بیشتر مقدار برآمد کے مطلوبہ معیار کے مطابق تھی۔ اس برس ایک ولندیزی اطلاع کے مطابق اس وقت کی پیداوار کم ہونے پر 3000 گانٹھ (تقریباً 12,000 من یا 6,000 ہنڈرویٹ) تھی۔ اس طور پر ہم اس علاقہ کی پیداوار کو 6000 سے لے کر 8000 ہنڈرویٹ تک قرار دے سکتے ہیں۔ اس میں گجرات اور شمالی پیداوار شامل کرنے کے بعد تقریباً 10,000 ہنڈرویٹ اس وقت تھی، جب کہ برآمدی تجارت اپنے عروج پر تھی، دستیاب ہوسکتی تھی۔ اس مقدار میں ہم ولندیزی مانگ کو 5000 سے 6000 ہنڈرویٹ تک یعنی کاروباری فصل کا تقریباً نصف سے زائد قرار نہیں دے سکتے۔ پس دوسرے خریداروں کے لیے بھی مال کی کافی گنجائش رہتی تھی۔ حالانکہ 1642ء کے خصوصی برس کے دوران ولندیزیوں کی خریداری مذکورہ تناسب سے بہت زیادہ تھی۔ 1640ء کے انگریزی تخمینہ کے مطابق یہ مشرقی ساحل پر 400 سے 500 کینڈی، تک یعنی 200 ہنڈرویٹ مل سکتی تھی، جبکہ ولندیزیوں کی برآمدی مقدار بالعموم 1000، ہنڈرویٹ سے کم اور انگریزوں کی برآمد بھی تھوڑی ہی تھی۔ سندھ کے خاص علاقہ کی پیداوار 2000 من (غالباً 66 ال۔ بی۔ کے من سے) تھی۔ اس طور پر ہندوستان سے برآمد کرنے کے لیے نیل کی جو مقدار حاصل کی جاسکتی تھی 12000 سے 14000 ہنڈرویٹ تک ہوئی۔ اس کے علاوہ نیل کی ایک بڑی مقدار مقامی مصرف میں آتی تھی۔ میں اس دور میں اس کی فی ایکڑ پیداوار کا پتہ نہ چلاسکا لیکن اگر یہ تصور کرلیا جائے کہ یہ موجودہ صدی کے اعداد (15 سے 20 ال۔ بی) سے زیادہ نہ تھی تو اس کے برآمدی خطے کا رقبہ 75,000 سے 100,000 ایکڑ تک آتا ہے۔[2]

---

[1] یہ اعداد پلسارٹ کے نیل کی تجارت کے متعلق مکمل اور مفصل تذکرہ سے ماخوذ ہیں۔ ولندیزی مخطوطہ اور اس کے مطبوعہ ترجمہ میں کچھ فرق پایا جاتا ہے۔ مخطوطہ میں 25000 گانٹھوں کی مجموعی تعداد اور ترجمہ میں 22000 گانٹھوں کی میزان ملتی ہے۔ گانٹھوں کو 55 ال۔ بی۔ کے) چار من بتایا گیا ہے۔

[2] ہندوستان کا شعبہ شماریات جس معیار کو تسلیم کرتا ہے وہ صوبہ متحدہ کے لیے

(بقیہ صفحہ 150 پر)

اعداد مذکورہ بالا اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تجارت میں باہمی مقابلہ کی بعید گنجائش تھی اور یہ تصور کرنا کہ ولندیزی اور انگریزی خریداروں نے اس کی منڈیوں میں اپنی اپنی اجارہ داری قائم کر لی تھی غلط ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ ان اقوام کے تاجر مجموعی طور پر سب سے بڑے خریدار تھے لیکن عام طور پر ان کا آپس میں اور نیز فارس میں اور دیگر ممالک کے سوداگروں سے جو ایشیائی ممالک اور نیز پوربی یورپ کو براہ خشکی برآمد کرنے کی غرض سے خریداریاں کرتے تھے، شدید مقابلہ رہا کرتا تھا۔ آخر الذکر تجارت بالکل ختم تو نہیں لیکن غالباً گھٹ گئی تھی۔ ولندیزی تحریروں میں بتایا گیا ہے کہ 1641ء میں آگرہ سے براہ خشکی نیل کے باہر جانے کا سلسلہ قائم تھا۔ جب کہ 1642ء کے انگریزی 'کورٹ منٹس' کی اطلاع کے مطابق بصرہ کے راستہ سے آنے والے مال کی وجہ سے پورے یورپ میں قیمتیں کم ہو رہی تھیں۔ پس ہم بجا طور پر یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اس کی تجارت میں برابر مقابلہ چلتا رہتا تھا۔ لندن پہنچنے والی مقدار کا زیادہ حصہ یورپ کے براعظم کو دوبارہ برآمد کر دیا جاتا تھا۔ اور اگرچہ حلب لندن سے دوسرے ممالک سے پہنچنے والے مالوں کا مدمقابل نہ ہو سکتا تھا مگر چونکہ نیل لندن سے مشرق البعد کو بھی جاتی تھی لہٰذا اس کے اثرات کو زیادہ شدت سے محسوس کیا گیا ہوگا۔ معاملہ کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ ایشیائی سوداگروں کی خریداری کے مقدار کو متعین کرنا ناممکن ہے۔ لیکن اس وقت کے تجارتی مراسلات میں اس کے متعدد حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی سرگرمیاں منڈی پر نمایاں طور پر اثر انداز رہا کرتی تھیں۔ ہمارے پاس آرمینی خریداروں کے متعلق پلسارٹ کا یہ واضح بیان موجود ہے کہ وہ "ایسے لالچی مہمانوں کی طرح جو یہ سمجھتے ہوئے کہ میز پر ضرورت کے مطابق کھانا نہیں ہے، ہر طشتری تک پہنچنے کی کوشش میں دوسرے مہمانوں سے ٹکراتے ہوئے ملک میں ایک موضع سے دوسرے موضع تک دوڑ لگاتے رہتے ہیں۔" اس نے یہ بھی شکایت کی ہے کہ انھوں نے اپنی خریداری کے شوق میں

(بقیہ صفحہ 149) 18 - ال - بی - اور بہار کے لیے 20، ال - بی - فی ایکڑ ہے۔ بمبئی کے لیے جہاں اب اس کی کسی قابل لحاظ مقدار میں کاشت نہیں ہوتی، کوئی معیار مقرر نہیں ہے (ESTIMATES OF AREA AND YIELD OF PRINCIPAL CROPS, TABLE II.) زیر مطالعہ عہد کے دوران گجرات میں اس کی فی ایکڑ پیداوار کی کوئی تحریری شہادت نہیں ملتی۔ میرا گمان ہے کہ یہ بمقابلہ شمالی ہندوستان کے قدرے کم تھی۔ لیکن اس کے تائیدی دلائل اس قدر غیر معتبر ہیں کہ ہم کسی قطعی فیصلہ پر نہیں پہنچ سکتے۔

اپنے ذاتی خرید کیے ہوئے مال کی قیمتوں کو بے حد بڑھا دیا ہے۔ ۱۶۴۴ء میں سورت کے آڑھتیوں نے فارس، مخا، اور بصرہ کی مانگ میں کمی کی اطلاع دی جس کے نتیجہ میں قیمتیں اس قدر گھٹ گئیں کہ "اس سے پلانٹرس[1] تقریباً فقیر ہوگئے۔ پس وہ اپنی معمول کی تیاری کو سال بہ سال کچھ نہ کچھ کم کرتے جارہے ہیں" پھر ۱۶۴۹ء میں آڑھتیوں نے واضح کیا کہ، حالانکہ بیانہ میں دسمبر یا جنوری میں جبکہ نیل پورے طور پر خشک ہو جاتی ہے۔ خریداری کرنا زیادہ مفید ہوتا لیکن اس سبب سے کہ ایشیائی سوداگر اس وقت تک انتظار نہ کرتے تھے وہ اس کے قبل ہی اپنی خریداریاں کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ پس باوجودیکہ علاقہ بیانہ اور گجرات کے کاشتکار اپنے مال کی کھپت کے لیے بنیادی طور پر غیر ملکی منڈیوں پر بھروسہ کرتے تھے، لیکن ان کا کاروبار بالعموم خریداروں کی ایک واحد جماعت تک محدود نہ رہتا تھا۔ ولندیزی اور انگریز، اہل فارس مغل اور آرمینی ان سب کے درمیان مقابلہ رہا کرتا تھا۔ اور اگر کسی فصل کے موقع پر یورپی خریدار آپس میں متحد بھی ہو جاتے تو وہ ایشیائی ممالک کی مانگ کا لحاظ رکھے بغیر من مانی قیمتوں کا حکم نہ لگا سکتے تھے۔ چنانچہ اس کی تجارت کی اہمیت باقی رہنے تک، اس کے پیدا کرنے والوں کو منفعت کی بہت سی صورتیں حاصل رہیں۔ لیکن اس تجارت کی مقدار کو متعین کرنا اس لیے دشوار ہے کہ لندن یا ایمسٹرڈم کو براہ سمندر پہنچنے والی نیل کا کچھ حصہ ان منڈیوں کو جہاں پہلے حلب کے راستہ سے مال پہنچا کرتا تھا چلا جایا کرتا تھا۔ جس کے نتیجہ میں یہ جزو لندن یا ایمسٹرڈم کی مانگ میں کسی واقعی اضافہ کو ظاہر نہیں کرتا۔ تقریباً ۱۶۷۰ء میں ولندیزیوں اور انگریزوں کی مجموعی برآمدات میں ۳۰،۰۰۰، سے لے کر ۴۰،۰۰۰ ایکڑ تک کی پیداوار کھپ جاتی رہی ہوگی۔ اور اس میں سے اس مقدار کے لیے جو بصورت دیگر حلب کے راستہ سے پہنچی ہوگی ایک قیاسی تہائی کرنے کے بعد، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مغربی یورپ کی نئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے ۲۰،۰۰۰ ایکڑ زمین پر اس کی کاشت کی گئی ہوگی اکبر بادشاہ کی شرح تشخیص کی بنیاد پر شمالی ہندوستان میں ایک ایکڑ پر نیل کی پیداوار کی قیمت اس وقت کے نظام زر کے اعتبار سے ۲۰ روپیہ (جو کہ اس وقت کی موجودہ قوت خرید کے اعتبار سے

---

[1] یہ واضح کرنا مناسب ہوگا کہ یہاں "پلانٹرس" (PLANTERS) کے مصداق نیل پیدا کرنے والے کسان یا ان میں زر نقد فراہم کرنے والے سرمایہ دار ہیں۔ ابھی تک یہاں یورپ کے نیل کے 'پلانٹرس' نہیں آئے تھے۔

140 روپیہ کے برابر رہی تھی ۔ درانحالیکہ ایک ایکڑ پر معمولی غذائی جنس کی پیداوار کی قیمت 5 روپیہ تھی ۔ پس ولندیزی اور انگریزی خریداروں نے اس کے پیدا کرنے والوں کی آمدنی میں بقدر تقریباً تین لاکھ روپیہ کا اضافہ کر دیا ہوگا ۔ یہ اضافہ پورے ملک کے رقبہ کے لحاظ سے تو بے حقیقت مگر جس محدود رقبہ کے یہ مصرف میں آتا تھا اس کے اعتبار سے بہت کافی تھا ۔ اس رقم میں مال کو باندھنے اس کا بیوپار کرنے اور باربرداری کے اخراجات کا بھی اضافہ کرنا چاہیے ۔ جو کم از کم بیانہ کی نیل کی صورت میں نسبتاً زیادہ تھا ۔

فصل ۹ ۔ شورہ

شورہ کی برآمد کو ہم قطعی طور پر ہندوستانی تجارت کے ایک نئے پہلو سے تعبیر کر سکتے ہیں ۔ سولھویں صدی کے دوران ایشیائی ممالک میں اس کی تجارت کے وجود کا کوئی پتہ نہیں چلتا ۔ اس کی ضخامت کے باعث اسے براہ خشکی منتقل نہ کر سکتے تھے ۔ پرتگیزی جہازوں کے ذریعہ اس کی یورپ برآمد ہونے والی مقدار جیسا کہ آگے ذکر آئے گا بہت تھوڑی تھی ۔ ہمیں اس کی تجارت کی ابتدا کو یورپ کی فوجی تاریخ میں تلاش کرنا چاہیے ۔ شورہ ان دنوں بندوق کے بارود کا ایک لازمی جز تھا اور تھوڑے عرصہ تک یورپ میں اس کی مانگ کو مقامی طور پر پورا کیا جاتا رہا ۔ یہ انسانوں اور حیوانوں کے ایسے حالات میں زندگی بسر کرنے کے نتیجہ میں ضمنی طور پر حاصل ہوتا ہے ۔ جنھیں ان دنوں مضر صحت تصور کیا جاتا ہے لیکن یہ مضر طریقۂ زندگی سترھویں صدی ہی کے دوران نہیں بلکہ اس کے زیادہ بعد تک بھی دور دراز علاقہ میں رائج رہا ، اس کی ضروری مقدار کو انھیں طریقوں سے جو اب بھی مروج ہیں یعنی غلیظ مٹی کو دھو کر حاصل کیا جاتا تھا ۔ زیر مطالعہ دور کے شروع ہوتے ہوتے یورپ میں جنگی فن کی ترقی کی وجہ سے شورہ کی مقامی فراہمی کی مقدار کم ثابت ہونے لگی ۔ اور یہ انکشاف کہ ہندوستان سے اس کی لا محدود مقدار دستیاب ہو سکتی ہے ۔ ان شریک جنگ اقوام کے لیے جو اسے سمندری راستہ سے منگانے پر قادر تھیں ، بے حد سود مند ثابت ہوا ۔

مجھے شورہ کی برآمد کا پہلا حوالہ 1605ء میں شاہ اسپین کے ایک خط سے ملتا ہے جس میں گوا کے وائسرائے کے نام ہدایت کی گئی تھی کہ وہ تا حکم ثانی شورہ کے دس یا بارہ پیپے وطن بھیجتا رہے ۔ خط میں پرتگال میں شورہ کی کم یابی پر زور دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ پچھلے چند برسوں سے اسے ہندوستان سے

منگایا جارہا ہے۔ پس ہو سکتا ہے کہ سولھویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے اس کی برآمد شروع ہوگئی ہو لیکن فرمائش کی مقدار بہت تھوڑی اور وہ بھی کاروباری نہیں سرکاری تھی۔ ان دنوں اسپین میں ان سامانوں کی فراہمی کے سلسلے میں جنھیں اب گولہ بارود کہتے ہیں بے حد دقت محسوس کی جارہی تھی اور وطن آنے والے وزنی جہازوں کی خالی جگہ پر کاروباری پہلوؤں کا لحاظ کیے بغیر سرکاری قبضہ کرلیا جاتا تھا۔ 1613ء میں اور پھر اس کے ایک سال بعد جہاز سازی کے مصرف میں آنے والے شہتیروں کو گواسے پابندی کے ساتھ روانہ کرنے کی ہدایت تھی۔ یہ ایک ایسی چیز تھی جس کا اس راستہ پر کوئی تاجر کاروبار نہ کرتا اور شورہ کی مانگ سے اس کی اسپین میں ضرورت ظاہر ہوتی ہے۔

ولندیزیوں نے ساحل کورومنڈل پر اپنے قیام کے بعد جلد ہی شورہ کی تجارت کی طرف قدم بڑھایا مجھے ان کی اس تجارت کے واقعی شروع ہونے کا پتہ نہ چل سکا۔ لیکن 1617ء کی ایک رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے آڑھتیے اس کی تجارت میں دلچسپی لینا شروع کر چکے تھے اور ضمیمہ 'ب' میں مندرج 'نیرڈین'+ نامی جہاز کے بیجک سے پتہ چلتا ہے کہ 1621ء میں اس کی اچھی خاصی مقدار برآمد کی گئی تھی۔ اس سال کے بعد اس کی خریداری، ان کی تجارتی تحریروں کا عام موضوع ہے۔ اس کے بعد انگریزوں نے بھی ولندیزیوں کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا۔ 'کورٹ منٹس' کے متعدد اندراجات، انگلستان میں ان کی کم یابی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس قدر قبل یعنی 1617ء میں اس کی کم یابی کے باعث کمپنی کو بندوق کے بارود کے فراہمی میں دقت پیش آئی۔ 1624ء میں بحریہ کے کمشنروں کا اصرار تھا کہ ولندیزیوں کی طرح انھیں بھی شورہ ہندوستان سے لانا چاہیے اور اس سال کے اواخر میں کمپنی سے خود اپنا بارود تیار کرنے اور اپنے لیے شورہ لانے کو کہا گیا۔ 1621ء میں انگلستان کو بھیجی ہوئی ایک رپورٹ کے خلاصہ میں اس اندراج سے کہ سورت کے نواحی علاقہ میں شورہ نہیں ملتا، ظاہر ہوتا ہے کہ 1620ء میں کمپنی نے اسے سورت سے بھیجے جانے کی فرمائش کی تھی لیکن چار سال بعد کیپٹن وِڈِل کی اطلاع کے مطابق ولندیزی اسے جہازوں پر بھرتی کے مال کے طور پر لاد رہے تھے۔ یہ ذخیرہ 1626ء کے اختتام پر لندن پہونچا۔ اور ہم اب یہ تصور کرسکتے ہیں کہ اس سال انگریزوں نے اس کی تجارت میں اپنے قدم جما لیے۔

+ HARRDEN

شورہ ہندوستان کے مختلف حصّوں سے حاصل کیا جاتا تھا۔ جیساکہ اس کے قبل گزرچکا ہے۔ سب سے پہلے ساحل کورومنڈل سے استفادہ کیا گیا۔ اور تھوڑے عرصہ بعد گجرات اور آگرہ سے اور پھر کونکن کے بعض بندروں سے لیکن بالآخر خریداروں کے اڑیسہ کی بندروں کی راہ سے اور پھر زیادہ موثر طور پر ہگلی کے راستہ بہار پہنچ جانے کے بعد مذکورہ بالامقامات سے اس کے حصول کی اہمیت کم ہوگئی۔ 1650ء تک تجارت کی مقدار واجبی رہی اور مجھے کسی بھی تجارتی موسم میں انگریزی برآمدات کے 50 ٹن تک پہنچنے کی کوئی مثال نہ مل سکی۔ 1625ء میں 25 ٹن کی، 1639ء میں 33 ٹن کی، 1643ء اور 1648ء میں 300 سے لے کر 400 تک گانٹھوں (5 ٹن سے کم) کی اور 1644ء میں 20 سے 25 ٹن تک کی اطلاعات ملتی ہیں۔ ولندیزی برآمدات کی مقدار قطعاً بہت زیادہ تھی لیکن ان کا صحیح شمار مشکل ہے۔ کیونکہ بعض جہازوں کے بار غیر واضح جسامت کی اکائیوں میں دیے گئے ہیں۔ ان کے تخمینی وزن کی بنیاد پر 1630ء اور 1650ء کے دوران برآمدات کی مقدار بظاہر 200 سے 300 ٹن تک رہی ہوگی اور ہم 300 ٹن کو ان کی اور انگریزوں کی مجموعی تجارت کا معیار تصور کرسکتے ہیں۔ اس وقت تک حقیقتاً شورہ بحیثیت ایک اہم تجارتی سامان کے نیل یا کیلیکو، کا ہمسر نہ تھا کیونکہ ساحل پر اس کی مروجہ قیمت خرید کی وجہ سے اس میں نسبتاً کم منافع کی گنجائش رہتی تھی۔ اور جہازوں پر لدائی کے وقت زیادہ نفع بخش مالوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ شورہ کی برآمدات صرف اس بنا پر نفع بخش ہوسکتی تھیں کہ انہیں جہاز پر سامانوں کی گانٹھوں کے درمیان کھلی ہوئی شکل میں بھرتی کے مال کے طور پر جسے انڈونٹ کنٹلج" کہتے تھے کچا کچ بھر دیا جائے [1]

پٹنہ میں ولندیزیوں اور انگریزوں کی تجارتی کوٹھیاں قائم ہونے کے بعد اس کی تجارت میں غیر معمولی توسیع ہوئی اور اس کی فراہمی کی سہولتوں میں اضافہ کے ساتھ ساتھ یورپ میں اس کی

---

[1] اسی طور پر گانٹھوں کے درمیان سیاہ مرچ کو عام طور پر کھلی ہوئی حالت میں رکھ کر لے جاتے تھے۔ اور بعض اوقات خام کپاس کو کھلا ہوا ٹھونس کر بھر دیتے تھے۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں، KINTLEDGE یا KINTLEGE کو وہ سامان بتایا گیا جو مستقلاً بھرتی کے مال کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ لیکن ہندوستان میں آڑھتیے اس لفظ کو عام طور پر ہر اس چیز کے مفہوم میں استعمال کرتے تھے جسے جہاز کے مال گودام میں کھلا ہوا رکھ کر کسی ایک سمندری سفر کے دوران لے جاتے تھے

مانگ بڑھی۔ 1653ء میں انگریزی کمپنی نے 200 ٹن شورہ کی فرمائش کی۔ اگلے برس کے، اعداد غیر واضح ہیں لیکن نجی مالکوں کے جہاز اس کے بیحد خواہشمند نظر آتے تھے اور کمپنی کی اجارہ داری کے دوبارہ بحال ہو جانے کے بعد بنگال سے جہازوں کے ذریعہ بھیجے جانے کی مقدار 800 ٹن مقرر کی گئی۔ میں مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں "ٹن" کو وزن کے بجائے پیمائش کی اکائی تصور کرتا ہوں۔ پس ان اعداد کا مذکورہ بالا اعداد کے ساتھ براہ راست موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔[1] اس تجارت میں ولندیزی شریک دار تھے۔ جنھوں نے 1661ء میں 8½00 ٹن وزن کی بڑی مقدار جہازوں کے ذریعہ بھیجی۔ پس زیر مطالعہ عہد کے ختم ہوتے ہوتے شورہ قطعی طور پر تجارت کی ایک اہم چیز ہو گئی تھی جبکہ بیس برس سے کم قبل اس کی حیثیت بھرتی کے صرف ایک مال کی تھی اور دراصل یہ بیشتر مختلف مقامات سے تھوڑا تھوڑا کر کے فراہم کیا جاتا تھا، مگر اب برآمد کرنے کی غرض سے اس کی پیداوار کو بہار میں مرکوز کر دیا گیا تھا۔ اس صورت حال کی توجیہ اس خطہ میں اس کی کم قیمتوں سے کی جا سکتی ہے۔ تحریری اعداد اس قدر کم ہیں کہ ان کی بنیاد پر مختلف مراکز کی پیداواروں کی لاگت کا صحیح موازنہ نہیں کیا جا سکتا لیکن انگریزی مراسلات اور بٹاویا 'جرنلوں' میں جو ذخیں گاہے گاہے ملتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ پٹنہ میں 74 ال۔ بی۔ کے ایک من کی لاگت تقریباً وہی تھی جو احمد آباد میں 37 ال۔ بی۔ کے ایک من کی یعنی وہاں کی قیمت کا ٹھیک نصف اور پٹنہ کے جہاز کی لدائی کے بندر سے نسبتاً زیادہ فاصلہ مسلسل دریائی باربرداری کے ذرائع کی موجودگی سے بے اثر ہو جاتا تھا۔ پٹنہ میں لاگت کی قیمت کا لحاظ رکھتے ہوئے زیر مطالعہ دور کے اختتام پر اس تجارت سے بہار کی سالانہ آمدنی تقریباً ایک لاکھ روپیہ ہوتی تھی اور پٹنہ سے جہاز تک مال برداری کا صرف بھی تقریباً اسی قدر آتا تھا۔ اس علاقہ کے اعتبار سے تو یہ رقم کافی نفع بخش تھی لیکن ہندوستان کے لیے بحیثیت مجموعی اس کی کچھ

---

[1] جیسا کہ ضمیمہ 'د' میں واضح کیا گیا ہے یہ بتانا مشکل ہوتا ہے کہ آیا 'ٹن' وزن کا پیمانہ ہے یا پیمائش کا۔ حالانکہ اس زمانہ میں بیس ہنڈرویٹ ٹن کا استعمال شروع ہو چکا تھا مگر یہ ابھی مستحکم نہ ہوا تھا۔ ولندیزی تحریروں کے مختلف اعداد کی بنیاد پر ایک 'لاسٹ' (LAST) میں پاؤنڈ کی تعداد کا حساب نکالا جا سکتا ہے مختلف مساوات میں بہت قریبی مطابقت پائی جاتی ہے اور ان سے شورہ کے ایک ٹن (TUN) (نصف لاسٹ) کا وزن تقریباً 1800 اور 1900 پاؤنڈ ایورڈ پائیز کے درمیان آتا ہے۔ اس بنیاد پر 800 ٹن (TUN) کی پیمائش، 700 اور 600 ٹن وزن کے برابر ہوگی۔

حقیقت نہ تھی۔

اس تجارت میں اکثر سرکاری حکام دخل اندازی کیا کرتے لیکن انصاف کی رو سے اس تجارت کے ظاہری محرک پر یعنی یہ کہ اس کی مانگ کا تعلق مقامی فوجی ضروریات سے تھا کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا اور عملی طور پر اس کے برآمد کرنے کی ممانعت سے معمولاً معقول رشوت دے کر یا محصول جمع کرنے والوں سے غلط بیانی کر کے بچایا جا سکتا تھا۔ ۱۶۴۶ء میں سرکاری دخل اندازی کی غیر متوقع طور پر ایک مختلف صورت اس وقت سامنے آئی جب اس وقت گجرات میں بادشاہ کے نائب شاہزادہ اورنگ زیب نے اس کی برآمد کو اس بنیاد پر ممنوع قرار دے دیا کہ ہندوستانی شورہ سے تیار شدہ بندوق کا بارود ممکن ہے کسی مسلم ملک کے خلاف استعمال کیا جائے۔ لیکن شاہزادہ کے دوسری جگہ تبدیل ہو جانے پر یہ رکاوٹ فوراً رفع ہو گئی۔ اور بہرحال اس زمانہ کے عیسائیوں کو اس ممانعت پر معترض ہونے کا کوئی حق نہ پہنچتا تھا کیونکہ اس کے تھوڑے دنوں قبل ہی روم کے کلیسائی پادریوں نے ٹھیک انھیں بنیادوں پر پرتگیزیوں کے بیجاپور گھوڑے فراہم کرنے پر اعتراض کیا تھا۔ سرکاری دخل اندازی کے علاوہ اس تجارت میں دوسری واحد دشواری اس کے صاف کرنے کے کارخانوں میں مناسب برتنوں کی فراہمی سے متعلق تھی۔ شورہ بہرحال ایک ضخیم شے ہوتی تھی اور اس کو آلائشوں سے صاف کرنا ضروری تھا لیکن ہندوستانیوں کا بھاپ بنا کر اس کی گندگی کو اڑانے کا طریقہ جس میں مٹی کے برتن استعمال کیے جاتے تھے غیر تسلی بخش تھا اور تانبہ کے آلات مقامی طور پر دستیاب نہ ہو سکتے تھے۔ ۱۶۴۱ء میں ساحل کورومنڈل کے ولندیزیوں نے لکھا کہ ان کے کڑاہ اب گھس گئے ہیں اور انھوں نے بتایا ہے ان کی مرمت کے تانبہ کی چادریں بھیجئے اور ساتھ ساتھ ہالینڈ سے نئے کڑاہ کی فراہمی کی فرمائش کی۔ اس کے گیارہ برس بعد انگریزوں کو معلوم ہوا کہ ہگلی یا لاہور میں مفید مطلب تانبا اور پیتل نہیں مل سکتیں۔ چنانچہ انھوں نے مدغاسکر میں نوآبادی قائم کرنے کے ایک ناکام منصوبہ کے سلسلے میں ٹکسال سازی کی غرض سے بھیجے گئے آلات کو اس مصرف میں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طور پر اس رکاوٹ کو بہ سہولت حل کر لیا گیا اور فی زمانہ اس میں دلچسپی کا یہ پہلو ہے کہ اس کے مطالعہ سے ان دنوں ہندوستان میں تانبہ کے ذخیرہ پر روشنی پڑتی ہے۔

فصل ۸ ۔ سوتی سامان

گذشتہ تین صدیوں کے دوران، ہندوستان اور مغربی یورپ کے درمیان سوتی سامان کی تجارت متعدد واضح ادوار سے گزری ہے اور اس موضوع کے طالب علموں کے لیے مناسب ہوگا کہ وہ اپنی توجہ صرف اس مخصوص زمانہ کے واقعات پر مرکوز رکھیں جس سے انھیں دلچسپی ہو۔ زیر مطالعہ عہد کا تعلق صدی کے نصف آخر میں یورپی فیشن میں رونما ہونے والی غیر معمولی تبدیلیوں سے نہیں ہے۔ ۱۶۵۰ء تک بحیثیت پوشاک کے تن زیب اور چھپے ہوئے کپڑے کی کوئی مانگ نہ تھی۔ پچھم کی طرف برآمد کی کیے جانے والے پہننے کے کپڑے کی تقریباً تمامتر منزل افریقہ یا امریکہ تھی جہاں اس کی تجارت کو پرتگیزیوں نے قائم کیا تھا۔ اس فصل میں ہمارا تعلق خصوصی طور پر میز پوش، بستر کی چادر، دست پاک+، یا تولیہ ایسی گھریلو ضروریات کی چیزوں کو پورا کرنے کے سلسلہ میں ہندوستانی کیلیکو کو استعمال کیے جانے اور اس سے بہت تھوڑے درجہ میں ہندوستان کے رنگین یا پرتکلف کپڑوں کے پردوں، یا سجاوٹ کے طور پر استعمال کیے جانے سے ہے۔

زیر مطالعہ عہد کے شروع ہونے کے قبل اہل یورپ کو ہندوستان کے سوتی کپڑوں کی اقسام سے روشناس کرانے کا خاص ذریعہ کپڑوں کی وہ تھوڑی سی مقدار تھی جو وہاں خشکی کے راستہ برآمد ہوتی تھی، اور ان کے وہاں بہت ہی محدود مقدار میں کھپت کا سبب اخراجات حمل و نقل کی زیادتی تھی۔ خود یورپ میں گھریلو استعمال کے لیے 'لنن'، اور سجاوٹ کے لیے منسوج تیار کیا جاتا تھا۔ کیلیکو اور چھینٹیں نفاست میں ان کپڑوں کا مقابلہ نہ کرسکتی تھیں اور ان کی منڈی میں کھپت صرف قیمتوں کے کم ہونے ہی کی صورت میں ہوسکتی تھی اور یہ بھی اس وقت ممکن تھا جب انھیں ایک طویل مسافت کے بعد سمندری راستہ سے یورپ پہنچایا جائے۔ پرتگیزیوں نے اس سلسلے میں انھیں جو مواقع حاصل تھے ان سے استفادہ نہ کیا۔ لہٰذا سترھویں صدی کے شروع میں مغربی یورپ میں سوتی سامانوں کی ایک وسیع مگر بالکل غیر ترقی یافتہ منڈی وجود میں آگئی تھی۔ اس صورت حال کے روشن امکانات کو خاص طور پر انگریزی کمپنی کی سرگرمی کے ذریعہ سمجھا گیا کیوں کہ جیسا کہ آگے ذکر آئے گا کہ ولندیزی اس منڈی کے جم

+ NAPKIN

جانے پر تو اس میں ضرور داخل ہو گئے لیکن اس کے شروع کرنے میں انھوں نے ذرا بھی حصہ نہ لیا۔ ان کے اس رویہ کا خاص سبب غالباً یورپی لنن کی صنعت کے مخصوص حالات تھے۔ انگلستان میں زیادہ مقدار میں لنن تیار نہ ہوتا تھا۔ لہٰذا کیلیکو کی درآمد اس کے اور وہاں کی مقامی صنعت کے درمیان مقابلہ کا سبب نہ ہو سکتی تھی۔ علاوہ اس کے کیلیکو کی غیر ممالک میں بکری کی وجہ سے "ملک کے اندر زر نقد آتا تھا"۔ لہٰذا اس وقت کے کاروباری حلقے کیلیکو کی درآمد کی موافقت میں تھے۔ برخلاف اس کے ہالینڈ میں "لنن" کی صنعت خود بڑے پیمانہ پر موجود تھی یہ امر قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ ولندیزی کمپنی کے تاجر کسی ایسی چیز کی درآمد پر زور دیں گے جو ان کے ملک کی خاص اور ایسی نوعیت کی پیداوار کے جس کی وہ بغیر کسی زحمت کے تجارت کر سکتے تھے "مدمقابل ہو۔ یاد رہے کہ مسالوں اور مشرق بعید کی تجارت کی اجارہ داری کی وجہ سے بٹاویا کے قبضہ میں یورپ کو بذریعہ جہاز بھیجنے کے لیے تجارتی سامانوں کی کمی نہ تھی۔ درانحالیکہ ہندوستان میں انگریز تاجروں کے لیے اپنے ملک واپس جانے والے جہازوں کے لیے سامان کی فراہمی اکثر زحمت کا سبب ہوا کرتی تھی۔ نیل تنہا "تجارت کو چلانے" کے لیے کافی نہ تھی۔ لہٰذا ہندوستان میں زیادہ مقدار میں قابل حصول سوتی سامانوں کے لیے یورپ میں منڈی قائم کرنا ضروری تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر مناسب ہوگا کہ اس منڈی کے قیام کی تفصیلات کو انگریزی تحریروں میں تلاش کیا جائے۔

انگریزی کمپنی، ہندوستان کے ساتھ اپنے کاروباری تعلقات قائم کرنے کے وقت ہی سے سوتی سامان کی تجارت کے امکانات سے باخبر تھی۔ متوقع مانگ کی نوعیت کا ۶۱۰۷ء اور اس کے بعد کے مسلسل جہازی بیڑوں کی مرسلہ ہدایات میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہمارے موجودہ مقصد کے لیے ولیم فنچ کی سورت سے اپنے وطن بھیجی گئی تجارتی رپورٹ کا حوالہ[1] کافی ہوگا۔ اس رپورٹ میں ایک لائق اور اپنے فرض سے باخبر خریدار کی موقع پر قائم کی ہوئی رائے کو بیان کیا گیا ہے۔ فنچ پہلے 'بافتوں' کے مختلف[1] اقسام بڑودچ کے نسبتاً زیادہ نفیس

---

[1] جیسا کہ پچھلے باب میں ذکر آچکا ہے، گجرات کے معمولی کیلیکو، کا تجارتی نام 'بافتہ' تھا اور شمالی ہندوستان کے مقام سمانا میں تیار کیے ہوئے کیلیکو کو 'سیمیانوز' اور عام استعمال کی دھوتیوں کو دتیز کہتے تھے۔ ولندیزی کپڑوں کے مشابہ بیرامیز اچھے قسم کے ہوتے تھے مگر ان میں تن زیب کے

(باقی صفحہ 159 پر)

مصنوعات اور دوسرے مقامات کے موٹے سامانوں کا اور اس کے بعد 'سیمیانوز'، جو 'کیلیکو' سے زیادہ چوڑے اور میرے خیال میں بمقابلہ بافتوں کے انگلستان کے لیے زیادہ موزوں تھے" ذکر کرتا ہے۔ 'سیمیانوز' (سماٹرا کے بافتے۔ مترجم) کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے 'کیلیکو' اور بافتہ کو تقریبًا مماثل اصطلاحات کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان کے بعد اس نے 'دتیوں' کا پھر بیرامیوں کا جو ولندیزی کپڑوں کے مشابہ تھے ذکر کیا ہے۔ کپڑوں کی مذکورہ چار اقسام کیلیکو کے عام مفہوم پر حاوی ہیں۔ ان کے بعد وہ ان سے نسبتًا ایک ہلکے کپڑے یا تن زیب موسومہ سیری لف جسے وہ غالبًا شمالی افریقہ کی تجارت کے لیے موزوں قرار دیتا ہے اور راس کماری کے قریب کسی مقام پر تیار ہونے والے زیادہ عرض کے ایک کیلیکو کا ذکر کرتا ہے جس کی انگلستان میں چادروں کے لیے اچھی کھپت" تھی۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ بشرط ضرورت "ان دیسی کپڑوں" سے بہتر کپڑے بھی مل سکتے تھے۔ پھر وہ شمالی افریقہ کی تجارت کے لیے موزوں بعض سامانوں کا اور گدوں اور نفیس پردوں کے لیے نفع پر فروخت ہونے والے پنٹاڈوز* (رنگین نقش و نگار سے مزین کپڑوں کے لیے عام انگریزی اصطلاح) کے ساتھ ساتھ سفید کیلیکو کے سلے ہوئے گدّوں اور سرخ یا نیلے رنگ کے کیلیکو کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ یہ اس کے بتائے ہوئے مغربی ممالک کو برآمد کیے جانے کے لائق موزوں سوتی کپڑوں کی مکمل فہرست ہے یعنی افریقہ کے لیے تن زیب، اور انگلستان میں گھریلو مصرف کے لیے مختلف اقسام کے کیلیکو کے علاوہ کچھ رنگین کپڑے بھی۔ اس کے بعد اس کا بیان جاوا اور سماترا کے ساتھ کپڑوں کی تجارت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

مذکورہ رپورٹ میں بتائے ہوئے خطوط پر انگریزوں کی بیشتر تجارت شروع ہوئی اور سورت سے روانہ ہونے والے پہلے جہاز پر بار کیے ہوئے سامانوں کو ہم ابتدائی دور کے برآمدات کا نمونہ تصور کر سکتے ہیں۔ اگلے صفحہ پر دیے گئے گوشوارہ میں ۱۶۱۹ء میں 'رائل آئن'، نامی جہاز کے ذریعہ برآمد کیے گئے سوتی سامان درج ہیں۔ قیمتیں گجرات کے مروجہ سکہ محمودی میں جو ایک روپیہ کے ۲/۵ حصے کے

(بقیہ صفحہ 158) بجائے 'کیلیکو' کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ نام کپڑوں کے بہت سے اقسام پر حاوی تھا اور سیری باف کا دکن کے مشہور تن زیبوں میں شمار تھا۔

+ Sahn Lauhas .

* PINTADOS

برابر ہوتا تھا اُگھلائی گئی ہیں۔ ان میں جہاز تک سامانوں کے اخراجات نقل وحمل بھی شامل ہیں۔
یہ پہلی نظر میں دیکھا جا سکتا ہے کہ اس فہرست میں شامل متعدد مدیں نمونہ کے طور پر بھیجے ہوئے سامانوں کی ہیں اور یہ بھی کہ خاص برآمدی سامان معمولی "کیلیکو" بڑے اور چھوٹے عرض کے بافتہ، دتیاں اور سیمیانوز، یعنی دس برس پیشتر فیج کے مجوزہ چار میں سے تین اقسام کے کپڑوں پر مشتمل ہے۔ یہ بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ایک ہی قسم کے نام کے سامان کے مختلف ذخیروں کی قیمتوں کے درمیان اچھا خاصا فرق ہے۔ اور اس تجارت کو سمجھنے میں اس بات کی بیحد اہمیت بھی ہے۔ ابھی تک اِن کپڑوں کا کوئی معینہ معیار نہ تھا۔ کاریگر انفرادی طور پر بیشتر اپنی مرضی کے کپڑے بنتے تھے اور خریداروں کو حسب ضرورت ان میں سے منفرد تھانوں کو لینا ہوتا تھا۔ انگلستان کے لیے بالعموم بہترین تھان منتخب کیے جاتے تھے اور گھٹیا سامان پوربی منڈیوں کے لیے جاوا بھیج دیا جاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ ہمعصر مصنفین جب انگلستان کے لیے "نفیس" سامانوں کی خریداری کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ان کا یہی مفہوم ہے۔

گوشوارہ

قسم	تھانوں کی تعداد	مالیت	اوسط قیمت فی تھان
کیلیکوز،		محمودی	محمودی
(ا) بافتہ			
(1) گنگھمس، ×	40	276	6.9
(2) چوڑا	8	120	15.0
،،	5302	33,195	6.3
،،	1000	6,777	6.8
زیادہ چوڑا (ج)	1	24	24.0
(3) کم چوڑا	980	3,680	3.8
،،	20	55	2.7

GINGAMES. ×

کم چوڑا	1997	9,950.	5.0
(4) میز کے رومالوں کے لیے	80	218	2.7
(5) 'واچیٹس' (یعنی نیلا)	20	160	8.0
رنگین	?	3,584	?
واچیٹس×	200	635	3.3
(ب) 'دتیاں'+			
(1) غیر مصرحہ	290	1,066	3.7
رر	480	2,190	4.6
دھولتہ	400	1,291	3.2
(ج) سیمیانوز*	2330	14,075	6.0
نفیس کپڑے اور غیر واضح اقسام			
متفرق کپڑے	200	(?) 187	(?) 0.9
رنیز	275	1150	4.2
ساہوا	50	431	8.6
نیکانیز	420	1,320	3.1
ارامیز	?	177	?

بعض رنیز پر اس قسم کا نمونہ بنا ہوتا تھا جسے انگلستان میں ڈیمسک کہتے ہیں۔
'نیکے نیز' دھاری دار کیلیکو ہوتے تھے۔ 'ارامیز' ناظرین کرتے کے استعمال میں آنے والے قسم کے کپڑے (احرام) ہو سکتے ہیں۔ مجھے 'ساہم' کی کوئی تفصیل نہ معلوم ہو سکی۔ اس سے ان کی مراد اعلیٰ قسم کے ہندوستانی کپڑے مثلاً تن زیب اور دیگر باریک کپڑے جو گرم ممالک کے لیے تو موزوں لیکن انگلستان

BUTTIES ×

BATCHETTS +

SEMIANOES *

میں استعمال کے لیے بے مصرف ہوتے ہیں، نہیں ہے۔ ان کا مفہوم 'کیلیکو' کے ان بہترین تھانوں سے ہے جو ان کی خریداری کے لیے موزوں تھے۔

انگلستان میں 'کیلیکو' کی مانگ غیر معمولی تیزی کے ساتھ بڑھی۔ 1619ء میں جہازوں کے ذریعہ بھیجے گئے سامان کی میزان 14,000 تھان (ہر تھان بالعموم 12 سے 15 گز تک لمبا ہوتا تھا) تھی اور 1625ء میں 200,000 تھانوں کی فرمائش ہوئی۔ 1628ء میں جس قدر گانٹھیں واقعتاً بھیجی گئیں ان کی تعداد 1,000 تھی جس میں 150,000 یا اس سے زائد تھان تھے اور 1630ء میں جب گجرات کے قحط کے باعث تجارت کا یہ دور اچانک ختم ہونے کے قریب پہنچ گیا تو کمپنی نے 'کیلیکو' کے 100,000 سے 200,000 تھانوں تک اور تھوڑے نفیس کپڑوں کی فرمائش کی۔ برآمد کی زیادہ مقدار کے باعث بادشاہ جیمس اول ادھر متوجہ ہوا۔ اور اسے کمپنی کے ڈپٹی گورنر سے دریافت کرنے پر کہ ان کا کیا مصرف ہے یہ جواب ملا کہ "ان کا بیشتر حصہ بہت کارآمد ہے اور انگلستان میں فروخت ہوتا ہے۔ ان کی وجہ سے لان[*] (باریک ململ) کیمرک، اور لنن، کے دوسرے کپڑوں کی قیمتیں کم رہتی ہیں۔ ان سامانوں کا باقی حصہ اب انگلستان کی خاص پیداوار کا درجہ رکھتا ہے اور ملک معظم کی مملکت کی ضروریات کے مصرف میں آنے کے بعد جو بچ رہتا ہے اسے مثل مقامی پیداوار کے دیگر ممالک کو برآمد کر دیتے ہیں۔"

بادشاہ نے اس صورت حال کو بے حد پسند کیا اور کہا کہ ملک "میں زر نقد لانے کا یہ آسان طریقہ ہے"۔ اس سے کچھ کم دو برس بعد گورنر نے کمپنی کو خبر دی کہ سورت کے کپڑوں کی بکری بہت بڑھ گئی ہے۔ اور کیلیکو کی غیر ملکی مانگ اس قدر زیادہ ہے کہ اگر 100,000 سے 200,000 تھان تک بھی ہوں تو تھوڑی مدت میں فروخت ہو سکتے ہیں۔ مانگ میں یہ اچانک اضافہ فوری طور پر تنہا گجرات سے پورا نہ ہو سکا تھا چنانچہ خریداروں کو شمالی ہندوستان کے ان مقامات پر بھیجا گیا جہاں کے خاص دلیساوری مال لندن کی منڈی کے لیے موزوں تھے۔ وہ مقامات جہاں آڑھتیوں کو خاص طور پر بھیجا گیا تھا پٹنہ اور سمانہ تھے لیکن دوسرے علاقوں خاص طور پر اودھ میں بنے ہوئے 'کیلیکو' کو بھی آگرہ سے خریدا گیا۔ پٹنہ کو جلد ہی خیرباد کہہ دیا گیا تھا مگر 1627ء تک سمانہ میں بار بار خریداریوں کی اطلاع ملتی ہے۔ لیکن یہاں کی مصنوع کے متعلق کمپنی کا آخری فیصلہ خلاف رہا اور 1630ء کے شروع کی فرمائشوں میں جس کا حوالہ پہلے آ چکا ہے صرف گجراتی کیلیکو کی طلب کی گئی اور "آگرہ کے مال کو" مع 'سیمیانو' کے بصراحت منع کیا گیا ہے لیکن قحط کی وجہ سے ان فرمائشوں کی تعمیل نہ کی جا سکی اور کپڑوں کے علاوہ حصول کو

LAWN *

وسعت دینا ضروری ہوا۔ 1635ء میں آگرہ، دریاباد ''سمپریا باد'' اور اکبریز'' کی خریداری کی ہدایت بھیجی گئی۔[1] اور ان میں سے پہلے دو کپڑے جو اودھ کے قصبات دریاآباد اور خیرآباد میں بنے جاتے تھے، مغربی اودھ کی ایک دوسری مصنوع مرکولی کے ساتھ ساتھ جلد ہی مشہور ہو گئے۔ 1640ء میں لکھنؤ میں ایک تجارتی کوٹھی دریاآبادی مال کو فراہم کرنے کے خاص مقصد سے کھولی گئی۔ خیرآبادی مال کو روک دیا گیا تھا۔ لیکن یہ ممانعت برقرار نہ رہی اور ہم صدی کی چھٹی دہائی میں ان دونوں مقامات کے کپڑوں کو لندن میں فروخت ہوتا ہوا پاتے ہیں۔ 1641ء میں کمپنی نے شمالی ہندوستان کے ان کپڑوں کے متعلق اپنی امتیازی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ بڑودہ یا بڑوچ کے جوڑے بافتوں کے بالمقابل مرکولی کو ترجیح دی گئی۔ دریاآبادی خوب قبول کیے جاتے تھے، اور شمالی ہند کے مال کے کم ہونے کی ہی صورت میں گجراتی بافتے فراہم کیے جانے کی اجازت تھی۔ اس طور پر شمالی ہند کے بنکروں کے لیے اب لندن کی منڈی کے دروازے قطعی طور پر کھل گئے۔

سندھ کی تجارت میں انگریزی کمپنی کی شمولیت کا ذکر کسی پچھلے باب میں آچکا ہے۔ 1635ء میں پہلے پہل جو خریدار کی بھیجے گئے تھے انھیں خاص طور پر لندن کے لیے موزوں کیلیکو تلاش کرنے کی ہدایت تھی حالانکہ ساتھ ساتھ ان میں گنی اور جاوا کی منڈیوں کے لیے علی الترتیب چارخانے اور کپڑوں کی بھی فکر کرنی تھی۔ خریداروں نے مقامی 'کیلیکوز' کے متعلق اچھے خیالات کا اظہار کیا اور انگلستان میں انھیں قابل قبول پایا گیا۔ یہاں ان کی بکری وقفوں کے ساتھ ہمارے عہد کے اختتام تک چلتی رہی لیکن اس علاقہ کے حالات کے باعث وہاں ان کی قابل حصول مقدار قلیل تھی۔

مشرقی ساحل سے لندن کے لیے 'کیلیکو' فراہم کرنے کی پہلی کوشش کا آغاز بظاہر 1621ء میں ہوا تھا لیکن اس کی بکری کے اطمینان بخش نہ ہونے کے باعث اسے ختم کر دیا گیا۔ 1630ء میں سورت کے آڑھتیوں نے اس موضوع کو دوبارہ زندہ کیا اور انگلستان میں گجراتی مال کی فراہمی کے

---

[1] دریاآباد، لکھنؤ اور فیض آباد کے نصف راستہ پر واقع ہے۔ خیرآباد لکھنؤ کے شمال میں تھوڑے فاصلہ پر ہے۔ مجھے ''اکبریز'' کی کوئی تفصیل نہ مل سکی لیکن قیاس کیا گیا ہے کہ یہ اکبر بادشاہ کا کوئی پسندیدہ یا اس کے نام پر موسوم کوئی کپڑا رہا ہوگا۔ یہ خاص طور پر اودھ میں اور کم از کم کچھ عرصہ تک فیض آباد کے قریب جلال پور کے نواح میں تیار ہوتا رہا۔

بند ہونے کی اطلاع پہنچنے پر کمپنی نے یہاں سے مال کی برآمدگی کی منظوری دے دی۔ لیکن لندن کی فرمائشوں کی تکمیل میں زیادہ تاخیر ہوئی اور 1636ء میں آڑھتیوں کو پچھلے پانچ برسوں کے دوران 32،500 پونڈ کی فرمائشوں کے بالمقابل صرف 1269 پونڈ کی مالیت کے "کیلیکو" فراہم کرنے پر بے حد سرزنش کی گئی۔ اس سرزنش کی وجہ سے جنوری 1639ء میں براہ سورت زیادہ مقدار میں یہاں کا مال انگلستان روانہ کیا گیا۔ اگلے موسم سرما میں کچھ بھی مال فراہم نہ ہو سکا۔ 1640ء میں سورت میں کافی مال کا ذخیرہ جمع ہو گیا لیکن اس قدر دیر ہو چکی تھی کہ ان کے لیے جہازوں پر گنجائش نہ نکل سکی اور اس برس کے بیجک میں "لانگ کلاتھ" کی صرف ایک گانٹھ کا بطور نمونہ بھیجے جانے کا اندراج ملتا ہے۔ "کیونکہ مدراس پٹم میں تمہارے نئے قلعہ کا یہ پہلا پھل ہے۔"

نئے علاقوں میں اس کاروبار کے پھیلاؤ کے نتائج کو قحط کے فوری اثرات کے زائل ہونے کے بعد 1639 اور 40ء میں سورت سے جہازوں کا ذریعہ انگلستان بھیجے گئے سامان کے بیجکوں میں دیکھا جا سکتا ہے، سوتی کپڑوں کے برآمد کیے ہوئے تھانوں کی تعداد حسب ذیل ہے۔

سورت سے لندن بذریعہ جہاز بھیجے گئے سوتی کپڑوں کے تھانوں کی تعداد

علاقہ حصول	موسم 1638-39ء	موسم (1) 1639-40	موسم 1640-41
مشرقی ساحل	18،225	—	25
بنگال	6،700	—	—
گجرات	38،883	13،660	18،918
آگرہ	2،823	12،122	23،550
سندھ	—	28،507	11،360
	66،641	54،289	53،853

[1] اس برس کا ایک بیجک لاپتہ ہے اور غالباً مجموعی برآمد مذکورہ اعداد سے زائد تھی۔ (نوٹ) کتاب کے جدید ایڈیشن میں ص 129 پر اس فٹ نوٹ کے حوالے کے عدد کا اندراج نہیں ملتا۔ اسے 1923ء کے ایڈیشن سے حاصل کیا گیا ہے۔

بیشتر گجراتی تھانوں کی طرح آگرہ اور سندھ کا کل مال جو اعداد بالا میں دکھایا گیا ہے 'کیلیکو' تھا۔ لیکن گجراتی تھانوں میں "گنی اسٹفس" کا بھی ذخیرہ یعنی مغربی افریقہ میں بکری کے لائق دھاری دار یا چارخانہ کے نفیس کپڑے تھے۔ جنوری 1639ء میں مشرقی ساحل اور بنگال سے بھیجے گئے سامان متنوع تھے۔ حالانکہ ان میں 'کیلیکو' کی کثرت تھی اور نفیس بیجکوں کو بغور دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی تک خریدار لندن کی منڈی کو فراہم کیے جانے والے سامانوں کے اقسام کے متعلق متذبذب ہی تھے۔ پس ہم اسے سامان کی تجرباتی کھیپ تصور کر سکتے ہیں۔ بنگال کے سامانوں کے متعلق کچھ مزید لکھنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ہمارے عہد کے دوران یورپی منڈیوں کو سامان فراہم کرنے والے ایک علاقہ کی حیثیت سے ان کو واضح کوئی اہمیت حاصل نہ ہو سکی تھی۔ لیکن خاص ساحلی 'کیلیکوز' جو بہت تیزی کے ساتھ پسند کیا جانے لگا تھا اس کا ایک مختصر بیان ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان کے ناموں کی مختلف شکلیں ہیں۔ ہم انھیں پارسیلز، موریز، سالیم پورس اور لانگ کلاتھ کے طور پر لکھ سکتے ہیں۔ پارسلیس (8 گز × 1 گز) فی الجملہ اعلیٰ ترین کپڑا تھا، حالانکہ موریز (9 × 1¼) کی بہترین قسم بھی تقریباً اسی حیثیت کی ہوتی تھی۔ اسی طور نفیس قسم کے سالیم پورس (16 × 1) عام موریز کے مساوی الحیثیت لیکن لیکن معمولی سالیم پورس لانگ کلاتھ (30-40 گز × 1 گز یا قدرے زائد) یا مضبوط کیلیکو کے مساوی الحیثیت اور گھریلو استعمال کے لیے بہت اچھے ہوتے تھے۔ لانگ کلاتھ ساحل پر تیار ہونے والا خاص 'کیلیکو' تھا۔ یہ بظاہر وہی کپڑا ہے جسے پرتگیزی اور ولندیزی گنی کلاتھ کہتے تھے لیکن یہ کپڑے سادہ رنگین یا تصویروں سے مزین (چھیٹا ڈوز) مشرق اور نیز مغرب میں بکتے تھے۔ اور ہمارے عہد کے ختم ہوتے ہوتے لندن کی منڈی میں اس کی حیثیت اہم ترین 'کیلیکو' کی ہو گئی تھی[1]

---

[1] اوپر متن میں مندرج تفصیلات ہمعصر تجارتی تحریروں سے ماخوذ ہیں۔ لہٰذا ہمیں ان کو اپنے عہد کے سلسلہ میں بعد کے ماخذ اور نیز ہابسن جابسن (HOBSON JOBSON) کی قیاس آرائیوں پر ترجیح دینا چاہیے۔ 'موریز' جنھیں اس تصنیف میں نیلے رنگ کا بتایا گیا ہے (صفحہ 707) صرف کبھی کبھی رنگین ہوا کرتے تھے لیکن انھیں بالعموم بادامی یا سفید کندی کی ہوئی حالت میں برآمد کرتے تھے۔ 'پارسلیس' سلمیٰ ستارے ٹنکے ہوئے عبا نہیں (صفحہ 708) بلکہ سادے کیلیکو کے تھان ہوتے تھے۔ 'سالم پورس' بالعموم

(باقی صفحہ 166 پر)

1631ء - 39 اور 41 - 1640ء کے اعداد متعلقہ کاروباری موسموں کی انگریزی تجارت کو ظاہر کرتے ہیں اور دس برس قبل کے زائد از 00،000، 1 تھانوں کے معیار میں اب واضح طور پر کمی ہوگئی۔ اس کمی کا سبب گجرات کا قحط تھا۔ ان کے حصول کے متبادل ذرائع کی تلاش میں کچھ وقت صرف ہوا اور اگر ایک طرف تنہا گجرات پوری مانگ کی مقدار کو پوری نہ کرسکا تو دوسری طرف یہاں کے مصنوعات کے معیار میں بھی نمایاں طور پر انحطاط رونما ہوا۔ اس صورت حال نے یورپی منڈی کے لیے تباہی کا خطرہ پیدا کردیا۔ چنانچہ 1638ء میں کمپنی نے اطلاع بھیجی کہ ہندوستانی 'کیلیکو' کے گھٹیا معیار اور ساتھ ساتھ ان کی قیمتوں کی گرانی نے اس کی مانگ کو رد کردیا تھا اور اب دوسرے ممالک کے مصنوعات اس کو بے دخل کرنے لگے تھے۔ اس کے تین برس بعد کی اطلاع ہے کہ سامان کے پچھلے کھیپ کے گھٹیا معیار کی وجہ سے ساکھ کو جو نقصان پہنچا وہ ابھی تک بحال نہ ہوسکا۔ "کیونکہ یہاں کیلیکو کی یہ صورت ہے کہ اگر انھیں جرمنی، اسکاچ اور فرانسیسی 'لنن' سے کم داموں پر فروخت نہ کیا جائے تو ان کی کافی کھپت نہ ہوگی اور اس صورت میں سورت کی تجارت کا ایک اہم ستون منہدم ہوجائے گا۔" ہندوستانی کیلیکو کا درحقیقت پچھمی یورپ کی مصنوعات سے اب براہ راست مقابلہ ہوا لہٰذا منڈی کا انحصار کلیتہً مال کی قیمت اور ان کے معیار ہونے پر ہوگا۔

مشرقی ساحل کی اضافہ پذیر اہمیت، اس تجارت کے اگلے دور کی نمایاں خصوصیت ہے یہ ساحل، پچھمی یورپ کے لیے سامان کی فراہمی کے ایک علاقہ کی حیثیت سے جلد ہی گجرات کو بے دخل کرنے والا تھا۔ 1638ء - 39 کی برآمدات کے بعد جس کا پہلے ذکر آچکا ہے اس علاقہ سے بظاہر سامان کی فراہمی رک گئی تھی کیونکہ 1644ء میں کمپنی کی اطلاع ہے کہ پانچ برسوں کے دوران یہاں سے بجز 'لانگ کلاتھ' کی گانٹھ کے اور کچھ موصول نہ ہوسکا۔ 1646ء میں بہرحال مدراس سے کچھ مال انگلستان پہنچا جسے نفع پر فروخت کیا گیا۔ 1650ء میں اس وقت جب کہ یورپی منڈیاں مندی چل رہی تھیں یہ اطلاع موصول ہوئی کہ خاص طور پر کورومنڈل کا مال فروخت ہو رہا ہے۔" جنھیں اس بنا پر کہ یہ فرانسیسی اور دیگر غیر ملکی فروختگیوں کے لیے انتہائی موزوں ہے،

(بقیہ صفحہ 165)

چھینٹ تو نہیں (صفحہ 78) مگر عام کیلیکو کی طرح چھپے ہوئے ہو سکتے تھے۔ اس قسم کے ناموں کے ماخذ کے متعلق بے حد قیاس آرائی کی گنجائش پائی جاتی ہے لیکن ان کی فرمائشوں اور بیجکوں کے حوالے سے ان کی نوعیت کو صحیح طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

سورت کے تمام کپڑوں سے زیادہ پسند کیا جاتا ہے" لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ 1646ء میں جب گجرات، آگرہ اور سندھ کے سامانوں کے ساتھ ساتھ مشرقی ساحل سے بھی سامان پابندی سے پہنچنے لگا تو یہ تجارت ایک نئے دور میں داخل ہوئی۔

میں اگلے دس برسوں کی برآمدات کے اعداد معلوم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا لیکن مختلف مراکز کو خریداریوں کے متعلق جو ہدایات جاری کی گئیں تھیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ تجارت 1640ء کے معیار سے آگے نہ بڑھ رہی تھی۔ یہ امر بہرحال واضح ہے کہ تجارت کے عملاً آزاد دنوں میں برآمدات میں زیادہ اضافہ ہوا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اجارہ داری کے دوبارہ بحال ہوجانے پر انگریزی منڈی زیادہ سامانوں سے پٹ گئی تھی۔ 1668ء میں جن سامانوں کی فراہمی کی فرمائش کی گئی ان کی مقدار حسب ذیل تھی۔

سورت سے ــــــ

'مرکولیز'×	10,000 تھان
کم عرض کے بافتے	10,000 "
زیادہ عرض کے بافتے	5,000 "
سندھی 'کیلیکو'	10,000 "
'دریا بادس'	10,000 "
'ڈنگاری' [1]	10,000 "
دیگر کیلیکو	8500 "
	63500

1,000 تھان چھینٹ اور 30 چھینٹ کے گدے بھی

---

[1] 'ڈنگاری' ایک بہت ادنیٰ قسم کا کپڑا تھا۔ (HOBSON JOBSON) ولندیزی بحیثیت میں دوسرے کپڑوں کی گانٹھوں کو باندھنے میں اس کا استعمال درج کیا گیا ہے۔

× MERCOULI

مدراس سے —

دلانگ کلاتھ	20,000 تھان = 50,000	معیاری تھان
دسالیم پورس	20,000 "	"
دوسرے کپڑے، معہ تھوڑے تن زیب کے	14,000 "	"
	84,000	

دلانگ کلاتھ، کی زائد لمبائی کا لحاظ رکھتے ہوئے، یہ دیکھا جائے گا کہ مانگ کی مجموعی مقدار تقریباً 15,000 معیاری تھان تھی جنھیں نصف سے زیادہ مشرقی ساحل سے فراہم ہونا تھا۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ منڈی کی ضروریات کا زیادہ تخمینہ لگایا گیا تھا۔ لہٰذا ایک سال بعد سورت سے سامانوں کی مانگ کو گھٹا کر بھی فرمائش کا بقدر ایک چہارم یا 16,000 تھان کرنا پڑا۔ اور 1660ء میں بھی اس کمی کو اس بنا پر برقرار رکھا گیا کہ منڈی سامان سے پٹی پڑی تھی اور کیلیکو لاگت کے دام پر بھی نہ فروخت ہو سکتے تھے۔ پس زیر مطالعہ عہد کے ختم ہوتے ہوتے، ہندوستان کے اس علاقہ سے کیلیکو کی مانگ کم ہو کر تیس برس قبل کے معیار کی تقریباً ایک بٹہ دس ($\frac{1}{10}$) ہو گئی تھی۔ البتہ مشرقی ساحل کی تجارت اطمینان بخش معیار پر برقرار رہی کیونکہ 1659ء میں مطلوبہ سامانوں کی فہرست میں 90,000 سے زائد معیاری تھانوں کی میزان ملتی ہے یعنی 50,000 دلانگ کلاتھ، 30,000 'سالیم پورس'، اور 11,000 دوسرے قسم کے کپڑے اس کے ساتھ ساتھ اگلے برسوں کے لیے اسی قسم کے تقریباً 100,000 معیاری تھان فراہم کرنے کی مستقل فرمائش کی گئی۔ پس لندن کی منڈی کو سوتی سامان فراہم کرنے والے ایک علاقہ کی حیثیت سے مدراس نے قطعی طور پر سورت کی جگہ لے لی۔

ولندیزیوں کی یورپی برآمدات کو اس سے زیادہ اختصار کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے 1620ء کے قبل ہی سے 'راس امید' کا چکر لگا کر سوتی مال لے جانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن ان کی برآمدات تقریباً سب کی سب اس نوعیت کی تھیں جن کی برازیل اور کبھی افریقہ میں کھپت تھی۔ اب ان خطوں سے پرتگیزیوں کی تجارتی اجارہ داری اٹھ چکی تھی اور ان کے بجائے جہاں ولندیزی تیزی سے غلبہ حاصل کر رہے تھے۔ اور انگریزوں ان کی برآمدی تجارت انھیں کا رد باروں تک محدود رہی جن میں پچھلی صدی کے دوران پرتگیزی اپنے قدم جمائے ہوئے تھے۔ اگلی دہائی میں انھوں نے اپنی اس تجارت میں کچھ ایسے سامانوں کا اضافہ کیا جن کی یورپی منڈی میں کھپت تھی اور

ان کی پہلی فرمائش جس کا مجھے پتہ چل سکا ہے وہ 1634ء میں 16,000 تھانوں کی تھی۔ اگلے چند برسوں میں ان کی یورپی تجارت میں اضافہ ہوا اور 1639ء میں ہالینڈ سے جو فرمائش کی گئی ان سے ہم ان کی تجارت کی وسعت کو معلوم کر سکتے ہیں۔ اس کا خلاصہ اس طور پر ہے[1]

1۔ گنی کلاتھ	500 ------ گانٹھیں
2۔ دیگر کیلیکو	
'سیمیانوز' (پنجاب)	1000 گانٹھیں
'امبرتیز' (بہار)	1000 "
زیادہ عرض کے بافتے (گجرات)	5,000 "
کم عرض کے بافتے (گجرات)	5000 – 4000 تھان
'دریاآبادس' (اودھ)	2.000 "
'سالیم پورس' (مشرقی ساحل)	4000 – 3000 "
'موریز' اور 'پارسیلس'	11,000 – 9000 "
	29,000 – 25000 "
3۔ مختلف تن زیب اور نفیس کپڑے (مشرقی ساحل اور بنگال)	11,000 — 8000 "

پہلے گذر چکا ہے کہ 'گنی کلاتھ' 'لانگ کلاتھ' کے مماثل ایک کپڑا تھا اور اس کی 500 گانٹھوں میں معیاری لمبائی کے تقریباً 20,000 تھان ہوتے تھے۔ اس طور پر مجموعی مانگ تقریباً 50,000 تھانوں کی ہوئی جس میں تن زیب اور نفیس کپڑوں کا تناسب بہت تھوڑا تھا۔ مجھے اس کے بعد سے، اپنے عہد کے اختتام تک ولندیزی تجارت کی تفصیلات کا کچھ پتہ نہ چل سکا لیکن 1670ء کے قبل تک اس میں کسی زیادہ اضافہ کی اطلاع نہیں ہے۔ اس

---

[1] یہ فرمائش HAGUE TRANSCRIPTS,II-LXXIII میں درج ہے۔ 'امبرتیز' پٹنہ کے قریب تیار کیے جانے والے 'کیلیکو' کو کہتے تھے۔ ان کا ذکر ENGLISH FACTORIES I. 162 میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر کپڑوں کی وضاحت پہلے آچکی ہے۔

x GUINEA CLOTH

سال کے بعد ان کی تجارت میں تیزی سے ترقی ہوئی۔

نئی برآمدات سے ہندوستانی بنکروں کو پہنچنے والے نفع کا شمار ان قیمتوں سے جو موقع پر کیلیکو کے لیے ادا کی جاتی تھیں کیا جا سکتا ہے۔ ان قیمتوں میں گانٹھوں کی تیاری ان کے باندھنے اور جہازوں تک پہنچانے کے اخراجات جو نسبتاً زیادہ ہوتے تھے شامل نہ کیے جاتے تھے زیر مطالعہ عہد کے دوران ان کی قیمتوں میں کسی مستقل تبدیلی کی کوئی شہادت نہ مل سکی۔ حالانکہ وقتاً فوقتاً یہ کم و بیش ضرور ہوا کرتی تھیں۔ اور اگر سندھ کے عام لمبائی والے کیلیکو کے ایک تھان کی قیمت ایک روپیہ سے لے کر دو روپیہ تک تھی جبکہ گجرات میں اس کی قیمت اس سے تقریباً نصف روپیہ زائد تھی۔ معیاری لمبائی کے لانگ کلاتھ کے بیچ کے نرخ تقریباً دو روپیہ فی تھان تھے لہذا ۵۰۰۰ ، ۱۰۰ سے زائد انگریزی مانگ کا یہ مفہوم ہوا کہ بنکروں کو اس سے تقریباً دو لاکھ روپے وصول ہوتے۔ اس میں ولندیزی برآمدات کا اضافہ کرنے پر ہم اس تجارت کی مجموعی مالیت کو تخمیناً تین لاکھ روپے یا اس سے قدرے زائد تصور کر سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس میں وہ اخراجات شامل نہیں ہیں جو وقت ضرورت تھانوں کی سفید کندی کرانے یا ان کی رنگائی بندھائی اور ان کو جہاز تک پہنچانے کے سلسلہ میں کیے جاتے تھے۔ دیگر برآمدات کی طرح اس میں بھی اور اگر وہ قیمتیں صرف چند علاقوں کے کاریگروں کے ایک مخصوص طبقہ کے درمیان تقسیم ہوتی تھیں اور نئی تجارت سے اس طبقہ کو اچھی خاصی منفعت حاصل تھی۔

یورپ میں کیلیکو کی برآمدی تجارت جانے میں وقتاً فوقتاً مختلف رکاوٹوں کا سامنا رہتا تھا۔ ان میں سے بعض براہ راست حکومت سے اور بعض صنعت کے مروجہ طریقوں سے متعلق تھیں۔ سرکاری مزاحمت کی بار بار شکایت رہا کرتی تھی مثلاً کبھی تو نئے محصولوں یا نئی جبری وصولیوں سے صنعت میں وقتی طور پر انتشار پیدا ہو جایا کرتا تھا۔ اور کبھی سرکاری سٹے کے لیے سامان فراہم کرنے کی غرض سے کرگھوں پر اجارہ داری نافذ کر دی جاتی تھی لیکن اس قسم کے واقعات تجارت کی کسی مخصوص شق میں دخل اندازی کے نہیں بلکہ انتظامیہ کی عام روش کے مظہر ہیں۔ ہمارے موجودہ مقصد کے اعتبار سے دوسری قسم کی دقتیں زیادہ اہم ہیں۔ سمندری ساحلوں کی پہنچ کے اندر جو کپڑا بننے کی صنعت تھی اسے خاص خاص ایشائی منڈی کو کپڑا فراہم کرنے کے واضح مقصد کے تحت منظم کیا گیا تھا، بلکہ ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی نشو و نما ہی اسی مقصد کے پیش نظر کی گئی تھی اور یورپی منڈیوں کے خریداروں کو ان کے

طریق کار کے مطابق اپنے کو ڈھالنا پڑتا تھا۔ چنانچہ مروجہ نظم کے مطابق انھیں مستقبل میں سامان کی فراہمی کے لیے زرِ پیشگی ادا کرنا ہوتا تھا لیکن انھیں منفرد دین داروں کی ساکھ جانچنے کے سلسلہ میں ہندستانی تاجروں کو ایسی سہولتیں حاصل نہ تھیں اور ضمانت کے مسئلہ پر بھی مختلف دقتیں پیش آتی تھیں۔
اس سلسلہ میں مدراس کی تجارتی بستی کے شرائط کی منظوری سے ایک عجیب تدبیر کا انکشاف ہوتا ہے جس میں 'نایک' نے یہ ذمہ داری قبول کی کہ "اگر انگریزی باشندے، تاجروں، کپڑا چھاپنے والوں[1]، بنکروں، وغیرہ ...... کو روپیہ دینے کے قبل ہمیں پہلے سے مطلع کر دیں اور ان کی خوشحالی اور سچے لین دین کی ہم سے ضمانت حاصل کریں تو پھر ایسی صورت میں اگر دیندار ان اپنا وعدہ پورا نہ کریں تو ہم انگریزوں کو ان کا روپیہ ادا کریں گے بہ صورت دیگر اگر وہ ہمارے علاقہ کے کسی بھی حصہ (کذا) میں موجود ہوں گے تو ہم انھیں ان کے حوالہ کر دیں گے"۔ لیکن قرض خواہوں کے مفاد میں سرکاری ضمانت کا یہ ایک ایسا خصوصی انتظام تھا جس کی عملی حیثیت بہرحال معرض بحث تھی اور اس علیہ کے تین برس بعد، مدراس کے آڑھتیوں کو اعتراف کرنا پڑا کہ "نادار چھیپوں اور بنکروں" پر اعتماد کرنے کی وجہ سے کمپنی کو سنگین نقصانات برداشت کرنے پڑے۔ ان کا یہ بھی قول تھا کہ "لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ ایک ایسے بڑے تاجر کے بغیر (جیسا کہ ولندیزیوں کے پاس ہے) جو ان سب کا ضامن ہو، اس طریق کار سے کلیتہً بچا نہیں جا سکتا۔ ہمارے پاس کبھی اس قسم کا ایک بڑا تاجر تھا"۔ لیکن اس نے اس کام کو غیر نفع بخش تصور کرتے ہوئے ترک کر دیا۔ اس کے تھوڑے ہی بعد ہمیں انگریزوں کی یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ انھیں کام کرنے والے بنکر نہیں مل رہے ہیں۔ کیونکہ ولندیزیوں نے اپنے وسیع وسائل کی وجہ سے دستکاروں کو زرِ پیشگی ادا کر کے پابند کر لیا ہے اور اس طرح وہ پیداوار پر عارضی طور سے قابض ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ نہ تصور کرنا چاہیے کہ ان پیشگی ادائیگیوں کی وجہ سے خریداروں کو ٹھیک ان کی مرضی کے مطابق مال مل جایا کرتا تھا۔ یورپی صارفین ایشیائی ذوق کے مطابق بنے ہوئے مال سے پوری طور پر مطمئن نہ رہا کرتے اور ہم زیرِ مطالعہ عہد کی پوری مدت میں یہ سنتے کہ کپڑوں کی لمبائی یا ان کے عرض یا ان میں دھاگوں کی تعداد میں تبدیلی کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ لیکن یہ کوششیں بہت کم کامیاب ہوا کرتیں۔ خریداروں میں باہمی مقابلہ نہ ہونے کی صورت میں تو بنکروں کا ان ہدایات کا تعمیل کرنا ممکن تھا۔ مثلاً سندھ میں بمقام نویبد تانوں میں دھاگوں کی تعداد بڑھوانے میں کوئی زحمت پیش نہ آئی۔

---

[1] کپڑا چھاپنے والے (چھیپے) وہ دست کار تھے جو 'پنٹاڈو' تیار کرتے یا سوتی کپڑوں پر نقش و نگار بناتے تھے۔

کیونکہ وہاں سے بہارے علاوہ اور خریدار نہ تھے۔" لیکن متعدد خریداروں کے ہوتے ہوئے بنکر
جانے بوجھے کپڑے پرانے ہی طریقوں پر تیار کرنا پسند کرتے تھے۔ اس طور پر مال میں یکسانیت ہونا
جس کا یورپی تھوک فروش خواہاں رہتا تھا بے حد وقت طلب تھا۔ منفرد تھان ہی نہیں بلکہ ہو سکتا
تھا کہ بھیجے ہوئے سامان کا مسلم ذخیرہ ہی لمبائی یا عرض یا دھاگوں کی تعداد کے لحاظ سے خاطر خواہ
نہ ہو۔ 1633ء میں کمپنی کو شکایت تھی کہ بھیجے ہوئے مال کی کھیپ "کسی بساطی کے گٹھڑ کے مثل تاجروں
کی غیر ملکی برآمد کے لحاظ سے تو ناموزوں اور دیہات کے خوردہ فروشی کے لیے موزوں ہے۔" اور
پانچ برسوں بعد انھوں نے تھانوں کی لمبائی پر نکتہ چینی کی اور مال میں کم از کم اس قدر یکسانیت
ہونے پر زور دیا ہے کہ "ہم جان سکیں کہ ہم کیا فروخت کر رہے ہیں اور خریدار یہ جان سکے کہ وہ کیا
خرید رہا ہے"۔ لیکن جن حالات میں یہاں کپڑے تیار کیے جاتے وہ کسی معینہ معیار کی پابندی میں مانع
ہوا کرتے۔ لہٰذا جب تک کہ ہندوستان کو اس صنعت کی عملی اجارہ داری حاصل رہی ان خامیوں
کو برداشت کرنا ناگزیر تھا لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ دیگر ممالک سے مقابلہ کی صورت میں یہی
خامیاں ضرر رساں ثابت ہوئیں۔

فصل 5۔ دیگر اشیا اور عمومی تبصرہ

وہ اشیا جن پر ابھی بحث آئی ہے یعنی نیل، شورہ اور کیلیکو، ہندوستان اور مغربی یورپ
کے درمیان نئے تجارتی رشتوں کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے تھے کیونکہ بغیر ان کے کسی نفع بخش تجارت
کا قیام ممکن نہ تھا لیکن ایک بار جب جہازوں کی آمد و رفت شروع ہو جاتی تو ان کے علاوہ
دوسرے سامانوں کے برآمد کے لیے بھی مواقع فراہم ہو جاتے اور یورپی آڑھتیے ہندوستان سے
ثانوی اہمیت کی اشیا کی تلاش میں پوری کوشش صرف کر کے انھیں لندن اور ایمسٹرڈم کی منڈیوں تک
پہنچاتے۔ ان میں سے بعض اشیا تو فی الفور مسترد کر دی جاتیں اور بعض دھیرے دھیرے قبول کی جاتیں
ان میں سے چار اشیا یعنی خام کپاس، سوت، شکر اور ریشم کا مختصر بیان مناسب ہوگا۔

مغربی یورپ میں کپاس کی صنعت کی ابتدائی تاریخ قدرے غیر واضح ہے لیکن اس قدر
معلوم ہے کہ سترھویں صدی کے آغاز پر انگلستان اور ان کے پڑوسی ممالک میں تھوڑا خام کپاس
شمع کی بتی اور معمولی استعمال کی دیگر اشیا کے لیے اور تھوڑا فسٹین× نامی کپڑا جس میں بالعموم

FUSTIAN ×

سن کا تانا اور سوت کا بانا ہوتا تھا تیار کرنے کے لیے مطلوب تھا۔ یہاں خام کپاس پابندی کے ساتھ 'لیونٹ'x سے درآمد ہوتا تھا جہاں اس کے ریشوں کو دبا کر کسی موٹی گانٹھیں جو سمندری نقل وحمل کے لیے موزوں ترین بنانے کے مشینی سامان موجود تھے۔ سورت کے انگریز بھی اس تجارت میں شرکت کے متمنی تھے۔ اور انھوں نے ایک سے زائد موقع پر خواہش کی کہ ترکی میں جس قسم کے شکنجے استعمال ہوتے ہیں ویسے ہی یہاں بھی فراہم کیے جائیں لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہ کی گئی۔ اور جب تک کپاس کی گانٹھوں کو کس کر باندھنے کا انتظام نہ ہو ان کی ضخامت ان کی مالیت کے تناسب سے بدیہی طور پر اس قدر زیادہ ہوتی تھی کہ ان کے لیے نیل، اور کیلیکو کے قسم کی چیزوں کے مقابلہ میں جہاز پر گنجائش نکالنا محال تھا۔ چنانچہ ہمارے عہد کے دوران اس کی باضابطہ تجارت وجود میں نہ آسکی لیکن وقتاً فوقتاً کپاس کو بغیر باندھے ہوئے جہاز کے مال گودام میں گانٹھوں کی درمیانی جگہوں کو بھرنے کی غرض سے ٹھونس دیا جاتا تھا۔ علاوہ اس کے اس کی تھوڑی مقدار زیادہ قیمتی سامانوں کو باندھنے کا مصرف پورا لینے کے بعد پابندی کے ساتھ لندن کی بازار میں فروخت ہوا کرتی تھی۔

سوت سمندری نقل وحمل کے لیے نسبتاً زیادہ موزوں چیز تھی لہٰذا اس کی باضابطہ تجارت کا قیام عمل میں آیا مگر اس کی ابتدائی کھیپوں کا لندن میں صحیح معنوں میں خیر مقدم نہ ہوا لیکن 1622ء میں آرمینیوں نے فسٹین بنانے کے لیے موزوں سوت کی خریداری شروع کی۔ 1628ء میں انگریزوں نے گجرات سے سوت کی 25 گانٹھیں برآمد کیں اور دو برس بعد کمپنی نے 600 یا 700 گانٹھوں کے سالانہ بھیجے کی بشرطیکہ اس سے زیادہ قیمتی مال قابل حصول نہ ہوں، ہدایت بھیجی۔ اس اثنا میں جیسا کہ ضمیمہ 'ب' میں مندرج کھیپوں کے خلاصہ سے ظاہر ہوتا ہے، ولندیزیوں نے چھوٹے پیمانہ پر مگر پابندی کے ساتھ ساحل کورومنڈل سے اس کی برآمد شروع کر دی تھی۔ اس کے ساتھ وہ سورت میں بھی خریداری کیا کرتے تھے۔ جو بہر حال شروع شروع میں انگریزوں کی خریداری کے پیمانہ پر نہ تھی۔ تقریباً 1630ء میں ان کی سالانہ کھیپت 150 گانٹھوں کی تھی۔ اگلی دہائی میں ان کی مانگ بڑھ کر تقریباً 200 گانٹھوں تک پہنچ گئی جب کہ 1638-39ء میں انگریزی برآمدات کی مقدار 300 گانٹھ تھی۔ زیر مطالعہ عہد کی بقیہ مدت کے دوران دونوں ساحلوں پر ولندیزیوں کی تجارت تقریباً 500 گانٹھ سالانہ کی مقدار پر برقرار رہی۔ لیکن اس مدت میں

LEVANT x

انگریزی تجارت کو زوال ہوا۔ 1641ء میں کمپنی نے اپنی مانگ کو گھٹا کر 100 گانٹھ کر دیا۔ کمپنی سوت کی درآمد کو ناپسند کرتی تھی لیکن انگریزی کاریگروں کی ناخوشی کے خیال سے جنھوں نے کمپنی کی تحریک کے مطابق اس اثنا میں ہندوستانی سوت کے بہت سے مصرف معلوم کر لیے تھے، اس نے اس قدر مقدار کی فرمائش کر دی تھی[1] اس کے دس برس بعد صرف 75 گانٹھیں برآمد ہوئیں جبکہ 1652ء میں 150 گانٹھوں کی فرمائش تھی۔ لیکن 1658ء میں تجارت میں عام اضافہ سوت پر بھی اثر انداز ہوا۔ اس کی مانگ دوبارہ بڑھ کر تقریباً 500 گانٹھوں پر پہنچ گئی۔ برآمد کیے ہوئے مال کے معیار میں فرق کا دائرہ بہت زیادہ وسیع رہا کرتا تھا۔ مجھے ولندیزیوں کی خصوصی برآمدات کے درجۂ معیار کے متعلق قطعی معلومات نہیں ہو سکی ہیں۔ لیکن غالباً ایک گانٹھ (تقریباً 160 ال۔بی) کی معقول اوسط قیمت 500 روپیہ اور اس بنیاد پر مجموعی برآمدات کی مالیت زیادہ سے زیادہ نصف لاکھ روپیہ لگائی جا سکتی ہے۔

1630ء میں جب گجرات میں خریداریاں اپنے عروج پر تھیں تو ایک عجیب و غریب حادثہ پیش آیا جس نے سوت کی تجارت کو متاثر کیا۔ بنکروں نے یہ خطرہ محسوس کرتے ہوئے کہ ان کے خام مال کی برآمد سے ان کی صنعت کو نقصان پہنچے گا۔ بڑودہ میں ایک باضابطہ مقاطعہ کا منصوبہ چلایا اور انگریزوں سے کہا گیا کہ وہ کپڑے اور سوت میں صرف ایک ہی چیز خرید سکتے ہیں لیکن اس کے بعد کے برسوں میں اس قسم کی مخالفت کے کوئی اشارے نہیں پائے جاتے اور میرا خیال ہے کہ یہ حادثہ صرف اس وجہ سے پیش آیا کہ انگریزوں کی فرمائش اس وقت کے موجودہ ذخیرہ سے بہت تیزی کے ساتھ تجاوز کر گئی تھی۔ ہندوستان اپنی ضرورت کا کل سوت تیار کر سکتا تھا لیکن اس کی

---

[1] میں انگریزی صنعت میں اس وقت جو تبدیلیاں ہوئیں ان کی تحقیق نہ کر سکا لیکن یقیناً ترقی پر تھیں اور ممکن ہے کہ ہندوستانی سوت کو تانوں کے لیے موزوں پایا گیا ہو۔ اس طور پر ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں انگلستان میں خالص سوتی کپڑوں کی تیاری کا کام شروع ہوا حالانکہ اس حقیقت کی تائید میں ابھی تک شہادتیں فراہم نہ ہو سکی ہیں۔ پروفیسر ڈینیلس* نے اس پرانے خیال کی نامعقولیت کو کہ یہاں خالص سوتی سامان اٹھارہویں صدی کے اختتامی زمانہ تک تیار نہ ہو سکے تھے ثابت کیا ہے لیکن ان کی تیاری کب شروع ہوئی۔ یہ ابھی تک غیر متعین ہے۔

PROFESSOR DANIELS *

مانگ میں ایک اچانک اضافہ جب تک کہ ساتھ ساتھ اس کی تیاری میں بھی اضافہ نہ ہو، صارفین کے لیے پریشانی کا سبب بن سکتی تھی۔

سترھویں صدی کے بعد سے اب تک دنیا میں شکر کے تجارتی حالات بہت زیادہ تبدیل ہو چکے ہیں۔ اس وقت شکر ان دنوں کی طرح بھی یورپ میں عام استعمال کی چیز نہیں بلکہ ایک قیمتی پرتکلف شے تصور کی جاتی تھی۔ ابھی تک یورپ میں سفید چقندر کی شکر کی صنعت وجود میں نہ آئی تھی اور نہ گنے کی شکر، مشرق میں چین اور ہندوستان سے اور مغرب میں برازیل اور جزائر انٹیلیز[x] سے حاصل کی جاتی تھی۔ زیر مطالعہ عہد میں [illegible] اس کی ہندوستان سے بیشتر برآمد کے علاوہ چین اور امریکہ کی تجارت پر بھی قابض تھے اور چونکہ ہندوستانی پیداوار کا زیادہ حصہ گھٹیا اور اس کے اخراجات نقل و حمل بھی زیادہ تھے۔ لہذا یہ اول اول یورپی منڈی میں زیادہ نہ کھپ سکی۔ ہندوستانی شکر کی تین عام قسمیں تھیں: ادنیٰ درجہ کا دیسی گڑ[1] جو برآمد کے قابل نہ تھا، باریک دانوں کی سفید شکر جسے پوڈر شکر کہتے تھے اور بڑے دانوں کی زیادہ صاف کی ہوئی شکر جو گراں اور جسے تاجر "قند" کہتے تھے۔ سورت کے آڑھتیے انھیں آخری دو قسموں کی انگلستان کے ساتھ کبھی کبھی تجارت کیا کرتے۔ کمپنی کبھی تو اس کی فرمائش کرتی اور کبھی اسے روک دیتی اور کم از کم ایک بار اسے جہاز کی خالی جگہ پر کرنے کی غرض سے لادا گیا تھا۔ مرسلہ مقدار بہت کم و بیش ہوا کرتی تھی لیکن ایسا شاذ ہی ہوتا کہ اسے کوئی اہم چیز تصور کیا گیا ہو۔ اور آڑھتیوں نے ایک سے زائد بار اسے بنگال سے منگانے کی جہاں پر یہ بہتر اور ارزاں رہا کرتی تھی صلاح دی ہو۔ ولندیزیوں نے اسے سورت سے برآمد کرنے میں کوئی دلچسپی نہ ظاہر کی۔ لیکن بعد میں صورت حال کے موافق ہو جانے پر انھوں نے ہندوستان کے دوسرے سمت سے اس کی تجارت کو کافی بڑھایا۔ 1636ء میں وہ معمولی پیمانے پر بنگال کی شکر برآمد کر رہے تھے اور صدی کی پانچویں دہائی میں ان کی تجارت میں کافی

---

[1] جگری یا گڑ اب بھی ہندوستان میں سب سے زیادہ مستعمل شکر کی ایک شکل ہے۔ یہ دانوں اور شیرہ کا مرکب ہوتا ہے اور اسے دیسی طریقوں سے تیار کرتے ہیں۔ سفید شکر اسی مرکب سے بڑی محنت اور کاوش کے بعد تیار کی جاتی ہے۔

ANTILLES x

توسیع ہوئی۔ ان دنوں بٹاویا بھیجی جانے والی شکر کی سالانہ مقدار تقریباً 5,00,000 ال بی تھی۔ اس کے بعد کی تحریریں نامکمل ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ برآمد کی اس مقدار کو اس سبب سے کہ یہ منڈی کی کھپت سے زائد تھی یا یورپ کی ضرورت دیگر مقامات سے پوری ہو رہی تھی برقرار نہ رکھا گیا۔ انگریزی کمپنی نے بنگالی شکر کی تجارت بڑھانے میں تاخیر کی۔ اس پر برسوں رائے و مشورے کیے گئے اور 52-1651ء میں اس کے لیے سرمایہ کی منظوری حاصل ہوئی لیکن اس کی وسیع تجارت کی پہلی علامت 1659ء میں 700 ٹن کی خریداری کی فرمائش سے ظاہر ہوئی۔ 'ٹن' کو وزن کا خواہ پیمائش کا پیمانہ تصور کیا جائے یہ ایک بڑی مقدار تھی۔ اس فرمائش کی مقدار کو اگلے برس کم کر دیا گیا لیکن انگریزی تجارت کی تاریخ کا زمانہ زیر مطالعہ عہد کے حدود کے باہر ہے اور اس عہد کے دوران اس کی مجموعی برآمد اس قدر بے ترتیب تھی کہ اس سے پیدا کرنے والوں کو اس سے جو منفعت حاصل ہوتی تھی اس کی مقدار کو متعین نہیں کیا جا سکتا۔

بنگال اور یورپ کے درمیان ریشم کی تجارت کا زمانہ بھی ہمارے عہد کے ختم ہونے پر شروع ہوتا ہے۔ پہلے مغربی ممالک کی ضروریات چین سے اور اس کے بعد فارس سے پوری ہوا کرتی تھیں۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، ولندیزیوں کے بالآخر بنگال میں باقاعدہ قدم جما لینے کے بعد ان کی برآمدات کا خاص مرکز جاپان تھا اور مجھے کوئی ایسی تحریریں دستیاب نہ ہو سکیں جن سے یہ ظاہر ہو کہ انھوں نے 1660ء کے قبل یورپی منڈی کی طرف توجہ کی تھی۔ انگریزی تجارت کی ابتدا اس وقت ہوئی جب 1657ء میں بالآخر کمپنی کو ضرورت کے مطابق سرمایہ فراہم کیا گیا اور [illegible] پونڈ کی رقم بنگال کے خام ریشم پر لگانے کی منظوری حاصل ہو گئی۔ اگلے برس کمپنی کو 600 گانٹھوں کی خریداری کا جس کی مجموعی مالیت تقریباً 20,000 روپیہ تھی مجاز کیا گیا۔

اس باب میں جو واقعات یکجا کیے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی یورپ کی برآمدی تجارت کے لیے سترھویں صدی کا نصف اول ایک طویل تجرباتی دور تھا۔ اس کی پہلی دہائی کے اواخر میں ہم ولندیزیوں کو مشرقی اور انگریزوں کو مغربی ساحل پر اس بات کا تجربہ کرتا ہوا پاتے ہیں کہ یہاں کس کس سامان کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے۔ اس کے دس برس بعد ولندیزیوں نے نیل اور شورہ کی دریافت کر لی تھی لیکن وہ ہندوستان کی تقریباً

بدترین نیل اور تقریباً گراں ترین شورہ کی خریداری کر رہے تھے۔ دوسری طرف انگریز اچھے قسم کی نیل کی تجارت قائم کرنے کے بعد گجراتی، کیلیکو، کی اہم ترین برآمدی تجارت کی بنیادیں استوار کرنے میں مصروف ہوئے۔ نصف صدی کے وسط تک سورت بظاہر قطعی طور پر یورپ کے لیے خاص بندر کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ مشرقی ساحل بہت کم مال فراہم کرتا اور بنگال یورپی خریداروں کے لیے ابھی تک ایک غیر معروف علاقہ تھا۔ 1630ء کے قحط کی وجہ سے ایک حیرت انگیز تبدیلی رونما ہوئی۔ اور گجرات سے ناکافی فراہمی کی تلافی کے لیے ہندوستان کے متعدد دیگر حصوں میں امکانات کا جائزہ لیا گیا۔ ولندیزی اپنی بہترین صلاحیت کے باعث بنگال میں بہت آگے بڑھ گئے لیکن انھوں نے اپنی اس حیثیت کو پہلے ایشیائی تجارت کو فروغ دینے پر صرف کیا۔ 1650ء کے بعد ہی ہندوستان کے مشرقی علاقے یورپی تجارت میں کوئی امتیازی مقام حاصل نہ کر سکے۔ اس امتیاز کے حصول کا سبب کچھ تو مدراس کے 'کیلیکو' کی موزونیت، کچھ بہار کے شورہ کی ارزانی اور کچھ بنگال سے ریشم کی اور شکر کی فراہمی تھی۔ گجرات صرف نیل کے معاملہ میں اپنے سابقہ امتیاز کو برقرار رکھ سکا لیکن امریکی مقابلہ کے دباؤ کی وجہ سے یہ تجارت بھی رو بہ زوال ہونا شروع ہو چکی تھی اور مرہٹوں کے عروج کے نتیجہ میں جو سیاسی حالات رونما ہوئے وہ آگے چل کر سورت بندر کے لیے جو شروع میں دوسرے بندروں پر سبقت حاصل کر چکا تھا مزید خطرے کا سبب ثابت ہونے والے تھے۔

جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، ہندوستان کو نئی برآمدی تجارت سے پہنچنے والی منفعت اچھی خاصی تھی کیونکہ اس تجارت نے ایسے سامانوں کی مانگ میں اضافہ کر دیا تھا جنھیں اس کے پیدا کرنے والے فراہم کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ بالواسطہ طور پر بھی ممالک کی ترقی پذیر منڈیوں سے تجارتی روابط قائم ہو جانے کی وجہ سے پورے ملک کی حیثیت تبدیل ہو گئی۔ پچھلی صدی میں پرتگالیوں کو تجارتی ترقی کے جو مواقع حاصل تھے ان کا انھوں نے مناسب استعمال نہ کیا تھا لیکن ولندیزی اور انگریزی کمپنیاں ایک بالکل مختلف نقطۂ نظر سے ہندوستان کے قریب آئیں، انھوں نے بالکل مختلف طریقے اختیار کیے اور نسبتاً بہت زیادہ کامیابی حاصل کی۔ ان کی وساطت سے ہندوستانی سامان ایمسٹرڈم، لندن، پیرس اور دوسری منڈیوں میں روشناس ہوئے اور ساتھ ساتھ یہاں کے صارفین کی پسند و ناپسند سے ہندوستان میں ان سامانوں کی تیاری کے علاقے متعارف ہوئے اور مشرقی ممالک میں ایسے سامانوں کی کھوج کی گئی جن کی مغرب میں

تجارت نفع بخش ہو سکتی تھی۔ اس طرح تجارت کی ایک نئی تنظیم وجود میں آئی اور اگر ایک طرف اس کی ابتدائی کارگزاریاں قابل لحاظ تھیں تو دوسری طرف اس کے لیے مستقبل میں لامحدود امکانات پائے جاتے تھے۔

اس تنظیم کا ایک پہلو تنقید طلب ہے کیونکہ فی زمانہ مہذب ممالک میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ دور حاضر کی تجارت میں فروخت کنندہ کو بیشتر کام کرنا ہوتا ہے۔ جب کوئی بھی ملک کسی نئی منڈی پر قابض ہونے کا قصد کرتا ہے تو اس مہم میں سامان کا بنانے والا، سرمایہ دار اور سرکاری نمائندے شریک ہوتے ہیں اور اکثر کثیر اخراجات کر کے منڈی میں داخل ہوتے ہیں اور سامانوں کو متوقع خریداروں کے دروازے تک پہنچاتے ہیں۔ ہندوستان کی جانب سے کبھی یورپ کی منڈیوں کے حصول کے سلسلہ میں اس قسم کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ ہندوستانی سامانوں کے پیدا کرنے والے اپنے سامانوں کو فروخت کرنے کے ضرور خواہشمند رہا کرتے اور ان کی طرف سے آنے والے غیر ملکی خریداروں کا خیر مقدم بھی ہوا کرتا۔ لیکن اس کاروبار میں ان کی حیثیت محض ایک مجہول عنصر کی تھی۔ ہمیں ان دنوں اس طرح کی کوئی اطلاع نہیں ملتی کہ ہندوستانی یورپ پہنچ کر اپنی فروختگی کو بڑھانے میں مصروف ہوں یا غیر ملکی خریداروں کو اپنے مرسلہ سامانوں کے نمونے پیش کر رہے ہوں۔ اس تجارت میں خریدار ایک فعال عنصر کی حیثیت رکھتا تھا جس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ نقل و حمل سے پہنچنے والے کثیر منافع میں ہندوستان کا کچھ حصہ نہ ہوتا۔ اگر یہاں تجارت کا کام صرف ایک یورپی کمپنی کرتی تو اس کے لیے ممکن ہوتا کہ وہ اپنی اجارہ داری قائم کر لیتی لیکن یہ ہندوستان کی خوش قسمتی تھی کہ صورت حال اس کے برعکس رہی۔ زیر مطالعہ عہد میں بعض مشرق البعد کے ممالک کو اس کا تجربہ ہو چکا تھا کہ ولندیزیوں کے لیے اجارہ داری کس قدر نفع بخش ثابت ہوئی تھی لیکن ہندوستان میں نسبتاً کم زور انگریزی کمپنی کا کاروبار میں شریک ہو جانا عام طور پر ہندوستانیوں کے لیے اپنے سامانوں کی معقول قیمت وصول کرنے میں معاون ثابت ہوا۔

باب ۵ کے ماخذ۔

فصل 1 : ۔ یورپی منڈیوں کے اس وقت کے عام حالات کا CUNNINGHAM VOL. 11 میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ پرتگالی جہازوں کے سامانوں کی فہرست کا حوالہ اس کے حاشیوں میں ملتا ہے۔

ان کی تجارت کے صیغۂ راز میں رکھے جانے کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو مثلاً BENNEVILLE 1
اور ہندوستانی ادرک کی گھٹیا قسم کے لیے LINSCHOTEN C-64 مالابار کی سیاہ مرچ کی تاریخ
ENGLISH FACTORIES اور DAGH REGISTER میں پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ متن میں مندرج
ENGLISH FACTORIES 111-62, 90,92, 157, 327 1V-9, V-148, 314,
VII-138 & X-220 سے ماخوذ ہیں۔ ولندیزیوں کی مشرقی ساحل سے سیاہ مرچ برآمد کرنے کی
کوشش کا ذکر مذکورہ تصنیف ۵۶۔ میں آیا ہے۔ اس کی تھوڑی تفصیل ضمیمہ 'ب' میں بھی
ملے گی۔

فصل 2 :۔ ولندیزی جہازوں کے ذریعہ جانے والے سامانوں کی مثال ---- DAGH
REGISTER (COROMANDEL) —— NOVEMBER 3, 1642 میں درج ہے۔ ولندیزی
جہازوں کے براہ راست یورپی سفروں کے لیے ضمیمہ 'ب' DAGH REGISTER - HAGUE
TRANSCRIPTS 30, کے متعدد اندراجات ملاحظہ ہوں۔ نیل میں ولندیزیوں کی ابتدائی دلچسپی
کا ذکر TEMPESTRAS SURAT 84,85 میں آیا ہے۔ انگریزوں کے 1630ء تک کے برآمدات
ENGLISH FACTORIES 1, 206, 111, 90, 92, 208 سے ماخوذ ہیں۔ 'لندن' نامی
جہاز کے سامان (40-1639ء) کا حوالہ مذکورہ تصنیف n 232, 233 VI, میں آیا ہے۔
1642ء اور اس کے بعد کے برآمدات تصنیف مذکورہ VII-P-XIX, 197 n, 256, 295,
IX PP IX, 19n میں اور کھلی ہوئی تجارت کے زمانہ کے لیے ملاحظہ ہو تصنیف مذکورہ
X-44, 57. پر اور جا بجا 'کورٹ منیں ایسوسیشن' کے کاروبار جلد 5 اور اس کے بعد کی جلدوں
میں بیان کیے گئے ہیں۔ مشرقی ساحل کے برآمدات کے لیے تصنیف مذکورہ VIII-27 1, IX,
20, 102, 154, اور LETTER BOOKS 17-196 ولندیزیوں کی برتری کا اعتراف
ENGLISH FACTORIES 11, 121, IV P XXX. VII, VI, P&L V, viii
191, 212 سے قلم بند کیا گیا ہے۔ ولندیزیوں کے ہندوستان میں لگائے ہوئے سرمایہ کے اعداد
DAGH REGISTER میں جن میں برسوں کے اندراجات درج ہیں ان سے اخذ کیے گئے ہیں۔

فصل 3 :۔ مسٹر فوسٹر نے JOURNAL ROYAL SOCIETY OF ARTS L XVI-362
میں زیر مطالعہ عہد کے دوران نیل کی انگریزی تجارت کا خلاصہ درج کیا ہے۔ پرتگیزی اجارہ داری
کے لیے ملاحظہ ہو COUTO X 11 572 حلب کی نیل کی تجارت کے حوالے

FIRST LETTER BOOKS - 285 - LETTERS RECEIVED 11- AND PURCHAS 1-
سے ماخوذ ہیں HAGUE TRANSCRIPTS 11-52 کے ایک قول کے مطابق 1621ء تک نیل
بیوانٹ سے انگلستان اور ہالینڈ پہنچ رہی تھی۔ مندرجہ قیمتیں مسٹر فوسٹر کی مذکورہ بالا تحریر سے
ماخوذ ہیں۔ نیل کی بنیادی اہمیت کے لیے ملاحظہ ہو TERPESTRAS SURAT 18, DE JONGE
II 495, LETTERS RECEIVED 1-28, FIRST BOOK 285, 308, 328 ROE-447
پلسارٹ نے شمالی ہند میں نیل کی پیداوار اتیاری کو بہ تفصیل بیان کیا ہے لیکن فرانسیسی ترجمہ ناکافی
ہوگا لہٰذا اصل کو دیکھنا چاہیے۔ سر کیمبج کی نیل کی صنعت کا بہترین تذکرہ GUJRAT REPORT
میں ملتا ہے۔ برآمد کے اقسام کے لیے ملاحظہ ہو (مثلاً) ENGLISH FACTORIES
vi- ,63 ,111 ان کے انگلستان میں استعمال کے لیے مسٹر فوسٹر کی مذکورہ بالا تحریر اور
COURT MINUTES JULY 2, 1634. اور ہندوستان میں سب سے ابتدائی خریداریوں کے لیے
PURCHAS 1-1V 429, and TERPESTRAS SURAT-75 سندھ سے خریداریوں کا ذکر،
(مثلاً) DAGH REGIS- میں۔ وین گورلا سے ENGLISH FACTORIES VIII, 29, vii
TER, SEPTEMBER 17, 1645. میں اور اس میں جابجا اور چیا گانگ سے تصنیف مذکورہ
مورخہ 13 فروری 1637ء میں ملتا ہے۔ مشرقی ساحل پر نیل کے لیے ضمیمہ 'ب' میں مندرج
بیجکوں کو اور نیز HAGUE TRANSCRIPTS 1-69, اور DAGH REGISTER
مورخہ 8 اکتوبر 1626ء اور اکثر اس تاریخ کے بعد ملاحظہ ہوں۔
انگلستان کو 1619ء میں برآمد کی ہوئی نیل کی مقدار ENGLISH FACTORIES 1-61
سے ماخوذ ہیں۔ اگلی دہائی کے معیار کے لیے ملاحظہ ہو تصنیف مذکورہ 111-92, 208,
ولندیزی برآمدات کو DAGH REGISTER کے اندراجات سے جمع کیا گیا ہے۔ ان کی 1639ء
کی فرمائش HAGUE TRANSCRIPTS 11-114 میں ملتی ہے۔ خریداروں پر قیمتوں کے
تبدیلیوں کے اثرات کے لیے ملاحظہ ہو ENGLISH FACTORIES VI-111, اور 1650ء
کے بعد تنزلی کے لیے تصنیف مذکورہ X 322, VIII, 253, IX, 29, 82, 196
و نیز LETTER BOOKS 11, 1-3 ملاحظہ ہوں۔
امریکی نیل کی برآمد کا پہلا حوالہ PURCHAS 111 V میں ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو نیز
COURT اس کے بعد کے حوالوں کے لیے CAMBRIDGE MODERN HISTORY IV

MINUTES JANUARY 18, 1633, OCTOBER 24, 1643 AND ENGLISH FACTO
موسم کی خرابی کے باعث تجارت میں خلل اندازی کے لیے ملاحظہ ہو (مثلاً RIES X
اور سرکاری کارروائی کے لیے ENGLISH FACTORIES VI 278, AND PELSART 5
اور اس میں جا بجا APPENDIX IX VIII, ENGLISH FACTORIES IV-324
(اجارہ داری vii. 203 (سندھ) اور viii, 143 (احمد آباد) ۔ آمیزش کے لیے ملاحظہ ہو
تصنیف مذکورہ VI,273, vii, AND VIII, 12,31,33,302 گجرات کی پیداوار کا تخمینہ
ENGLISH FACTORIES DAGH REGISTER MAY 20, 1644 اور 232, V 73, VII
میں اور آگرہ کی PELSARAT 5, ENGLISH FACTORIES IV-325 JUNE 13,
مشرقی ساحل پر ۔ ENGLISH FACTORIES VI- اور سندھ میں تصنیف مذکورہ 1644
خشکی کے راستہ کی تجارت کے قائم رہنے کا حوالہ v. 129 DAGH REGISTER MAY 20,
1641, COURT MINUTES DEC 29, 1643, ENGLISH FACTORIES VII-136
میں ملتا ہے ۔ پلسارٹ کے حوالے ولندیزی قلمی نسخہ کے ورق 6 سے لیے گئے ہیں ۔ اکبر کی فصلوں
پر عائد کی ہوئی تشخیص آئین اکبری (ترجمہ) ii ۹۹۴F سے لی گئی ہے ۔

فصل 4 : ۔ پرتگیزیوں کی شورہ کی برآمد کے حوالے LISBON TRANSCRIPTS 1-10
اور IV.931 میں ملتے ہیں ۔ دیگر غیر تجارتی برآمدات کی مثالیں تصنیف مذکورہ ii.371,
iii.465 سے ماخوذ ہیں ۔ مجھے مشرقی ساحل پر ولندیزی تجارت کا پہلا تذکرہ HAGUE
TRANSCRIPTS II-30, میں ملا ہے ۔ ملاحظہ ہو نیز تصنیف مذکورہ ii.162 اور 20 نومبر 1924ء
اور اس کے بعد کا DAGH REGISTER انگلستان میں شورہ کی فراہمی کے لیے ملاحظہ ہو
اور مع COURT MINUTES - OCT 31, 1617, FEB 29, 1624, MAY 20, 1625
جا بجا انگریزی تجارت کی ابتدا کے لیے ملاحظہ ہو تصنیف مذکورہ مورخہ 5 جنوری 1627ء اور 90,
4,175 اور viii,203 برآمد کی مقدار تصنیف مذکورہ ENGLISH FACTORIES I-251, III-
VII سے حاصل کی گئی ہے ۔ 1939ء کے اعداد 1656 - ORIGINAL CORRESPONDENCE (منسلکات)
میں ملتے ہیں ۔ شورہ کے بھرتی کے مال کے طور پر استعمال کیے جانے کا ذکر ENGLISH FACTORIES
ولندیزی تجارت. III, 208, VI, 94, 175, IX 196 X-7, 276,
کے اعداد DAGH REGISTER سے جمع کیے گئے ہیں ۔ تجارت میں

دخل اندازی کی مثالیں ENGLISH FACTORIES. iii-270, iv-143 AND vii i-34
میں گھوڑوں کی تجارت کا حوالہ COURTS VIII 235 میں آتا ہے۔ صاف کرنے کی مشین
کی فراہمی کا حوالہ DAGH REGISTER FEB19, 1641 AND NOVEMBER 29, 1645
(COROMANDEL) اور نیز ENGLISH FACTORIES IX-95

فصل 8 :۔ انگلستان میں سوتی سامان کی کھپت کا DANIELS, اور BAINES,
میں ضمنی ذکر آیا ہے۔ ہندوستان سے ابتدائی مانگ کی نوعیت کے لیے ملاحظہ ہو
(FINCH) فنچ FIRST LETTER BOOK, 131, 148, 258, 303 کی رپورٹ
LETTERS RECEIVED 1 میں ملتی ہے۔ ۱۶۱۹ء کی برآمد کا جدول ENGLISH FACTO-
RIES 1, 61 سے مرتب کیا گیا ہے۔ 1625ء اور 1628ء کے اعداد تصنیف مذکورہ 2080
92- iii میں اور 1630ء کی فرمائش تصنیف مذکورہ iv. 8 میں ہے۔ اس زمانہ کی انگریزی
منڈی کے لیے ملاحظہ ہو COURT MINUTES AUGUST 6, 1623 اور شمالی ہندوستان
کی خریداریوں کے لیے ملاحظہ ہو ENGLISH FACTORIES I PP XXI ff 111-141 اور
اس میں جابجا قحط کے بعد تجارت کی تبدیلی کے لیے ملاحظہ ہو ENGLISH FACTORIES IV
97, 158, V-146, 278 سندھ کے لیے تصنیف مذکورہ 164 ,IV-118, 129 اور
مشرقی ساحل کے لیے تصنیف مذکورہ 1. 343, ii. 336, IV-64, 228 V-218
۱۶۳۸-۱۶۴۱ء کے برآمدات ORIGINAL CORRESPONDENCE 1656, 1725, میں
منسلکہ بیجکوں سے ماخوذ ہیں۔ ساحلی سامانوں کا بیان خاص طور پر LETTER BOOKS VOL
11, 13-17, 196 اور ضمیمہ ب میں مندرج ولندیزی بیجکوں کی تفصیلات سے منقول
ہے۔ گجراتی 'کیلیکو' کے معیار کے خراب ہونے کا حوالہ ENGLISH FACTORIES VI-56,
میں آیا ہے۔ مشرقی ساحل کی تجارت میں اضافہ کا پتہ ENGLISH FACTORIES کی بعد کی
جلدوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو خاص طور پر VII-173, VIII, 164, 297
اس زمانہ کے لیے تفصیلی اعداد LETTER BOOKS VOL. ii, 1-3, 13-17, 21-24
سے لیے گئے ہیں۔

ولندیزیوں کی برازیل اور مغربی افریقہ کے ساتھ تجارت ELLIAS ii-Ch.VII میں بیان
کی گئی ہے۔ ان کی یورپ کو سوتی مال کی برآمد کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ ب اور نیز

LETTERS RECEIVED IV_34, ENGLISH FACTORIES, 1-41, 44; 11-336
TERPESTRAS SURAT_76 HAGUE TRANSCRIPTS 1-163, 318, 11-52, 114a
DAGH REGISTER MAY 20, تجارت میں مزاحمت کا اکثر حوالہ ملتا ہے۔ مندرجہ مثالیں
1641 سے ماخوذ ہیں۔ ENGLISH FACTORIES V-296 and VIII-118 زربشگی اور ضمانت
کے متعلق اطلاعات تصنیف مذکورہ VI-156 AND VII-46 سے حاصل کی گئی ہیں خرابیوں اور
ان کی اصلاح کے لیے ملاحظہ ہو تصنیف مذکورہ IV-30, VI-57, VII-126, VIII-117
1641ء
مورخہ 20 مئی اور 3 ستمبر DAGH REGISTER اور COURT MINUTES, SER 6, 1658

فصل 6 :۔ انگریزوں کی کپاس کی مانگ کے متعلق DANIELS 2 ff نے بحث کی ہے۔ گانٹھیں
تیار کرنے کی مشینوں کی فرمائش کے لیے ملاحظہ ہو ENGLISH FACTORIES III-212 اور خام
کپاس کی برآمد کے لیے تصنیف مذکور IV, III-62 فروختگیاں COURT MINUTES میں جابجا
درج ہیں۔ انگریزی سوت کی تجارت کے واقعات ENGLISH FACTORIES 1-58, 11-157
III-209 IV-22, VI-312, LETTER BOOKS 11, 1-3, 13-17 سے لیے گئے ہیں
سے لیے گئے ہیں۔ ولندیزی تجارت کی مقدار حسب معمول DAGH REGISTER میں مندرج جہازوں
کے ذریعہ بھیجے گئے سامانوں کے اعداد کو جمع کر کے حاصل کی گئی ہے ملاحظہ ہو نیز HAGUE TRAN-
SCRIPTS 1, 318 AND 11, 114a ۔

اس زمانہ میں شکر کی تجارت کے لیے ملاحظہ ہو ELIAS 1-71 سورت سے برآمدات
کا اکثر ذکر ENGLISH FACTORIES eg 1-51, IV-4,9, 323, VI-58, میں ملتا ہے۔
مشرقی ساحل کی ولندیزی تجارت کو DAGH REGISTER میں ابتداے 31 اکتوبر 1636ء
سے اخذ کیا گیا ہے۔ بنگال میں انگریزی تجارت کے لیے ملاحظہ ہو ENGLISH FACTORIES VIII
اور اس میں جابجا۔ اسی تصنیف کی ابتدائی جلدوں میں ریشم کی تجارت کا گاہے گاہے حوالہ آیا ہے
لیکن بحیثیت ایک تجارتی مسئلہ کے اس کی تاریخ X.188 سے شروع ہوتی ہے۔

باب 5

ہندوستانی منڈیوں کی روش

فصل 1۔ منڈیوں کی عمومی کیفیت

ولندیزیوں اور انگریزوں کی تجارت کے بعد اب ہم ان منڈیوں کے حالات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جن میں وہ داخل ہوئے تھے۔ سترھویں صدی کے ہندوستان کو آرکاڈیا ایسی سیدھی سادی معاشرت کا ملک تصور کرنے والوں کی غلط فہمی رفع کرنے کے لیے اس دور کی تجارتی تحریروں کی ایک سرسری واقفیت ہی کافی ہوگی۔ اس وقت کے خریدنے اور بیچنے والے اپنی جملہ اہم خصوصیات کے اعتبار سے موجودہ زمانہ کے خریدنے اور بیچنے والوں کے مشابہ تھے اور ہندوستانی تاجر، کاروباری صلاحیت کے معاملہ میں بھی کسی طور پر ان غیر ملکی تاجروں سے کمتر نہ تھے جن کے ان کے ساتھ معاملات رہا کرتے تھے۔ سورت میں اول انگریزی تاجر ولیم فنچ کا اس بنا پر کہ مقامی تاجر غیر ملکی جہازوں کے پہنچ جانے پر اپنے سامان کو دوگنے داموں سے کم پر نہیں بیچتے وہاں ایک باضابطہ تجارتی کوٹھی کے قائم کرنے پر اصرار تھا۔ اس نے اپنے خیال کو اس مشہور مقولہ میں واضح کیا ہے کہ" وہ شیطان کی طرح مکار ہیں اور میں انھیں اس کی ذریات تصور کرنے پر مجبور ہوں" اور ہندوستان کے دوسرے متعدد مقامات سے بھی ان کے متعلق اسی قسم کے توصیفی کلمات قلمبند کیے جا سکتے ہیں۔ اس دور کی تجارتی تحریروں میں ظاہر کیے ہوئے خیالات اور کبھی کبھی ان کی زبان بھی بالکل جدید طرز کی ہے اور مستثنیات کو چھوڑ کر ہمیں ان میں بیان کیے ہوئے تجارتی معاملات پر حالیہ معاشی تجزیہ کے نتائج کا اطلاق کرنے میں پس و پیش نہ ہونا چاہیے۔ پورے ملک میں

ہمیں منڈی کی معینہ قیمتیں ملتی ہیں جو رسد اور طلب میں تغیرات کے ساتھ ساتھ مسلسل کم و بیش ہوا کرتی تھیں۔ تیاری کی لاگت کے تابع ایک معیاری قیمت کے تخیل سے بھی لوگ بخوبی مانوس تھے اور اگر ہمیں تیاری کی معیاری لاگت میں تبدیلی کے بہت کم آثار نظر آتے ہیں تو اس کا غالباً سبب یہ ہے کہ زراعت اور صنعت کے حالات ایسے تھے کہ تاجروں کے پیش نظر وقت کی جس قدر قلیل مدت رہا کرتی اس میں اس عمل کے لیے بہت کم گنجائش نکل پاتی۔ ہم خریداروں اور بیچنے والوں کے درمیان شدید ترین مقابلہ بلا شرکت غیرے تجارتی معلومات کے حصول کی فکر، تاجروں کے گھیرے کی تنظیم اور تجارتی اجارہ داری اور دلالوں کے ایک بڑے طبقہ کی اپنی مخصوص سرگرمیاں اور ساتھ ساتھ قرضہ، مبادلہ اور بیمہ کی ایک حیرت انگیز طور پر ترقی یافتہ مالی مشینری کو موجود پاتے ہیں۔ اور کم از سورت میں سترھویں صدی کے دوران لوگ تجارتی بحران کے وقوعہ سے بھی اسی طور پر مانوس تھے جیسا کہ ہم اس سے اندنوں بمبئی میں ہیں اور حالانکہ اس وقت دیوالیہ ہونے کا کوئی باضابطہ قانون نافذ نہ تھا لیکن لوگ اسے تسلیم کرتے تھے[1]

مذکورہ بالا دو مستثنیات کا تعلق سرکاری مزاحمت کے خطرہ اور باربرداری کے کام میں مطلوب زیادہ وقت اور اخراجات سے ہے۔ سرکاری مزاحمت کی صورت یہ تھی کہ ہندوستانی منڈیوں میں کاروبار کرنے والے تاجروں کو برابر یہ خطرہ لگا رہتا تھا کہ مقامی صوبیدار یا اس کا کوئی نمائندہ کسی بھی چیز کے خریدار یا بیچنے والے کی حیثیت سے منڈی میں کسی وقت بھی داخل ہو سکتا ہے اور جب ایسا پیش آجاتا تو تاجروں کے مابین مقابلہ سرکاری طاقت کی بنا پر ختم ہو جاتا تھا۔ بعض صورتوں میں اس مزاحمت کو مفاد عامہ کی ضروریات کے تحت جائز قرار دیا جاتا تھا حالانکہ ممکن تھا کہ یہ جواز محض فرضی ہو۔ لیکن بہر حال غیر ملکی تاجروں کو اس عہد کے دوران سورت میں سیسہ پر صوبیدار کی نافذ کردہ اجارہ داری، پورے ملک میں شورہ کی بکری پر پابندی یا سکہ کی قلت کی صورت میں تانبہ کی دوبارہ برآمدگی کی ممانعت پر کوئی خاص اعتراض پیدا نہ ہوا تھا مگر انھیں نیل، سوتی سامان، مسالے، یہانتک کہ غذائی اجناس ایسی اہم اشیا پر حکومت یا اس کے عہدیداران کی منفعت کی خاطر مسلم قبضہ کر لینے یا انھیں اجارہ داری میں لے لینے یا اس سے نسبتاً زیادہ عمومی نوعیت کی اجارہ داری کے خلاف ضرور شکایت تھی۔

ہمعصر تحریروں میں تجارتی سامانوں پر مکمل قبضہ کر لینے یا اجارہ داری کے واقعات کی

---

[1] منگی (ج ۲ ۔ صفحہ ۰) پٹنہ میں ایک دیوالہ کے واقعہ کو صراحت سے بیان کرتا ہے۔

اس قدر کافی مثالیں ملتی ہیں کہ ان سے یہ کلّیہ ثابت ہو جاتا ہے کہ مقامی صوبیداران عملاً خود اپنی مرضی سے اور نیز حکام بالا کی ہدایت پر منڈی میں داخل ہوا کرتے تھے۔ ہم ۱۶۴۷ء میں صوبیدار احمد آباد کی عائد کردہ نیل کی اجارہ داری کو مقامی اقدام کی ایک مثال تصور کر سکتے ہیں۔ اس کے متعلق انگریز تاجر اس طور پر لکھتے ہیں۔

"ہمارے صوبیدار نے انتہائی بے انصافی اور بے ایمانی کے ساتھ چند بنجاروں (گشتی سوداگروں) کو اپنے ہاتھ شکر کا ایک بنڈل بیچنے پر مجبور کر کے ۱۰۰۰ روپیہ کا غیر قانونی منافع کمایا جس سے اس کی اس قدر ہمت افزائی ہوئی کہ وہ اب اس مقام کا تنہا تاجر بننے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ جلد ہی اس شہر اور علاقہ کی تمام نیل پر مکمل قبضہ کرنے والا ہے۔ ہم کو یہ امکان نظر نہیں آتا کہ اس کو امسال اس سے کچھ نفع حاصل ہو کیونکہ نیل کے کاشتکاروں نے بھی اس کی ان کارروائیوں کی پوری طور سے مخالفت کرنے کا مصمم قصد کر لیا ہے لیکن اگر وہ اپنے منصوبہ میں کامیاب ہو گیا تو ہمیں جلد اسی سے اپنے لیے مکھن اور چاول حاصل کرنا ہوگا۔"

حقیقتاً صوبیدار کو اس میں بظاہر زیادہ منافع نہ ہوا تھا کیونکہ اس کے تھوڑے عرصہ بعد ہم سنتے ہیں کہ "نیل کے کاشتکاروں" نے ۲۵۰ روپیہ ادا کر کے اپنے ذخیروں کو فروخت کرنے کی آز[ادی] خرید لیا۔" جو انھیں ہمارے صوبیدار کو اس مال کے منافع کے طور پر دینا تھا جو اس[...] بیچتا (یہ کہنا صحیح ہوگا کہ) خرید نا ظاہر کیا۔" لیکن اس قدر قلیل رقم کے قبول کیے جا[نے] سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ایسا اہم کاروبار بھی ایسی حقیر بنیادوں پر بھی سرکاری مزاحمت کا شکار ہو سکتا تھا۔ اسی طرح ایک موقع پر مشرقی ساحل کے مسالوں کی تجارت پر اجارہ داری عاید کی گئی اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد کورے کپڑوں کا یہی حشر ہوا۔ ۱۶۷۱ء میں گجراتی کپڑے کے تھان عارضی طور پر حکومت کی جانب سے مُکا بھیجے جانے کے لیے اجارہ داری کے تحت لائے گئے" اور نجی خریداروں کے لیے سامان تیار کرنے والے بنکروں کو موت کی دھمکی دی گئی اور ۱۶۳۵ء میں جب کہ ابھی صورت قحط کی زد ہی میں تھا کہ غذا کی مقامی قیمتیں بڑھ کر دوگنی ہوگئیں کیونکہ صوبیدار اور ایک یا دو تاجروں نے مل کر مقامی ذخیرہ پر پورا قبضہ کر لیا۔ اس نوعیت کی کارروائیوں کا بہ سہولت انجام پانا اس لیے ممکن ہوتا کہ بعد تجارتی مراکز پر اکثر کاروباری برادری کے افراد ہی کو مقامی صوبیدار مقرر کر دیا جاتا اور موجودہ زمانہ کی طرح ان دنوں حکام کے لیے تجارت ممنوع نہ تھی۔ چونکہ حکام اس معاملہ میں آزاد تھے لہٰذا یہ تقریباً لازمی تھا کہ وہ اپنے سرکاری

اختیارات سے اپنے کاروبار میں ناجائز فائدہ اٹھائیں اور بھی تاجروں کے لیے اس خطرہ کی موجودگی کا برابر لحاظ رکھنا ضروری ہوتا تھا۔

بڑے پیمانہ پر اجارہ داری کی نمایاں ترین مثال وہ ہے جو 1633ء میں نیل کی منڈی میں پیش آئی۔ اس اجارہ داری کے تحت جو بظاہر فارس کے خام ریشم کی شاہی اجارہ داری کے نمونہ پر ترتیب دی گئی تھی ایک تاجر نے مملکت مغلیہ کے جملہ نیل کے ذخیرہ اور گجرات و بیانہ کے پیداوار کی خریداری کے حقوق کے عوض میں شاہی خزانہ کو ایک کثیر رقم ادا کرنے کا اقرار کیا۔ اس کے بعد اس نے سرکھیج میں 16 روپیہ میں نیل خرید کر 27 روپیہ فی من مقامی (33 ال.بی کی شرح پر فروخت کرنا شروع کیا۔ لیکن نیل کے بڑے بڑے خریداروں کے کنارہ کشی اختیار کر لینے کے باعث اس کا یہ منصوبہ ناکام رہا اور 1635ء کے ختم ہوتے ہوتے اس کے کاروبار کو پہلے کی طرح آزاد کر دیا گیا۔ اس عام اجارہ داری کی ناکامیابی کا سبب ولندیزی اور انگریز تاجروں کا وہ اتحاد تھا جو اسے شکست دینے کے لیے عمل میں آیا تھا۔ ان کی مجموعی مانگ منڈی کا اہم ترین واحد عنصر تھا۔ چھوٹے چھوٹے زیادہ تعداد میں منفرد خریداروں کی موجودگی میں یہ اجارہ داری نسبتاً زیادہ مدت تک چل سکتی تھی جیسا کہ مشرقی ساحل پہ سامان کو سمندری راستہ سے لے جانے کی اجارہ داری کے معاملہ میں جن کا پچھلے باب میں ذکر آچکا ہے پیش آیا لیکن اجارہ داری کے قائم رہنے کی مدت طویل ہوتی یا مختصر تقریباً ہر تجارتی کاروبار میں اس نوعیت کی مزاحمت کے امکان کو ذہن میں رکھنا پڑتا تھا۔

ابھی تک صرف مخصوص اشیا یا کاموں کی اجارہ داریوں کو بیان کیا گیا ہے لیکن یہ بات کہ کوئی بھی امر کسی صوبیدار کو کسی بندرگاہ کی مسلم تجارت پر اپنی اجارہ داری نافذ کرنے میں مانع نہ ہوتا، ہگلی بندر کی مثال سے واضح ہوتا ہے کہ جہاں 36-1635ء میں ولندیزوں کو اطلاع ملی کہ تین افراد کو بلا شرکت غیرے ایسے خصوصی حقوق عطا کیے گئے ہیں جن کے تحت وہ جملہ سامان کی قیمتوں کو اپنی مرضی کے مطابق معین کر سکتے ہیں۔ اسی طرح غیر ملکی تاجروں کی ایک جماعت کے تجارتی کاروبار کو بھی اجارہ داری دی جا سکتی تھی۔ 625 میں مسولی پٹم کے ولندیزیوں کو آمدنی کے ایک وسیلہ کے طور پر اجارہ پر دے دیا گیا تھا جس کی ؟ سے وہ سوائے ان تاجروں کے جنھوں نے ان حقوق کو خریدا تھا کسی دوسرے کے ساتھ کاروبار کرنے کے حق سے محروم ہو گئے تھے۔ جب کہ 1628ء میں انگریزوں کے اس بندرگاہ سے کنار

اختیار کرنے کے منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب اسی نوعیت کے انتظام کی وہاں موجودگی بھی تھی۔ گولکنڈہ کے مشہور وزیر میر جملہ کے تحت جس نے بعد میں مغلوں کی اطاعت قبول کر لی تھی اجارہ داری کا نظم غالباً اپنی مکمل ترین شکل میں رائج تھا۔ بقول منکی میر جملہ وزیر بننے کے قبل ایک خود ساختہ تاجر تھا۔ اور اس عہدہ پر تقرری کے بعد بھی اس کی کارروائیوں سے اس قول کی تائید ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب اس کی وزارت عروج پر تھی تو اس کے پاس تجارتی سامانوں کے لیے زمینی باربرداری کے ایک وسیع انتظام کے ساتھ ساتھ دس سمندری جہاز بھی تھے اور ان کے علاوہ وہ متعدد غیر ممالک کے ساتھ اپنی تجارت کے لیے مزید جہاز تیار کرا رہا تھا۔ ولندیزیوں سے آزردہ خاطر ہو کر اس نے مشرقی ساحل کی مسلم تجارت پر اجارہ داری قائم کرنے کی غرض سے انگریزی کمپنی کے ساتھ ایک طرح کی شراکت داری قائم کرنے کی تجویز کی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے کاروبار پر بھی متوجہ رہا اور اس نے ملک کے ایک بڑے خطہ کے نبکروں کو اپنے کام کے لیے مخصوص کر لیا اور بتایا جاتا ہے کہ "جب تک کہ وہ تمام درآمدی سامانوں پر اپنی اجارہ داری قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتا اس نے اسی راہ پر چلنے کا مصمم قصد کر لیا ہے۔" مدراس کے آڑھتیے مجوزہ شرکت داری کی معقولیت پر شک کرتے تھے کیونکہ انھیں یہ تردد تھا کہ پھر اسی طرح دیگر مقامات پر بھی اجارہ داریاں قائم ہونے لگیں گی جو کمپنی کے کاروباری مفاد کے لیے مضر ہوگا۔ اور اس زمانہ کی تحریروں کے قارئین اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ان کے خطرات درست ثابت ہوئے حالانکہ مشرقی ساحل پر اجارہ داری کا منصوبہ میر جملہ کے گولکنڈہ چھوڑ کر مغلوں کی ملازمت اختیار کر لینے پر ختم ہو گیا۔

دوسری استثنائی صورت جس کا اوپر حوالہ آیا ہے یعنی وقت اور اخراجات بار برداری۔ یہ بھی سرکاری مزاحمت کے خطرات سے عملاً کم اہم مسائل نہ تھے۔ اس کے نتیجہ میں منڈیوں کے حدود اس قدر سکڑ گئے تھے کہ جنھیں فی زمانہ غیر معمولی طور پر تنگ تصور کیا جائے گا اور ساتھ ساتھ ان دنوں قیمتیں دنیا میں کسی چیز کی موجود رسد پر نہیں بلکہ اس کی مقامی فراہمی کے تابع رہا کرتی تھیں۔ اسی طور پر درآمدی سامان کے معاملہ میں بھی اہم عنصر وقت کا تھا۔ فی زمانہ ہندوستان کے کسی بھی حصہ میں کسی چیز کی قلت کا خطرہ پیدا ہو جانے پر فوراً بیرونی ممالک کو بذریعہ بحری تار خبر دی جاتی ہے اور اس کی زائد رسد کے بالعموم چند ہفتوں کے اندر اندر

آجانے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ برخلاف اس کے زیر مطالعہ دور میں سیسہ، یا مونگا یا بعض مخصوص طرز کے اونی کپڑوں کے پہنچنے میں تقریباً دو سال کی مدت صرف ہوتی تھی۔ سورت سے ماہ جنوری میں وطن، فرمائش روانہ کی جاتی تھی اور اگر کوئی خلاف توقع وقوعہ پیش نہ آجاتا تو سامان اگلے ستمبر تک آپاتا تھا۔ جب تک ممکن ہے کہ منڈی کے حالات بالکل ہی تبدیل ہو چکے ہوں بس دور دراز مقامات کو بھیجے جانے والے سامانوں کی کھیپ مرتب کرنے میں بڑی بے اطمینانی رہا کرتی کیونکہ جو سامانوں کی فرمائش رہتی وہ ممکن ہے سرے سے قابل حصول ہی نہ ہوں اور اگر قابل حصول ہوں بھی تو ممکن ہے کہ وہ پہنچتے پہنچتے ناقابل فروخت ہوجائیں۔ لہٰذا تاجر کچھ تو مقامی قیمتوں سے اور کچھ بالکل تازہ ترین اطلاعات سے جو پہلے ہی تھوڑی بہت متروک ہوچکی رہتی تھیں رہنمائی حاصل کیا کرتے تھے۔ ہندوستان اور یورپ کے درمیان خطوط کے براہ بصرہ اور حلب خشکی سے بھیج کر وقت کی کچھ کفایت ہوسکتی تھی۔ اس راستہ پر سہولتوں کا ایک بار تجربہ ہونے کے بعد اسے کم و بیش پابندی کے ساتھ استعمال کیا جانے لگا تھا[1] لیکن بہرحال اس راستہ سے آمد و رفت کسی طور پر بھی قابل اعتماد نہ تھی۔ ممکن تھا کہ عام حالات میں خشکی کی راہ سے بھیجے ہوئے خط سے عملاً ایک سال کی مدت کی کفایت ہوجائے لیکن بصورت دیگر اس کا بھی امکان پایا جاتا تھا کہ اس میں بحری ڈاک کے اتنا ہی وقت لگ جائے۔ جہاں تک مشرق بعید کا تعلق ہے وہاں کی ڈاک میں اس طور پر وقت کی کوئی کفایت ممکن نہ تھی اور عمومی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان دنوں دور دراز کی منڈیوں کے درمیان تعلقات کے انتہائی غیر یقینی ہونے کے باعث تجارتی کاروبار میں ایک ایسے عنصر نے راہ پائی تھی جس سے ہم فی زمانہ ناآشنا ہیں۔

---

[1] پرتگیزی وقتاً فوقتاً خبروں کو براہ حلب خشکی سے اور سوئیز سے بھی بھیجے ہے ——— ملاحظہ ہو مثلاً (COUTS X. 1.72) لیکن جو مثالیں میری نظر سے گزریں ان میں بھیجی ہوئی خبریں تجارتی نہیں بلکہ سیاسی تھیں۔ ۱۶۱۶ء میں ولندیزی ایمسٹرڈم اور مسولی پٹم کے درمیان براہ خشکی سلسلۂ مواصلات قائم کرنے کے امکان پر غور کر رہے تھے لیکن ان دنوں جنگوں کی وجہ سے اس راستہ میں رکاوٹیں حائل تھیں (HAGUE TRANSCRIPTS 1-83) انگریزوں کا خشکی کے راستہ کا استعمال کرنا صدی کی چوتھی دہائی میں پایا جاتا ہے۔ (ENGLISH FACTORIES VI. 245 VII. 27. etc.)

خالصتہً ہندوستانی کاروباروں میں وقت کا عنصر، ہرچند کہ ناقابل لحاظ نہ تھا مگر پھر بھی کم از کم جہاں تک سامانوں کے براہ خشکی اکٹھا کرنے یا تقسیم کرنے کا تعلق ہے یہ خرچ کے بالمقابل ثانوی درجہ میں تھا۔ ہمعصر تحریروں میں مندرج تھوڑی بہت تفصیلات سے زمینی باربرداری کے اخراجات کا ایک تخمینی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ 1619ء میں تقریباً 500 ال۔ بی وزن کے ایک اونٹ کے بار کا آگرہ سے سورت تک براہ برہان پور باربرداری کا خرچ ¾14 روپیہ تھا۔ 1638ء میں اسی راستہ پر ¾2 روپیہ فی 74 ال۔بی کے نرخ پر باربرداری کا ٹھیکہ ہوا تھا۔ 1651ء میں آگرہ سے احمدآباد تک براہ راجپوتانہ 3/16 13 روپیہ فی اونٹ وصول کیا جاتا تھا جب کہ 1639ء میں آگرہ سے لاہور تک مال کی ڈھلائی کی شرح 74 ال۔ بی کے ایک من کی 2 روپیہ تھی۔ مذکورہ اور نیز دیگر شرحوں کو ایک مشترک اکائی میں تحویل کرنے پر شمالی اور مغربی ہندوستان کے علاقہ میں 100 ال۔ بی مال کو 100 میل لے جانے کا صرفہ نصف و تین چہارم روپیہ کے درمیان آتا ہے۔ اس میں مسلح محافظین اور اندرون ملک درآمدی محاصل کے اخراجات شامل نہیں ہیں۔ ان آخرالذکر اخراجات میں مقامی حالات کے تحت زیادہ فرق رہا کرتا تھا۔ یہ بات کہ ان اخراجات سے لاگت میں اچھا خاصہ اضافہ ہو جایا کرتا تھا۔ پیٹر منڈی* کے ایک ٹھیکہ کے حوالہ سے واضح ہوتا ہے جس کے تحت آگرہ سے احمدآباد تک کے مال باربرداروں نے 45 روپیہ فی گاڑی اور ½9 روپیہ فی اونٹ کے بار کی شرح سے ادائیگی کی صورت میں جملہ درآمدی محاصل کو اپنے ذمہ لے لیا تھا۔ یاد رہے کہ اس راستہ پر خود مختار سرداروں کی ایک کثیر تعداد تھی لہٰذا ہم ان اعداد کو پورے ملک کی معیاری شرح نہیں تصور کر سکتے۔ جہاں تک خالص باربرداری کے اخراجات کا تعلق ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیش قیمت سامان تو اپنے وزن کی فی اکائی پر ان کو برداشت کر سکتے تھے لیکن معمولی زرعی پیداواروں کے لیے ان کا بار بہت زیادہ ہوا کرتا تھا۔ سولھویں صدی کے اختتام پر شمالی ہندستان میں گیہوں کی عام قیمت 185 ال۔ بی فی روپیہ تھی۔ اس کے 100 میل کے اخراجات باربرداری اس کی قیمت کو دوگنا کر دینے کے لیے کافی تھے اور اس کی گجرات میں کھپت کی منڈیوں تک ڈھلائی اس کی مروجہ قیمت کو بڑھا کر 5 گنے سے لے کر 8 گنے تک پہنچا دیتی۔ ہم زیر مطالعہ عہد کے دوران پھر سورت میں گیہوں کی عام قیمت کو تقریباً 85 ال۔ بی۔ فی روپیہ پاتے ہیں۔ گیہوں جو 250 میل یا اس سے کم فاصلہ سے سورت پہنچتا تھا اسے اگر اس قیمت پر فروخت کیا جاتا تو اس سے صرف

اخراجات باربرداری پورے ہو سکتے تھے۔ لہٰذا درآمد کا دائرہ 200 میل سے کافی کم رہا ہوگا اور قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہی زیادہ فاصلہ سے غذائی اجناس کو یہاں کھینچ سکتا تھا۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نیل کے قسم کی اشیا کے لیے آگرہ اور احمدآباد کی ایک مشترک منڈی تھی کیوں کہ تجارت کی غرض سے ان کے مابین باربرداری ممکن تھی اور بڑے خریداران ان میں سے کسی ایک شہر میں اپنی خریداری کر سکتے تھے۔ دوسری طرف، غذائی اجناس کے معاملہ میں ہمیں پورے ہندوستان کو کثیر تعداد کی تقریباً آزاد منڈیوں میں منقسم تصور کرنا چاہیے کیونکہ زمینی باربرداری کے اخراجات اس قدر زیادہ تھے کہ ان میں باہم مقابلہ خارج از بحث تھا۔ پانی کے راستہ کی موجودگی کی صورت میں، منڈیوں کی ایک دوسرے سے علیحدگی نسبتاً کم ہو جاتی تھی اور سمندر تو خاص طور پر ایک طاقتور متحد کرنے والے عامل کے درجہ میں تھا۔ درآمد اور برآمد کے معاملہ میں سورت اور لہاری بندر ایک منڈی تھے بشرطیکہ یہاں تجارتی سامان کی اس قدر مقدار موجود ہو جو ایک ساحلی ناؤ پر لادنے کے لیے کافی ہوتی۔ اسی طور گجرات اور مالابار سوائے اس صورت میں کہ سمندری قزاقوں نے سمندری راستہ کی ناکہ بندی کر لی ہو، ایک منڈی کی حیثیت میں تھے اور تقریباً یہی شکل سورت اور مسولی پٹم کی بھی تھی۔ ان آخر الذکر بندروں پر بٹاویا میں ولندیزیوں کا صدر مقام ہونا درآمدی اشیا کی قیمت کو برابر رکھنے کا ایک اہم سبب تھا کیونکہ کونسل لاگت کے خرچ کو بہت ہی تھوڑی مقدار میں بڑھا کر مسالوں، چینی کے برتنوں، یا بیش قیمت دھاتوں کے قسم کے سامانوں کو ہندوستانی ساحل کے ان مقامات پر جہاں ان کے لیے بہترین منڈی موجود ہو بھیج سکتی تھی اور یہی عمل متعدد برآمدات کی قیمت پر بھی کارفرما تھا۔ حالانکہ سوتی سامانوں کے ایسی اشیاء میں اختصاص کے باعث بعض صورتوں میں بدل کا فوری انتظام ناممکن ہوتا۔[1] بہرحال اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ جنگوں اور سمندری قزاقی کی خلل اندازیوں کے علاوہ عام طور پر ساحلی منڈیاں اگر باہم متحد نہیں تو ایک دوسرے کے تابع رہا کرتی تھیں لیکن براہ خشکی سامان کی ایک منتشر نقل و حرکت بھی کم قیمت اشیا کے

---

[1] بقول پلسارٹ (ص 6) ولندیزی مشرقی ساحل پر کثرت سے مال درآمد کر کے شمالی ہندوستان میں اپنی تجارت کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ اس نے وہاں درآمد کو کم کیے جانے اور سورت میں اسے بڑھائے جانے کی سفارش کی۔ اس کے چند برس بعد ایمسٹرڈم سے ایک عمومی حکم نامہ جاری ہوا کہ خلیج سورت اور مسولی پٹم میں سامان کی فراہمی کا ایسا نظم قائم کیا جائے کہ پورے خطہ میں قیمتوں کی ایک ہی سطح قائم رہے۔

معاملہ میں منڈی کے اس رشتہ کو منقطع کرنے کے لیے کافی ہو سکتی تھی۔

فصل 2 - اشخاص اور تنظیم

ہمعصر تحریروں کا ہر مطالعہ کرنے والا، ہندوستانی منڈیوں میں جن مقامات پر ولندیزی اور انگریز تاجروں نے اپنے قدم جمالیے تھے وہاں ان کی اہمیت کا اندازہ لگانے میں آسانی کے ساتھ مبالغہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان دو قوموں کے تاجروں کو مجموعی طور پر مغربی یورپ سے سامانوں کی فراہمی کی عملی اجارہ داری حاصل تھی اور اسی طور پر وہاں کے لیے سامان کی خریداری پر بھی ان کا قبضہ تھا لیکن ایسا نہ تھا کہ ہندوستانی منڈیوں میں یورپی تجارت غالب حیثیت میں رہی ہو اور میل جول کے ساتھ کام کرنے کی صورت میں یہاں کی تجارت پر ولندیزی اور انگریزی کمپنیوں میں سے ہر ایک جس درجہ میں اثر انداز ہو سکتی تھی وہ ان کے باہمی مقابلہ کی وجہ سے بہت کم ہو گیا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وقتاً فوقتاً اس مقابلہ کو جو یورپی مفاد کے لیے تو ضرر رساں لیکن ہندوستانی پیدا کرنے والوں اور صارفین کے لیے نفع بخش تھا ختم کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ لیکن یہ کوششیں عارضی ثابت ہوئیں یہاں تک کہ 1634ء میں نیل کی سرکاری اجارہ داری کو ناکام بنانے کی غرض سے ان کے درمیان جو معاہدہ عمل میں آیا تھا اس میں بھی آگرہ میں انفرادی خریداریوں کی وجہ سے شدید رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ یورپی تاجر کبھی کبھی مخصوص اشیاء کی تجارت میں منڈیوں پر حاوی رہتے تھے لیکن یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کبھی بھی تجارتی رجحانات پر غالب رہے بلکہ یہ حیثیت منفرد ہندوستانی مسلمانوں، بنیوں، یا چیٹیوں کو جیسی بھی صورت ہو حاصل رہی۔ ان اشخاص کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی دولت اور صلاحیتوں کی بنا پر اپنے کاروباری علاقہ کی پوری تھوک تجارت پر تقریباً پوری طرح قابض رہا کرتے۔

سورت کا ملک التجار ویرجی ورا ہمارے عہد میں اس زمرہ کا ممتاز ترین ہندوستانی تھا۔ صحیح یا غلط یہ دنیا کا دولتمند ترین تاجر شمار کیا جاتا تھا[1] اس کا سب سے پہلا حوالہ جو مجھے

---

[1] میں نے اس نام کو انگریزی زبان میں نقل کرتے وقت ENGLISH FACTORIES کا اتباع کیا ہے۔ پروفیسر سرکار اسے بہرجی بورہ (شیواجی صہ ۱۱۹) اور نیز بیرجی بورہ (اورنگ زیب ج ۱ صہ 325) (۱۹۳ صہ ۱، ۱۱۱)

مل سکا ہے۔ ۱۶۱۹ء سے متعلق ہے جب کہ سورت کے ایک جہاز کے نگراں کے ساتھ جو اس کی ملازمت میں تھا انگریزی جہازوں نے اچھا سلوک کیے جانے کا سفارشی پروانہ دیا۔ اس کے بعد سے تجارتی تحریروں میں اس کا معمولاً مختلف اشیا مثلاً سونا، چاندی، سیسہ، مونگا اور ہاتھی دانت، مسالے، فیون، کپاس بلکہ سورت کی تھوک منڈی میں فروخت ہونے والی تقریباً ہر چیز کے خریدار یا بیچنے والے کی حیثیت سے اکثر ذکر ملتا ہے۔ اس کا کاروبار بڑے پیمانہ پر تھا اور اس کے زیر اثر تجارتی انجمنیں 5 سے ۱۰ لاکھ روپیہ تک کی مالیت کے مسلّم جہازوں کے سامان کو خریدنے پر آمادہ رہا کرتی تھیں۔ ایسی لمبی لمبی خریداریوں کے نتیجہ میں وہ قدرتی طور پر مخصوص اشیا مثلاً ولندیزیوں کے درآمد کیے ہوئے مسالوں کی اجارہ داری پر عارضی طور سے قابض ہو جاتا تھا۔ ہم اس کی تجارتی انجمنوں کو 45 روپیہ فی من پر خریدی ہوئی لونگ کو 62 سے 65 روپیہ تک پر فروخت کرتا ہوا پاتے ہیں۔ غیر ملکی سامانوں کے علاوہ سورت میں سیاہ مرچ اور یہاں سے مالابار کے ان بندروں کی ساحلی تجارت پر بھی جو پرتگالیوں کے زیر اثر نہ تھے اس کا قبضہ تھا۔ اس کا کاروبار بہت پھیلا ہوا تھا اور اس کی شاخیں یا انجمنیں احمد آباد، آگرہ، برہان پور اور گولکنڈہ ایسے مقامات پر نیز مالابار اور مشرقی ساحلوں پر موجود تھیں۔ ساتھ ساتھ اس کا جاوا، بصرہ اور گامبرونؒ سے بھی تعلق قائم تھا۔ وہ اکثر انگریزی جہازوں کے ذریعہ مذکورہ مقامات پر اپنا سامان بھیجا کرتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ منڈی میں اس کی طاقت اس قدر بڑھی جو انگریز آڑھتیوں کے لیے پریشان کن ثابت ہوئی۔ "ایک معمولی سوداگر" کی حیثیت سے شروع کر کے وہ "تمام یورپی سامانوں کا تنہا اجارہ دار بن گیا اور ۱۶۳۴ء میں اس کے متعلق کہا گیا کہ وہ اس مقام (سورت) کے کمتر درجہ کے تاجروں پر اس درجہ حاوی ہے کہ وہ جب کبھی بھی کوئی خریداری کرتے اور زیادہ قیمتیں ادا کرتے تو انھیں اس سے باز رکھا جاتا اور انھیں یہ جرأت نہ ہوتی کہ وہ اسے اپنے ارادوں یا مرضی سے باخبر کریں کیونکہ وقت اور قیمت

(بقیہ صفحہ ۱۹۲) لکھتے ہیں۔ یہ جن عبارتوں میں آئے ہیں ان سے بین طور پر واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی شخص ہیں۔ ۱۶۶۹ء میں سورت سے REV. JOHN/ESCALIST کے لکھے ہوئے ایک خط میں اس کو دنیا کے دولت مند ترین تاجر کی حیثیت سے شہرت کی تائید کی گئی ہے۔ یہ خط سر طامس براؤن کی تصنیفات (ج ۴ صفحہ ۴۹) کے WILKINS ایڈیشن میں چھپا ہے اور یہاں جس حصہ کا حوالہ آیا ہے وہ INDIAN ANTIQUITY FOR 1921 PP 312, ff. میں ملتا ہے

ابھی تک اس مرضی و منشا کے اندر ہیں، ان خیالات کو ظاہر کرنے والی کونسل نے یہ بھی واضح طور پر لکھا کہ "وہ اس کی غیر نفع بخش دوستی سے عاجز آچکے ہیں جس سے وہ دھیرے دھیرے چھٹکارہ حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور دوسرے بہتر طور پر معاملہ کرنے والوں کی طرف رجوع کرنا چاہتے ہیں۔" لیکن کونسل کے یہ منصوبے پورے نہ ہوئے کیونکہ 1642ء میں ویرجی درا "دیگر تمام بنئے تاجروں کو خوفزدہ کر کے اپنا پابند بنا رہا تھا" اور اس کے چار برسوں بعد بھی آڑھتیے اسی کے قابو میں تھے۔ زیر مطالعہ دور کی آخری دہائی میں ہمیں ایک سودے کی خرید و فروخت کے سلسلہ میں نزاع پیدا ہونے کی اطلاع ملتی ہے جسے فیصلہ کے لیے لندن رجوع کیا گیا۔ کمپنی نے اس کا فیصلہ ویرجی درا کے خلاف کیا لیکن اس کی خاطرداری کے خیال سے اس کے لیے ایک بیش قیمت تحفہ بھیجا جو اسے راضی کرنے میں ناکام رہا اور کچھ عرصہ تک وہ اس قدر رخفا رہا کہ کمپنی کو "وہ کسی شرح سود پر بھی قرض دینے کے لیے رضامند نہ ہوا۔"

ویرجی درا اپنے اس قدر اثرات کے باوجود مقامی حکام کو نظر انداز نہ کر سکتا تھا۔ 1636ء میں وہ صوبیدار سے اس وجہ سے کہ وہ اس کے ساتھ شراکت داری کا خواہاں ہے، خائف تھا کیونکہ اسے اس میں "بھینس کر خسارہ" اٹھانے کا امکان نظر آرہا تھا۔ اس کے بعد کے ایک صوبیدار مسیح الزماں نے بظاہر یہ بھانپ لیا تھا کہ وہ جبری وصولیوں کے لیے بہت موزوں شخص ہے، کیونکہ 1638ء کے اختتام پر ہم اسے سورت کے قید خانہ میں انتہائی بہیمانہ مظالم میں مبتلا پاتے ہیں۔ اس کے خلاف کسی مخصوص الزام کی صراحت نہیں ملتی اور ہمیں یہ بھی علم نہیں کہ یہ صحیح تھا یا غلط۔ لیکن اس کے خلاف جو کارروائی عمل میں لائی گئی وہ بظاہر خلاف ضابطہ تھی، کیونکہ دیوان (شاہی مالی حکام کا صوبجاتی نمائندہ) کے مطلع کرنے پر بادشاہ نے ویرجی درا کو بذات خاص جوابدہی کے لیے دربار میں طلب کیا اور بالآخر صوبیدار اپنے عہدہ سے برطرف ہوا۔ اس کے بعد ہمارے عہد کے اختتام پر ویرجی درا کا کاروبار کسی سنگین مزاحمت سے دوچار نہ ہوا۔ 1664ء میں شیواجی کی سورت پر یورش سے اس کو شدید نقصان اٹھانا پڑا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ وہ معہ ایک اور تاجر کے "ابھی تک سربلند اور لمبے چوڑے کاروبار میں مصروف ہے۔" 1665ء میں چند گمنام درخواستیں بٹادیا پہنچیں جن میں اسے سورت میں ولندیزی تجارتی کوٹھی کے ساتھ ناقص کاروباری معاملات کرنے کے الزام میں متہم کیا گیا اور تقریباً اسی زمانہ میں تھونیو نے اسے ایک

ایسا دوبست قرار دیا جس کی پونجی ۵۰ لاکھ بتائی ہے۔ تھونیو نے جس اکائی میں یہ رقم ظاہر کی ہے، واضح نہیں ہے لیکن ایک دوسری ہمعصر تحریر میں اسے ۵۰ لاکھ روپیہ بتایا گیا ہے[1]۔ اور ہم یہ تسلیم کر سکتے ہیں کہ لوگ عام طور پر ویرجی ورا کو اسی قدر سرمایہ کا مالک بتاتے تھے۔ لیکن یہ تخمینہ بلاشک حقیقت سے بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں اس کی موت کی کوئی اطلاع نہ مل سکی لیکن یہ غالباً 1677ء کے قبل واقع ہوئی تھی[2]۔

اب قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ویرجی ورا کے ایسے حالات کا امکان منڈی میں یورپی تاجروں کی موجودگی کو پسند کرتا تھا۔ کم از کم انگریزوں کی حد تک واقعات کی روشنی میں اس کا جواب بظاہر اثبات میں ملتا ہے کیونکہ وہ ایک طویل مدت تک خوشی خوشی ان کی تجارت کے لیے سرمایہ فراہم کرتا رہا جس کے دوران وہ غالباً انھیں ملک بدر کر سکتا تھا۔ کسی پچھلے باب میں گزر چکا ہے کہ انگریز اکثر سورت میں سرمایہ فراہم کرنے کی وجہ سے قرض لینے پر مجبور رہتے تھے اور ویرجی ورا ہی ان کی بیشتر ضروریات کا کفیل ہوا کرتا اور منڈی میں وہ ایسی موثر شخصیت کا مالک تھا کہ یہ بجا طور پر تصور کیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ چاہتا تو دوسروں کو انھیں قرض دینے سے باز بھی رکھ سکتا تھا۔ اس کے برخلاف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ ایک موقع پر جب کہ انگریز غیر معمولی پریشانیوں میں مبتلا تھے تو اس نے رضاکارانہ طور پر یک مشت دو لاکھ روپیہ کا قرض دینا منظور کیا۔ اسی طرح ایک دوسرے موقع پر اس نے ایک لاکھ روپیہ کی غیر متوقع رقم قرض دے کر ان کی ساکھ کو گرنے سے بچا لیا۔ یہ قیاس کہ اس کا یہ عمل انسان دوستی یا اخلاص کے جذبہ کے تحت تھا، مہمل ہوگا۔ وہ باضابطہ سود وصول کرتا تھا۔ جسے وہ منڈی کے حالات کے تحت بڑھاتا رہتا تھا۔ وہ اپنے عائد کردہ شرائط کو پوری سختی کے ساتھ پوری کراتا تھا اور ہم اس نتیجہ پر پہنچنے میں پوری طور سے حق بجانب ہوں گے کہ وہ ان تاجروں کی موجودگی کو جنھیں وہ جملہ کاروباری سہولتیں بہم پہنچاتا، قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور یہ کہ اس کا یہ فیصلہ تھا کہ انگریزوں کی غیر موجودگی کے مقابلہ میں ان کے

---

[1] یہ عدد ESCALIST '1 کے خط سے جس کا حوالہ کسی پچھلے فٹ نوٹ میں گزر چکا ہے، ماخوذ ہے۔

[2] یکم جون 1678ء کے DAGH REGISTER میں سورت کے چند عجیب و غریب خطوط طبع ہوئے ہیں۔ ان کا موضوع کچھ اس نوعیت کا ہے کہ اگر ویرجی ورا اس وقت کاروبار کر رہا ہوتا تو ان میں اس کے نام کا ذکر آنا تقریباً لازمی تھا لیکن اس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔

موجود رہنے کی صورت میں زیادہ روپیہ کمایا جاسکتا ہے۔ اس کے طور طریقہ سے جو دوسرا نتیجہ نکالا جاسکتا ہے اس کا تعلق اس زمانہ میں شخصی ساکھ کی اہمیت سے ہے۔ تحریروں میں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ اپنے قرضوں کے سلسلہ میں ضمانت طلب کیا کرتا تھا اور یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اس قسم کا مطالبہ بے حاصل ہوتا کیونکہ انگریزوں کے پاس کوئی شے محسوس ضمانت میں دینے کے لیے نہ تھی۔ ان کا مقامی سرمایہ بیش از بیش فوری طور پر ناقابل فروخت سامانوں کے ایک ذخیرہ پر مشتمل رہتا تھا۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ گجرات کے ایسے حالات میں، اگر قرض لینے والے کی ذاتی ساکھ اچھی ہو تو اسے ایک کاروباری سودے کے طور پر لاکھوں روپیہ کا قرض دیا جاسکتا تھا۔

مشرقی ساحل پر 'ملایا' نام کے خاندان یا فرم میں ویرجی وُرا کا ایک مثل موجود تھا جس کا صدر مقام پولی کٹ اور سلسلہ جنوب میں نیگاپٹم تک پھیلا ہوا تھا۔ ملایا خود تو 1634ء میں مرگیا تھا لیکن اس کے رشتہ داروں نے اس کے کاروبار کو قائم رکھا اور اس کے مرنے کے دس یا پندرہ برس بعد تک ہمیں انگریزی تحریروں میں "ملایا" کا نام ملتا رہتا ہے۔ ویرجی وُرا کے فرم کے مقابلہ میں اس فرم کے کاروبار کو سمجھنا نسبتاً زیادہ دشوار ہے کیونکہ اس کی سرگرمیاں جنوب کی پیچیدہ سیاست میں بہت زیادہ الجھی ہوئی تھیں۔ ملایا کا چھوٹا بھائی چنا چیٹی جو اس کے مرنے پر فرم کا سربراہ ہوا تھا متعدد عہدوں کا اجارہ دار تھا۔ اور وہ وقتاً فوقتاً میدان جنگ میں فوجوں کی کمان بھی سنبھالتا تھا نشیب و فراز اس کی زندگی کا لازمی جزو تھا اور ایک موقع پر تو بحیثیت ایک قرضدار کے اس کی ساکھ کو شبہ کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا تھا لیکن اس کے واقعی دیوالیہ ہونے کی کوئی تحریری سند نہیں ملتی۔ فرم کا خاص کاروبار جہازی سامان کی باربرداری تھی اور اس کی ان مختلف چالوں سے جو ولندیزی اور انگریزی تحریر میں ملتی ہیں، میرا خیال ہے کہ فرم کی خاص پالیسی ایک کمپنی کو دوسری کمپنی کے خلاف لڑانا تھا۔

قدرتی طور پر معمولی تاجروں کے متعلق، بمقابلہ مذکورہ قسم کی فرموں کے ہمارے پاس کم اطلاعات ہیں۔ ان کے سلسلہ میں صرف اس قدر لکھنا کافی ہوگا کہ ان کا کاروبار نسبتاً چھوٹے پیمانہ پر تھا اور وہ معمولاً اپنی منڈی پر حاوی اشخاص کے بتائے ہوئے ڈھرے ہی پر کام کرتے تھے تحریروں میں سورت کے ایک تاجر کا یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ اس نے ویرجی وُرا کا اعلانیہ مقابلہ کرنے کے ارادہ سے مونگے کی ایک پوری کھیپ خریدلی لیکن اسے دو برس تک اس خریداری

کو تسلیم کرنے کی جرأت نہ ہوسکی اور وہ انگریزوں کے مال گودام میں "بے طلب اور بے توجہ"
پڑی رہی لیکن اس دور کے مراسلات سے واضح ہوتا ہے کہ اس قدر انفرادیت کے مظاہرہ کی
بھی معمولاً توقع نہ کی جاتی تھی۔ تحریروں میں دلالوں کی حیثیت بمقابلہ معمولی تاجروں کے زیادہ
نمایاں نظر آتی ہے اور ان کی خدمات کو استعمال کرنے کا عام رواج تھا۔ یہ زیادہ تعداد میں اور
ہر جگہ موجود رہا کرتے اور بعض اوقات تو وبال جان بھی ثابت ہوتے۔ 1665ء میں سورت کے
انگریز آڑھتیوں نے یہ قاعدہ بنایا کہ دوسرے دلال اُن کی تجارتی کوٹھی میں داخل نہ ہوں بجز کمپنی
کے دلالوں کے ...... اور ان کے بعض جانے ہوئے ملازمین کے جب تک کہ ان کو کوئی ایسا کام
نہ ہو جو کمپنی سے متعلق ہو نیز انھیں اندر آنے کی پہلے سے اجازت حاصل کرنی ہوگی۔ اس کے خلاف
عمل سے بے حد پریشانیاں ہوئیں کیونکہ اس طور پر یہی نہیں کہ دوسروں کی ہر قسم کی نجی تجارت کو بڑھایا
گیا بلکہ ہماری تجارت کے رازوں کو بھی معلوم کر لیا گیا جو اس طریقہ سے قبل از وقت ظاہر ہو گئے۔
کبھی کبھی ہمیں دلالوں کی جعلسازی اور نمک حرامی کے واقعات کا بھی علم ہوتا ہے لیکن
میں سمجھتا ہوں کہ ان دنوں کے مروجہ رسم و رواج کے حدود کے اندر یہ بالعموم معقول خدمت انجام
دیتے تھے اور یہ تصور کرنے کے کچھ وجوہ ملتے ہیں کہ انگریز ایک طویل عرصہ تک ایسے دلالوں کی ٹولی
کے چکر میں پھنسے رہے جو زیادہ بھلے مانس نہ تھے[1] ان کا کاروباری اخلاق جیسا بھی رہا ہو لیکن

---

[1] انگریزوں کے پہلے دلال جادوداس کی بے ضابطگیاں ابتدائی مراسلات کا ایک عام موضوع ہے۔
مثلاً ENGLISH FACTORIES 41,42 RECEIVED i 284,304, v 115, vi 232 ٹامس رو (ص 216) LETTERS
کا کہنا ہے کہ ہمارے کاموں میں تنہا اس کی مزاحمت دیگر جملہ مزاحمتوں سے زیادہ ہے۔" اور یہ بھی کہ (ص 277)
"وہ ہر چیز میں بجز دیانتداری کے پورا ہے (اس کے باوجود۔ مترجم) اس معاملہ میں انتخاب کی بہت
تھوڑی گنجائش ہے۔" میں اسے ایک پریشان کن مگر ناگزیر ملازم تصور کرتا ہوں جیسا کہ اس وقت
بھی کبھی کبھی ہندوستان میں پائے جاتے ہیں اور اس نے بلاشک اپنے اعزہ کو کمپنی کی ملازمتیں
دلوانے میں کامیابی حاصل کی کیونکہ 1632ء میں منڈی کے قول (ج 2 ص 79) کے مطابق پٹنہ میں
اس کا نائب گوردھن داس (سورت کا دلال) ہمارے آگرہ کے دلال دھن جی اور بڑودہ کے دلال پنجو
کا چچازاد بھائی تھا۔ یہ دو بھائیوں کے لڑکے تھے اور برہان پور کا دلال جادوداس کا تیسرا بھائی تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی کوششوں سے ٹھیک قیمتیں دلاتے تھے۔ اور جیسا کہ اگلی فصل میں ذکر آئے گا قیمتیں منڈی کے حالات کے لحاظ سے تیز رفتاری کے ساتھ جنبش کیا کرتیں۔

میرے خیال میں تاجروں کو دلالوں سے ممیز کرنے والی چند سرمایہ کی ملکیت ہوا کرتی تھی اور اس مخصوص معاملہ کے علاوہ، زیر مطالعہ دور کی منڈیوں میں اختصاص کی بہت کم مثالیں نظر آتی ہیں۔ ویرجی وورا خاص طور پر تو ایک تاجر یعنی چیزوں کی خرید فروخت کرنے والا تھا اور وہ ہر اس چیز کا کاروبار کرتا تھا جس میں نفع کی امید پائی جاتی ہو۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ محصول لے کر جہازوں پر سامان کی لدائی کا کام بھی کرتا تھا، وہ ایک ساہوکار اور لوگوں کی اندوختہ رقوم کا امانت دار بھی تھا اور وہ اپنی ذیلی شاخوں کے نام بلوں یا ہنڈیوں کے ذریعہ ترسیل زر کا بھی انتظام کرتا تھا اسی طور پر ملایا کی فرم بھی طرح طرح کا کاروبار کرتی تھی اور مجھے کوئی ایسا ساہوکار جو تاجر نہ ہو یا کوئی ایسا ممتاز تاجر جو اپنے کاروبار کو ایک مخصوص قسم کے سامانوں ہی تک محدود رکھتا ہو نہیں ملا۔ اختصاص سے سب سے زیادہ قریبی مثال غالباً سکوں کا کاروبار کرنے والوں یا صرافوں میں پائی جاتی تھی۔ رائج الوقت سکوں کے متنوع ہونے کے باعث یہ کاروبار صرف اس کے ماہرین ہی کر سکتے تھے اور صراف* پکارے جانے والے ماہروں نے ٹیورنیر ایسے سیاح کو اپنی فنی صلاحیت سے متاثر کیا تھا۔ لیکن یہ بھی تنہا سکوں ہی کا کاروبار نہ کرتے کیوں کہ ہمیں ایک موقع پر اطلاع ملتی ہے کہ ایک صراف نے جو انگریزوں کی ملازمت میں تھا ان کے ایک چھوٹے جہاز کو خلیج فارس کے ساتھ کاروبار کرنے کی غرض سے کرایہ پر لیا اور اسی طور پر ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کبھی کبھی انگریزی دلال خود اپنے کھاتہ میں بھی کاروبار کرتے ہیں ممکن ہے کہ بحری بیمہ بھی ایک فنی مہارت کا کاروبار رہا ہو لیکن اس موضوع پر مجھے کوئی قطعی اطلاع نہ مل سکی۔ بیمہ کا رواج عام تھا اور ہمیں جنگی بیموں کا کاروبار کرنے و نیز ایک "زائد المیعاد منڈی" کے وجود کا بھی ہمیں علم ہے لیکن بیمہ کرنے والوں کے نام یا ان کی حیثیتیں واضح نہیں کی گئی ہیں۔ غالباً زیادہ امکان اس کا ہے کہ معمولی تاجر ہی بیموں کا بھی کاروبار کیا کرتے تھے۔

پس ہم اپنے عہد کے ایک ہندوستانی تجارتی مرکز کو غیر معین تعداد کے کاروباری اشخاص پر مشتمل جو متعدد ذیلی شاخوں میں منقسم نہ ہو تصور کر سکتے ہیں لیکن ان کے درمیان درجہ بندی کا تعین ان کی صلاحیتوں اور زر سرمایہ کی کمی وبیشی کے اعتبار سے ہوتا تھا اور یہ سب کے سب ہر نفع بخش کاروبار میں شرکت کے متمنی رہا کرتے بشرطیکہ یہ ان کے اور ان تجارتی سربراہوں کے درمیان جن کو

وہ خفا کرنا نہ چاہتے تھے تصادم کا موجب نہ ہو۔ پس عربوں کے عدن پر دوبارہ تسلط کے بعد مختلف ہندوستانی بندروں سے بہ عجلت جہاز پہنچنا شروع ہو گئے اور منڈی سامانوں سے اس قدر پٹ گئی کہ ان کی فروختگی زیادہ نقصان کے ساتھ ہی ممکن ہو سکی۔ مخا میں، سرکاری مظالم کے باعث حالات اس سے بھی بدتر تھے اور اشین سے کوئی جہاز واپس نہ ہوا جس کے نتیجہ میں بہت سے ہندو اور مسلم تاجر سورت میں دیوالیہ ہو گئے اور پورے ملک میں سوتی سامانوں کی قیمت گھٹ گئی۔ 1667ء میں ولندیزی تحریروں کی دوبارہ اطلاع ہے کہ سکوں کے متعدد کاروباری اور مخا کے بعض تاجر سورت میں دیوالیہ ہو گئے ہیں جس سے سونے و چاندی کی منڈی تتر بتر ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ اسی پریشانی کا انگریز آڑھتیوں کے خط میں بھی حوالہ آیا ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ گامبروں سے "کسی بھی چیز کی فرمائش ہونے پر اسے اس قدر کثیر مقدار میں وہاں ناگہانی طور پر پہنچا دیا جاتا ہے کہ وہ بے قدر ہو جاتی ہے۔ یہی حال مخا کا بھی ہے۔ پس اب بصرہ ہی ایسا مقام رہ جاتا ہے جہاں سب سے زیادہ نفع کی امید پائی جاتی ہے۔" لیکن یہ آخری رائے جلد ہی غلط ثابت ہو گئی کیونکہ 1667ء میں بصرہ میں بھی سامانوں کی اسی قدر افراط ہو گئی جس قدر مخا میں کیونکہ "وہاں افراط سامان پہنچ گئے اور بکری بہت کم ہو گئی۔" اشین کی منڈی میں بھی اسی قسم کی پریشانی تھی۔ وہاں کا ظالم بادشاہ 1641ء میں مر چکا تھا اور اس کے جانشین کی انصاف پسندی کی شہرت نے ہندوستان کی متعدد تجارتی مہموں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ پس وہاں سوتی سامانوں کی کثرت ہو گئی اور جلد ہی یہ تخمینہ لگایا گیا کہ وہاں سامانوں کی موجود تعداد آنے والے دو برسوں کے لیے کافی تھی۔ مذکورہ ادوار ایام کے دیگر واقعات سے جو عمومی نتائج اخذ ہوتے ہیں وہ یہ تاثیر پیدا کرتے ہیں کہ کاروبار میں شوق کی زیادتی اور ضبط کی کمی جو اب مغربی منڈیوں کی خصوصیات ہیں ایسے اوصاف ہیں جو ایک پرانی تاریخ رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے عہد میں قوت اور پیش قدمی کرنے کی صلاحیتوں کی کمی نہ تھی اور ان دنوں جو حالات تھے ان کے پیش نظر ان صلاحیتوں کے بیشتر سٹے کی نوعیت کے کاروباروں پر صرف کیے جانے پر ہمیں تعجب نہ ہونا چاہیے۔

فصل ۵۔ گجرات میں نیل کی منڈی

ہم چند اہم اشیا کی تحریری قیمتوں میں تبدیلیوں کو بیان کر کے زیر مطالعہ دور میں منڈیوں کے

طریق عمل کو بہتر طور پر واضح کرسکتے ہیں۔ یہ لکھنا چنداں ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ ہندوستانی ماخذ میں قیمتوں کے باضابطہ اندراجات نہیں ملتے لیکن انگریزی مراسلات میں اس موضوع پر وسیع معلومات موجود ہیں۔ مزید براں 'ڈیٹا' یا جرنلوں' میں ان کے علاوہ بھی بہت سے اعداد محفوظ ہیں۔ چنانچہ موافق حالات میں قیمتوں کی کمی وبیشی کی تقریباً ایک مسلسل ترتیب قائم کی جاسکتی ہے۔ بدقسمتی سے ان میں سے بعض اعداد کا سمجھنا دشوار ہے۔ مثلاً ادنی کپڑے اس قدر مختلف اقسام کے ہوتے تھے کہ ان کی خصوصی واقفیت حاصل کیے بغیر ان کی مندرجہ قیمتوں پر بحث کرنا نامناسب ہوگا۔ چند درآمدی اشیاء مثلاً مونگا اور ہاتھی دانت کے متعلق بھی تقریباً اسی قسم کا خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ دوسری طرف برآمدات کے سلسلہ میں ان کے مقامات حصول کے بدلے جانے سے شورہ اور سوتی سامان کے مندرجہ اعداد کی قیمتیں متاثر ہوتی ہیں۔ آنے والی وضاحتوں کو اس طور پر مرتب کیا گیا کہ جہاں تک ہوسکے یہ دقتیں پیش نہ آئیں۔ بعض اشیاء مثلاً سیسہ یا پارہ یا لونگ کے معیار کے سلسلہ میں کسی نمایاں فرق کا سوال نہیں پیدا ہوتا درانحالیکہ دوسری اشیا مثلاً نیل کے لیے اس کی زیادہ برآمدی مقدار کی اوسط اداکردہ یا، قلمبند کی ہوئی قیمت کے اعداد دیے گئے ہیں اور اس طرح منفرد پارسلوں کے معیار میں فرق کے باعث قیمتوں کی کمی وبیشی کو خارج کیا گیا ہے۔ جن اکائیوں کے مقدار میں قیمتیں درج کی گئی ہیں ان پر ضمیمہ د میں بحث آئی ہے۔ ایک یا دوسری من کی تجارتی گنجائش کے سلسلہ میں تھوڑی بہت دقت محسوس ہوتی ہے کیونکہ ان کا کبھی کبھی ذکر آنے سے یہ اکثر واضح نہیں ہوتا کہ یہ کوئی باضابطہ رواج تھا یا محض ایک خصوصی رعایت۔ لیکن اس مد میں 5 فی صدی سے زائد کی غلطی نہیں ہوسکتی اور اہم نشیب و فراز کا جہاں تک تعلق ہے وہ بہت زیادہ ہیں لہٰذا ہم ان سے جو نتائج اخذ کرسکتے ہیں وہ گو ریاضی کے اعتبار سے تو غالباً نہیں لیکن نفس امر کے لحاظ سے صحیح ہیں۔

پہلی وضاحت احمدآباد کی منڈی میں سرکھیج کے برآمدی نیل کی قیمت سے متعلق ہے جس کے اعداد آنے والے جدول میں دیے گئے ہیں۔

ان اعداد کا مفہوم سمجھنے کے لیے مناسب ہوگا کہ سب سے پہلے اس دور کے شروع ہونے پر منڈی میں اس کی مسلمہ قیمت کے معیار کا پتہ چلایا جائے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ابتدائی انگریز خریداران 18 روپیہ کے معیار کو تسلیم کرتے تھے۔ نومبر 1613ء میں طامس آلڈورتھ* کی احمدآباد

× [illegible]

ے اطلاع کے مطابق پرتگالی خریداروں کی غیر موجودگی کے باعث قیمتیں بہت کم ہوگئی تھیں

1609-13ء کی مدت کے دوران احمد آباد میں سرکھیج کے نیل کی قیمتیں

نوٹ: قیمتیں 33 ال۔بی کے فی من کی روپیوں (اور اعشاریہ) میں دی گئی ہیں۔ 1635-36ء میں اس من کا وزن بڑھا دیا گیا تھا۔ لہٰذا 1636ء سے ماخذ میں مندرج قیمتوں کو بقدر ۱۰ فیصدی کم کر دیا گیا ہے (پرانے اور نئے من میں 20 : 18 کی نسبت تھی) تاکہ اس زمانہ کے اعداد کے موازنہ میں سہولت ہو۔

حوالوں میں LETTERS RECEIVED کے لیے L. R. ENGLISH FACTORIES کے لیے DAGH REGISTER E. F. کے لیے FACTORY RECORDS D. R. کے لیے F. R. اور ORIGINAL CORRESPONDENCE کے لیے OC استعمال کیا گیا ہے۔

سال	قیمت روپیہ اور اعشاریہ	تفصیل	حوالہ
معیاری	18.00	مندرجہ	L.R. ج صفحہ 300 اور جابجا
1609ء	12.00-10.500	"	L.R. ج (1) صفحہ 28
1612ء	14.00	"	JOURDAIN صفحہ 217
1613ء	14.00	"	L.R. ج (1) صفحہ 306
1614ء	12.00-10.500	ادا کی ہوئی	L.R. ج (2) صفحہ 214، 238
"	13.50-12.00	مندرجہ	" " صفحہ 248
1617ء	15.00-12.500	"	TERPESTRAS SURAT ضمیمہ 4
1618ء	18.500-15.500	ادا کی ہوئی	" " ضمیمہ 7
1619ء	15.00	تخمینہ	EF ج (1) صفحہ 62
1621ء	10.00	"	FR سورت ج (1) صفحہ 16
"	9.5-9.25	ولندیزیوں کی ادا کی ہوئی	EF ج (1) صفحہ 348

سال	قیمت روپیہ اور اعشاریہ	تفصیل	حوالہ
1621ء	9.25	انگریزوں کی ادا کی ہوئی	EF ج۔ ص 353
1622ء (جنوری)	7.00	تخمینہ	〃 ج (2) ص 19
〃 (اگست۔دسمبر)	9.00-8.00	مانگی ہوئی	〃 〃 ص 109، 158، 162
1623ء (اپریل)	8.00-7.50	مندرجہ	〃 〃 ص 219
〃 (نومبر)	8.75-8.50	〃	〃 〃 ص 328
〃 〃	12.00	مانگی ہوئی	〃 〃 ص 328
〃 (دسمبر)	10.25	ادا کی ہوئی	〃 〃 ص 331
1625ء	12.00	مندرجہ	EF ج (3) ص 63
〃	11.00	تخمینہ	FR سورت ج (1) ص 100
1628 (جنوری)	15.00-14.00	مانگی ہوئی	EF ج (3) ص 230
〃 (مارچ)	14.25-12.75	〃	〃 〃 ص 275
1630ء	16.00	مندرجہ	FR سورت 84 (2)، 52
1632ء	22.00-19.00	〃	EF ج (4) ص 215
1633 جنوری	25.00-23.00	〃	〃 〃 ص 255
〃 (نومبر)	18.00-16.00	ولندیزی قیمت کے مطابق	〃 〃 ص 328
1634ء	27.00	اجارہ داری کی قیمت	EF ج (5) ص 70
1635ء	27.00 (؟)	ادا کی ہوئی	EF ج (5) ص 142
1636	25.20	تخمینہ	〃 〃 ص 292
1638	18.00 سے کم (؟)	مندرجہ	〃 (6) ص 92
1639ء (جنوری)	26.90	ادا کی ہوئی، اوسط	OC 1656ء
〃 (دسمبر)	17.30		OC 1764ء
1640ء (جنوری)	20.00	مندرجہ	EF ج (6) ص 232
〃 (دسمبر)	16.70	ادا کی ہوئی، اوسط	OC 1764ء
〃 〃	14.40-62.60	چہ سے انداز کی ہوئی	EF ج (6) ص 273

سال	قیمت روپیہ اور اعشاریہ	تفصیل	حوالہ
1641ء	14٫40-13٫50	مانگی ہوئی	DR ص 42-11-3
1642ء اواخر	14٫85-14٫92	ادا کی ہوئی	DR ص 43-4-27
1644ء	17٫00	〃	EF ج (7) ص 164
1645ء	(؟) 22٫50-20٫70	مانگی ہوئی	〃 〃 ص 254
1646ء	21٫60-20٫25	〃	〃 (8) ص 31
1647ء	20٫25-17٫10	ادا کی ہوئی	EF ج ص 77
1648ء (جنوری)	17٫55-17٫10	تخمینہ } تجربہ	〃 〃 ص 189
(اپریل)		واقعی } تجربہ	〃 〃 ص 203
1650ء	13٫50-12٫60	مندرجہ	〃 〃 ص 305
1653ء	14٫22	ادا کی ہوئی	OC 2309
1655ء	(؟) 11٫81	-	EF ج (10) ص 18
1656ء	16٫20-15٫75	مندرجہ	〃 〃 ص 76
1663ء	13٫50-13٫25	ادا کی ہوئی	DR ص 63-6-21

نوٹ:- 1635ء- غالباً 27.00 کی عدد کو گھٹا کر 25.30 کر دینا مناسب ہوگا۔ یہ واضح نہیں ہے کہ من کے وزن میں اضافہ اس سودے کے قبل ہوا یا بعد میں۔

1638ء - مشتبہ۔ ایک آڑھتیے نے اپنی بچت میں قلم نہ کیا۔

1645ء۔ یہ قیمت فی گھنٹہ بتائی گئی ہے لیکن ایسا ناممکن ہے اور میرا قیاس ہے کہ یہاں مراد من سے ہے۔

1655ء۔ آلائش سے بھری ہوئی۔ "نصف گرد" بیان کی گئی ہے۔

"یہاں تک کہ بہترین چیٹی نیل جو معمولاً 18 روپیہ بکتی تھی اب 10 میں ل رہی ہے اور اس کے روز بروز مزید کم ہوتے کا امکان ہے" اور اگلے برس یا اس کے قریبی زمانہ میں دو یا تین دیگر تاجروں نے بھی اسی نرخ کو اپنے حوالوں میں استعمال کیا ہے۔ ان تاجروں کا ہندوستان میں خاص کاروبار نیل خریدنا تھا اور ہم یہ تصور کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ انھوں نے منڈی کے حالات

معلوم کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا ہوگا لیکن اگر ہم زبردستی ایسا قیاس کرلیں کہ ان تاجروں کو دلالوں نے سازش کرکے مغالطہ میں مبتلا کردیا تو ایسی صورت میں یہ کہنا درست ہوگا کہ انگریزی خریداروں کے آغاز پر معیاری شرح 15 روپیہ سے یقیناً زائد تھی۔ یہ صحیح ہے کہ 1609ء میں فنچ کی واقعتاً سب سے پہلی قلم بندکی ہوئی 10 سے 12 روپیہ من تک کی قیمت اس معیار سے بہت کم ہے لیکن ہم اس کی قیمت کو غیر معمولی طور پر کم کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ اول تو فنچ خریداری نہیں بلکہ محض تحقیقات کررہا تھا اور جس وقت منڈی خریداروں کی تلاش میں ہو جیسا کہ بدیہی طور پر گجرات میں صورت حال تھی تو تحریری قیمتوں سے کم ہونے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس موسم کے دوران گجرات شدید مالی بحران میں مبتلا تھا اور ہم بجا طور پر یہ تصور کرسکتے ہیں کہ ذخیروں کے مالک اپنا مال نکالنے کے لیے غیر معمولی طور پر بے چین رہے ہوں گے۔ اپنی رپورٹ کے چند ہفتہ قبل لکھے ہوئے ایک خط میں فنچ ایک سربرآوردہ تاجر کے یکایک دیوالیہ ہو جانے سے اور ایک دوسرے تاجر کی جو اس دیوالہ میں ..... ملوث تھا فراری کی اطلاع دیتا ہے۔ لہٰذا ان حالات میں مذکورہ قیمتوں کو ہم معمول کی قیمتیں نہیں بلکہ اس وقت کی بعض بحرانی قیمتوں سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

جدول میں اس کے بعد کے عدد 1612ء کے موسم بہار سے متعلق ہے۔ یہ جو رڈین وہ قیمت بتاتا ہے جس پر بحر قلزم کے بعض سودوں کا حساب کتاب ٹھیک کرنے کی غرض سے اتفاق ہوا تھا اور ہم انھیں گجرات کے اس موسم کی قیمت تصور کرسکتے ہیں۔ اگلے دو برسوں کے دوران معلوم ہے جنگ کی وجہ سے پرتگیزی خریداروں کی غیر موجودگی نے قیمتوں کو گھٹا دیا تھا لیکن یہ رکاوٹ جلد ہی رفع ہوگئی اور جب ولندیزی بحیثیت امکانی خریداروں کے گجرات پہنچے تو قیمتوں کو بڑھاکر 18 روپیہ پر پہنچا دیا گیا جسے میں نے معیاری تصور کیا ہے۔ 1619ء میں انگریزوں کی برآمد کی ہوئی بیشتر [illegible] نرخ کا جہاز پر معہ پہنچائی کے حساب 50 محمودی یا 16 روپیہ آتا ہے احمدآباد جہاز تک پہنچانے کا صرفہ ایک روپیہ فی من تھا۔ اس طور پر اس سال کی واجب قیمت 15 روپیہ ہوئی[1]۔ 1625ء ۔ 1626ء کے دوران قیمتیں بہت کم رہیں یہاں تک کہ ایک موقع پر 7 روپیہ تک کی

---

[1] ORIGINAL CORRESPONDENCE نمبر 1725 میں منسلک تفصیلی بیجک میں احمدآباد سے سورت کے لنگرگاہ سوالے تک جہاز پر 200 من پہنچانے کا صرفہ 2038 روپیہ درج ہے۔

خبر ملتی ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ مجھے اس کمی کا کوئی سبب تحریروں میں نہ مل سکا کیونکہ خریداران قیمتوں کی گرانی کے جواز میں تو دلیلیں پیش کرنے میں بالعموم مستعدی لیکن قیمتوں کی کمی کی وجہ بیان کرنے میں خاموشی سے کام لیتے ہیں۔ اب پرتگیزیوں کی خریداری بقدر قلیل ہوگئی تھی لیکن ولندیزیوں اور انگریزوں کی مجموعی مانگ سے منڈی کو سہارا ملا ہوگا اور میرا قیاس ہے کہ قیمتوں کی کمی کا عارضی سبب زیادہ پیدا کرنا ہو سکتا ہے کیوں کہ اس کے کاشتکاروں کے پاس نئے خریداروں کی صحیح ضروریات کے تعین کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ان کی کاروباری گرم جوشی کو دیکھ کر دھوکا کھایا ہو۔ بہرحال اس کمی کا سبب جو بھی رہا ہو 1628ء تک کچھ قیمتیں 15-14 روپیہ تک آ گئیں اور 1630ء کے اوائل میں 16 روپیہ کا بھی حوالہ ملتا ہے۔ بس قیمتوں کا گرنا ایک عارضی صورت حال تھی۔ اس کے بعد قحط آیا اور کچھ وقفہ کے لیے اس کی منڈی ٹھنڈی پڑ گئی۔ 1630ء کے اختتام پر پچھلا ذخیرہ کی قیمت 18 روپیہ پر پہنچی۔ پچھلا ذخیرہ "بچا ہوا ردی مال" تھا اور ابھی نئی فصل کا کوئی امکان نہ تھا۔ کاشتکاری کے از سر نو شروع ہونے پر غذائی اجناس کو اولیت دی گئی لہٰذا نیل کی قیمتیں بڑھ کر 25 روپیہ پر پہنچیں اور 1633ء کے اواخر میں اس اجارہ داری کی وجہ سے جس کا بیان کسی پچھلی بحث میں گذر چکا ہے حالات نے مزید پیچیدگی اختیار کی۔ اس موقع پر ولندیزیوں اور انگریزوں نے 18-16 روپیہ تک ادا کرنے کی حد بندی کا آپس میں معاہدہ کر لیا لیکن اجارہ داران 27 روپیہ سے کم پر رضامند نہ تھے، اور ان کی کارروائیوں کے باعث پیداوار میں جو کمی ہوگئی تھی اس نے انھیں تقویت پہنچائی۔ شمالی علاقوں کے کاشتکاروں نے "بالعموم ضدی اور جبری ہونے کے باعث" اپنی کھڑی فصلوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالا اور حالانکہ ہمارے پاس گجرات میں اس قسم کے کسی واقعہ کی اطلاع نہیں ہے۔ تاہم ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یہاں بھی کاشت کم ہوگئی تھی۔ اجارہ داری ختم ہونے کے دو برس بعد تک قیمتیں 25 روپیہ یا اس سے بھی زائد رہیں لیکن اب اس کی کاشت بحال ہونا شروع ہو چکی تھی اور 1639ء اور 1640ء میں انگریزوں نے تقریباً 17 روپیہ پر خریداری کی۔ قیمتوں کی کمی تھوڑے وقفہ تک قائم رہی لیکن اس اثنا میں ملاوٹ میں بے حد اضافہ ہوگیا تھا اور یورپی خریداران معیار کی بہتری پر اصرار کر رہے تھے۔ پھر قیمتیں 1644ء تک بحال ہوگئیں جس کا سبب تیاری کے معیار میں سدھار اور فصل کی کمی بتایا جاتا ہے۔ اگلے دو برسوں کے دوران قیمتیں 20 روپیہ سے زائد تھیں، اس اضافہ کا سبب ان سرکاری اقدامات

کو بتایا جاتا ہے جو آمیزش کی روک تھام کی غرض سے عمل میں لائے گئے۔ 1648ء تک ملاوٹ کے سبب سے پھر پریشانی محسوس کی گئی۔ مجبوراً انگریز آڑھتیوں نے خود نیل سازی کا تجربہ شروع کیا لیکن وہ اخراجات کو زیادہ کم نہ کر سکے۔ 1650ء میں شمالی علاقوں اور نیز گجرات میں بہت اچھی فصل ہو جانے سے ایک ردعمل رونما ہوا اور اس کے تین برسوں بعد ادا کردہ اوسط قیمت 14 روپیہ سے تھوڑی زائد ہو گئی۔ 1655ء میں اس قدر کم قیمت کا سبب ملاوٹ میں زیادتی کو بتایا جاتا ہے اور 1660ء تک کی قیمتوں کے موجود حوالے 15 روپے کے قریب ہیں درانحالیکہ 1663ء کی ایک ولندیزی اطلاع میں بتایا جاتا ہے کہ 14 روپیہ سے کم کی خریداریاں اس وقت قیمتوں میں اضافہ کو ظاہر کرتی ہیں۔

یہاں اس اطلاع کا اضافہ مناسب ہوگا کہ ٹیورنیئر* جو زیر مطالعہ عہد کے آخری بیس برسوں کا تجربہ رکھتا تھا، مروجہ قیمت کو 15 سے 20 روپیہ تک بتاتا ہے۔ یہ قیمت اس معیار سے اچھی خاصی مطابقت رکھتی ہے جو اس عہد کی ابتدا کے لیے تجویز کی گئی ہے۔ لہٰذا پورے عہد کو ذہن میں رکھتے ہوئے معمول کی قیمت میں کسی اضافہ کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔ اس زمانہ میں جو نشیب و فراز واقع ہوئے ان کی توجیہ رسد یا طلب کی ان تبدیلیوں سے کی جا سکتی جو تحریروں میں ملتی ہیں اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ کمی و بیشی کم از کم اتنی ہی تیزی کے ساتھ ٹھیک سطح پر آجایا کرتیں جتنا کہ معقول طور پر توقع کی جا سکتی تھی۔ اگر اس خیال کو کہ ابتدائی انگریز خریداران کو دھوکہ دیا گیا تھا، صحیح تصور کر لیا جائے تو بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے عہد کی آخری دہائی کے دوران قیمتوں میں 1613ء کے بالمقابل جب انھوں نے خریداری شروع کی تھی تو کوئی خاص اضافہ ہوا تھا۔

فصل ۵۔ درآمدی سامانوں کے لیے منڈیاں

اگلی چیز جس پر اب ہمیں غور کرنا ہے پارہ ہے۔ اس دھات کی محدود مگر مستقل مانگ رہا کرتی تھی۔ میرا قیاس ہے کہ اس کا خاص مصرف شنجرف بنانے میں تھا اور یہ ہندوستان میں پیدا نہ ہوتی تھی[1] کہ اس کی درآمدی منڈی کے یہاں موجود ہونے کا سبب تھا۔ اس کی

[1] آگرہ کے قریب پارہ کی ایک کان کا حوالہ LETTERS RECEIVED iii, 63 میں آتا ہے (باقی صفحہ آئندہ)

منڈی میں سالانہ کھپت کا 15,000 سے 20,000 ال۔ بی تک کا تخمینہ لگایا گیا ہے جو تقریباً مستقل تھی۔ اس کی فراہمی میں کمی اس کی قیمتوں کو تیزی سے چڑھا دیتی تھی اور اس کی تھوڑی ہی سی زیادتی منڈی کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہوتی۔ اس کا ذخیرہ چین اور نیز یورپ سے آتا تھا۔ اس کے جہاز بحر قلزم اور نیز راس امید دونوں ہی راستوں سے آسکتے تھے۔ یہ اپنی مختصر جسامت کے باعث خفیہ طور پر نجی کاروبار کے لیے ایک موزوں چیز تھی۔ ان جملہ اسباب نے اس کی تجارت کو بالکل سٹہ کا کاروبار بنا دیا تھا اور اس کی قیمتیں وسیع حدود میں کم و بیش ہوا کرتیں۔ ان کی بکری کی اکائی گجراتی من تھی اور سہولت موازنہ کی سہولتوں کی خاطر میں نے 1636ء اور اس کے بعد کی قیمتوں میں 10 فیصدی کی تخفیف کر دی ہے تاکہ مندرجہ اعداد 33 ال۔ بی کے من پر تسلسل کے ساتھ منطبق ہو سکیں۔ گجرات کی مختلف منڈیوں میں روپیوں اور محمودیوں دونوں کے حوالے ملتے ہیں اور میں نے سورت اور احمد آباد کے درمیان باربرداری کے اخراجات (تقریباً ایک روپیہ فی من) کو نظر انداز کرتے ہوئے انھیں ایک سلسلہ میں لیا ہے۔

1609ء میں فنچ نے اس کی قیمتوں کو 64 سے 80 روپیہ تک پایا تھا لیکن جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ ایک بحرانی مدت تھی جس میں خریداریاں رُکی رہی ہوں گی۔ 1612-13ء کے درمیان بکری 120 سے 160 روپیہ تک رہی لیکن 1614ء میں تازہ مال کی فراہمی کے باعث نرخ گھٹ کر 100 روپیہ پر آ گیا جب کہ 1615-16ء میں آگرہ کے قریب اس کی ایک کان کے دریافت ہونے کی بے بنیاد خبر کے نتیجہ میں "خریداروں کے نہ ہونے" سے اس کی قیمت 80 روپیہ ہو گئی۔ 1619ء اور اس کے بعد کی مدت میں قیمتوں کی سطح گری اور اگلے چند برسوں تک منڈی میں قیمتوں کا عام رجحان 90-60 روپیہ پر رہا۔ یہ تخفیف غالباً سورت میں ولندیزیوں کے قیام کے سبب سے واقع ہوئی تھی کیونکہ اب ان کے اور انگریزوں کے لائے ہوئے مالوں میں مقابلہ پیش آیا۔ 1625-26ء میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ ولندیزی کچھ بھی نہ لائے تھے، انگریزی بہت تھوڑی مقدار میں اور براہ بحر قلزم سے بھی اس کی فراہمی بہت مختصر تھی جس کے نتیجہ میں قیمتیں 100 روپیہ تک بڑھیں اور اس کے چھوٹے چھوٹے ذخیروں کا نرخ 120 پر پہنچا۔ اس کے بعد دوسری اہم تبدیلی 1630ء میں پیش آئی۔ جب قحط کے بالکل شروع شروع میں ولندیزی

(بقیہ ص 206) لیکن اس کے متعلق کچھ اور نہیں سنا جاتا اور میرا خیال ہے کہ خریداروں نے قیمتوں کو کم کرنے کی غرض سے اس کو فرضی طور پر شہرت دیدی تھی۔

درانگریزی نجی تاجروں کے لائے ہوئے کثیر ذخیرہ نے منڈی کو توڑ دیا اور قیمتیں 50 روپیہ پر آگئیں۔ اس کے نجی کاروبار کے باعث قیمتوں کی کمی برقرار رہی۔ 1633ء میں 36 روپیہ کی نرخ تھی، 1634ء میں 42 روپیہ اور 1636ء میں ولندیزیوں نے اس کی تھوڑی تعداد 35¼ روپیہ پر فروخت کی۔ اگلے نو برس تک اس کی قیمتوں کے اندراج نہیں ملتے۔ لیکن اس کے حوالے دوبارہ 1645ء میں تقریباً 70-65 روپیہ کے اور 1649ء میں 110 روپیہ سے اچھے خاصے زائد کے نرخ پر ملنا شروع ہوتے ہیں۔ اس اضافہ کا جزوی سبب چینی فراہمی کا ختم ہو جانا معلوم ہوتا ہے کیونکہ 1652ء میں انگریزی آڑھتیوں نے لکھا کہ اگر اس کا کاروبار دوبارہ سنبھلا تو اس کی قیمتیں پھر گھٹ کر 60 روپیہ پر پہنچ سکتی ہیں۔ اس وقت ولندیزی، انگریز اور پرتگیزی سب ہی اس کی درآمد کر رہے تھے اور بظاہر قیمتیں زیادہ گریں کیونکہ 1654ء میں ½75 روپیہ کی نرخ پر کیے گئے سودے کو پچھلی قیمتوں سے کافی کم قیمت پر بیان کیا گیا تھا۔ 1659ء تک قیمتوں کے 100 روپیہ ہو جانے اور ولندیزیوں کے 64 روپیہ کا نرخ وصول کرنے پر اس کا کاروبار پھر بحال ہوا۔ اس نوعیت کی منڈی کے متعلق کوئی عمومی کلیہ قائم کرنا بدیہی طور پر ایک جوکھم کا کام ہوگا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ پورے زیر مطالعہ عہد کے دوران اس کی معمول کی قیمت میں جس کو میں 100-80 روپیہ پر متعین کرتا ہوں کسی اضافہ کے آثار نہیں ملتے اور یہ کہ کبھی کبھی شدید کاروباری مقابلہ کی وجہ سے اس کے صارفین کو کم از کم عارضی منفعت حاصل ہو جایا کرتی تھی۔

سیسہ کی سورت کی منڈی، پارہ سے زیادہ مختلف تھی۔ اس کی بھی بیشتر فراہمی درآمد کے ذریعہ تھی جو میرا خیال ہے کہ مسلم طور پر یورپ سے ہوتی تھی[1]۔ ولندیزی اور انگریزی مال میں مقابلہ رہا کرتا تھا لیکن اس کی تجارت آزادانہ تھی کیونکہ مقامی صوبیدار بالعموم شہر کے پورے ذخیرہ پر خریداری کا دعویدار تھا اور اس کی کھپت کے متبادل ذرائع نہ موجود ہوتے تو اس کی قیمتیں کلیۃً اس کی مرضی پر منحصر رہتیں۔ حقیقت یہ تھی کہ متبادل ذرائع موجود تھے۔ احمدآباد میں اس کی بالعموم ایک آزاد منڈی موجود تھی۔ ساتھ ساتھ ساحلی جہازوں کے مالک اس دھات کو بھرتی کے مال کے طور پر لادنے کے لیے خوشی خوشی تیار رہتے اور ہم اس کی سورت سے

---

[1] بٹاویا جرنلس، سیام سے سیسہ کی برآمد کا وقتاً فوقتاً ذکر کرتے ہیں۔ ممکن ہے اس میں سے کچھ سورت بھی پہنچا کرتا ہو۔ حالانکہ مجھے اس کے متعلق کوئی تحریر نہیں ملتی۔

گوا، ملہاری بندر اور راجہ پورا ور نیز بحر قلزم اور خلیج فارس تک کی فروختگیوں کے بارے میں سنتے ہیں۔ پس صورت حال یہ تھی کہ درآمد کیا ہوا سیسہ عموماً مقامی صوبیدار کے ہاتھ فروخت کیا جاتا، لیکن وہ سوائے زور وزبردستی اختیار کیے اسے ساحل پر مروجہ نرخ بازاری سے کم پر حاصل نہ کرسکتا تھا۔ اگرچہ نزاع سے بچنے کے لیے اس کے ساتھ غالباً تھوڑی بہت رعایت کیے جانے کا امکان پایا جاتا ہے۔

ہمارے عہد کے آغاز پر اس کے ایک گجراتی من کی قیمت 7 اور 8 محمودی کے درمیان تھی[1] اور 1630ء تک باوجودیکہ اس کی قیمتوں کے اچھے خاصے اندراجات موجود ہیں گراں میں کمی کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی۔ 1634ء کی اطلاع ہے کہ انگریزی کمپنی کے سیسہ کو تقریباً دو برس تک درآمدی محصول کے دفتر میں روک دیا گیا تھا کیونکہ صوبیدار اسے $5\frac{1}{2}$ محمودی کے نرخ پر لینا چاہتا تھا لیکن 1638ء میں قیمتیں بڑھ کر $7\frac{1}{2}$ محمودی اور 1642ء میں 8 محمودی ہوگئیں۔ قیمتوں کے ان اعداد کو اور نیز ان کو جو آگے قلمبند کیے جاتے ہیں اور بقدر 10 فیصدی من کے وزن میں اضافہ کی گنجائش کے خیال سے کم کر دینا چاہیے لیکن اس قدر چھوٹے اعداد سے کسری منہائیاں مکمل صحت کا غلط تاثر پیدا کرتی ہیں اور یہاں میں نے ان منہائیوں کے لیے گنجائش چھوڑی ہے۔ 1646ء میں تاجر 10 محمودی وصول کرنے کی امید رکھتے تھے اور 1650ء میں نرخ یہیں پہنچ گیا اور 1652ء میں صوبیدار 8 محمودی ادا کرنے پر تیار تھا اور 1659ء میں ادا کردہ قیمت $9\frac{1}{2}$ محمودی تھی۔ اگر ہم کبھی کبھی کی جبری فروختگیوں کو خارج کر دیں اور یہ بھی یاد رکھیں کہ ان اعداد میں 10 فیصدی کی منہائی کرنا ہے تو ہم دیکھیں گے کہ 50 برسوں کے دوران قیمتوں کا دائرہ 7 سے لے کر 9 محمودی تک رہا اور ان میں کمی وبیشی کا کوئی واضح رجحان نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ہندوستانی ساحلوں پر اس کی معمول کی قیمتوں میں کوئی خاص اضافہ نہ ہوا کیونکہ اگر اضافہ ہوا ہوتا تو سورت کا صوبیدار اپنی بولی کی قیمتوں کو بڑھانے پر مجبور ہوتا ورنہ یہ اضافہ اپنے لیے کوئی اور منڈی تلاش کرتا۔

---

[1] میں نے محمودیوں میں مندرج اعداد کو قلم بند کیا ہے کیوں کہ وہ اس قدر چھوٹے ہیں کہ اگر انھیں روپیوں میں تبدیل کیا جائے تو بہت قلیل کسروں کو استعمال کرنا ہوگا۔ محمودی کی قیمت تقریباً $\frac{2}{5}$ روپیہ کے برابر تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھ کر $\frac{1}{2}$ روپیہ پر پہنچ گئی۔

درآمدی منڈی کی روش کی تیسری وضاحت کو ہم لونگ کی فروختگیوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ لونگ کا انگریزی تحریروں میں نسبتاً کم تذکرہ ملتا ہے لیکن ولندیزی اس کا بار بار ذکر کرتے ہیں۔ اس کا کاروبار مختلف ادوار سے گزرا، سولھویں صدی کے دوران نظری اختیار سے اس پر شاہِ پرتگال کی اجارہ داری تھی لیکن اس کی نجی تجارت بھی سرگرمی سے ہوتی رہی اور مجھے شبہ ہے کہ پرتگیزیوں کا ملکس پر پورا تسلط ہوجانے پر بھی اس کے بیچنے والوں کے درمیان واقعتہً تھوڑا بہت مقابلہ چلتا رہا۔ صدی کے ختم ہوتے ہوتے جبکہ مسالے کے جزیروں میں سیاسی حالات اضافہ پذیر طور پر پیچیدگی اختیار کیے ہوئے تھے مکسر کی منڈی نے نمایاں حیثیت اختیار کی اور اس کے اگلے پچاس برسوں کی تاریخ ولندیزیوں کا اس کے حصول کے مقامات پر قبضہ اور مکسر کے راستہ سے اس کے نکلنے کو روکنے کی مسلسل کوششوں سے متعلق ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی اجارہ داری، صدی کی چھٹی دہائی تک ہی اپنے کام کو پوری باقاعدگی سے شروع کرسکی۔

ابوالفضل نے تقریباً 1595ء میں مغل دربار میں لونگ کی معمول کی جو قیمت بیان کی ہے وہ حساب نکالنے پر اندرون ملک باربرداری کے اخراجات کا لحاظ رکھتے ہوئے سورت بندر پر 33 ال۔ پی کے ایک گجراتی من کے لیے 55 روپیہ آتی ہے[1] سترھویں صدی کے پہلے پچیس برسوں میں قیمتوں میں نمایاں اضافہ ہوا جس کا میں کوئی سبب نہ معلوم کرسکا۔ لیکن ہم اس کے سبب کو جزاً مسالے کے جزائر میں بدامنی اور جزاً یورپ کے برآمد میں اضافہ سے منسوب کرسکتے ہیں۔ سورت میں قیمت 1617ء میں 64 روپیہ، 1621ء میں 72 روپیہ اور 1622ء میں 84 روپیہ تھی۔ اس کے بعد گیارہ برسوں تک کوئی اندراج نہیں ملتا لیکن جب اطلاعات دوبارہ ملنا شروع ہوئیں تو قیمتیں زیادہ ہی تھیں یعنی 1633ء میں 77 روپیہ، 1634ء میں 55 روپیہ اور 1636ء کے اوائل میں 67 روپیہ۔ آخرالذکر ونیز اس کے بعد کے جملہ اعداد

---

[1] ابوالفضل کی بتائی ہوئی قیمت 60 دام فی سیر ہے جو اکبری من کے لیے 60 روپیہ ہوتی ہے۔ پلسارٹ (ورق 8) 1626ء میں لکھتا ہے کہ پرانے تاجروں نے اسے بتایا تھا کہ آگرہ میں 60، 80 روپیہ کا نرخ رہا کرتا تھا۔ اس طور پر غالباً ابوالفضل کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔

میں من کے وزن میں اضافہ کی گنجائش کے طور پر ۱۰ فیصدی کی تخفیف کردی گئی ہے۔ 1636ء کے اواخر میں قیمتیں اچانک کم ہو کر ۴۰ روپیہ پر آگئیں اور 1641ء اور 1645ء کی درمیانی مدت میں نرخ 27 اور 35 روپیہ کے بیچ میں گھٹتا بڑھتا رہا۔ 1648ء میں صارفین کے لیے اس کی قیمتیں بڑھادی گئیں کیونکہ جس تجارتی انجمن نے پورے ذخیرہ کو ½41 روپیہ میں خریدا تھا اس نے اسے دوبارہ 55 سے ۶۰ روپیہ تک میں بیچا اور 1649ء میں مروجہ قیمتیں ۵0 روپیہ پر رہیں۔ تحریروں میں اب پھر خلاً پیدا ہوتا ہے۔ لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب ایمسٹرڈم کے حکام بالآخر اس منزل پر پہنچ گئے تھے کہ وہ مسالوں کے کاروبار کو پوری دنیا میں یکساں طور پر منظم کرسکیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ 1657ء میں ہندوستان کے لیے ایک مقررہ مقدار معین کی گئی جسے وہ مقررہ یا زائد قیمت پر فروخت کرسکتا تھا اور اس وقت اس کی کم سے کم قیمت حساب لگانے پر 33 ال۔ بی کے ایک من کی 77 روپیہ آتی ہے۔ اس کی فراہمی اور قیمت کے درمیان بین طور پر کوئی متناسب رشتہ نہیں پایا جاتا کیونکہ 1661ء میں اس کی فروختگی تقریباً 95 روپیہ کے ایسی اونچی قیمت پر ہوئی[1]۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے اس علاقہ کے صارفین کو تقریباً 1615ء سے 1636ء تک کی اور پھر 1648ء سے اس کے بعد تک کی مقابلہ کی قیمتوں سے زائد ادا کرنا پڑا۔ اس سلسلہ میں اطلاع مزید یہ ہے کہ سورت کی منڈی میں خریداروں کے لیے کبھی کبھی ۴ سیر فی من کی تخفیف دی جاتی تھی۔ ولندیزی تحریروں میں یہ اطلاع واضح طور پر ملتی ہے اور میں نے ان کے اعداد میں اس کا لحاظ رکھا ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ انگریزی تحریروں کے بعض اندراجات میں بھی تقریباً ۱۰ فی صدی کی منہائی کی گنجائش نکلتی ہو۔ اس طور پر اگر کوئی غلطی ہوتی ہے تو وہ حقیقی نشیب و فراز کے بالمقابل بہت مختصر ہوگی۔

مشرقی ساحل پر لونگ کا کاروبار نسبتاً زیادہ دلچسپ پہلو رکھتا ہے۔ کیونکہ یہاں تھوڑے عرصہ تک ولندیزیوں کا اہل ڈنمارک سے مقابلہ رہا جو مکسر سے اس کے ذخیرے حاصل کیا کرتے تھے۔ مسولی پٹم کی قیمتیں بمقدار پگوڈا فی مقامی من (تقریباً ۲۶ ال۔ بی کا) دی گئی ہیں اور میں نے انھیں روپیوں میں تحویل کرنے کی کوشش نہیں کی ہے کیونکہ کسی خاص سال میں صحیح تناسب کو معین کرنے کی

---

[1] RELIA VOL. III میں مسالوں کے ایک ذیلی اندراج سے پتہ چلتا ہے کہ 1653ء تک بہرحال قیمتوں کا تعین کردیا گیا تھا لیکن اس کی واقعی تاریخ کے متعلق کوئی تحریر نہیں ملتی۔

غرض سے "پگوڈا" کی بمقدار چاندی قیمت کے تدریجی اضافہ کو معقول صحت کے ساتھ معین نہیں کیا جاسکتا۔ بہرحال ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اکبر کے دربار کی شرحیں جنھیں میں نے اپنے حساب کا نقطۂ آغاز تصور کیا ہے۔ سترھویں صدی کی ابتدا میں مسولی پٹم میں سپرد کیے ہوئے ایک مقامی من کے لیے، پگوڈا کے بہت قریب تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سورت کی طرح یہاں بھی، صدی کے اوائل میں ایک نمایاں اضافہ ہوا۔ 1616ء کے ایک یا دو برس قبل ½8 سے 10 پگوڈا تک کو معمول کی قیمت بتایا گیا تھا[5] لیکن 1618ء میں ½14 پگوڈا، کا نرخ تھا، یہ قیمت اس کے قبل کبھی نہ سنی گئی تھی"۔ نرخ 1622ء میں 13 پگوڈا اور 1631ء میں مزید اضافہ کے بعد یہ 20 پگوڈا پر پہنچ گیا۔ اس مرحلہ پر اہل ڈنمارک سے مقابلہ نے شدت اختیار کی اور قیمتیں اچانک گھٹ کر 8 پگوڈا پر آگئیں۔ 1638ء میں قیمتیں مزید کم ہوکر 6 اور 1639ء میں 4 یا ½4 پگوڈا ہوگئیں۔ انگریز آڑھتیوں کے قیاس کے مطابق ان قیمتوں کا مقصد "اہل ڈنمارک کو بالکل ختم کرنا تھا" اگلے پانچ برسوں تک قیمتیں 5 پگوڈا پر قائم رہیں۔ اس کے بعد تحریروں میں پھر خلاء پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے بعد جب ہمیں اس کے کاروبار کے متعلق دوبارہ اطلاعات ملنا شروع ہوتی ہیں تو اس وقت تک اجارہ داری پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھی اور ایمسٹرڈم کی کم از کم معینہ قیمت 13 اور 14 پگوڈے کے درمیان آتی ہے۔ لہٰذا اس صورت میں قیمتوں کی جنگ نے تھوڑے عرصہ تک صارفین کو فائدہ پہنچایا لیکن بالآخر انھیں معہ لقائے کے پورا حساب چکانا پڑا، کیوں کہ ولندیزیوں نے جس اجارہ داری کو اپنی کوششوں سے قائم کیا تھا وہ تقریباً نصف صدی کی مدت تک برقرار رہی۔

جاوتری اور جائفل کی منڈی کی روش بھی کچھ اسی طور پر رہی اور صارفین کو بالآخر ان کی بھی زیادہ قیمتیں ادا کرنی پڑیں لیکن ان سامانوں کے علاوہ جو اجارہ داری کے تحت تھے دیگر درآمدات کے معمول کی قیمتوں میں اضافہ کے کوئی آثار نہیں پائے جاتے اور ٹین، ہاتھی دانت اور مونگے کی قیمتوں کے جو اعداد ملتے ہیں وہ بجائے اضافہ کے کمی ہی کے رجحان کو ظاہر کرتے ہیں۔

فصل 8 غذائی اجناس اور چاندی

یہ بات دعوے سے کہی جاسکتی ہے کہ سیسہ، یا پارہ یا مسالوں کی قیمتیں ہندوستانی آبادی کے لیے

---

[5] قیمتوں کا یہ اندراج SCHORER 8-7 سے ماخوذ ہے یہ اطلاع بلا تاریخ کے ہے لیکن چوں کہ یہ 1616ء میں ہالینڈ پہنچی تھی لہٰذا اسے 1614ء یا 1615ء کی منڈی کے متعلق ہونا چاہیے۔

فی الجملہ بہت کم اہمیت رکھتی تھیں۔ یہ دعویٰ صحیح ہے اور ہم اس کا اطلاق جملہ درآمدی سامانوں پر بھی کر سکتے ہیں کیونکہ ان میں سے کوئی بھی چیز یہاں کی عام آبادی کے زیادہ مصرف میں آنے والی نہ تھی۔ البتہ نیل کی منڈی زیادہ عام اہمیت رکھتی تھی کیوں کہ دراںحالیکہ اسے نسبتاً تھوڑی تعداد میں کاشتکار برآمد کی غرض سے پیدا کرتے تھے لیکن اس کا، غذائی اجناس سے مقابلہ رہا کرتا تھا جس کے نتیجہ میں اس کی قیمتوں سے زراعت کو متاثر کرنے والے حالات کا اندازہ ملتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہم سب سے زیادہ غذائی اجناس، تلہن اور کپاس ایسی خام پیداواروں کی قیمتوں کی روش سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان اشیاء سے فی الجملہ ان دنوں ملک کی بیشتر آمدنی کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے ان اشیاء کے لیے جو مواد ملتا ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔ مجھے تلہن کے متعلق اعداد بالکل نہیں ملتے، کپاس کے اعداد اس قدر تھوڑے ہیں کہ ان کی بنیاد پر قیمتوں کا کوئی مربوط سلسلہ قائم نہیں کیا جا سکتا اور غذائی اجناس کے متعلق بھی جو مواد ملتا ہے وہ بہ اعتبار مقدار بہت مایوس کن ہے۔ انگریز آڑھتیے بالعموم غذائی اجناس کے کاروبار سے غیر متعلق تھے۔ ولندیزیوں کو اس سے دلچسپی تھی لیکن موجود تحریریں ان کی ادا کی ہوئی قیمتوں یا ان کے بھیجے ہوئے ذخیروں کی مالیت کے متعلق خاموش ہیں اور ان کے نجی اخراجات یا جہازوں کے سامان خورد و نوش کے باضابطہ حسابات میرے علم کی حد تک محفوظ نہیں ہیں[1]۔ پس جو اطلاعات موجود ہیں وہ متفرق طور پر ہیں لیکن جس قدر واقعات تحریروں میں ملتے ہیں وہ کچھ اس طور پر مربوط ہیں کہ ہم ان سے وقتی نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

ابوالفضل نے سولھویں صدی کے اختتام پر شمالی ہندوستان میں غلوں کی معمولی قیمتوں کو بیان کیا ہے اور ہم اچھے خاصے اطمینان کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اول تو مختلف غذائی اجناس کی ان دنوں کی اور ۱۲-۱۹۱۰ء کی اضافی قیمتیں تقریباً ایک سطح پر ہیں اور دوم یہ کہ مذکورہ دونوں مدتوں کے درمیان ان کی واقعی قیمتوں میں ۷ گنے کا اضافہ ہوا۔ مجھے ۱۶۰۰ء اور ۱۶۶۰ء کی درمیانی مدت کے شمالی ہندوستان کے لیے اعداد نہیں ملتے لیکن گجرات کی منڈیوں کے متعلق حسب ذیل معلومات موجود ہیں۔ ۱۶۰۹ء میں فنچ کے قول کے مطابق "بہترین" چاول ایک ریال آف ایٹ*

---

[1] AGRA ACCOUNTS جس کا کسی اور جگہ حوالہ آچکا ہے صرف دو برسوں کے متعلق ہے۔ جن میں سے کم از کم ایک غیر معمولی سال تھا۔

* RIAL OF EIGHT

میں ایک کوئنٹل مل سکتا تھا جو 65 ' ال۔ بی فی روپیہ ہوتا ہے اور اس سے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ معمول چاول اس سے کافی سستا رہا ہوگا۔ 1611ء میں ایک انگریزی جہاز کے لیے چاول $65\frac{1}{4}$ ال۔ بی، گیہوں $53\frac{1}{4}$ ال۔ بی اور کوئی دال (مونگ) $72\frac{3}{4}$ ال۔ بی کی شرح پر خریدی گئی تھی۔ غالباً یہ اشیاء اپنی مروجہ بازاری شرحوں سے کافی گراں رہی ہوں گی کیونکہ ان کے خریداروں کو جہازوں پر رسد کا سامان پہنچانے کی عجلت تھی اور اس کے علاوہ انھیں علاقہ کے متعلق کوئی خاص واقفیت نہ تھی۔ علاوہ بریں خریداری اکتوبر میں کی گئی تھی جب گیہوں کا نرخ تقریباً اپنے انتہا پر ہوتا ہے۔ 1619ء میں بنتم بھیجے گئے گیہوں کے ایک کھیپ کے بیجک میں اس کی جہاز پر پہنچائی اور لدائی سمیت مندرجہ شرح $78\frac{1}{2}$ ال۔ بی آتی ہے جو منڈی کے حساب سے 80 ال۔ بی سے قدرے زائد ہوتی ہے۔ 1623ء میں ہمیں جہازوں کے لیے روٹی پکانے کے لیے گیہوں کے آٹے کی خریداری کی تحریر ملتی ہے اور آٹے اور گیہوں کے درمیان ہمعصر تناسب کا لحاظ رکھتے ہوئے گیہوں کی شرح خریداری 85 ال۔ بی فی روپیہ آتی ہے۔ ولندیزی آڑھتیے وین ٹوسٹ کے بیان کے مطابق 1630ء کے قحط کے قبل گیہوں کی معمول کی قیمت $10\frac{2}{5}$ اشٹایورس* کے بیے $33\frac{3}{4}$ ولندیزی پونڈ کے حساب سے تھی جو تقریباً $82\frac{1}{2}$ ال۔ بی اوار ڈپوائیز فی روپیہ کے مساوی ہے[1]۔ مذکورہ صورتوں میں سے کسی ایک کے بھی استثنائی قیمت ہونے کی شکایت نہیں پائی جاتی اور نہ ہی مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ متعلقہ برسوں میں گیہوں کی قلت تھی لہٰذا میرا خیال ہے کہ ان قیمتوں سے وین ٹوسٹ کے مذکورہ عمومی بیان کی تائید ہوتی ہے۔ وین ٹوسٹ* جیسا کہ اس کے کاغذات اور تحریروں سے واضح ہوتا ہے گجرات کی تفصیلی واقفیت رکھتا تھا اور میرا خیال ہے کہ یہ صحیح طور پر نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ صدی کے اول پچیس برسوں میں گیہوں کا معمول کا نرخ تقریباً 80 یا 85 ال۔ بی فی روپیہ تھا۔ چاول کے معمول کی قیمت کا مجھے کچھ پتہ نہ چل سکا بجز اس بیان کے کہ بڑودہ میں ایک روپیہ کا تقریباً 65 ال۔ بی ملا کرتا تھا۔ 1661ء میں چاول کے

---

[1] 'گجرات رپورٹ' مرتبہ 1629ء میں بڑودہ کی جو معمول کی قیمت دی ہوئی ہے وہ حساب لگانے پر $75\frac{1}{2}$ ال۔ بی آتی ہے۔ یہ تقریباً یقینی ہے کہ وین ٹوسٹ کی تحریر کے وقت یہ اطلاع اس کے پاس موجود تھی۔ اس نے غالباً پورے گجرات کے علاقہ کا لحاظ رکھتے ہوئے زیادہ نرخ بتایا ہے۔ مگر اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

سودے کا نرخ جس کا اوپر حوالہ آیا ہے، گیہوں سے تھوڑا سستا تھا اور اس کے حصول کے مقامات کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کے درمیان یہی رشتہ مستنبط بھی کیا جا سکتا تھا۔ لیکن چاول کے اقسام کی قیمتوں میں اس قدر زیادہ فرق تھا اور ہے کہ اس نوعیت کے اعداد کی بنیاد پر کوئی نتیجہ اخذ کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔

قحط سالی کے دنوں میں قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہو جایا کرتا تھا۔ 1630ء میں انگریز آڑھتیوں نے گیہوں ½13 ال۔ بی کے نرخ پر خریدا اور ایک ہی ماہ بعد انھیں معلوم ہوا کہ غلہ نا قابل حصول ہے "خواہ سابقہ معمول کی سات گنا قیمت کیوں نہ ادا کی جائے"۔ اگرچہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے معمول کی قیمتیں 80 یا 85 ال۔ بی تھیں تو یہ اب بڑھ کر 2! ال۔ بی یا اس سے کم ہو گئیں۔ 1631ء میں مزید آفات پیش آئیں اور اس سال ستمبر میں ہم نرخ کو ½ 2 سیر فی محمودی پر سنتے ہیں جو 6 ال۔ بی سے بہت تھوڑا زائد فی روپیہ ہوتا ہے۔ جاڑوں میں اس کا ذخیرہ پہنچ جانے پر ½12 ال۔ بی کا نرخ ہو گیا، یہاں تک کہ اس کے ذخیرہ پر مسلّم قبضہ کر لیا گیا جس کے نتیجہ میں قیمتیں پھر بڑھیں۔ اس کے بعد قیمتوں کا جو اگلا اندراج ملتا ہے وہ 1635ء سے متعلق ہے جب کہ گو کے لیے 33 ال۔ بی کے نرخ پر گیہوں کی خریداری کی گئی اور اب بظاہر تنگی کا دور ختم ہو گیا۔ اور قیمتیں کم ہونا شروع ہو گئیں۔ بروقت بارش کے باعث ہر قسم کے افراط غلے پیدا ہوئے اور 1636ء میں قیمتیں قحط سالی کے پہلے سے بھی کم پر پہنچ گئیں۔ کسی پچھلی فصل میں گزر چکا ہے کہ 1638ء تک نیل کی قیمت زیادہ رہنے کے بعد 1639ء اور 1640ء میں معمول پر پہنچی تھی۔ اس واقعہ سے بظاہر اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ غذائی اجناس کی سابقہ معمول کی قیمتیں بھی بحال ہو گئیں اور نیل کے معاملہ میں دو سال کی تاخیر، غذائی اجناس کو اولیت دیے جانے کے باعث متوقع تھی۔

پس حتمی طور پر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سترھویں صدی کے آغاز پر گجرات میں گیہوں کی معمول کی قیمت 80 سے 85 ال۔ بی فی روپیہ تک تھی اور یہ کہ 1630ء کی قحط سالی کے اثرات نے اسے مستقلاً تبدیل نہ کر دیا تھا اور مزید یہ کہ نرخ کم از کم 1640ء تک قائم رہے۔ یہاں پہنچ کر معلومات کی براہ راست فراہمی کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اور اگلے بیس برسوں کے دوران، بجز قلت کے دنوں کے مجھے گجرات میں غذائی اجناس کی قیمتوں کے بارہ میں کوئی بھی اطلاع نہیں ملتی۔ معلومات کی یہ غیر موجودگی علت سے خالی نہیں ہے۔ ان دنوں انگریز آڑھتیے اپنے اخراجات میں بے حد تخفیف کر رہے تھے اور میرا خیال ہے اگر قیمتوں کی گرانی کے لحاظ سے انھوں نے بھی اجرت

اور اپنے نجی اخراجات کو بڑھا دیا ہوتا تو وہ غلہ کی قیمتوں کا ضرور ذکر کرتے۔ اس سلسلہ میں شکایات کی غیر موجودگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ شکایت کا سبب مفقود تھا اور آڑھتیے مروجہ قیمتوں کو معمول کے مطابق تصور کرتے تھے۔[1]

براہ راست معلومات کی غیر موجودگی میں، اس مسئلہ پر سورت میں اُجرت کی مروجہ شرحوں کی مدد سے ہم کچھ روشنی ڈال سکتے ہیں۔ 1636ء کے ایک خط کے مطابق چپراسیوں کو پہلے 5 سے 7 محمودیوں تک ماہانہ اُجرت دی جاتی تھی۔ 1634ء میں نرخیں بقدر 3 محمودی بڑھادی گئیں۔ اس کے بعد اس اضافہ کو ختم کرنے کی کوششوں کی اس بنا پر کامیابی کے ساتھ مخالفت کی گئی کہ حالانکہ غلوں کی قیمتیں تو گھٹ گئی ہیں لیکن کپڑے کی گرانی ابھی تک برقرار ہے۔ لہٰذا 1636ء میں غلوں کی قیمت معمول پر آجانے کے بعد بھی چپراسی 8 سے 10 محمودی تک پا رہے تھے۔ اس کے بعد سے ہمیں اپنے عہد کی پوری مدت میں ان کی اجرتوں کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ یہ بات خود ہی ظاہر کرتی ہے کہ اجرت میں کوئی نمایاں فرق نہ ہوا۔ لیکن اوونگٹن کو 1690ء میں سورت پہنچنے پر معلوم ہوا کہ اس وقت وہاں اجرت کا نرخ 4 روپیہ یا ہمارے عہد کے اواخر کی شرح مبادلہ کی رو سے 9 محمودی تھا۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ نرخوں میں پچاس برسوں بعد بھی کوئی تبدیلی نہ ہوئی اور یہ امر ہمارے اخذ کیے ہوئے اس نتیجہ کی تائید کرتا ہے کہ اس اثنا میں غلوں کے نرخوں میں اس قدر اضافہ نہ ہوا تھا جس سے اُجرت میں اضافہ ضروری ہو جائے۔ پس ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ 1610ء اور 1640ء کے دوران غلہ کے نرخ میں کوئی فرق نہ ہوا اور اگلے بیس برس کی مدت کا جہانتک تعلق ہے اس میں کسی اضافہ کی کوئی شہادت نہیں پائی جاتی اور جو شہادتیں موجود ہیں وہ ان کا اچھا خاصہ مستقل ہی ہونا ظاہر کرتی ہیں۔

ہمیں اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ شمالی ہندوستان کے مروجہ نرخوں کے 185 ال۔ بی گیہوں کو آگرہ سے گجرات پہنچانے کا صرفہ تقریباً 3 روپیہ تھا اور ظاہر ہے کہ اس طور پر کل منافع کے صرف ایک روپیہ ہونے کی صورت میں کوئی شخص یہ کام نہ کر سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ منڈیاں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ علیحدہ تھیں اور پہلے گزر چکا ہے کہ قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہی

---

[1] 1650ء اور نیز 1659ء میں ہمیں بارش کے نہ ہونے کے سبب سے قیمتوں میں اضافہ کی اطلاع ملتی ہے لیکن معمول کی نرخوں میں کسی اضافہ کا پتہ نہیں چلتا۔

دور دراز مقامات سے ذخیرہ کو قحط زدہ علاقوں تک کھینچ کر لا سکتا تھا۔ ایسے حالات میں سمندری بار برداری سے جو زیادہ سہولتیں بہم پہنچتی تھیں وہ اس امر سے واضح ہوتی ہے کہ سورت کے انگریزوں نے قحط کے دوران فارس سے گیہوں خریدنا اور اس کے پندرہ برس بعد مدراس کے قحط زدہ علاقہ تک اسے پہنچانا شروع کیا۔ سمندری ساحل تو ایک دوسرے کو مدد فراہم کر سکتے تھے لیکن ملک کے اندرونی علاقوں میں جب تک کہ گجرات کی طرح قیمتیں نہ بڑھ جائیں کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دور حاضر سے زیادہ زیر مطالعہ عہد میں غلوں کی قیمت اور مروجہ سکوں کی قوت خرید کے درمیان ربط پایا جاتا تھا۔ 1595 اور 12-1610ء کی درمیانی مدت میں جسے میں نے اس موضوع پر اپنے شائع کیے ہوئے حسابات کی بنیاد تصور کیا ہے۔ روپیہ کی قیمت بمقدار غلوں کے سات گنا گھٹی ہے۔ ان آخر الذکر برسوں میں گجرات میں گیہوں کا تھوک نرخ تقریباً 20 ال۔ بی فی روپیہ تھا لہٰذا اس جنس کے اعتبار سے تین صدی کی مدت میں روپیہ کی قیمت 4 یا ½4 گنا کم ہوئی۔ یہ مسئلہ کہ اس تخفیف کا کوئی جزو ہمارے عہد میں واقع ہوا یا نہیں خصوصی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ جب تک ہم اسے حل نہ کر لیں اس وقت تک مالگذاری زمین کے بار کے متعلق جسے بجا طور پر ستر ہویں صدی کے دوران بارش کے بعد ملک کی معاشی زندگی کا اہم ترین عنصر قرار دیا جا سکتا ہے، ہم قطعی نتائج پر نہیں پہنچ سکتے۔ یہ بات واضح ہے کہ گجرات میں تقریباً تمام تھوک سودے چاندی کے سکوں میں طے کیے جاتے تھے اور یہ نتیجہ اخذ کرنے کے لیے کوئی بنیاد نہیں پائی جاتی کہ ان کی گردش کی رفتار میں کوئی تبدیلی واقع ہوئی۔ یاد رہے کہ مشرقی ساحل کی لونگ کی منڈی کی قیمتوں کے علاوہ ابھی تک جس قدر قیمتوں پر ہم نے بحث کی ہے وہ سب کی سب چاندی کی مقداروں میں ہیں۔ یہ بھی گذر چکا ہے کہ بالآخر مسالوں کی گرانی کا سبب ولندیزیوں کی اجارہ داری کا مکمل ہو جانا تھا لیکن مسالوں کو چھوڑ کر، درآمدات کی کسی مخصوص برآمدی شے، یا اہم غذائی اجناس کی معمول کی قیمتوں میں کسی اضافہ کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کا یہ مفہوم ہوا کہ چاندی کے سکوں کی قیمتوں میں بھی کسی کمی کے آثار نہیں ملتے۔ یہ درست ہے کہ ہم نے جملہ اشیاء کو اپنی بحث کا موضوع نہیں بنایا ہے لیکن سوتی سامانوں، خام کپاس اور تلہن کے علاوہ بقیہ تمام چیزیں ہماری بحث کے دائرہ میں آ گئی ہیں۔ خام کپاس اور تلہن کے متعلق ضروری مواد، جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے موجود نہیں ہے اور چونکہ سوتی سامانوں کے متعلق موجود اعداد کو سمجھنا ان کے معیار کو جن پر پردہ پڑا ہوا ہے سمجھے بغیر ناممکن ہے لہٰذا

میں نے انھیں نظر انداز کرنا مناسب سمجھا، مثلاً یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ گجرات کے اہم کیلیکوز یعنی چوڑے اور کم عرض کے بافتے 1620ء کے مقابلہ میں 1640ء میں انگلستان کے لیے ارزاں قیمت پر خریدے گئے تھے[1] لیکن قحط کے بعد اُن کی بُنائی میں خرابی کی شکایات کی موجودگی میں ان قیمتوں میں کمی کی بنیاد پر کوئی نتائج اخذ نہیں کیے جا سکتے اور قحط کی زد سے محفوظ علاقوں کے متعلق کافی عرصہ تک کی قیمتیں تحریروں میں نہ ملنے کے باعث ہم ان کے بارے میں کسی نتیجہ پر پہنچنے سے مجبور ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ شہادت نامکمل ہے لیکن اس کے باوجود ہم یہ وقتی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ زیر بحث نصف صدی کی مدت میں چاندی کی قیمتوں میں کمی واقع ہونے کے ذرا بھی امکانات نہیں پائے جاتے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ کمی واقع ہوئی ہیں ان دو باتوں کی تشریح کرنا ہوگا اول یہ کہ متعدد ایسی اشیا کی قیمتوں میں اضافہ ہوا جن پر بحث نہیں آئی ہے اور جو یہ اعتبار اہمیت ان اشیا کی قیمتوں میں مجموعی اضافوں کے مساوی ہے جن پر بحث آچکی ہے اور دوسرے یہ کہ برآمدات: نیل اور غلوں کی قیمتوں میں ایسی بنیادوں پر جن کا ہمیں پتہ نہیں چلا سکا کمی واقع ہوئی جس کے باعث قیمتیں چاندی کی قیمت میں مفروضہ کمی سے متاثر نہ ہو سکیں۔ جب تک مذکورہ بالا دونوں امور کی تائیدی شہادتیں نہیں ملتیں۔ اس موضوع پر مزید بحث بے سود ہوگی اور میں اپنے اس عارضی نتیجہ کے بعد آگے بڑھتا ہوں کہ 1610ء اور 1660ء کی درمیانی مدت میں گجرات کی منڈیوں میں چاندی کی حیثیت بطور قیمت کے ایک خاصے مستحکم معیار کے برقرار رہی۔

اگر یہ نتیجہ گجرات کے لیے قابل تسلیم ہے تو ہم بجا طور پر اس کا اطلاق فی الجملہ شمالی ہندوستان پر بھی کر سکتے ہیں۔ ہم شمالی علاقہ کو چاندی کی ایک واحد منڈی تصور کر سکتے ہیں۔ اس کی مقامی پیداوار یا زمینی سرحدوں کے راستہ سے اس کی زیادہ آمد تقریباً نہیں کے برابر تھی اور اس کی فراہمی کو بنگال، سندھ، اور گجرات کے ساحلوں پر اس کی درآمد سے قائم رکھا جاتا تھا۔

---

[1] پچھلے باب کے جدول میں 1619ء کے سامانوں کے بڑے کھیپ کے لیے جہاز تک پہنچائی اور لدائی سمیت جو اوسط قیمتیں درج ہیں ان میں چوڑے بافتہ کے لیے 3.6 اور 8.6 محمودی فی تھان اور کم عرض کے بافتہ کے لیے 3.8 اور 5.0 محمودی دکھلایا گیا ہے۔ دسمبر 1640ء کے بیچک میں ORIGINAL CORRESPONDENCE 1764 مماثل قیمتیں (جہاز تک پہنچائی سمیت) چوڑے بافتہ کے لیے 5.2 اور 5.5، کم چوڑے بافتہ کے لیے 3.8 اور 4.1 محمودی ملتی ہیں۔

بنگال کی سمندری تجارت کی تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے عہد کی آخری دہائی تک جب کہ ولندیزیوں نے اپنی برآمدی تجارت کو بحال کر کے وسیع کیا، وہاں چاندی کی آمد زیادہ نہ تھی۔ اس نقطۂ نگاہ سے سندھ کی اہمیت اور بھی کم تھی اور میرا خیال ہے کہ ہمعصر تحریروں کا مطالعہ کرنے والے اس بات سے اتفاق کریں گے کہ گجرات کے مختلف بندروں کی تجارت ہی اس کے حصول کا اہم ترین ذریعہ تھا۔ لہٰذا ہم چاندی استعمال کرنے والے شمالی علاقہ کو ایک ایسا مخزن تصور کر سکتے ہیں جو خاص طور پر گجرات سے پُر ہوتا تھا حالانکہ اس میں چاندی کی ذیلی رسد بنگال اور سندھ سے بھی پہنچا کرتی تھی۔ لیکن ہمیں چاندی کو کلیتہً کوئی حرکت پذیر چیز نہ تصور کرنا چاہیے کیونکہ اس کے حمل ونقل کے اخراجات ونیز خطرات ناقابلِ لحاظ نہ تھے۔ ایسی صورت میں، اگر چاندی کی مجموعی رسد ملک کی کھپت سے زائد رہی ہوتی اور نتیجۃً جو چاندی گردش میں تھی اس کی مقدار میں زیادتی کا رجحان پایا جاتا تو اس کی وجہ سے اس کی قیمت میں سب سے زیادہ کمی گجرات میں جہاں اس کا بیشتر حصہ پہنچتا اور سکوں میں ڈھالا جاتا، نمایاں ہوتی۔ مگر چونکہ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ گجرات میں کوئی قابل لحاظ کمی واقع نہ ہوئی، لہٰذا ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ پورے ملک میں چاندی کی حیثیت بطور ایک مستحکم معیار کے برقرار رہی یا بہ الفاظ دیگر ولندیزی یا دوسرے تاجر چاندی کی جو مقدار یہاں پہنچاتے تھے وہ شمالی اور مغربی ہندوستان کی مجموعی کھپت سے زائد نہ تھی۔ اس سلسلہ میں سورت میں مغلوں کے ٹکسال کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے واقعات بادی النظر میں سکوں میں زیادہ اضافہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تقریباً جملہ درآمد کی ہوئی چاندی خواہ وہ غیر ملکی سکوں کی شکل میں ہو خواہ ڈلوں کی شکل میں براہ راست ٹکسال پہنچ کر روپیوں یا محمودیوں کی شکل میں دوبارہ باہر آتی تھی[1] ہمارے عہد کے آغاز پر گجرات کی خاص ٹکسال احمد آباد میں تھی۔ یہ ایک بار بند کر دیے جانے کے بعد غالباً بندر کی اضافہ پذیر اہمیت کے پیش نظر ۱۶۲۰ء میں دوبارہ کھولی گئی۔ ۱۶۳۶ء تک سورت میں درآمد کی ہوئی چاندی، مقامی ٹکسال

---

[1] جیسا کہ ضمیمہ د میں واضح کیا گیا ہے کہ ۱۶۳۷ء تک محمودی بگلان میں ملہر نام کی ٹکسال میں ڈھالی جاتی تھی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہ سکہ ۱۶۲۰ء میں سورت کی ٹکسال کے دوبارہ کھل جانے پر یہاں نہ ڈھالا جاتا تھا لیکن بہرحال اس ٹکسال کا خاص تعلق روپیہ کی ڈھلائی سے تھا۔

کی گنجائش سے زیادہ ہوگئی تھی اور اس کے دو برس بعد انگریزوں کے صدر مقام کو احمد آباد منتقل کرنے کی تجویز کا ایک سبب سکوں کی قلت کو بھی بتایا گیا ۔ لیکن اس قلت کو سورت کے ٹکسال کی گنجائش کو بڑھا کر رفع کیا گیا جو اس کے بعد سے بظاہر جملہ عام ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہوگئی۔ پس یہ یقینی ہے کہ سورت میں چاندی کی درآمد میں اضافہ ہوا لیکن اس سے یہ نہ تصور کرنا چاہیے کہ یہ اضافہ پورے گجرات پر حاوی تھا اور واقعاتی اعتبار سے تو اس اضافہ کو کھمبات سے تجارتی کاروبار کی سورت کو منتقلی کا نتیجہ تصور کرنا چاہیے ۔ پرتگالیوں کی تجارت کا خاص مرکز کھمبات تھا اور ان کی درآمد کی ہوئی چاندی قدرتی طور پر احمد آباد کے ٹکسال میں پہنچتی تھی۔ تجارت کے پرتگالیوں سے ولندیزیوں اور انگریزوں کو منتقل ہو جانے کے بعد سورت کو ترقی مگر کھمبات کو زوال ہوا اور سورت کی سکہ سازی میں اضافہ کا توازن شمالی ٹکسالوں میں کمی سے پورا ہوا ۔

اس تبدیلی کو ہندوستانی عجائب گھروں میں موجود مغلیہ سکوں کے ذخیروں سے معلوم کیا جا سکتا ہے جو فی الجملہ کافی مدت پر پھیلے ہوئے ہیں ۔ اس سے ہم ان کی مدد سے مختلف ٹکسالوں کی اضافی اہمیت کا ایک تخمینی اندازہ بھی کر سکتے ہیں ۔ حسب ذیل اعداد سکوں کے تین خاص ذخیروں کی فہرست سے ماخوذ ہیں[1]

ہندوستانی عجائب گھروں میں چاندی کے سکوں کے نمونوں کی تعداد

عہد حکومت	احمد آباد کی ٹکسال				سورت کی ٹکسال			
	لکھنؤ	لاہور	کلکتہ	میزان	لکھنؤ	لاہور	کلکتہ	میزان
اکبر	153	51	53	257	—	1	—	1
جہانگیر	79	27	32	138	14	4	5	23
شاہجہاں	34	9	12	55	88	22	31	141
اورنگ زیب	21	5	11	37	131	55	91	277
	287	92	108	487	233	82	127	442

[1] اورنگ زیب کے سکوں میں وہ چند نمونے بھی شامل ہیں جنھیں 1658ء میں مراد بخش نے ڈھلوایا تھا۔

اکبر سے اورنگ زیب تک کے مجموعی زمانہ پر غور کرنے سے دیکھا جائے گا کہ مذکورہ بالا ذخیروں میں دونوں ٹکسالوں میں ڈھلے ہوئے سکوں کی تعداد تقریباً برابر برابر ہے لیکن سورت کے ٹکسال کی ترقی کے ساتھ احمدآباد کی تنزلی ہوئی۔ سورت کے ٹکسال کی عہد شاہجہانی کے اوائل میں توسیع کی گئی اور اس کے بعد سے اس کی حیثیت گجرات کے خاص ٹکسال کی ہو گئی۔ عہد عالمگیری کے موجود نمونوں کا ⅘ حصہ اسی ٹکسال کا فراہم کیا ہوا تھا۔ پس یہ اعداد ہمارے اخذ کردہ اس نتیجہ کی تائید کرتے ہیں کہ زیر مطالعہ عہد کے دوران گجرات میں چاندی کی درآمد میں کوئی متناسب اضافہ نہ ہوا تھا۔ یہاں سے یورپ کی براہ راست تجارت بیشک ایک نئی صورت حال تھی لیکن اس وقت کی مجموعی تجارت میں اس کا تناسب کم تھا اور یہ سوچنے کے لیے کہ اس میں زیادہ توسیع کی گئی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی اور ملک کے اس حصہ کے مجموعی تجارتی کاروبار پر نظر رکھتے ہوئے ہم یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ تجارت کی روش ایسی نہ تھی جو پیداوار کی قیمتوں میں عام اضافہ کی مؤید ہو۔[1]

اب میں اپنی توجہ کو ہندوستان کی دوسری سمت مبذول کرتے ہوئے بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ساحل کورومنڈل پر غذائی اجناس کی قیمتوں کی روش کے متعلق تقریباً کوئی بھی مواد فراہم نہ ہو سکا۔ یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ اس خطہ میں قحط کی کثرت رہتی تھی اور خراب فصلوں کے دنوں میں قیمتیں بہت بڑھ جاتی تھیں لیکن عام برسوں میں ان کے رجحانات کا پتہ نہیں چلتا اور ہم صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کے مصارف میں اضافہ کے متعلق شکایات کی غیر موجودگی اس نظریہ کی مؤید ہے کہ معمول کی قیمتوں میں کوئی خاص اضافہ نہ ہوا۔ بمقدار چاندی اجرت کی نرخوں کا استحکام بھی اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ میتھولڈ جس نے مسولی پٹم کو 1623ء میں چھوڑا تھا، تجارتی کوٹھی کے ملازمین کی اجرت ایک ریال آف ایٹ ماہانہ بتاتا ہے جو تقریباً دو روپیہ کے برابر آتا ہے۔ 1658ء میں ولیم اسمتھ نے

---

[1] ممکن ہے کہ زیر مطالعہ عہد میں فارس سے گجرات میں چاندی کی کم آمد نے یورپ کی بڑھی ہوئی درآمد کے اثرات کو جزوی طور پر کم کر دیا ہو، حالانکہ اس دعوے کو حق بجانب ثابت کرنے والی قطعی شہادتیں نہیں ملتیں۔ درآمد برآمد کا فرق، بجز فارس کے ریشم کی نئی برآمد سے ضرور متاثر ہوا ہوگا۔

METHWOLD ×

WILLIAM SMYTH o

اسی علاقہ کی کوٹھی کے ملازمین کا نرخ ۴ شلنگ سے ۵ شلنگ تک بتایا ہے جو ان دنوں رُپیہ کے ۲ شلنگ ۳ پنس کا ہونے کے باعث میتھولڈ کے تیس برس قبل بتائے ہوئے نرخ کے برابر ہوا اور یہ بہت زیادہ بعید از امکان معلوم ہوتا ہے کہ اس مدت میں زندگی کے مصارف میں کوئی زیادہ تبدیلی واقع ہوئی ہو۔

البتہ دوسری طرف، بنگال میں ۱۶۵۰ء اور ۱۶۶۰ء کی درمیانی مدت میں غلوں کی قیمتوں میں ایک اچانک اضافہ ہونے کی قطعی شہادتیں ملتی ہیں جس سے ملک کے اس حصہ کے معاشی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ یاد ہوگا کہ تقریباً ۱۶۵۰ء میں ولندیزیوں اور انگریزوں کے ہگلی میں مقیم ہو جانے کے بعد ہی، بنگال کے تجارتی کاروبار کو ترقی حاصل ہوئی۔ ۱۶۵۸ء میں انگریز آڑھتیوں نے اپنی نجی ضروریات کے لیے گزارہ کی رقم میں اخراجات زندگی کے زیادہ بڑھ جانے کے باعث اضافہ کی درخواست بھیجی۔ یہ درخواست اب موجود نہیں ہے لیکن کمپنی کے جواب سے پتہ چلتا ہے کہ درخواست میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ رسد کے سامان کی قیمتیں تین گنی تھیں لیکن کمپنی نے اسے پورے طور پر قبول نہ کیا بلکہ تفصیلی حسابات طلب کیے۔ ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ آڑھتیوں نے اضافہ کی مقدار میں مبالغہ سے کام لیا ہوگا یا کم از کم اپنے وعدے کو امکانی حد تک حق بجانب ظاہر کرنے کی کوشش کی ہوگی لہٰذا اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ قیمتیں واقعتہً تین گنی ہوگئی تھیں درست نہ ہوگا۔ لیکن اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ قیمتوں میں اس درجہ کا اضافہ ضرور ہوگیا تھا کہ دس برس سے کم قبل کی مقرر کی ہوئی گزارہ کی رقم اب ناکافی ثابت ہو رہی تھی۔

قیمتوں کا یہ اضافہ بنگال اور ہندوستان کے دیگر ساحلوں کے درمیان کسی اختلاف کے آغاز کا نہیں بلکہ ایک ایسی بے قاعدگی کے بظاہر ازالہ کا سبب ثابت ہوا جو کچھ دنوں سے چل رہی تھی۔ دسمبر ۱۶۵۸ء تک مقامی قیمتیں بے حد بڑھ گئی تھیں لیکن ٹھیک ۸ برس قبل چاول، گھی، تیل اور گیہوں ایسی چیزیں وسب کی سب دوسرے مقامات کے مقابلہ میں نصف یا اس سے قدرے زائد نرخ پر ملا کرتی تھیں۔ بہ الفاظ دیگر، ۱۶۵۰ء کے اختتام تک، بنگال میں قیمتیں ان قیمتوں سے جن سے انگریز تاجر مانوس تھے یعنی ہندوستان کے دیگر ساحلوں کی مروجہ قیمتوں سے بے حد کم تھیں لیکن چند ہی برسوں میں ایک تیزی کے ساتھ اضافہ پذیر تجارت نے جس میں تقریباً پورا سرمایہ چاندی کی شکل میں لگا ہوا تھا قیمتوں کو دیگر ساحلوں کے معیار تک

بلکہ اس سے قدرے زائد پر پہنچا دیا۔ اس سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پہلے بنگال میں چاندی کی فراہمی بمقابلہ دیگر ساحلوں کے کم تھی جس کے نتیجہ میں قیمتیں بمقدار چاندی معمولاً کم رہی ہوں گی اور ۱۶۵۰ء اور اس کے بعد سے درآمدات میں ناگہانی اضافہ نے اس مخصوص سبب کو رفع کرکے بنگال میں قیمتوں کو دیگر ساحلوں کی سطح پر پہنچا دیا۔ یہ نتیجہ اس حقیقت سے بھی مطابقت رکھتا ہے کہ سابق میں بنگال اپنا چاول ان علاقوں کو برآمد کیا کرتا تھا جنھیں قدرتی طور پر اپنی ضروریات کورومنڈل سے پورا کرنا چاہیے تھا۔ مثال کے طور پر فنچ* کی تحریر کے مطابق سونار گاؤں (موجودہ ڈھاکہ کے قریب) پورے "ہندوستان" اور لنکا کی ضروریات پوری کرتا تھا۔ ہمارا قیاس ہے کہ یہاں 'ہندوستان' سے جنوبی ساحل مراد ہے جہاں پر غلہ کے درآمد ہونے کی اطلاع بہت سے دیگر ماخذ میں بھی پائی جاتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہاں بنگال سے چاول کیوں درآمد کیا جاتا تھا جبکہ یہ نسبتاً مختصر اور کم خطرناک سمندری سفر کے بعد کورومنڈل ہی سے دستیاب ہو سکتا تھا۔ اس کا واحد معقول جواب یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنگال میں غلوں کی لاگت اس قدر کم رہی ہوگی کہ اس میں باربرداری کے اخراجات بھی پورے ہوتے رہے ہوں گے۔ یہ امر کہ قیمتیں واقعتاً کم تھیں سیزر فریڈرک سے لے کر ولیم میتھولڈ تک متعدد مشاہدین کے بیانات سے واضح ہوتا ہے۔ ۱۶۲۰ء کے قریبی برسوں کے متعلق لکھتے ہوئے ولیم میتھولڈ نے بنگال سے مسولی پٹم کو غلہ اور دیگر سامانوں کی تجارت کی اطلاع دی ہے۔

"جس جگہ یہ لائے جاتے ہیں وہاں کی افراط کے مدنظر ان کا یہاں لایا جانا ایسا ہی ہے جیسا کہ نیوکاسل کو کوئلہ پہنچانا، پھر بھی لوگ اسے یہاں اطمینان بخش نفع پر فروخت کرتے ہیں"۔ یہ دو ایسے ساحلی خطوں کے درمیان جو محض رسل و رسائل کے ناقص ذرائع سے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں، چاندی کی قوت خرید میں فرق کی ایک نمایاں شہادت ہے۔

لہٰذا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ۱۶۵۰ء تک بنگال میں چاندی کی فراہمی کم رہی۔ اس کمی کی ایک امکانی توجیہہ وہاں کے نظام مال کا طریقہ بھی ہو سکتا ہے۔ مالگذاری زمین کی ادائیگی بیشتر چاندی میں ہوتی تھی اور اس کا زیادہ حصہ اس شکل میں معمولاً مغلیہ دربار بھیج دیا جاتا تھا۔ چاندی کی جو مقدار صوبوں میں روک لی جاتی تھی وہ بظاہر مقامی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ناکافی ہوتی۔ نتیجتاً چاندی کی قیمت معمولاً زیادہ رہا کرتی جس کا یہ مفہوم ہوا کہ چیزیں معمولاً ارزاں

---

x

تھیں۔ آئین اکبری میں پورے بنگال کی مالگذاری 150 لاکھ روپیہ کے قریب بتائی گئی ہے[1] لیکن چند وجوہ کی بنا پر یہ اطلاع اگر فرضی نہیں تو مبالغہ آمیز ضرور ہے۔ عہد شاہجہانی کے متعلق مختلف واقعات کے پیش نظر ہم مطالبۂ مالگذاری کو 130 لاکھ روپیہ پاتے ہیں[2]۔ اس کا تھوڑا حصہ بلا شک مقامی صرفہ میں آتا تھا لیکن اگر ہم اس امر کو مد نظر رکھیں کہ عطیہ داران متل صوبوں کے بالعموم اپنی آمدنیوں کو نقد کی شکل میں دارالسلطنت بھیج دیا کرتے تھے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہاں سے ملک کے اندرونی حصہ کو چاندی کی ایک بڑی مقدار جو غالباً 100 لاکھ روپیہ کے برابر رہی ہوگی مسلسل چلی جایا کرتی تھی۔ کسی پچھلے باب میں گزر چکا ہے کہ 1650ء سے قبل بہت عرصہ تک بنگال کی سمندری تجارت بہت کم رہی اور باوجودیکہ ہم اس کی مالیت کا صحیح شمار نہیں کر سکتے پھر بھی اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ یہ اس نکاس کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ صوبہ کی ضرورت کے مطابق چاندی فراہم کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ پھر ولندیزی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ 1650ء کے قبل کے برسوں میں ان کی بنگال کے ساتھ ایک لاکھ روپیہ کے قریب کی تجارت تھی لیکن 1661ء میں یہ 20 لاکھ کے قریب پہنچ گئی۔ یہ اضافہ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے نئے کاروبار سے متعلق تھا جس کے لیے سرمایہ بیشتر چاندی درآمد کر کے فراہم کیا جاتا تھا۔ ساتھ ساتھ یہاں پر انگریز بھی اس سے نسبتاً مختصر مگر اچھی خاصی مقداروں میں اپنی تجارت کو بڑھا رہے تھے اور ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ زیر مطالعہ عہد کے اختتامی برسوں میں چاندی کی افراط آمد میں یہ اضافہ اگر 20 لاکھ سالانہ سے زائد نہیں تو اس کے قریب ضرور تھا جو بنگال کی مالی حیثیت کو نمایاں طور پر تبدیل کر دینے کے لیے کافی ثابت ہوا۔ مجھے کوئی ایسے اعداد نہ مل سکے جو اس مدت میں مطالبۂ مالگذاری میں اضافہ کو ظاہر کرتے ہوں[3]۔ شمالی علاقہ کی طرف یہاں سے چاندی کے نکاس کے تقریباً ایک سطح پر قائم رہنے

---

[1] آئین اکبری میں مندرج بنگال کے اعداد و شمار ایسے علاقوں پر بھی مشتمل ہیں جو اس کی تالیف کے وقت حکومت مغلیہ کی حدود سے باہر تھے اور کم از کم ایسے علاقوں کے متعلق ان اعداد و شمار کو صحیح نہیں تصور کیا جا سکتا۔ ASCOLI (صفحہ 25) 1658ء کی مالگذاری کو 131 لاکھ روپیہ بتاتا ہے

برٹش میوزیم کے تین مخطوطات (اورنٹیل 1842، ایڈیشنل 6588 اور 6598) میں مالگذاری کو 5246 لاکھ دام بتایا گیا ہے۔ 40 دام کے ایک روپیہ کے حساب پر مسٹر ایسکولی کی دی ہوئی رقم آجاتی ہے۔

[3] اسکولی (ASCOLI (CC)) 1800ء میں مقرر کردہ سلیکٹ کمیٹی کے نقش قدم پر کہتا ہے

(باقی صفحہ 225 پر)

(باقی صفحہ 225 پر)

کی صورت میں چاندی کی بڑھی ہوئی تعداد مقامی ضروریات کو پورا کرنے میں کافی حد تک مدد
رہی ہوگی اور اس طور پر قیمتوں میں کمی کا خاص سبب زائل ہوگیا ہوگا۔

اس تحقیقات کا آخری ماحصل یہ نکلتا ہے کہ درانحالیکہ موجود شہادتیں نا مکمل ہیں۔
مگر جس قدر موجود ہیں ان کے خلاصہ کو ہم اس عارضی نتیجہ کی شکل میں پیش کر سکتے ہیں کہ ہمارے
عہد میں پورے شمالی اور مغربی علاقوں میں چاندی کی قیمتیں مستحکم رہیں لیکن بنگال میں آخری
دہائی کے دوران یہ قیمتیں تیز رفتاری کے ساتھ مندی ہوئیں۔ اس طور پر ایک طویل المیعاد
بے قاعدگی، ختم ہوکر ہگلی میں قیمتیں ہندوستان کے دیگر ساحلی علاقہ کے مطابق ہوگئیں۔

فصل 6۔ سونا اور تانبہ

پچھلی فصل میں ہم اس عارضی نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ باستثنا 'بنگال'، زیر مطالعہ عہد کی
پوری مدت کے دوران چاندی کی حیثیت قیمت کے ایک مستحکم معیار کے طور پر برقرار رہی۔ اب
ہمیں سونے اور تانبہ پر غور کرنا ہے جو دونوں بحیثیت اشیا کے اپنی قیمتوں کی بنیاد پر بطور سکہ
کے چلا کرتے تھے۔ میں نے ضمیمہ د میں واضح کیا ہے کہ ہمارے عہد کے دوران نئے گھوڑا نام کے
طلائی سکوں کی بمقدار چاندی قیمت مشرقی ساحل پر بڑھ گئی تھی اور ہم یہ توقع کر سکتے
ہیں کہ گجرات میں سونے کی منڈی بھی اسی نسبت سے تیز ہوئی ہوگی لیکن تحریروں میں جو مواد
ملتا ہے وہ اس قدر کم ہے کہ اس توقع کی نہ تو تائید ہوتی ہے اور نہ ہی تردید۔ ہمیں زیر مطالعہ
عہد کے وسط کے متعلق بیش از بیش اس قدر معلومات ہیں کہ وقتی طور پر دیگر اشیا کی طرح اس کی
منڈی بھی قحط کے باعث بے ترتیب ہوگئی تھی۔ کیونکہ امیر طبقہ اپنے ذرائع آمدنی کے بند ہوجانے
سے قوت خرید سے محروم اور دوسری طرف غربا غلہ خریدنے کے لیے اپنے زیورات بیچنے پر مجبور
ہوگئے تھے۔ قحط کے بعد 1635ء میں 20 شلنگ کا انگریزی سکہ 20 محمودیوں میں بکتا تھا۔
جبکہ 1646ء میں اس کی قیمت $21\frac{1}{2}$ محمودی ہوگئی تھی۔ اس اضافہ کی اہمیت تسلیم، لیکن پھر
بھی چونکہ خصوصاً سونے کی منڈی میں کاروباری توڑ جوڑ کی گنجائش رہا کرتی تھی اس لیے کسی

(بقیہ ص 224)

تھا کہ یہ ممکن ہے کہ شاہ شجاع کی مدات آمدنی (13 لاکھ روپیہ) کوئی نیا بندوبست یا تشخیص نہ ہو بلکہ صرف
کتابت کی نظر ثانی رہی ہو۔" اگلی تشخیص جس کا تحریروں میں اندراج ملتا ہے 1722ء تک نہ ہوئی تھی۔

قطعی نتیجہ پر پہنچنے کے لیے ہمیں مزید مواد کی ضرورت ہوگی۔ ایک موقعہ پر انگریز آڑھتیوں کی شکایت تھی کہ وہ صرافوں اور مبادلۂ زر کا کام کرنے والوں کے رحم وکرم پر ہیں، جو اپنی مرضی کے مطابق ان دونوں قسم کے سکوں کی قیمتیں کم وبیش کرتے رہتے ہیں" اور مندرجہ فرق، منڈی کا محض نشیب وفراز ہو سکتا ہے۔ 1652ء میں سورت کے آڑھتیوں کی اطلاع کے مطابق سونے کی قیمتوں میں بجائے کمی کے اضافہ کا زیادہ امکان پایا جاتا تھا لیکن ہمیں اپنے عہد کے اختتامی برسوں کے متعلق قیمتوں کے واقعی اندراجات نہیں ملتے۔ مملکت مغلیہ میں سونے کا استعمال بہرحال اس قدر محدود پیمانہ پر تھا کہ اس کی قیمت سے سکوں کے استعمال کرنے والے عمومی طور پر متاثر نہ ہوتے۔ یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ہمیں جنوب میں سونے کی قیمتوں کے مندا ہونے کے آثار نظر آئیں گے لیکن یہاں بھی ضروری مواد کی کمی ہے اور مسالے وہ واحد اشیا ہیں جن کی قیمتوں کی، میں ایک باقاعدہ ترتیب قائم کر پایا ہوں اور جن کے متعلق پہلے گذر چکا ہے کہ ان کا کاروبار ولندیزی اجارہ داری کی معینہ نرخوں پر ہوا کرتا تھا۔

تانبہ کے متعلق ہماری معلومات نسبتاً زیادہ وسیع اور نیز زیادہ عمومی دلچسپی کی حامل ہیں۔ زیر مطالعہ عہد کے آغاز پر صورت حال یہ تھی کہ شمالی ہندوستان کا پورا یا تقریباً پورا انحصار مقامی کانوں کی پیداوار پر تھا جبکہ جنوب کی ضرورت خاص طور پر پرتگالیوں کی جاپان سے درآمدات کے ذریعہ پوری ہوا کرتی تھی۔ شمال میں اس دھات کی انتہائی گرانی اس امر سے ظاہر ہوتی ہے کہ اس کی ٹکسالی قیمت کا حساب تانبہ کے ایک پونڈ کے لیے تقریباً 7 ال۔ بی گیہوں کا آتا ہے۔ جب کہ 12-1610ء میں یہ 6 ال۔ بی گیہوں کے برابر تھا اور جنوب میں بھی اس کی قیمتیں زیادہ کم نہ رہی ہوں گی کیونکہ ایسا ہونے کی صورت میں درآمدات کو مالابار اور گوا سے گجرات کے بندرگاہوں کی طرف موڑ دیا جاتا۔ ان داموں یہ دھات ایک عیش وعشرت کی چیز تھی اور اس کے بنے ہوئے برتن موجودہ زمانہ کے مقابلہ میں بہت کمیاب تھے۔ صنعت و حرفت میں اس کا استعمال تھوڑا تھا اور کبھی کبھی توپ کی ڈھلائی میں اس کی ضرورت کے علاوہ یہ غالباً مجموعی طور پر بیشتر ٹکسالوں ہی میں استعمال ہوتا تھا۔ تقریباً 1620ء تک، مجھے شمالی ہندوستان میں تانبہ کی قیمت میں کسی خاص تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا۔ عہد اکبری میں مبادلہ کا سرکاری نرخ 40 دام یعنی 80 گجراتی پیسہ فی روپیہ برابر 33 پیسہ فی محمودی تھا۔ 1609ء میں فنچ[x] نے محمودی

FINCH x

کے مروجہ نرخ کو 31 یا 32 پیسہ بتایا ہے جو "تانبہ کی قیمت میں نشیب و فراز کے ساتھ بدلتا رہتا ہے" اور 1615ء کے اوائل میں الکنگٹن[x] نے 34½ پیسہ قلمبند کرتے ہوئے نرخ میں کمی و بیشی کے رجحان کا ذکر کیا ہے۔ پس، بہرحال دس برس تک اس کی قیمتوں میں کسی اضافہ کے آثار نہیں پائے جاتے اور نہ ہی ابھی تک گجرات میں اس کی درآمد شروع ہوئی تھی کیونکہ 1619ء میں جب سورت کے انگریز آڑھتیوں کو فارس تانبہ بھیجنے کی خواہش ہوئی تو انھوں نے پہلے اس کی برہان پور یعنی بعض کانوں ہی کے اطراف میں تلاش کی اور بالآخر اسے سکوں کی شکل میں برآمد کیا۔ حالانکہ مرسلہ مقدار صرف 330 ال۔ بی ہی تھی جو ایک باقاعدہ درآمد کی تجارت کی موجودگی میں بلاشک مقامی طور پر بھی حاصل کی جا سکتی تھی۔ اگلی دہائی میں کسی وقت قیمتوں میں ایک نمایاں اضافہ ہوا۔ نرخ میں جو تبدیلی کا پہلا حوالہ مجھے ملا ہے وہ 1626ء کا پلسارٹ کا یہ بیان ہے کہ آگرہ میں 58 پیسوں کا ایک روپیہ ہوتا تھا۔ یہ 80 پیسہ کے سابقہ نرخ میں ایک نمایاں تبدیلی تھی۔ 1636ء میں سورت کے انگریز آڑھتیوں کی تحریر کے مطابق قحط کے دو یا تین برسوں تک محمودی کی قیمت 21-20 یا 22 پیسہ سے زیادہ نہ تھی۔ اس حساب سے روپیہ 50 سے 55 پیسہ کا ہوا۔ نرخ 1636ء میں 25 پیسہ فی محمودی، 1640ء میں 24½ اور بیس برسوں بعد بھی یہ 24½ اور 25 کے درمیان ہی تھا۔ پس ناقابل لحاظ کمی و بیشی کو نظر انداز کرتے ہوئے، جو بہرحال 1616ء تک 80 پیسہ (یا 40 دام) کے برابر تھا، 1627ء اور اس کے بعد سے 60 پیسہ (30 دام) یا قدرے کم یا زیادہ کا ہو گیا۔[1]

قیمتوں میں اضافہ کے بعد گجرات میں جاپانی تانبہ کی مسلسل درآمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ جاپان میں اپنا قدم جمانے کے بعد ولندیزیوں نے مشرقی ساحل کو جاپانی تانبہ فراہم کرنے میں دیر نہ لگائی۔ لیکن ان کے سورت لائے ہوئے تانبہ کا پہلا تحریری اندراج 1635ء میں ملتا ہے[2] اور اس کے

---

[1] چاندی اور تانبہ کے درمیان بازاری شرح مبادلہ میں بےحد نشیب و فراز رہا کرتا تھا۔ 1637ء کے " AGRA ACCOUNTS " میں روپیہ کو جنوری 1637ء میں صرف 50 پیسہ، اپریل 1654ء میں 52 پیسہ، ستمبر 1665ء میں 55 پیسہ اور اگلے اکتوبر میں 58 پیسہ کا بتایا گیا ہے۔

[2] کبھی ہندوستان کی ضروریات کو پوری کرنے میں بظاہر جو تاخیر ہوئی اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ 1629ء سے 1634ء تک ولندیزیوں کی جاپانی تجارت سیاسی مشکلات کی بنا پر تقریباً رک گئی تھی۔ ان کے بالآخر ختم ہو جانے پر تانبہ کی درآمد فوراً شروع ہو گئی۔

ELKINGTON X

بعد کے چند برسوں تک ان کی فروختگیاں قابل لحاظ رہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دھات کی یہاں واقعی ضرورت تھی۔ 1640ء میں جاپان سے تانبہ کی برآمد ممنوع قرار دے دی گئی اور اس مانعت کے 7 یا 8 برسوں کے دوران ہم ولندیزیوں کو سویڈن یا دیگر یورپی علاقوں کا تانبہ سورت اور مسولی پٹم میں فروخت کرتا ہوا پاتے ہیں۔ 1648ء میں جاپان سے برآمد دوبارہ شروع ہوئی اور پھر اس کی تجارت بظاہر بغیر مزید مزاحمت کے چلتی رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ ولندیزیوں نے بنگال میں اپنے قدم جما لینے کے بعد اسے وہاں بھی پہنچانا شروع کیا۔

1661ء کے بٹاویا جرنل* کے اندراجات سے ہمارے عہد کے اختتام پر منڈی کے حالات پر کسی قدر روشنی پڑتی ہے۔ سورت کے ایک خط میں اس دھات کی قیمتوں میں ناگہانی اضافہ کے دو وجوہ بیان کیے گئے ہیں۔ اول درآمدات کی کمی دوسرے خانہ جنگی کے باعث کانوں میں کام کرنے والوں کی کمی۔ گجرات کے حکام نے اس ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تانبہ (سکوں خواہ دھات کی شکل میں) کی برآمد کو ممنوع قرار دیا جس کے نتیجہ میں روپیہ کا نرخ 30 سے 33 دام تک ہو گیا۔ پس ہم اپنے عہد کے اختتام پر دیکھتے ہیں کہ تانبہ کی بمقدار چاندی کی قیمت مستقل طور پر تقریباً بقدر 20 فیصدی بڑھ گئی یعنی ایک روپیہ میں پیسوں کی تخمینی تعداد اپنے پرانے معیار یعنی 80 سے گھٹ کر موجودہ مسلمہ معیار یعنی 64 کے قریب پہنچ گئی اور اب شمالی ہندوستان کو اس کی فراہمی صرف مقامی ذرائع سے نہیں بلکہ جزوی طور پر جاپان کی کانوں سے بھی ہونے لگی۔

ابھی تک ہماری بحث کا تعلق تحریری واقعات سے تھا قیمت میں اچانک اضافہ کا میں کوئی سبب نہ معلوم کر سکا لیکن چاندی کی قیمتوں کے جائزہ سے ہم جن نتائج پر پہنچے ہیں وہ اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ اس کا سبب چاندی سے نہیں بلکہ تانبہ سے متعلق تھا پس ہمیں اس کی مانگ میں کسی مستقل اضافہ یا اس کی فراہمی میں کسی مستقل کمی کی تلاش کرنی چاہیے۔ جہاں تک اضافہ کا تعلق ہے یہ بجائے خود بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اس دور کی تاریخ میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جو اضافہ کی نشاندہی کرے اور نہ ہی میں کسی ایسی صورت حال کی موجودگی کا قیاس کر سکا جسے ہم اضافہ کا سبب قرار دیں۔ برخلاف اس کے مجھے اس کی فراہمی کا کم ہو جانا زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ 1630ء کے قبل کے برسوں میں بعض ہندوستانی کانوں میں اس کی پیداوار ختم ہو گئی اور قیمتوں میں اضافہ کے مستقل ہونے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی پیداوار کا خاتمہ عارضی نہ تھا۔ عہد اکبری سے

---

* BATAVIA JOURNAL

راجپوتانہ اور وسطی ہندوستان کی کانوں کی پیداوار کے ختم ہونے کی اطلاع ہمارے علم میں آچکی ہے اور مملکت مغلیہ کے بہت بڑے حصے کو یہی کانیں تانبہ فراہم کیا کرتی تھیں۔ میرا قیاس ہے کہ ان میں سے بعض کی پیداوار انھیں مخصوص دنوں میں ختم ہوئی جس کے نتیجہ میں تانبہ کی قیمت میں جو اضافہ ہوا اس نے ولندیزیوں کو اس کی گجرات میں ایک نفع بخش درآمدی تجارت کرنے پر ابھارا۔

باب 8 کے ماخذ

یہ باب فی الجملہ انگریزوں کی ان تجارتی مراسلات پر جن کی فہرست LETTERS RECEIVED اور ENGLISH FACTORIES میں درج ہے اور نیز DAGH REGISTER میں مندرج ہندوستان سے بھیجی ہوئی رپورٹوں پر مبنی ہے مندرجہ ذیل تفصیلی حوالوں کو جامع نہیں بلکہ صرف مثال کے طور پر تصور کرنا چاہیے۔ منڈیوں کی روش کو بخوبی سمجھنے کے لیے ان ماخذ کا تفصیلی مطالعہ ضروری ہے۔

فصل 1 : ہندوستانی تاجروں کے متعلق فنچ کی رائے LETTERS RECEIVED 1۔ میں ہے۔ سیسہ کی اجارہ داری کے لیے ENGLISH FACTORIES, 1 شورہ کے لیے تصنیف مذکورہ viii۔53 اور 31 مارچ 1641ء کا DAGH REGISTER تانبہ کی برآمد کی ممانعت کے لیے تصنیف مذکورہ مورخہ 18 اکتوبر 1661ء ملاحظہ ہو۔ احمد آباد کے نیل کی اجارہ داری کے لیے ENGLISH FACTORIES vi.11 مسالوں کے لیے 26 دسمبر 1641ء کا DAGH REGISTER کپڑے کے لیے ENGLISH FACTORIES IX.22 اور 20 مئی 1641ء کا DAGH REGISTER

تاجروں کے صوبیدار مقرر ہونے کے لیے تصنیف مذکورہ 147، i ملاحظہ ہوں۔ قحط سالی کے دنوں میں غلہ کے لیے ENGLISH FACTORIES iii.209 نیل کی شاہی اجارہ داری کا بیان تصنیف مذکورہ iv,324-28 اور v,1-70-73 میں آیا ہے ہگلی میں عام اجارہ داری کا بیان 10 جون 1636ء کے DAGH REGISTER سے ماخوذ ہے۔ ولندیزی تجارت کی اجارہ داری کے لیے مذکورہ تصنیف مورخہ 13 مارچ 1625ء اور ENGLISH FACTORIES iii-282 ملاحظہ ہو میر جملہ کے متعلق منکی کا بیان 231، i میں ہے اور اس کے تجارتی کاروبار کا ENGLISH FACTORIES xx میں اکثر حوالہ آتا ہے۔ زمینی باربرداری کے متعلق مندرجہ معلومات ENGLISH FACTORIES 1, 278 MUNDY ii & AGRA ACCOUNTS MS JOURNAL R.As کے 1618ء اور جولائی 1617ء اکتوبر میں ملتا ہے۔ 74, VI, 135

میں شمالی ہندوستان کی قیمتوں پر بحث آئی ہے۔

فصل 2 : ولندیزیوں اور انگریزوں کے درمیان کاروباری مقابلہ تجارتی تحریروں سے مسلسل ملتا ہے مثلاً ENGLISH FACTORIES III-208 V-205 دونوں کے مل کر کام کرنے کے سلسلہ میں دقتوں کے لیے تصنیف مذکورہ 142، 69، i. v. ملاحظہ ہو۔ سورت سے انگریزوں اور ولندیزیوں کی رپورٹوں میں وریجی ورا کا اس کثرت سے نام آتا ہے کہ اس کے جملہ حوالوں کی پوری فہرست طویل ہوگی۔ اہم موضوعات پر قارئین کی رہنمائی کے لیے غالباً حسب ذیل حوالے کافی ہوں گے۔ اس کی تجارتی انجمنوں کے حوالے 3 اکتوبر 1644ء اور 9 جون 1645ء (سورت کے DAGH REGISTER) اور نیز ENGLISH FACTORIES VIII, 206 میں آئے ہیں۔ اس کے غیر ملکی روابط تصنیف مذکورہ 105 viii, 250 vii, 212, iii میں، اس کا منڈیوں پر تسلط مذکورہ تصنیف 10-108 ,94 ,vi ,31 اس کا انگریزوں کو قرض تصنیف مذکورہ ix-119, 141 viii 5, 52 v. 97, 216 iv-193, 216, iii, 201, 300 x. 380 اور اس کی دولت کا بیان THEVENOT 46 میں آیا ہے۔

"ملایا" کا کبھی کبھی ذکر ENGLISH FACTORIES اور اس سے زیادہ DAGH REGISTER میں ملتا ہے دیکھئے مورخہ 14 اگست 1636ء اس کی وفات کے لیے اور مورخہ 27 نومبر 1640ء، 9 فروری 1641ء، 15 فروری 1643ء اس کے جانشینوں کے سیاسی مشاغل کے لیے، مورخہ یکم جون 1644ء اس کی مالی حالت کے لیے اور مورخہ 14 مارچ 1637ء، مورخہ 27 نومبر 1640ء اور مورخہ 19 اگست 1645ء اس کی تجارتی پالیسی کے لیے ملاحظہ ہوں۔

دلالوں کی سرگرمیوں کے لیے خاص طور سے ملاحظہ ہو ENGLISH FACTORIES V-102 ان کی بے ایمانیوں کے لیے تصنیف مذکورہ iii, 229, iv, 101, v-171, vi 225, viii, 209.

صرافوں کے لیے تصنیف مذکورہ viii. 21, iii-296 اور TAVERNIER I, 29 بحری بیموں کے لیے ENGLISH FACTORIES II. 101. viii- 92, سامانوں کی بھرمار اور اس کے نتیجہ میں ناکامی کے لیے ملاحظہ ہو۔ عدن میں 22 مارچ 1636ء DAGH REGISTER مخا اور بصرہ میں تصنیف مذکور مورخہ 18 جولائی 1644ء (سورت) اور ENGLISH FACTORIES VII, 208, viii اشین میں 20 مئی اور 15 دسمبر 1641ء اور 10 مارچ 1642ء DAGH REGISTER کا

فصل ۵ : نیل کے بتائے ہوئے نرخ پہلے جدول میں ملتے ہیں۔ ابتدائی معیار اور فیچ کے تخمینوں کے لیے ملاحظہ ہو LETTERS RECEIVED 1, 23, 28, 306 11, 152, 214 1630ء میں قحط کی قیمتوں کے لیے ENGLISH FACTORIES IV کاشتکاری میں تخفیف کے لیے تصنیف مذکورہ iv. 325، ملاوٹ کے لیے تصنیف مذکورہ vi, 273, vii, 163, viii-31-203 VI-273 ٹیورنیئر کی بیان کی ہوئی قیمت تصنیف مذکورہ ii 9 میں ہے۔

فصل ۴ : پارہ۔ ٹانگ کے لیے ENGLISH FACTORIES iii-325, 334, نجی تجارت کے لیے تصنیف مذکورہ iv. 32 اور 13 فروری 22 اکتوبر 1630ء کی COURT MINUTES 1626ء تک کی قیمتیں LETTERS RECEIVED 1-3, 235 ENGLISH FACTORY RECORDS (SURAT) VOL. 102 ORIGINAL CORRESPONDENCE 1241 سے ماخوذ ہیں۔ 1630ء میں سامان کی افراط اور اس کے بعد قیمتوں میں کمی کے لیے اور پھر بحالی ENGLISH FACTORIES IV-32, 80, 102, 180, 275-V, 82, 205 کے لیے مذکورہ تصنیف viii. 188, 282, ix. 121, 252, x. 199. اور یکم مئی 1661ء کا۔ DAGH REGISTER

سیسہ : سرکاری اجارہ داری کے لیے ENGLISH FACTORIES 1-323, iii 204-275 متبادل منڈیوں کے لیے مذکورہ تصنیف vi, 218, v. 69, iv. 104, ix. 71 157, 196, vii- LETTERS RECEIVED 1-33, ملاحظہ ہوں قلمبند کی ہوئی قیمتیں 204, 275, 235, 238, 300, ii-193, iii-6,9 iv, 296, 336, v-107, vi-159. ENGLISH FACTORIES i, 323, iii-334, iv- 32, 129, V.7, VI- ORIGINAL اور نیز 98, 204, viii-7, 216, 282, ix-140 AND X-199. CORRESPONDENCE 1794, 1801 سے ماخوذ ہیں۔

لونگ : مغلیہ دربار کی قیمت آئین اکبری (ترجمہ) ج 1 صفحہ 66 میں درج ہے بسورت کی ابتدائی قیمتیں ORIGINAL CORRESPONDENCE 609: TERPESTRAS SURAT APPENDIX VII AND ENGLISH FACTORIES ii-25 سے ماخوذ ہیں۔ 1633ء ORIGINAL CORRESPONDENCE 1543A. سے 1649ء تک کی قیمتیں تصنیف مذکورہ (1850.) اور 14 مئی 1633ء، 26 دسمبر 1641ء، 3 جولائی 1643ء اور 9 جون 1645ء

تصنیف مذکورہ DAGH REGISTER کے D سے ماخوذ ہیں۔ آخری اجارہ داری کی قیمتیں تصنیف مذکورہ
مورخہ ۱۷ اگست 1657ء یکم مئی 1661ء اور ENGLISH FACTORIES X. 157.
میں ملتی ہیں۔ مشرقی ساحلوں کی قیمتوں کے لیے ملاحظہ ہو تصنیف مذکورہ I. 41; ii. 136, v;
186, 47 اور 27 مارچ 1631ء، 25 نومبر 1632ء، 29 نومبر 1640ء
23 دسمبر 1641ء، 29 دسمبر 1644ء 14 مئی 1645ء 3 جون 1661ء DAGH REGISTER
فصل ۵: شمالی ہندوستان میں غلوں کی قیمت پر اکتوبر ۱۹۱۷ء اور جولائی ۱۹۱۸ء JOURNAL R. A.
میں بحث آئی ہے۔ سورت کی قیمتیں ENGLISH FACTORIES I, 63 LETTERS RECEIVED 181
سے ماخوذ ہیں۔ قحط کی قیمتیں اور ان کی بحالی کے لیے ENGLISH FACTORIES IV, 95, 122,
تخفیف اخراجات 165, 196, 209 VI. 146, 149, 151, 177.
کو تصنیف مذکور vii. 121, 171; viii, 245; ix. 14, 148. 216. میں چپراسیوں کی
اجرت کی تصنیف مذکور 151. V اور OWINGTON 392 میں بیان کیا گیا ہے۔ 51-1658ء
کی قلت کے لیے ENGLISH FACTORIES X. 196, 306 اور غلہ کی سمندری راہ سے منتقلی
کے لیے تصنیف مذکورہ iv, 196, viii, 74, 106.
سورت کی ٹکسال کا حوالہ تصنیف مذکور i. 36, 218, v. 68, 216. vi - 86 اور ملاحظہ
ہو آئین اکبری (ترجمہ) ج ۱ ص ۳۱ میں آیا ہے۔ مشرقی ساحلوں پر اجرت کے لیے ملاحظہ ہو،
ENGLISH FACTORIES X. MATHWOLD NO. 1 بنگال میں قیمتوں کے اضافہ کے لیے تصنیف
مذکور 407. x اور اس کے قبل کی ارزانی کے لیے تصنیف مذکور ORIGINAL CORRESPON-
DENCE 2188, PURCHAS II, X. 1720 1737- اور METHWOLD. 1005 ملاحظہ ہو۔
ولندیزیوں کی بنگال میں تجارت کی مالیت متعلقہ برسوں کے لیے DAGH REGISTER کے
مسلسل اندراجات سے ماخوذ ہے۔

فصل ۶: سورت میں سونے کی قیمت کے متعلق بیانات ENGLISH FACTORIES
III. 296, IV. 123, V. 121, VIII. 7, IX. 141, پر مبنی ہیں۔ تانبہ کے حالات پر
INDIA AT THE DEATH OF AKBAR 148 ff میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بحث آئی
ہے۔ مبادلہ کی ابتدائی شرحیں LETTERS RECEIVED I. 34, III. ... میں
اور ENGLISH FACTORIES I. 100, 114 سے 1636ء اور اس کے بعد کی شرحیں

تصنیف مذکور IV-206 اور VI-244 اور 26 جون 1661ء کے DAGH REGISTER سے ماخوذ ہیں۔ تانبہ کی درآمد کے لیے تصنیف مذکور مورخہ 22 مارچ 1636ء، 14 مارچ 1637ء، 20 فروری اور 30 اکتوبر 1648ء، 12 اپریل 1661ء اور متعدد دیگر ذیلی اندراجات اور نیز "ENGLISH FACTORIES II-260, V-81 n -101, 100." ملاحظہ ہو۔
1661ء کے بحران کو تصنیف مذکور X-306 میں اور اسے زیادہ تفصیل کے ساتھ اس سال کے DAGH REGISTER کی متعدد عبارتوں میں بیان کیا گیا ہے۔

باب ۶

پیداوار اور صَرف

فصل ۱ پیداوار میں تبدیلیاں

زیر مطالعہ عہد کے دَوران پیدا کرنے کا جو نظام رائج تھا اسے تصنیف 'انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر' کے تیسرے اور چوتھے بابوں میں بیان کیا جا چکا ہے لہٰذا اس کو مکرّر بیان کرنا تضیع اوقات کے مترادف ہوگا۔ سترہویں صدی کے نصفِ اوّل کے مآخذ میں اس نظام کے باضابطہ یا تفصیلی حالات نہیں ملتے لیکن انھیں ضمنی طور پر اس کے عملی طریقوں پر کافی مواد فراہم کیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کہنا مبالغہ آرائی نہ ہوگی کہ تجارتی تحریروں میں مندرج پیدا کرنے والوں کا ہر عمل میری مذکورہ تصنیف میں بیان کیے ہوئے نقطۂ نگاہ کے مطابق ہے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان تحریروں کی تعبیر اس سے مختلف مفروضہ پر ممکن نہ تھی۔ زمین کو جو ملکی آمدنی کا اہم ترین ذریعہ تھا۔ کسان چھوٹی چھوٹی آراضیوں میں بیشتر بغیر کسی سرمایہ کے سہارے کاشت کرتے تھے اور وہ اپنی پیداوار کا زیادہ حصہ حکومت کو مالگذاری کے طور پر دے دیتے تھے۔ پیدا کرنے کی دوسری قسمیں، مثلاً کان کھدائی یا دستکاری کو بھی اسی طور چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں منظم کیا گیا تھا اور ان کو بھی سرمایہ کی کمی اور حکومت یا اس کے نمائندوں کے مطالبات کی وجہ سے پریشانیاں لاحق رہا کرتیں۔ پیدا کرنے والے بالعموم منڈی میں شرکت کے متمنی رہا کرتے لیکن ان کے حالات اس کی اجازت نہ دیتے کہ وہ اپنے لیے نئی منڈیاں تلاش کر سکیں۔ ہمارے عہد میں اِس نوعیت کی پیداواری قوتوں کا وجود جیسا کہ دورِ حاضر میں بھی

یورپ میں پایا جاتا ہے، مفقود تھا اور جیسا کہ آگے ذکر آئے گا، اس عہد کے مخصوص حکومتی نظام کا ماحول، اس تھوڑے بہت حوصلہ کے لیے جو لوگوں میں جوکھم کام کرنے کے لیے پایا جاتا تھا، سازگار ہونے کے بجائے ناسازگار ثابت ہوتا تھا۔ اگر ہمارے عہد کے اختتام کا ۱۳ء کے آغاز سے موازنہ کیا جائے تو ہم درمیانی مدت میں پیداواروں یا ان کے پیدا کرنے کے طریقوں میں کوئی تبدیلی نہ پائیں گے اور اس عہد کی تجارتی تحریروں میں ہمیں صرف ان کوششوں کا جو خریداروں کی نامزد کی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے سلسلہ میں کی جاتی تھیں یا یہ کہ ان کوششوں میں کسی حد تک کامیابی حاصل ہوسکی اور ان کے علاوہ سرکاری مزاحمتوں کی مختلف صورتوں کا بیان ملتا ہے۔

جہاں تک زراعت کا تعلق ہے تجارتی اہمیت کی پیداواروں کی فہرست میں صرف ایک تبدیلی کا پتہ چلتا ہے یعنی تمباکو کا ظہور[1]۔ کسی پچھلے باب میں ذکر آچکا ہے کہ ساحل کورومنڈل اور نیز گجرات سے اس کی خشک پتیوں کی برآمد شروع ہوچکی تھی اور اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس کا ہندوستان میں استعمال بظاہر حیرت انگیز تیز رفتاری کے ساتھ بڑھ گیا تھا۔ 1617 میں جہانگیر نے اس کے حقہ میں استعمال کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ یہ ممانعت نتیجہ خیز ثابت ہوئی یا نہیں اس سے صرف نظر کرتے ہوئے ہم اس حکم سے کم از کم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ اس وقت یہ عمومی استعمال میں داخل ہو رہی تھی۔ منّی کا عہدِ عالمگیری کے اوائل کے متعلق بیان ہے کہ ٹیکسوں کا اجارہ دار صرف دہلی میں 5000 روپیہ یومیہ تمباکو کے محصول کے طور پر ادا کرتا تھا۔ ہم اس رقم کی صحت پر تو اس سبب سے کہ یہ ناممکن طور پر زیادہ ہے شبہہ کرسکتے ہیں لیکن ہمیں اس بیان کو اس کے عمومی استعمال کی سند کے طور پر قبول کرنے میں عذر نہ ہونا چاہیے۔ منّی یہ بھی کہتا ہے کہ

---

[1] ENGLISH FACTORIES (i 296 ii 70) میں مندرجہ ذیل یادداشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ بسکٹ کی تجارت ہوا کرتی تھی۔ مگر اس اطلاع کی تصنیف مذکورہ vii 66 پر صحت کی گئی ہے۔ کبھی کبھی آلو کا بھی ذکر آیا ہے۔ METHWOLD 995 & ENGLISH FACTORIES 191. لیکن مجھے کوئی ایسی چیز نہ مل سکی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اس کی تھوک تجارت ہوا کرتی تھی اور یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ آلو میں کون کون سی گانٹھ دار ترکاریاں شامل ہیں۔ سترھویں صدی کے دوران اس لفظ کا مفہوم تبدیل ہوا ہے۔ غالباً مذکورہ یادداشتوں میں میٹھے آلو (بٹاٹا) کا ذکر آیا ہے۔

اس کے محصل کے ایک انتہائی ظالمانہ فعل کے باعث اس کا محصول منسوخ کر دیا گیا۔ پھر وہ اس منسوخی سے غریبوں کو جو فائدہ پہنچا تھا اس پر رائے زنی کرتا ہے۔ اس کے اس اظہارِ خیال سے بھی اس کے عمومی استعمال کا پتہ چلتا ہے۔ اس طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ایک نئی اور نفع بخش تجارتی پیداوار نے اپنے لیے جگہ بنالی تھی۔ لیکن جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے یہ واحد تبدیلی تھی جو عمل میں آئی۔

زرعی پیداواریں جن کے لیے تجارتی مانگ بڑھی، تیل اور کپاس تھے۔ ہم اس میں ریشم کا بھی اضافہ کر سکتے ہیں کیونکہ تجارت میں کام آنے والے بیشتر ریشم کو ان پالتو کیڑوں سے پیدا کیا جاتا تھا جنھیں خوراک فراہم کرنے کے لیے شہتوت کے پیڑوں کی کاشت کی جاتی تھی۔ کسی پچھلے باب میں گزر چکا ہے کہ یورپی تاجر جو تیل، سوت اور 'کیلیکو' باہر لے جایا کرتے اس کا کم از کم بیشتر حصّہ قطعی طور پر نیا کاروبار تھا اور یہی صورت بنگال کے ریشم کے لیے جاپانی منڈی کی بھی تھی۔ اس امر سے کہ یہ جملہ مانگیں پوری ہو رہی تھیں، واضح ہوتا ہے کہ پیدا کرنے کا عمل ترقی پذیر تھا۔ کسان اپنی کاشت کے انتخاب میں محض رواج کی پابندی نہ کرتے بلکہ منڈیوں کی مانگ کو بھی پورا کرنے کی کوشش میں رہا کرتے تھے۔ انگریز تاجروں نے خام مال کی کمی کو، قحط کے بعد گجرات میں سوتی سامان کی قلت کا جزوی سبب قرار دیا۔ "جو ہمارے خیال کے مطابق خاص طور پر پچھلے چند برسوں میں ہر طرح کے غلوں کی زیادہ گرانی کے باعث ہے جس نے بیشک گاؤں والوں کو ان راستوں پر لگا دیا جو ان کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش ہوں اور اس لیے انھوں نے کپاس کی کاشت بند کر دی" ساتھ ساتھ 1644 کے اوائل کی اطلاع کے مطابق مانگ میں کمی اور قیمتوں میں زیادہ تخفیف کے باعث سندھ میں تیل کی پیداوار سال بہ سال کم ہوتی جا رہی تھی۔ بہر حال ممکن ہے کہ رسد کی طلب سے موافقت ناقص یا کم از کم سست رہی ہو۔ پچھلے باب میں بتایا جا چکا ہے کہ تقریباً 1622 میں گجرات میں تیل کی قیمتوں میں کمی کا سبب غالباً پچھلی یورپ کی نئی مانگ کا ایک مبالغہ آمیز تخمینہ تھا اور دوسری اشیاء کے معاملہ میں، سرمایہ کی کمی، کسانوں کے موقع سے فائدہ اٹھانے میں مانع رہا کرتی تھی جیسا کہ 1644 کے اواخر میں سندھ میں اور ایک سے زائد بار ساحل کورومنڈل پر پیش آیا۔

ایک مخصوص چیز کی مانگ میں اچانک اضافہ کے نتیجہ میں جو واقعات پیش آتے

ان سے اس موضوع پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ بحرِ قلزم کی تجارت میں انگریزوں کی شرکت کی ممانعت، جس کا پہلے ذکر آیا ہے، جزوی سبب یہ خطرہ تھا کہ تمام تاجروں کے لیے سُوتی سامان کا ذخیرہ کافی نہ ہوگا اور 18/16 میں فی الواقعی ایسا ہی پیش آیا۔ پھر دس برس بعد بنکروں نے اپنے خام مال کے برآمد کیے جانے پر تشویش محسوس کر کے سُوت کے انگریز خریداروں سے مقاطعہ کیا۔ منڈی میں کپڑے یا سُوت کے ذخیروں کی معمولاً کمی کے پیشِ نظر میرا خیال ہے کہ مذکورہ دونوں صورتوں میں ان کے خطرات برحق تھے۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ اِس نوعیت کے واقعات دوبارہ پیش نہ آئے۔ اِن دِقّتوں کے چند برسوں بعد ہم دیکھتے ہیں کہ انگریز بہت زیادہ مقدار میں سُوتی مال اور ولندیزی کم از کم اسی قدر زیادہ مقدار میں سُوت خرید رہے ہیں۔ اور اب ان کی خریداریوں کی کوئی مخالفت نہیں کی جا رہی ہے۔ اس سے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اب خام کپاس اور سُوت کی رسد بڑھی ہوئی طلب کے مطابق ہو چکی تھی۔ انگریز تاجروں کی نیل کی بالکل ابتدائی خریداریوں کے سلسلہ میں ہمیں اس قسم کی کسی دِقّت کی اطلاع نہیں ملی، لیکن نیل کے معاملہ میں یاد ہوگا کہ جیوں ہی انگریزوں نے اپنی خریداری واقعی میں شروع کی اسی وقت جنگ کے باعث پھر پرتگالیوں کی مانگ رُک گئی۔ اس طور پر موجود ذخیرہ جُملہ خریداریوں کے لیے اگر زیادہ نہیں تو کم از کم کافی ثابت ہوا۔ بٹاویا جرنلس، میں اہم برسوں کے ریشم کے اندراجات موجود نہیں ہیں اور نہ ہی مجھے اس امر کی کوئی اطلاع مل سکی کہ ولندیزیوں کی خریداریوں کی ابتدا میں مخالفت ہوئی یا نہیں لیکن یہ واضح ہے کہ جب اس کی نئی تجارت قطعی طور پر مستحکم ہو گئی تو ان کی افراط برآمدات کی مقامی طور پر کوئی مخالفت نہیں کی گئی حالانکہ اگر اس کے نتیجہ میں ہندوستانی کاریگر اپنے خام مال سے محروم ہو گئے ہوتے تو ایسا ہونا متوقع تھا۔ لہٰذا اس معاملہ میں بھی زیادہ امکان اسی امر کا ہے کہ نئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے اس کی رسد میں اضافہ کیا گیا۔

یہ نتائج اس براہِ راست شہادت کے مطابق ہیں جس کا اوپر ذکر آیا ہے کہ کسان منڈی کے مطالبات پورا کرنے میں اپنی پوری سعی کرتے تھے اور نیز یہ اس نتیجہ کو بھی حق بجانب ثابت کرتے ہیں کہ ولندیزیوں اور انگریزوں کی خریداریوں کے نتیجہ میں نیل، کپاس اور غالباً ریشم کی بھی پیداوار میں توسیع ہوئی۔ ان کے علاوہ زیرِ مطالعہ عہد کے دوران

مجھے زرعی پیداواروں میں کسی اور خاص تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا۔ اس عہد کی نمایاں خصوصیات کا تعلق سامانوں کے پیدا کرنے کے بجائے ان کی تقسیم سے ہے اور ہم ان کا بہ سہولت مطالعہ اس عہد کے مالی نظم و نسق کے ذیل میں جو ان دنوں اہم ترین عامل کی حیثیت میں کارفرما تھا، کر سکتے ہیں۔ فی الوقت اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ اگر کسانوں کی آمدنی کی بچت صفر کے برابر نہ تھی تو یہ کمی کی طرف ضرور مائل تھی۔ پس اسی تناسب سے ان کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کا حوصلہ پست ہوتا جا رہا تھا۔ ان دنوں کسان کاروبار کی اصل محض اس قدر تھی کہ وہ سال بہ سال منڈی کی مانگ کے بدلتے ہوئے حالات کے لحاظ سے اپنی کاشت میں ردّ و بدل کرتا رہے اور پہلے گزر چکا ہے کہ حکومت کی دخل اندازی کے امکان نے ان حالات کو پیچیدہ بنا دیا تھا اور جیسا کہ تیل کی اجارہ داری سے ظاہر ہوتا ہے، یہ دخل اندازی اس کے متوقع منافع میں مزاحم ہو سکتی تھی۔ اس سے آگے بڑھنے کی کوشش غالباً عقلمندی کے خلاف ہوتی۔ علاوہ بریں موجودہ تحریروں سے بھی اس قسم کے کسی اقدام کا پتہ نہیں چلتا۔

زراعت کے متعلق ابھی جو کچھ کہا گیا ہے اس کے زیادہ حصّہ کا اطلاق پیدا کرنے کی دوسری شکلوں پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ معدنیات کے معاملہ میں اس عہد کی نمایاں ترین خصوصیت پہلے مشرقی ساحل پر اس کے بعد بہار میں شورہ کی اہمیت کا اضافہ ہے۔ اس کی زیادہ برآمد کے نتیجہ میں کثیر تعداد میں کام کرنے والوں کو روزگار فراہم ہو جاتا تھا۔ لیکن اس سے صرف ایک محدود ہی علاقہ کی آبادی مستفید ہو پاتی تھی۔ ممکن ہے کہ علاقۂ گولکنڈہ کے لوہا پیدا کرنے والوں کو بٹاویا کی مانگ سے کچھ فائدہ پہنچا ہو کیونکہ بعض اوقات ولندیزیوں کی مسولی پٹم سے لوہے اور فولاد کی برآمدات زیادہ ہوا کرتی تھیں لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ یہ کس حد تک کوئی نئی صورت حال تھی اور یہ کہ اس کے اثرات لازمی طور پر مقامی ہی تھے[1]۔ دوسری طرف، بعض تانبہ کی کانوں کی پیداوار کے ختم ہونے کا

---

[1] تقریباً 1660ء میں ولندیزی گوداوری کے ڈیلٹا میں لوہے کی صنعت کو بڑھانے میں مصروف تھے اور ان کے لائے ہوئے دستکاروں نے بظاہر اس کی ٹکنیک کو صحیح معنوں میں ترقی دی لیکن ان واقعات کا تعلق اس کے بعد کے عہد سے ہے۔

امکان پایا جاتا ہے جیسا کہ منڈی کی روش سے ہم نے پچھلے باب میں نتیجہ نکالا ہے اور اس موضوع پر ہماری معلومات ان تبدیلیوں پر بالکل ختم ہو جاتی ہیں۔

مصنوعات کے سلسلہ میں بھی، پچھمی یورپ کی نئی مانگ کو پورا کرنے کی غرض سے 'کیلکو' کی تیاری میں اضافہ کے علاوہ کسی اور اہم تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا۔ اس دَور کی تجارتی تحریروں میں بنکروں کی حیثیت کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف تو ان کا ہر فرد اپنے لیے کام کرتا، اور دوسری طرف وہ اس سرمایہ دار کے قابو میں رہا کرتا جو سامانوں کی خریداری اور نیز کام کے دَوران گزر بسر کے لیے اسے روپیہ پیسہ فراہم کرتا۔ تاجروں کا زر پیشگی ادا کرنے کا طریقہ اس قدر معروف ہے کہ اس کی مزید صراحت ضروری نہیں معلوم ہوتی۔ ولندیزی اور انگریز خریداروں نے یہاں پہنچنے پر اس طریقہ کو بخوبی رائج پایا تھا۔ لہٰذا انھیں بھی اپنی ضرورت کے سامانوں کی فراہمی کے لیے اسے اختیار کرنا پڑا۔ بہرحال جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے اس کا طریقِ عمل سہل نہ تھا مگر فراہمیٔ سرمایہ کے کسی اور طریقہ کی غیر موجودگی میں یہ ناگزیر تھا۔ بنکروں کے لیے غالباً ولندیزیوں اور انگریزوں کی آمد نفع بخش ثابت ہوئی۔ باوجود پیشگی رقم قبول کر لینے کے، صورتِ حال میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہ ہوئی بلکہ منفرد بنکر کو مالک کا انتخاب کرنے کے لیے نسبتاً زیادہ وسیع میدان مل جاتا تھا۔ اور زیادہ تعداد میں ایسے لوگوں کی موجودگی کے باعث جو اس کی خدمات حاصل کرنے کے خواہشمند رہا کرتے، یہ ممکن تھا کہ وہ معاہدہ کی شرائط کو اپنے لیے بہتر بنا سکے۔ کسی مخصوص معیار کے سامانوں کے حصول کے امکان کے متعلق متناقض اطلاعات سے صحیح صورتِ حال کی صراحت کی جا سکتی ہے۔ متعدد خریداروں کے مقابلہ کی صورت میں بنکر اپنی تیاری کے مال میں کوئی تبدیلی نہ کرتے جبکہ ولندیزیوں اور انگریزوں کی عملی اجارہ داری کی وجہ سے انھیں پوری منڈی کے مطلوبہ معیار کے قریب قریب مطابق سامان مل جایا کرتا تھا اور جو کاروباری سہولتیں ولندیزیوں کو پولی کٹ میں اور بعد میں انگریزوں کو مدراس میں اپنی اپنی حیثیتوں کی وجہ سے حاصل تھیں ان میں سے غالباً ایک یہ تھی کہ مقامی کاریگر تھوڑا بہت ان کے زیرِ اثر رہا کرتے۔

بنکروں کی حیثیت ہمیشہ ایک آزاد عامل کی ہوا کرتی۔ پچھلے باب میں ذکر آ چکا ہے کہ مشرقی ساحل اور گجرات میں ان کے کام کو کبھی کبھی اجارہ داری میں لے لیا جاتا۔

اسی طور پر بنگال میں بھی نفیس کپڑوں کے بننے والے بظاہر دربار شاہی کے نافذ کردہ تھوڑی بہت پابندی کے تحت رہا کرتے تھے کیونکہ وہاں ہم شاہی بنکروں کے ایک داروغہ (اوورسیر) کو تعینات پاتے ہیں۔ مجھے اس عہدہ کی تفصیلات پر کوئی ہمعصر بیان نہ مل سکا لیکن ولندیزی تاجروں کو اس عہدہ داری جانب سے اپنی تجارت میں مزاحمت کی شکایت رہا کرتی تھی اور میرا قیاس ہے کہ اس کا کام شاہی محل کو تن زیب (مسلن) فراہم کرنا تھا۔ یہ ایک ایسی ضرورت تھی جسے عام تاجروں کی مانگ پر اولیت حاصل رہا کرتی تھی۔

دیگر زمروں کے کاریگروں کے متعلق ہماری معلومات قلیل ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنائی کی صنعت کا نظام ہی بظاہر عام طور پر رائج تھا۔ مثلاً شورہ کی فراہمی کا انحصار پٹنہ کے نواح میں زر پیشگی کی ادائیگی پر تھا اور علاقہ بیانہ کے بعض حصوں اور سندھ میں و مشرقی ساحل پر نیل حاصل کرنے کے لیے پہلے سے پیشگی رقم دینا ضروری تھا۔ حالانکہ گجرات میں اس کی تیاری پر مقامی سرمایہ داروں کا قبضہ تھا جو قیاساً اس کے کاشتکاروں کی مالی امداد کیا کرتے۔ حالات بدیہی طور پر ایسے تھے جو اس کے طریق عمل کی کسی بلا ارادہ اصلاح میں حائل تھے اور چند تبدیلیاں جو تحریروں میں ملتی ہیں بظاہر ولندیزیوں یا انگریزوں کی پیش قدمی کی رہین منت ہیں۔ شورہ کی صفائی کے کام میں تانبہ کے ظروف کا استعمال مشرقی ہندوستان کے معیار کے مطابق گجرات میں نیل تیار کیے جانے کی کوشش، رنگ سازی، رسی کی تیاری اور غالباً جہاز سازی کے طریقوں میں بھی تھوڑی بہت اصلاح، یہی کل تبدیلیاں تھیں جو ظہور میں آئیں[1]۔

---

[1] نیل اور شورہ کی تیاری میں جو بہتری کی گئی یا اس سلسلہ میں جو کوششیں ہوئیں ان کو ابواب 4، 5 میں بیان کیا گیا ہے۔ 1647 میں احمد آباد میں رنگائی کا ایک کارخانہ قائم کیا گیا تھا۔ ENGLISH FACTORIES VII, 90, 127 اس کا مقصد اس نقصان سے بچنا تھا جو مقامی رنگ سازوں کی نااہلی کی وجہ سے ہوتا تھا۔ باوری BOWERY 102, 105 کے بیان کے مطابق ولندیزی پوربی ساحلوں پر رسی بنانے کا کام کرتے تھے اور مقامی جہاز سازوں نے اپنے فن کو بیشتر انگریزوں سے سیکھا تھا لیکن مجھے شبہ ہے کہ ہمارے عہد میں جو کچھ بھی ترقیاں ہوئیں وہ ولندیزیوں کی پیش قدمی کی مرہون ہیں۔ ان دنوں ریشم کو ریل پر چڑھانے کے کام کو بھی ترقی دینے کی کوشش ہو رہی تھی (ENGLISH FACTORIES X-296) لیکن اس کے نتائج ہمارے عہد کے بعد ظاہر ہوتے۔

شہری کاریگروں کی اُجرتیں جگہ جگہ پر مختلف تھیں لیکن کسی ایک علاقہ میں یہ حیرت انگیز طور پر یکساں رہا کرتیں اور اُجرتوں کا کاریگروں کی ہنرمندی سے کوئی علاقہ نہ ہوا کرتا۔ پلسارٹ آگرہ کے جملہ طبقہ کے کاریگروں کی اُجرتوں کا یکساں ہونا بتاتا ہے۔ اس کے چند برس قبل میتھولڈ نے مشرقی ساحل پر ایسی ہی صورتِ حال کی نشاندہی کی تھی۔ اُجرتوں کی اس یکسانیت کی وجہ سے مخصوص طبقوں کے متعلق موجود معلومات کی بُنیاد پر ہم عام کاریگروں کے بارے میں نتائج اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے بشرطیکہ وہ ایک ہی علاقہ سے متعلق ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ کاریگروں کے متعلق ضروری مواد کی اِس قدر کمی ہے کہ ہم اس کی بُنیاد پر عمومی نتائج نہیں اخذ کرسکتے[1]۔ اور ہمیں موازنہ کی غرض سے پوری تجارتی کوٹھیوں کے چپراسیوں یعنی ایسے ملازمین کی ماہانہ اُجرتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے جن میں کوئی مخصوص ہنر نہ ہوا کرتا۔ لیکن ماہانہ اُجرتوں کے مفہوم میں ایک دھوکے کا امکان پایا جاتا ہے۔ پلسارٹ کے قول کے مطابق آگرہ میں اکثر 40 دن کا مہینہ شمار ہوتا تھا اور اس مدّت کے لیے متعدد زمروں کے ملازمین 3 یا 4 روپیہ پاتے تھے اور پھر بعض مہینوں کی تنخواہ کپڑوں یا دیگر اشیاء کی شکل میں ادا کی جاتی تھی۔ پس 4 روپیہ کی "ماہانہ" شرح واقعتہً 3 روپیہ سے کافی کم کی کمائی کے مرادف ہوسکتی تھی۔ چونکہ ان معاملات میں ہندوستان کے بیشتر حصّہ کے لیے آگرہ ہی کو معیار تصوّر کیا جاتا تھا۔ لہٰذا ہم یہ شُبہ کرسکتے ہیں کہ بعض دیگر مقامات پر بھی شرحیں اِسی طرح بڑھا کر دکھائی جاتی رہی ہوں گی۔ اِسی طور پر گولکنڈہ میں بھی اُجرت کے بدلہ میں مال دینے کا طریقہ رائج تھا کیونکہ ایک ولندیزی سرگذشت کے مطابق وہاں کا صوبیدار ایک تہائی گراں نرخ کے حساب

---

[1] AGRA ACCOUNTS میں' جا بجا' یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ تحریری اُجرتیں عہدِ اکبری کی ان اُجرتوں سے جو آئینِ اکبری (ج 2 ص 225) میں درج ہیں بمشکل ہی تبدیل ہوئی ہیں۔ اکبر کے عہد میں معمولی مزدوروں کو 2 اور 3 درم یومیہ دیا جاتا تھا۔ 1637 میں ولندیزی معمولی مزدوروں کو بالعموم 4 پیسہ (2 درم) اور ان سے بہتر کو 7 پیسہ اور بُوڑھیوں کو 12 اور 13 پیسے دیتے تھے۔ اکبر کے عہد میں باہنر کاریگروں کو 6 اور 7 درم مِلا کرتے تھے۔

سے چاول اور نمک اپنے ملازمین کو بطور اُجرت دیا کرتا تھا اور ممکن ہے کہ بعض غیر سرکاری مالکان بھی اپنے ملازمین کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرتے رہے ہوں۔

میتھولڈ تقریباً 1620 میں پوربی ساحلوں پر مروجہ شرحوں کو اس طور پر قلمبند کرتا ہے "اپنے تئیں یہ معلوم کرنے کے بعد" کہ تین پینس یومیہ" ایک ماہر کاریگر کے لیے زیادہ مزدوری ہے وہ اپنے ملازمین کو ایک پینس اور اس سے تھوڑا کم ادا کرتے ہیں"۔ اور گھریلو ملازمین ایک ریال آف ایٹ یا دو روپیہ ماہانہ پاتے ہیں۔ روپیہ کو 2 شلنگ 3 پینس کا فرض کرکے اور یہ تصوّر کرتے ہوئے کہ ان کی ملازمتیں مسلسل چلا کرتیں، بہترین کاریگر کی مزدوری $3\frac{1}{2}$ روپیہ، گھریلو ملازمین کی دو روپیہ اور معمولی کاریگروں (ماہر کاریگروں کے "ماتحتوں") کی $1\frac{1}{3}$ روپیہ یا اس سے کم تھیں۔ جیسا کہ پچھلے باب میں گزر چکا ہے کہ اس خطہ کے ملازمین کی اُجرت کی شرح تقریباً چالیس برس بعد تک تبدیل نہ ہوئی تھی اور ہم بجا طور پر یہ تصوّر کرسکتے ہیں کہ کاریگروں کی اُجرتیں بھی اسی طرح مستحکم رہیں حالانکہ اس مدّت کے بعد مجھے کوئی ایسے اندراجات نہیں ملتے جس سے میرے اس قیاس کی تائید ہوتی ہو۔ میں شمالی ہندوستان کے متعلق بھی تقابلی اعداد حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ اور گجرات کے لیے ہمارے پاس صرف چپراسیوں کی اُجرتوں کا وہ تقابل موجود ہے جو پچھلے باب میں مرتب کیا گیا تھا۔ پس ہمارے عہد میں شہری اُجرتوں میں اضافہ کی کوئی سند فراہم نہیں ہوتی اور ملازموں کی ماہانہ تنخواہوں کی مثال سے بھی کسی تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا۔[1]

---

[1] اس سلسلہ میں ایک اور اطلاع قابلِ توجہ ہے۔ 1636 میں قیمتوں کے معمول پر آجانے کے بعد ایک خبر رساں کو جسے سورت میں روک لیا گیا تھا تین پیسہ یومیہ گزارہ کے طور پر دیے گئے تھے۔ ہم اسے قلیل ترین رقم جو ایک" لاغر اور کاہل بدمعاش" کے گزر اوقات کے لیے کافی ہو تصوّر کرسکتے ہیں۔ اس شخص کا ایسے ہی حقارت آمیز طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ ENGLISH FACTORIES V, 294 یہ حساب کرنے پر تقریباً $1\frac{1}{2}$ روپیہ ماہانہ نکلتی ہے اور ہم اس کا دربارِ اکبری کے ادنیٰ ترین غلام کے ایک درم یومیہ یا $\frac{3}{4}$ روپیہ ماہانہ کے گزارہ سے موازنہ کرسکتے ہیں۔ یہ دونوں اعداد بشرح معمول غلّہ کی تقریباً ایک ہی مقدار ظاہر کرتے ہیں۔

مملکتِ مغلیہ میں ہمارے عہد کے بیشتر حصّہ میں عوامی کاموں پر کثیر رقمیں صرف ہوتیں حالانکہ یہ رفاہِ عامّہ کے کام نہ تھے۔ رفاہِ عامّہ کے کاموں کی مثالیں جو میرے مطالعہ سے گزری ہیں وہ برہانپور میں جہانگیر کا تعمیر کردہ کارخانۂ آب رسانی اور عہدِ شاہجہانی میں پنجاب کی نہروں کی تعمیر یا مرمت ہے۔ اوّل الذکر تعمیر بالکل مقامی نوعیت کی تھی اور ہمیں اس کو ایک لحاظ سے فوجی کام تصوّر کرنا چاہیے کیونکہ برہانپور متعدد برسوں تک دکن میں مصروف شاہی فوجوں کا مستقر رہا اور اس تعمیر کا مقصد عوام کے لیے نہیں بلکہ فوج کے لیے پانی کا انتظام کرنا تھا۔ پنجاب کی نہریں غیر ملکی تخلیقی صلاحیتوں کا نتیجہ تھیں۔ اسے علی مردان خاں نے شروع کرایا تھا جو 1637 میں فارس سے یہاں پہنچنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد پنجاب میں بادشاہ کا نائب مقرّر ہو گیا تھا[1]۔ 1639 میں اس نے دریائے راوی سے ایک نہر نکالنے کی تجویز کی جو ایک لاکھ روپیہ کے تخمینی خرچ پر منظور ہوئی اور اس کے چند برسوں بعد اور اس کی نگرانی میں جمنا سے دہلی تک کی موجود نہر دوبارہ تعمیر ہوئی۔ مجھے آخر الذکر کام کے اخراجات کی کوئی تحریری شہادت نہ مل سکی لیکن غالباً یہ کم و بیش نہر راوی کے خرچ کے برابر اور نمائشی عمارتوں کے خرچ سے بہت کم رہا ہوگا۔ ہمیں ایسی عمارتوں کی ایک ایسی طویل فہرست ملتی ہے۔ جہانگیر نے لاہور اور آگرہ میں کثیر رقمیں صرف کیں لیکن اس سلسلہ میں عہدِ شاہجہانی میں حیرت انگیز ترقیاں دیکھنے میں آئیں۔ ہمعصر مصنفین نے اس کی بعض عمارتوں کی لاگت کو بیان کیا ہے۔ دولت آباد کی مسجد کی ۱۰ لاکھ، دہلی کے محل کی 60 لاکھ، آگرہ کے تاج محل کی 917 لاکھ۔ باوجودیکہ ان اعداد کے غلط ہونے کا امکان ہے۔ پھر بھی یہ لاہور کی نہر کے تخمینہ سے جو اس نوعیت کے ماخذ سے حاصل کردہ

---

[1] علی مردان خاں کو اکثر انجینئر بتایا جاتا ہے مگر اس کو غالباً ایک منصوبہ بند کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ عبدالحمید بادشاہ نامہ میں .ELLIOT VI- 67 لکھتا ہے کہ "علی مردان خاں نے بادشاہ کو مطلع کیا کہ اس کا ایک ساتھی نہریں بنانے کا ماہر ہے" اور جب نہر کی تعمیر کی منظوری حاصل ہوگئی تو خاں نے اس کی تعمیر کا کام اپنے ایک معتمد ملازم کے سپرد کیا۔" میرا قیاس ہے کہ انجینئر واقعتاً ایک فارس کا رہنے والا تھا جو علی مردان خاں کے ہمراہ ہندوستان آیا تھا۔

ہے، قابلِ موازنہ ہے۔ اس نوعیت کے کاموں کا فوری نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ عام تجارتی سرگرمیاں رُک جاتی تھیں۔ چنانچہ آگرہ کی تمام گاڑیاں دہلی کی تعمیرات کے لیے ضبط کرلی گئی تھیں اور ایک موقع پر ساحلوں پر جانے والے سامان اثنائے راہ میں کئی مہینوں تک پڑے رہے اس کے بعد شاہی افسروں نے ان کو کھیتوں میں پھینک کر گاڑیوں کو شاہی استعمال میں لے لیا" لیکن جبری خدمت اس دور میں ایک معمولی واقعہ تصور کیا جاتا تھا۔ اور اس سے بہت زیادہ پُرکشش موضوع یعنی ان تعمیرات پر لگے ہوئے کثیر التعداد کام کرنے والوں کے ساتھ برتاؤ اور ان کی اُجرتوں کے متعلق بظاہر کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔

تعمیری صنعت کی سرگرمیاں عوامی کاموں ہی تک محدود نہ تھیں کیونکہ مُلک کی ظاہری شکل دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں تعمیر پر روپیہ خرچ کرنا فیشن میں داخل تھا۔ فرانسسکو پلسارٹ کا اس موضوع پر ایک دلچسپ بیان موجود ہے جس کا تعلق عہدِ جہانگیری کے اواخر سے ہے۔ اس کے بیان کے مطابق 1626 تک اعتماد الدولہ کے مقبرہ پر 3½ لاکھ روپیہ صرف ہو چکے تھے اور اس کی تکمیل کے لیے ابھی مزید دس لاکھ روپیہ درکار تھے۔ وہ ملکۂ نور جہاں کی تعمیر کردہ متعدد سرایوں اور محلوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ ان تعمیروں سے ملکہ کا مقصد بقول اس کے دائمی ناموری کے حصول کے شوق کا تھا۔ امرا کی دولت کے عدم تحفظ پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہے کہ:

کسی چیز کو یہاں تک کہ نفیس عمارتوں، باغوں، مقبروں یا محلوں تک کو دوام حاصل نہیں۔ ہر شہر کے اندر اور ان کے نواح میں کھنڈرات دیکھ کر حیرت اور افسوس ہوتا ہے۔ ان عمارتوں کی دیکھ بھال صرف اسی وقت تک ہوتی رہتی ہے جب تک کہ ان کے مالک زندہ اور ان کے پاس ضروری وسائل موجود ہوں۔ تعمیر کرنے والے کے مرنے پر ان کی عمارات کی کوئی نگہداشت نہیں کرتا بلکہ ہر شخص خود اپنی اپنی عمارات بنوانے کی فکر میں رہتا ہے۔ اگر ان تمام عمارتوں کی دیکھ بھال اور مرمت ہوتی رہے تو ایک صدی کے دوران ہر شہر کے چاروں طرف بلکہ ہر موضع قدیم عمارتوں سے پُر ہو جائے گا۔ لیکن حقیقت امر یہ ہے کہ شہر کو جانے والی سڑکیں مسمار ستونوں سے پٹی پڑی ہیں۔

اس عہد میں تعمیر شدہ عمارات میں سے بعض کی فنی قدر و قیمت کو زیرِ بحث نہیں لایا

جاسکتا۔ لیکن ان کی معاشی اہمیت کا چونکہ تعلق بجائے پیدا کرنے کے صرف کرنے کے عمل سے ہے۔ لہٰذا یہ قدرتی طور پر ہمیں ان موضوعات کی طرف لے جاتی ہیں جن پر اگلی فصل میں بحث آئی ہے۔

فصل 2 صَرف

میں اس تصنیف میں جس کا حوالہ پہلے آچکا ہے اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ سترہویں صدی کے آغاز پر ہندوستان کی آبادی ایک مختصر مگر انتہائی دولتمند اور فضول خرچ اعلیٰ طبقہ، ایک کم تعداد اور کفایت شعار متوسط طبقہ، اور ایک کثیر التعداد ادنیٰ طبقہ جو دورِ حاضر کی طرح غریب مگر فی الجملہ اس وقت سے کافی بدتر عالم میں زندگی بسر کرتا تھا، پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد مزید شہادتیں جو میری تحقیقات سے گزریں، وہ بھی اسی نتیجہ کی تصدیق کرتی ہیں۔ پچھلی باتوں کی تکرار کا ذکر فضول ہوگا۔ لہٰذا اس فصل میں میرا خیال ہے کہ موجود مواد میں سے صرف اس قدر درج کروں جو ہمارے مذکورہ نتیجہ کی تشریح کے لیے ضروری ہو۔ چونکہ اس زاید شہادت میں کوئی تضاد نہیں پایا جاتا اس لیے میرا مجوزہ طریق کار حق بجانب معلوم ہوتا ہے۔ مجھے اپنے عہد کی تحریروں میں ایک واحد شہادت بھی ایسی نہیں ملتی جو میرے اخذ کردہ نتیجہ کو باطل کرے بلکہ برخلاف اس کے تائیدی شہادتیں بے شمار ہیں۔ میں یقین کرتا ہوں کہ موجود ماخذ کو مجموعی طور پر مطالعہ کرنے والے میرے اخذ کردہ نتیجہ کو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کریں گے۔

آگرہ میں ولندیزی کوٹھی کے افسرِ اعلیٰ فرانسسکو پلسارٹ[x] کے ہندوستان میں اپنے سات سالہ تجربہ کی بنیاد پر 1626ء میں مرتب کیے ہوئے بیان سے ہمیں اس عہد کے دوران شمالی ہندوستان کے معیارِ زندگی کے متعلق مفصل ترین واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ان کے بیان کے ترجمہ میں جو آگے آتا ہے، دیکھا جائے گا کہ سخت الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اگر ہم انھیں ان کے سیاق کی عبارت سے علیحدہ کر دیں تو ایسا محسوس ہوگا کہ یہ ایک سنسنی خیز تحریر ہے مگر اس کے طویل بیان کے ایک مجموعی مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا

---

x FRANCISE PELSART

معتدل مزاج اور باصلاحیت تاجر تھا جس کا اندازِ تحریر بالعموم سیدھا سادہ اور کبھی کبھی روزمرہ کی بول چال کا تھا اور جو اپنے ماحول سے گہری دلچسپی بھی رکھتا تھا۔ وہ اپنے چاروں طرف پائے جانے والے افلاس اور ظلم سے بے حد متاثر تھا اور ہمیں کبھی کبھی اس کی تحریر میں پائی جانے والی تلخی کو اس کی اپنے نادار پڑوسیوں کے ساتھ گہری ہمدردی کا مظہر تصور کرنا چاہیے۔ مملکتِ مغلیہ کے نظم و نسق کو بیان کرنے کے بعد وہ امیروں کی انتہائی فراوانی اور مطلق العنانہ اقتدار کے عالم میں اور عوام کی غایت درجہ کی محکومی اور فلاکت کی حالت میں زندگی کے طریقہ کو بیان کرتا ہے۔ مفلسی اس درجہ شدید اور جانگسل کہ عوام کی حالت کا نقشہ کھینچنا یا اسے بیان کرنا ممکن نہ ہو کیونکہ یہاں غایت درجہ کی تنگی کا گھر اور المناک مصائب کا مسکن دیکھنے میں آتا ہے۔ اس پر بھی عوام صبر کے ساتھ برداشت کرتے رہتے ہیں کیونکہ انھیں اس سے بہتر کسی چیز کی امید نہیں اور مشکل ہی سے کوئی شخص سعی کرتا ہے کیونکہ کسی ایسے زینہ کا حصول جس سے اوپر کی ترقی کی جا سکے، محال ہے۔ کسی کاریگر کا لڑکا بجز اپنے باپ کے پیشہ کے کوئی اور پیشہ اختیار نہیں کر سکتا اور نہ ہی وہ کسی دوسری ذات میں شادی بیاہ کر سکتا ہے۔

آبادی کے صرف تین طبقے یعنی کاریگروں، چپراسیوں یا ملازمین اور دوکانداروں کے ایسے ہیں جنھیں درحقیقت محض نام کی آزادی حاصل ہے۔ لیکن ان کی حیثیت بھی اپنی مرضی سے بنے ہوئے غلاموں سے تھوڑا ہی مختلف ہے۔ کاریگروں کے لیے دوگونہ مصیبت کم اُجرت اور ظلم کی ہے۔ ہر فن کے کاریگر جن کی تعداد کثیر ہے (کیونکہ کوئی کام جو ہالینڈ میں ایک تنہا آدمی انجام دیتا ہے یہاں ختم ہونے کے پہلے چار آدمیوں کے ہاتھ سے گزرتا ہے) صبح سے شام تک کام کرنے کے بعد صرف 5 یا 6 ٹکا[x] یعنی 4 یا 5 اسٹایورس[1] کما پاتا ہے۔ دوسری مصیبت، صوبیدار، امراء، دیوان، کوتوال، بخشی اور دیگر شاہی حکام کے نظام کی ہے۔

---

[1] بعض اوقات لفظ 'ٹکا' کا مفہوم سمجھنا دشوار ہوتا ہے۔ ولندیزی روپیہ اپنے 24 اسٹایورس کے مساوی تصور کرتے تھے۔ اس حساب سے یہاں 'ٹکا' اکبری درم کے برابر ہوا جس کے اُن دنوں تیس ٹکا ایک روپیہ کے برابر ہوتے تھے۔

TACKA X

اگر ان میں سے کسی کو بھی کاریگر کی ضرورت ہوتی تو اس آدمی کی مرضی معلوم کیے بغیر اُسے گھر یا راستہ میں پکڑ لیتے اور اس کے اعتراض کرنے پر اُسے خوب پیٹتے اور شام کو نصف اُجرت دے کر یا بغیر اُجرت ہی کے رُخصت کر دیتے۔ ان واقعات سے اس کی خوراک کی نوعیت کا آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ گوشت کی لذّت سے نا آشنا ہوتا جہاں تک ان کی یک رنگی روزانہ کی خوراک کا تعلق ہے انھیں تھوڑی سی کھچڑی کے علاوہ کچھ اور میسّر نہ آتا جیسے موتھ میں چاول[1] ملا کر تھوڑی سی آگ پر اُس وقت تک پکاتے رہتے جب تک کہ پانی جل نہ جائے اور وہ اسے شام کے وقت تھوڑے سے گھی کے ساتھ کھا لیا کرتے۔ دن میں وہ تھوڑی بھُنی ہوئی کھچڑی کوئی اور غلّہ چباتے جو ان کے قول کے مطابق ان کے لاغر پیٹ کو آسودہ کرنے کے لیے کافی ہوتا۔

ان کے مکانات مٹّی کے اور چھت چھپّر کی ہوتی۔ فرنیچر بہت ہی تھوڑا یا بالکل نہ ہوتا۔ صرف چند مٹّی کے برتن جن میں پانی رکھتے یا کھانا پکاتے ہیں۔ اور دو بستر کیونکہ یہاں شوہر اور بیوی ساتھ نہیں سوتے۔ ان کے بستر کے کپڑے تھوڑے محض ایک چادر یا دو بچھانے اور اوڑھنے دونوں مصرف کے لیے۔ یہ گرمی کی راتوں کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ لیکن موسم سرما میں شدید سردی کی راتیں واقعی میں انتہائی تکلیف دہ ہوتی ہیں اور وہ اُپلوں کی تھوڑی سی آگ سے اپنے کو گرم رکھتے ہیں۔ چونکہ ان کے گھروں میں آتشدان یا چمنی کا انتظام نہیں ہوتا لہٰذا وہ آگ کو دروازہ کے باہر سُلگاتے ہیں۔ اس آگ کی وجہ سے پُورے شہر میں اس قدر زیادہ دُھواں ہو جاتا ہے کہ آنکھوں سے پانی کا بہنا اور گلے کا گھُٹنا لازمی ہے۔

اس مُلک میں چپراسیوں یا ملازموں کی تعداد بہت زیادہ ہے[2] ... مغل

---

[1] اصل میں لفظ 'کھچری' ملتا ہے۔ میں نے GRAENE ERTIJENS, (لفظاً ہری دال) کا ترجمہ موتھ کیا ہے۔ AGRA OCCOUNTS میں لفظ موتھ کی تشریح ایک ایسے ہی لفظ سے کی گئی ہے۔ موتھ کی دال کو نباتات داں PHASEOLUS ACONTI FOLIUS کہتے ہیں۔

[2] یہاں جو عبارت حذف کر دی گئی ہے اس میں مختلف مضامین کے فرائض منصبی کا تفصیلی

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ان کے سُست کاموں کی وجہ سے انھیں اُجرتیں کافی منہائیاں کرنے کے بعد ادا کرتے ہیں۔ بیشتر امراء چالیس دن کا مہینہ شمار کرتے ہیں اور اس مدّت کے لیے انھیں 3 یا 4 روپیہ ادا کرتے ہیں۔ پھر کئی کئی مہینوں کی اُجرتوں کو بقایا میں رکھ کر انھیں پھٹے پُرانے کپڑوں یا دوسری چیزوں کی شکل میں ادا کیا جاتا ہے۔ ان میں سے بہت تھوڑے اپنے مالک کا دیانتداری کے ساتھ کام انجام دیتے ہیں۔ وہ جن چیزوں کی بھی ممکن ہوتا ہے چوری کر لیتے ہیں اور اگر وہ اپنے مالک کے لیے ایک روپیہ کا بھی غلہ خریدیں تو اس میں ان کا اپنا حصہ یا دستوری (کمیشن) وصول کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اس قدر کم اُجرتوں پر وہ اپنا اور اپنے گھر والوں کا گزر نہیں کر سکتے۔ پس ان کی حالت اور طریقۂ زندگی اس کاریگر سے بہت ہی تھوڑا مختلف ہوتا ہے جو اپنے افلاس کی دولت[lw] میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

دُکاندار خواہ مسالے، مفرد ادویات، پھل، کپڑے یا کسی بھی اور چیز کی تجارت کرے، کاریگر سے قطعی طور پر بہتر حالت میں رہتا ہے اور ان میں سے بعض تو دولتمند بھی ہوتے ہیں لیکن ان کی کوشش یہی رہتی ہے کہ ان کی دولت ظاہر نہ ہو ورنہ ان پر فرضی الزام لگا کر ان کا اثاثہ قانوناً ضبط کر لیا جاتا کیونکہ مخبر مکھیوں کی طرح حکام کے گرد و پیش لگے رہتے ہیں اور وہ دوست و دشمن میں امتیاز نہیں برتتے اور بوقت ضرورت حکام کی خوشنودی کی خاطر جھوٹی گواہی بھی دیتے ہیں۔ مزید براں ان پر اس قدر ظلم روا رکھا جاتا کہ اگر شاہی امراء یا صوبیدار ان کے کسی سامان کے خواہش مند ہوتے تو انھیں اسے بہت تھوڑی یعنی نصف سے کم قیمت کے عوض فروخت کرنا پڑتا۔

یہ ان غریب بدبختوں کی زندگی کا ایک مختصر سا خاکہ ہے۔ ہم ان کی منکسرانہ غلامی

(ص 247 سے آگے)
بیان اور ان کے حدود و اختیارات کی رسمی تفریق درج ہے۔ پلسارٹ صورتِ حال کا ایک انگریزی جہاز کے حالات سے موازنہ کرتا ہے: جہاں اگر اگلا مستول پانی میں گر جاتا تو بڑا جہازراں آگے بڑھ کر اسے اٹھانے میں اپنی کسرِ شان تصور کرتا حالانکہ وہ ایسا کرکے اسے بچا سکتا تھا۔ پرتگالیوں کے اس نوعیت کے آدابِ ملازمت کا لوگ عام طور پر تمسخر اُڑایا کرتے تھے۔

[lw] لفظاً "اپنے معقول افلاس میں"۔ اس قسم کے انوکھے فقرے اس وقت رائج تھے۔

کا ان بے بس حقیر زمینی کیڑوں یا چھوٹی مچھلیوں سے مقابلہ کر سکتے ہیں جو اپنے کو خواہ کتنا ہی زیادہ چھپائے رکھیں مگر انھیں بہر حال طوفانی سمندر کے بڑے اور عجیب الخلقت جانور نگل ہی جاتے ہیں۔ اب ہم بڑوں اور امیروں کا کچھ حال بیان کرنا چاہتے ہیں لیکن ایسا کرنے میں ہمیں اپنے اندازِ کلام کو یکسر بدلنا ہوگا کیونکہ جس قلم نے ان کی المناک پوشاکوں میں ملبوس بے پناہ افلاس کو جو شفقت، یگانگت اور مسرت سے بیگانہ مگر آنسوؤں کی مسلسل شبنم سے بھیگی ہوئی ویرانی کے قریب ہو، بیان کیا ہے۔ اس قلم کو اب اپنے طرزِ تحریر کو یک لخت بدلتے ہوئے یہ لکھنا ہوگا کہ ان امراء کے محلات ہیں دُنیا کی تمام تر دولت موجود رہا کرتی۔ وہ دولت جو جگمگاتی تو ضرور ہے مگر غریبوں کے پسینہ سے مستعار اور نچوڑ کر حاصل کی گئی ہے۔ لہٰذا ان کی حالت ہوا کی طرح ناپائیدار ہے کیونکہ اس کا مدار مستحکم بُنیادوں پر نہیں بلکہ شیشہ کے ستونوں پر ہے جسے دُنیا کی نگاہیں چمکدار تو ضرور تصوّر کرتی ہیں لیکن جو محض ایک ہلکے سے طوفان کے دباؤ سے ڈھیر ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد پلسارٹ امراء کی عیش و عشرت کی زندگی کی بہت سی تفصیلات اور ان کے حالات کی ناپائیداری کو قلمبند کرتا ہے اور اپنے بیان کو اس اعتراف پر ختم کرتا ہے کہ کفایت شعار اور دولتمند امراء کو مستثنیات میں شمار کرنا چاہیے لیکن اس کا اصرار ہے کہ اس کے بیان کا اطلاق امراء کی ایک بڑی اکثریت پر ہوتا ہے۔ مُلک کے اندرونی علاقوں کے متعلق اس کے بیان میں بہت ہی کم تفصیلات مِلتی ہیں۔ وہ اپنی ایک عبارت میں کہتا ہے کہ "کسانوں سے اس قدر نچوس لیا جاتا ہے کہ ان کے کھانے کے لیے خشک روٹی بھی مشکل ہی سے بچ رہتی" ایک دوسری اطلاع کے مطابق "اگر کسانوں پر اتنی بیدردی کے ساتھ مظالم نہ ڈھائے جائیں تو زمین کی پیداوار افراط بلکہ غیر معمولی طور پر زیادہ ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ لازماً ایک شہری تھا اور اس کے دیہاتی علاقوں کے متعلق حوالے بالکل ضمنی حیثیت میں ہیں[1]۔

---

[1] لفظ بہ لفظ مفصل مقابلہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ مملکت مغلیہ میں معیارِ زندگی کے متعلق J. DE LACT نے اپنے بیان کو جس مواد کی بُنیاد پر مرتب کیا ہے ان میں پلسارٹ کی مذکورہ بالا

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ولندیزی آڑھتیوں کی ان دنوں مرتب کی ہوئی دوسری اطلاعات کا انداز اس سے تھوڑا مختلف ہے اور ان میں ان دنوں کی معیارِ زندگی کو باضابطہ طور پر درج نہیں کیا گیا ہے لیکن ہمیں ان میں وقتاً فوقتاً ایسے قول ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالات پلسارٹ سے ملتے جلتے تھے۔ تاجر جس نے گولکنڈہ کے حالات بیان کیے ہیں لوگوں سے وصول کی جانے والی مالگذاری کی مقدار پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ لوگ بیحد غریب اور مفلوک الحالی میں زندگی بسر کرتے تھے اور وصولیوں کے باعث مُلک ویران ہو گیا تھا۔ گجرات کی اطلاع کے مطابق بُنکر اپنی زیادہ غُربت کے باعث اُدھار پر اپنا مال فروخت نہ کر سکتے تھے۔ وہ اپنا گزر روزانہ کی کمائی سے کیا کرتے اور انھیں سُوت کی خریداری کے لیے پیشگی رقم کی محتاجی رہا کرتی۔ مالگذاری کی زیادتی کے باعث کسانوں کی کمائی محض ان کی محنت کے بقدر ہوا کرتی اور انھیں بڑے لوگوں کے لیے عیش و عشرت کا سامان فراہم کرنے کی خاطر محنت کرنا پڑتی لہٰذا ان کی حیثیت غلاموں سے بہت تھوڑی ہی مختلف ہوا کرتی۔ اس کے چند برس بعد ولندیزی تاجر وین ٹوسٹ گجرات کی حالت کو بھی ایسا ہی بتاتا ہے۔ کسان زمین کی پوری پیداوار سے دستبردار ہونے پر مجبور کیے جاتے۔ جس کے نتیجہ میں حکّام کو کافی تعداد میں کسان نہ مل پاتے۔ میتھولڈ اور سُورت میں اس کی کونسل نے قحط کے بعد حالات کی بتدریج بحالی کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ مواضعات بہت سُست رفتاری سے آباد ہوتے ہیں حالانکہ ان کی فلاح آبادی ہی پر منحصر ہے اور اگر ہر قسم کے حاکموں کے انتہائی مظالم اور طمع سے غریبوں کو سر اُٹھانے کے لیے ایک برس کی بھی

(صفحہ 249 سے آگے)

رپورٹ کی عبارتیں بھی شامل تھیں (DE IMPERIO MAGNI MONGOLIS PP-116 ff) DE LAET کے پیشِ نظر GUJARAT REPORT بھی تھی جس کا وہ وقتاً فوقتاً حوالہ دیتا ہے اور جن معلومات کو وہ ولندیزی ماخذ سے حاصل کردہ بتاتا ہے ان کا بیشتر حصہ ان دونوں ماخذ میں موجود ہے۔ اس لیے DE LAET کے بیان کو یہاں نقل کرنا غیر ضروری ہوگا۔ یہ اس کے ماخذ کا صحیح خلاصہ ہے لیکن اس کی حیثیت ثانوی شہادت کی ہے۔ اطلاع مزید یہ ہے کہ فرانسیسی مترجم پلسارٹ کی رپورٹ کی ان عبارتوں کا ترجمہ کرنے میں بہت زیادہ کامیاب نہیں رہا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ میرا ترجمہ بہ حدِ ممکنہ لفظ بہ لفظ ہے۔

VAN TWIST x

مہلت مل جائے تو وہ اپنے پاس جانوروں کو رکھ کر زمین سے افراط پیداوار حاصل کر سکتے ہیں۔"
اس کے دس برس بعد انگریزی کونسل کی سندھ کے متعلق اطلاع ہے کہ "آبادی اس درجہ مظالم اور المناک افلاس میں مبتلا ہے کہ باوجودیکہ زمین زرخیز اور اچھی ہے اور اس پر اچھے قسم کی زیادہ مقدار میں نیل پیدا ہو سکتی ہے مگر ان کے پاس اسے کھا دینے (کاشت کرنے) اور بونے کے نہ تو وسائل ہی ہیں اور نہ حوصلہ۔"

برنیئر* اور ٹیورنیر کے ابتدائی مشاہدات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالات جیسا کہ بیان کیے گئے ہیں ویسا ہی ہمارے عہد کے انتہائی برسوں تک برقرار رہے۔ برنیئر جو مملکتِ مغلیہ میں 58-1656 تک مقیم رہا اپنے کولبرٹ کے نام خط میں کسانوں کے احوال کا ایک اندوہناک نقشہ کھینچتا ہے:

زرخیز زمین کا ایک بڑا حصہ، مزدوروں کی کمی کے باعث غیر مزروعہ رہتا ہے۔ ان میں سے بیشتر تو حاکموں کے بُرے برتاؤ کی وجہ سے ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ بیچارے اپنے حریص مالکوں کے مطالبات کو پورا نہ کر سکنے کے باعث اپنے ذریعۂ معاش ہی سے نہیں بلکہ اپنے بچوں سے بھی محروم کر دیے جاتے ہیں جن سے غلاموں کے طور پر خدمت لی جاتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہوتا ہے کہ کسانوں میں سے بیشتر گھناؤنے مظالم سے عاجز آ کر دیہاتوں کو خیرباد کر کے بہتر طریقۂ زندگی کے حصول کی خاطر شہروں اور چھاؤنیوں کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو وہ کسی راجہ کے علاقہ میں بھاگ جاتے ہیں کیونکہ وہاں مظالم کم اور آرام زیادہ رہتا ہے۔

اس کے بعد برنیئر کا بیان ہے کہ:

جب تک جبر نہ کیا جائے زمین کی کاشت شاذ ہی ہو پاتی ہے اور کوئی شخص گڑھوں اور نہروں کی مرمّت کرنے کے نہ تو لائق ہے اور نہ ہی اس پر تیار ہے۔ دیہاتوں میں بے حد ناقص طریقوں پر کاشت کی جاتی ہے اور آبپاشی کی کمی سے اس کے زیادہ حصہ میں فصل نہیں ہوتی۔ آبادی کے مصائب کا صحیح نقشہ کھینچنا ممکن نہیں۔ وہ ڈنڈے اور کوڑے کے زور پر دوسروں کی منفعت کے خاطر مسلسل محنت کرتے رہتے ہیں۔

ٹیورنیر جس نے 1640 اور 1660 کے دوران وقفہ وقفہ پر ہندوستان میں سفر کیا تھا۔ مملکتِ مغلیہ کے حالات کو اسی انداز میں قلمبند کرتا ہے۔ بقول اس کے کسان بے حد غریب ہو گئے ہیں کیونکہ اگر حکّام کو ان کے اثاثہ کی خبر ہو جاتی تو وہ اسے فی الفور حق یا ناحق ضبط کر لیا کرتے۔ ہندوستان میں پورے پورے صوبوں کو ریگستان کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے جہاں سے کسان حاکموں کے مظالم کی وجہ سے مفرور ہو گئے ہیں۔

مذکورہ اندراجات غالباً زرعی آبادی کی بدحالی کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔ شہروں کے کاریگروں کے متعلق برنیر کا بیان ملاحظہ ہو:

یہ نہ تصوّر کرنا چاہیے کہ کاریگر قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے یا اسے آزادی حاصل رہتی ہے۔ ڈنڈے کی مار یا خود اس کی ضروریات کی شدّت ہی اسے کام پر لگا سکتی ہے۔ وہ کبھی امیر نہیں ہو سکتا۔ وہ اسی کو غنیمت تصوّر کرتا ہے کہ اسے بھوک میں کھانا اور جسم ڈھانکنے کے لیے موٹے سے موٹا کپڑا میسّر آ جائے۔ اگر وہ کچھ روپیہ پیسہ کما لے تو اس کا کوئی بھی حصّہ اس کی جیب تک نہ پہنچتا بلکہ اس سے تاجر ہی کی دولت بڑھتی ہے۔

وین لوسٹ اسی انداز میں تاجروں کی آسائش اور کاریگروں کے افلاس کے درمیان فرق پر زور دیتا ہے۔ اسی طور پر بُنکر جو صنعتی آبادی میں تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ تھے، ولندیزی اور انگریزی مراسلات کے ضمنی حوالوں کے بقول پورے مُلک میں انتہائی غُربت و افلاس کے عالم میں زندگی بسر کرتے تھے۔ کسی پچھلے باب میں ہندوستانی غلاموں کی برآمدی تجارت پر بحث آ چکی ہے۔ اس تجارت کے واقعات بھی مندرجہ بالا مشاہدات سے ہم آہنگ ہیں۔ ہم ان دنوں آبادی کے بیشتر حصّہ کو آسائش کی نہیں بلکہ بقاء کی آخری حد پر پاتے ہیں جن میں کام کرنے کا حوصلہ مفقود اور جن کے لیے بجز انتقالِ مکانی کے ان دو میں سے کسی ایک صورت کے اختیار کرنے کے مفر کی کوئی راہ نہ تھی یعنی کسی ایسے علاقہ کو فراری جہاں فی الوقت حالات نسبتاً سازگار دکھائی دے رہے ہوں یا کسی غیر مُلک میں روٹی کے وعدہ پر اپنی شخصی آزادی کی فروختگی۔ یہ تو معمول کی پیداواری کے دنوں کے حالات بیان ہوئے۔ اگلے باب میں ہماری تحقیقات کا موضوع وہ حالات ہوں گے جو پیداواری کے معمولات میں خلل واقع ہو جانے کی صورت میں پیش آتے تھے۔

باب 6 کے ماخذ

فصل 1 : تمباکو کے استعمال کے حوالے ELLIOT VI 351 اور MANU
CCI 11-175. میں ملتے ہیں۔ منڈی کے حالات کے لحاظ سے کاشت کے لیے غلّوں کا
انتخاب خاص طور پر DAGH REGISTER اور ENGLISH FACTORIES V.64, vii-
(SURAT) مورخہ 3/جون 1644 ، 2/اپریل اور 9 جون 1645 کی مختلف عبارتوں سے
ماخوذ ہے۔ سرمایہ کی کمی کی مثالیں DAGH REGISTER اور ENGLISH FACTORIES vii
مورخہ 14/اگست ، 6/اکتوبر 1634 اور 6/اکتوبر 1636 میں ملیں گی۔ سامانوں کی کمی کے
خدشات کے لیے ملاحظہ ہو ENGLISH FACTORIES, 1.PP.XV. 92. & 1v-22 اور
خصوصی معیار کے سامانوں کے حصول میں آسانی یا دقت کے لیے ملاحظہ ہو مذکورہ تصنیف
111-209. vii-187; اور DAGH REGISTER مورخہ 31/جنوری 1633، 14/اگست
1634، 31/اکتوبر 1636 اور 20/مئی 1641 ۔ بنگال میں بنکروں پر پابندیوں کے لیے
ملاحظہ ہو تصنیف مذکورہ مورخہ 29/نومبر 1661 ۔ اس موضوع کا حوالہ TAYLORS
DACCA. 173. 189 میں بھی آیا ہے۔ مشورہ کے لیے پیشگی ادائیگی کے لیے DAGH
REGISTER مورخہ 12/اپریل 1661 اور نیل کے لیے ENGLISH FACTORIES, 111-
246 ملاحظہ ہو۔

اُجرتوں کے متعلق مندرج اطلاعات PELSART. 16 ff. METHWOLD 1001:
اور BEGINENDE VOORTGONGH (VANDEN BROECKES JOURNAL) 11-77 ff.
عمومی کاموں کے ضمن میں برہانپور کے کارخانہ ENGLISH FACTORIES. V.151. X-261
آب رسانی کا IMPERIAL GAZETTER IX 105 میں، نہروں کا ELLIOT. vii-67. 86
میں، عمارتوں کے تخمینی اخراجات کا تصنیف مذکورہ vii-86. 142. اور SARKAR'S
STUDIES, 30 میں بیان ملتا ہے۔ جبری خدمت کے لیے ENGLISH FACTORIES,
11-230, viii-253, 299, اور ذاتی عمارتوں کے لیے PELSART,MS, ff-2, 21
ملاحظہ ہو۔

فصل 2 : پلسارٹ کے بیان کا طویل ترجمہ مخطوطہ 23 ff. H. سے کیا گیا ہے۔

کسانوں کے متعلق اس کے مشاہدات ff- 18 & 20 پر ہیں۔ گولکنڈہ کا حوالہ VANDEN
BROECKE'S JOURNAL کے VOORTOGHGH p-77 TENIER, میں ملتا ہے۔
گجرات کے لیے GUJRAAT REPORT ff-7. 20. 21. VAN I. xli & ENGLISH
FACTORIES V-68, ۔ سترہ کے لیے تصنیف مذکورہ 209 -viii اور عہد
زیرِ مطالعہ کے اختتامی برسوں کے لیے TAVERNIER i-291 اور BEGINNDE 205,
226, 228, 230 ملاحظہ ہوں۔

باب 7

قحط کے معاشی نتائج

فصل 1۔ قحط سالیوں کی نوعیت اور ان کا تواتر

پچھلے باب میں جو بحث گذر چکی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ زیر مطالعہ عہد کے دوران پیدا کرنے کے عمل میں عام طور پر اہم واقعات پیش نہ آئے۔ یہ عمل، طلب کی تبدیلیوں سے متاثر تو ہوتا مگر خود طلب میں کوئی تبدیلیاں نہ پیدا کرتا اور انتظامیہ کی دخل اندازیاں اور نیز قحط کے سانحت ان میں سدِ راہ ہوا کرتے۔ انتظامیہ کی دخل اندازیوں پر بحث بعد میں آئے گی۔ اس باب میں ہمارے مطالعہ کا موضوع قحط کے اثرات اور ان کا تواتر ہے۔ یہ موضوع ایک گہرے مطالعہ کا مستحق ہے کیونکہ اس روزمرہ کے لفظ کے مفہوم میں تبدیلی نے ایسے تصورات پیدا کر دیے ہیں جو غلط بنیادوں پر قائم ہیں۔ فی زمانہ ہندوستان میں "قحط" کا مفہوم ان ہنگامی صورت سے ہوتا ہے جس میں حکومت نے بڑے پیمانہ پر بیکاری کے وجود کو تسلیم کر لیا ہو اور ملک میں کسی عمومی قانونِ مساکین کے نافذ نہ ہونے کے باعث ایسی صورتوں میں امداد کی خصوصی کارروائیاں ضرور ہو جاتی ہیں۔ سترہویں صدی کی سرگذشتوں میں جن قحطوں کا ذکر آتا ہے وہ کام کا نہیں بلکہ صحیح معنوں میں غذا کا قحط ہوا کرتا بلکہ خود غذا ہی کے حصول کا مسئلہ پیدا ہو جایا کرتا تھا اور بعض اوقات مقبولِ عام مصنفین کی مختلف اوقات میں قحط سالیوں کی تعداد کے موازنہ کے سلسلہ میں مذکورہ حقائق کو استعمال میں لانے کی کوشش شروع ہی سے مفہوم کی اس تبدیلی کے

باعث بے اثر ہو جاتی ہے۔ اوّل تو ہندوستان میں کافی دنوں سے غذا کا قحط پیش ہی نہیں آیا ہے اور دوسرے یہ کہ گذشتہ صدی کے وسط کے قبل کی مُدّت میں کام کے قحط کے متعلق کوئی باضابطہ تحریری اندراج نہیں ملتا اور اس حقیقت کی بُنیاد پر (اگر یہ حقیقت ہو) کہ پچھلے زمانوں کے غذائی قحطوں کے مقابلہ میں ان دنوں کام کے قحط زیادہ عام ہیں کوئی، معقول نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ مزید براں یہ کام ایک بیّن حقیقت ہے کہ مطبوعہ سرگذشتوں میں غذائی قحطوں کے بیان نامکمل ہیں کیونکہ ولندیزی اور انگریزوں کی تجارتی تحریروں میں متعدد کا ذکر کیا گیا ہے مگر ہمیں ان کا کہیں اور حوالہ نہیں ملتا۔ بطور ایک مثال کے 1632 اور 1650 کی درمیانی مُدّت میں ہمیں ہندوستانی تحریروں سے کسی قحط کا پتہ نہیں چلتا جبکہ ولندیزی اطلاعات میں 1635 میں گولکنڈہ میں اموات کی کثرت کا، 1646 میں پوربی ساحل پر بنکروں کے بھوک سے مرنے کا اور اس کے ایک برس بعد راجپوتانہ کے ایک حصّہ کا اسی سبب سے "مسلّم طور پر غیر آباد" ہو جانے کا ذکر آیا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں براہ راست موازنہ کی کوشش کو ترک کرتے ہوئے، میں نے اپنے عہد کے دوران ایسے برسوں کی ایک فہرست مرتب کی ہے جن میں کہا جاتا ہے کہ زرعی پیداوار کی قِلّت کے باعث خواہ وہ غذا کی ہو خواہ خام مالوں کی، پیداوری کے عمل میں سنگین روکاٹیں پیدا ہوئیں۔

اس فہرست کے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جاتا۔ بٹاویا جرنلس، جو اس قسم کی معلومات کے لیے امتیازی اہمیت کے ماخذ کا درجہ رکھتے ہیں متعدد برسوں خصوصاً 1647 اور ۱۶۵۵ کی درمیانی مدت کے یا تو لاپتہ ہیں یا نامکمل ممکن ہے ان لاپتہ 'جرنلس' میں قلت یا قحط کی ایسی تفصیلات رہی ہوں جنھیں ہم کسی دوسرے ذرائع سے نہیں حاصل کر سکتے۔ لیکن اگر پورے عہد کی تجارتی تحریریں موجود بھی رہی ہوتیں تو وہ پورے ہندوستان پر نہیں بلکہ صرف اُن حصوں پر حاوی ہوتیں جن سے تاجروں کا ربط قائم تھا مثلاً بندیل کھنڈ جو موسمی تغیرات سے خصوصی طور پر متاثر ہونے والا علاقہ تھا ان کی حدود سے کلیتہً باہر تھا اور اسی طور پر پنجاب بھی جو دور حاضر کی نہروں کی تعمیر کے قبل متعدد اہم خصوصیات کے اعتبار سے بندیل کھنڈ سے مشابہ تھا۔ بس ان حالات میں ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ذیل کی فہرست میں مندرجہ سنوات میں پیداوار کے عمل میں ضرور رخنہ پڑا ہوگا لیکن یہ نہیں

کہا جا سکتا کہ جو سنوات فہرست میں درج نہیں ہیں وہ پورے ہندوستان میں خوشحالی کے ایام تھے۔ یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ہمارے عہد کے نصف آخر کی تحریروں میں آئے ہوئے قحط بمقابلہ نصف اوّل کے زیادہ ہیں۔ ممکن ہے یہ فرق کچھ مفہوم رکھتا ہو لیکن اس سے زیادہ ممکن یہ ہے کہ یہ غیر ملکی تاجروں سے روابط کی توسیع کا نتیجہ تھا اور جہاں تک ولندیزیوں کا تعلق ہے کہ یہ ان کے واقعات کو درج کرنے کے بہتر طریقہ کا نتیجہ ہو کیونکہ ان کے صدی کی پانچویں دہائی کے اب تک محفوظ "جرنلس" 1630ء کے قبل کی مدّت کے مقابلہ میں بہت زیادہ مکمّل ہیں۔ فہرست حسب ذیل ہے:۔

15 — 1614 سن مختتمہ مارچ 1616ء میں جہانگیر بادشاہ ایک مہلک وبا کا پھیلنا درج کرتا ہے جسے حکّام نے خشک سالی کا نتیجہ بنایا تھا کیونکہ دو مسلسل برسوں تک ملک بارش کی کمی میں مبتلا رہ چکا ہے۔ وبا نے پنجاب کو مشرقی دہلی تک متاثر کیا تھا لیکن قیاس ہے کہ خشک سالی کے اثرات پنجاب ہی تک محدود رہے ہوں۔ اس اندراج میں بارش کی کمی کے صحیح سال نہیں دیے گئے ہیں۔

19 — 1618 میں ایک ولندیزی آڑھتیہ نے مسولی پٹم سے اپنی تحریر میں ان دنوں کی نسبتاً زیادہ خوشحالی کو، غلاموں کی کم تعداد میں خریداری کا سبب بتایا ہے۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ چار برس قبل کی زیادہ خریداری کا سبب پولی کٹ اور اس کے نواح میں انتہائی قلّت اور قحط تھا جب کہ سینکڑوں کی تعداد میں موتیں واقع ہوئیں لیکن اب چاول کی فراہمی کافی ہو جانے سے حالات تبدیل ہو گئے ہیں اور زیادہ تعداد میں غلام حاصل نہ کیے جا سکے۔ اس اطلاع سے 1618 یا 1619 میں ساحل کورومنڈل پر ایک شدید قحط کی نشاندہی ہوتی ہے۔ مؤرخ ایم۔ ڈے فریہ وائی سوزہ اس کے بعد کے برسوں سے متعلق لکھتا ہے کہ قلّت اور قحط کے باعث بہت سے لوگ تباہ ہو گئے۔ اس نے علاقہ کا تعین نہیں کیا ہے لیکن واضح طور پر یہاں جنوبی ہند مراد ہے میتھولڈ+ جو پوربی ساحل کو 1622 میں چھوڑ چکا تھا، علاقہ وجے [؟] کے بعض علاقوں میں قلّت اور قحط کی اس قدر شدّت بیان کرتا ہے "کہ والدین ہزاروں کی تعداد میں اپنے چھوٹے بچّوں کو سمندر

+ METHWOLD

کے ساحل پر لاکر 5 فنم چاول کے عوض میں ایک بچہ فروخت کر رہے ہیں" میں ان تینوں بیانات کو ایک واحد آفت یعنی تقریباً 19-1618 کے ہولناک قحط کے متعلق تصور کرتا ہوں [1]

1630 متعدد ہندوستانی، ولندیزی اور انگریزی ماخذ میں بارش نہ ہونے کے باعث جو ہولناک تباہی پیش آئی اس کو بیان کیا گیا ہے۔ ملک کے معاشی حالات پر اس کے مرتب شدہ اثرات پر اگلی فصل میں تفصیلی بحث آئی ہے۔

1635 سورت کے ولندیزی آڑھتیوں کی اطلاع کے مطابق پوری مملکت گولکنڈہ میں سامان رسد ناقابل حصول تھا اور قحط کے باعث کثرت سے موتیں ہوئیں۔ یہ اطلاع مارچ 1636 میں بٹاویا پہنچی تھی۔ لہٰذا یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے پہلے بارش نہیں ہوئی تھی۔ قحط کے پھیلاؤ کو بیان کرنے میں کچھ مبالغہ آرائی معلوم ہوتی ہے کیونکہ پوربی ساحل سے کسی شدید قحط کی اطلاع موصول نہ ہوئی تھی حالانکہ مسولی پٹم میں چاول کے حصول میں دقت محسوس ہوئی تھی اور اگلے موسم خزاں تک خام کپاس کی بھی

---

[1] مسٹر لوڈ نے 1623 اور 28-1628 کو قحط کے سال بتاتے ہیں - APPENDIX A OF THE HISTORY AND ECONOMICS OF INDIAN FAMINES لیکن یہ اندراجات صحیح نہیں ہیں۔ 1623 کے لیے اس کا ماخذ ETHRIDGE P. 40 ہے۔ ETHRIDGE نے غلطی سے 1623 کو 1040 ھجری کا سال تصور کیا ہے (جس کا آغاز حقیقتاً جولائی 1630 میں ہوا تھا) اور جن واقعات کو وہ 1623 سے منسوب کرتا ہے، واقعتاً 1630 کے بڑے قحط کے دوران واقع ہوئے تھے۔

یہی 29-1628 کا بھی ماخذ ہے لیکن جن واقعات کو وہ اس سنہ کے تحت درج کرتا ہے بیّن طور پر وہی ہیں جنھیں اس نے 1040ھ کے ضمن میں بیان کیا ہے۔ لہٰذا انھیں 1630 سے متعلق تصور کرنا چاہیے۔ 1628 اور 1629 میں موسم موافق نہ تھا اور ان برسوں میں نیل کی کاشت کم ہوگئی تھی (ENGLISH FACTORIES IV 20-238) 1629 میں بارش تاخیر سے ہوئی اور موسم کے ختم ہوتے ہوتے غیر معمولی طور پر زیادہ ہوئی - HAGUE TRANSCRIPTS I, 298 لیکن تجارتی مراسلات سے قحط کی قسم کے کسی واقعہ کا پتہ نہیں چلتا اور اپریل 1630 میں ولندیزی اور انگریزی تاجر اپنے کاروباروں میں مصروف اور اس سے پرامید تھے۔

قِلّت تھی۔ غالباً گولکنڈہ کے مشرقی اضلاع میں شدید قحط سالی تھی جہاں سے قدرتی طور پر خبریں پہنچا کرتی تھیں۔ علاوہ اس کے مسولی پٹم کے اطراف میں تھوڑی قِلّت تھی۔

1640 اوائل 1641 میں ولندیزیوں نے پولی کٹ اور مدراس کے نواح میں بارش کی قِلّت کی اطلاع دی جس کے باعث سامان رسد کو سمندری راستے سے درآمد کرنا پڑا۔ ساحل سے بعد کی خبروں سے یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ قحط نے شدّت اختیار کی۔

1641 ولندیزی اطلاع کے مطابق کپاس کی قِلّت کے باعث کپڑے کے نرخ بیحد گراں ہو گئے تھے۔ 1642 کے موسم گرما میں بھی احمد آباد میں کپاس کمیاب تھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالباً گجرات اور زیر شمال میں پچھلا موسم ناموافق رہا تھا۔

43 — 1642 جنوری 1643 میں پپلی (اڑیسہ) کے نواح میں غیر معمول خشک سالی کے باعث چاول کے متعلق اطلاع تھی کہ "یہ بیحد کمیاب بلکہ تقریباً ناقابل حصول تھا۔ 43-1642 میں موسم سرما کی بارش بنگال میں کم ہوئی۔

46 — 1645 ساحل کورومنڈل کے جنوبی خطہ میں ان دنوں شدید قحط کا عالم تھا۔ 46-1645 کے انگریز آڑھتیوں کے چند محفوظ خطوط میں 1645 میں بارش کی کمی کا ذکر نہیں ملتا لیکن اکتوبر 1646 اشین کے ایک خط سے کمی کا ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ اس خط میں نیگاپٹم سے فاقہ کش غلاموں کے جہاز کے ذریعہ پہنچنے کی اطلاع اور غلاموں کی معرفت یہ خبر کہ "پچھلے 13 مہینوں سے ایک شدید قحط ہے . . . . ایسا کہ لوگ اپنے کو بطور غلام کے کسی بھی شخص کے سپرد کر دیتے ہیں جو محض ان کا پیٹ بھر دے" موصول ہوئیں۔ 1646 میں بھی بارش نہ ہوئی اور جنوری 1647 تک ساحل پر حالات خطرناک تھے۔ پولی کٹ، سینٹ طوم، اور مدراس سے امداد کی کثرت کی اطلاع موصول ہوئی۔ "یہاں تک کہ تمام رنگ ساز[1] اور بُنکر مر گئے ہیں"، سورت سے بھیجا ہوا چاول "گراں نرخوں" پر فروخت ہوا اور 1647 کی بارش تک قحط کا سلسلہ رہا۔ اس سال اکتوبر میں مدراس کے آڑھتیوں کی اطلاع کے مطابق اس وقت تک قحط کو شروع ہوئے

---

[1] پینٹرس، PAINTERS وہ اصطلاح ہے جسے بالعموم پنٹادوز (PINTADOS) یا چھپے ہوئے سوتی کپڑوں کے تیار کرنے والوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔

دو برس ہو چکے تھے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے پہلے کی قلّت علاقہ نیگاپٹم تک ہی محدود نہ تھی۔ ان کی یہ بھی اطلاع ہے کہ "مملکت" کی نصف آبادی ختم ہو گئی اور وہ "مُردار جانوروں کی لاشوں کے تعفن کا جو ہم جہاں بھی جاتے ہیں پڑی ہوئی ملتی ہیں اور جنھیں دیکھ کر خوف معلوم ہوتا ہے اور مرتے ہوئے لوگوں کی آہ و بکا کا بھی جو سننے والوں کو اس سے کم خوف زدہ نہیں کرتی حوالہ دیتے ہیں۔

1647 اس سال راجپوتانہ کے کچھ حصّوں میں بارش نہیں ہوئی اور نتیجۃً "قحط واقع ہوا یہاں تک کہ وہ حصّے" یا تو، اموات کی کثرت یا، آبادی کے فرار ہو جانے سے بالکل غیر آباد اور ناقابلِ گذر ہو گئے ہیں"۔

1648 ساحل کورومنڈل پر قحط کی دوبارہ آمد اس قدر یقینی محسوس کی گئی کہ سورت سے وہاں چاول بھیجے جانے کا انتظام کرنا پڑا لیکن پھر وقت سے اس قدر بارش ہو گئی کہ یہ خطرہ ٹل گیا۔

1650 سورت کے آڑھتیوں نے مطلع کیا کہ "امسال پورے ہندوستان میں کم بارش ہوئی اور وسط جولائی سے تو بہت ہی تھوڑی بلکہ بالکل ہی نہیں ہوئی جس کے نتیجہ میں بہت سے مقامات پر غلّہ کی قیمتیں ابھی سے (اکتوبر) دوگنا ہو گئی ہیں اور قلّت کا بہت زیادہ اور عام طور پر خطرہ محسوس کیا جارہا ہے"۔ یہ خشک سالی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے اثرات اودھ اور نیز گجرات تک تھے اور غلّہ کی "تقریباً پورے ہندوستان" میں کمی تھی لیکن بظاہر اس کی شدّت بہت زیادہ نہ تھی کیونکہ معمول کے مطابق اموات یا اپنی خوشی سے غلام بننے کی اطلاعات نہیں ہیں۔

1658 اسی موسم میں بارش کی قلّت سے تمام اقسام کے سامان رسد کی قیمتیں فروری 1657 تک سورت میں دوگنی ہو گئی تھیں لیکن اس تباہی کے اثرات سندھ میں زیادہ محسوس کیے گئے کیونکہ اس سال کے ستمبر کی اطلاع ہے کہ قحط اور بیماری نے "آبادی کے بیشتر حصّہ کو ختم کر ڈالا"، اور سورت کے آڑھتیوں نے لہاری بندر تک اس خیال سے غلّہ بھیجا کہ بنکروں کو تقسیم کرکے انھیں مرنے سے بچایا جا سکے۔

60-1659 کے موسم گرما میں پوربی ساحل پر قلّت محسوس کی گئی۔ اس کا سبب بارش کی کمی تھی جس میں میدان جنگ میں فوجوں کے لیے رسد کے مطالبہ نے

شدت پیدا کر دی۔ اکتوبر 1659ء میں مسولی پٹم سے ایک خط کی اطلاع کے مطابق لوگ غذا کی قلّت کے باعث روزانہ مر رہے ہیں اور 1661ء میں ساحل پر قحط برقرار رہا۔ گجرات میں بھی بارش کی کمی محسوس کی گئی جہاں اپریل 1660ء میں قیمتیں بہت گراں تھیں اور سندھ میں بھی ابھی تک قحط کا غلبہ تھا یہاں تک کہ "زندہ لوگ مُردوں کو بمشکل ہی دفن کر پاتے"۔ مؤرخ خافی خاں 1070ھ (جو ستمبر 1659ء میں شروع ہوا) کے متعلق رقم طراز ہے کہ بارش کی قلّت اور جنگ اور فوجوں کی نقل و حرکت سب نے مل کر غلّہ کو بیحد کمیاب اور گراں کر دیا اور بہت سے اضلاع بالکل ویران ہو گئے اور یہ کہ کافی تعداد میں آبادی دارالسلطنت منتقل ہو گئی۔ نیگا پٹم سے بھی کمیابی کی اطلاع موصول ہوئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا عہد ایک وسیع علاقہ میں پھیلی ہوئی تباہی پر ختم ہوا۔

فہرست مذکورہ بالا سے جو صورتِ حال سامنے آتی ہے وہ مایوس کن ہے اور اگر ان کے ماخذ کے نقائص کو ذہن میں رکھا جائے تو ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ سترھویں صدی کے دوران ہندوستان کی آب و ہوا بیشتر ویسی ہی تھی جیسی کہ ان دنوں۔ میرا خیال ہے کہ دورِ حاضر کے دوران کسی بھی دہائی کا کارنامہ 1640 اور 1650 کی درمیانی مدّت کے کارنامہ سے ہر چند کہ ان کے متعلق معلومات نامکمل ہیں، بڑھا ہوا نہ تھا۔ تفصیلی موازنہ کی کوشش سے گریز کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مقامی نوعیت کی غذائی قلّتیں تو اکثر پیش آتی تھیں مگر اس کے ساتھ ساتھ شدید اور دور دور تک پھیلے ہوئے قحطوں کی بھی اتنی کثرت تھی جو تاجروں اور پیدا کرنے والوں کے اندازوں کو متاثر کرنے کے لیے کافی ہو۔ البتہ دونوں صورتوں سے جو نتائج برآمد ہوتے وہ مختلف ہوا کرتے۔ پہلے گذر چکا ہے کہ اُن دنوں براہ خشکی دور دراز تک غلّہ کی منتقلی کے اخراجات بہت زیادہ ہوا کرتے۔ لہٰذا غذا کی مقامی قلّت کو درآمد کے ذریعہ پورا کرنا ممکن نہ ہوتا۔ باوجودیکہ ملک کے دوسرے حصّے میں غلّہ کافی مقدار میں موجود رہا کرتا پھر بھی لوگ ہزاروں کی تعداد میں موت کی نذر ہو جاتے جیسا کہ 1647ء میں پوربی ساحل پر پیش آیا۔ اس طور پر متاثرہ علاقہ کی معاشی زندگی کا شیرازہ اموات کی کثرت اور نیز انتقال مکانی کے باعث درہم برہم ہو جایا کرتا تھا۔ مگر ان دونوں صورتوں کا ریلوے کے موجودہ نظام کی موجودگی میں اب پیش آنا ناممکن ہو چکا ہے۔ موجودہ ایام میں مقامی قلّت کے اثرات

زیادہ علاقہ پر پھیلے ہوئے ہونے کے باعث اس کی شدت کو کم کر دیتے ہیں کیونکہ اب ان حالات میں کافی مقدار میں غلہ درآمد کر لیا جاتا ہے۔ پس اب غذائی قحط کا تصور ہی بجز ایسے مخصوص چند قحطوں کے جواب بھی تاجروں کی رسائی سے باہر ہیں خارج کیا جا چکا ہے۔ ہمارے عہد کے دوران کسی بھی موسم میں مختلف شدت کے غذائی قحطوں کا واقع ہونا ممکن تھا لیکن چونکہ دور حاضر میں ہم اس نوعیت کے قحطوں سے نامانوس ہیں لہٰذا مناسب ہوگا کہ ان کے معاشی نتائج پر ذرا تفصیل سے بحث کی جائے۔ 1630 کے قحط کے متعلق تحریری معلومات اس قدر وسیع ہیں کہ ان کے بیان کو اس فصل میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اگلی فصل اس بحث کے لیے مخصوص کی جاتی ہے۔

فصل۔ 2۔ 31-1630 کا قحط

اس بڑے قحط کا فوری سبب 1630 میں بارش کی کمی تھی۔ یہ کمی ہندوستان کے وسطی علاقہ میں پیش آئی۔ دریائے گنگا کا میدان اس سے متاثر نہ ہوا تھا اور پیٹر منڈی[x] کی سورت سے شمالی علاقوں کے سفر کی سرگذشت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مالوں کا بیشتر حصہ اس کمی سے بچا ہوا تھا۔ عہد شاہجہانی کے وقائع نگار کا بیان ہے کہ مغلوں کے صوبے دکن اور گجرات میں بارش بالکل ہی نہ ہوئی اور ان کے نواحی علاقوں میں بھی اس کی کمی تھی۔ پوربی ساحل کے انگریزی خطوط مظہر ہیں کہ تباہی کے اثرات ہندوستان کی ایک سمت سے دوسری سمت تک پھیلے ہوئے تھے اور ایک تاجر جس نے جولائی 1631 میں مسولی پٹم کا سفر کیا تھا لکھتا ہے کہ "بنکروں اور دھوبیوں کی آبادی کا بیشتر حصہ موت کی نذر اور پورا علاقہ تباہ ہو گیا ہے"، جنوب میں خشک سال کے اراگون تک پہنچنے کا ہمیں علم ہے لیکن اس کے آگے کے علاقہ کے متعلق کوئی تحریری معلومات فراہم نہیں ہوتیں۔ سندھ بھی متاثر تھا لیکن 1635 میں وہاں سے لکھے ہوئے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ تباہی زیادہ شدید نہ تھی کیوں کہ ہمیں یہاں ایسے آثار نہیں ملتے جیسے ابھی تک گجرات میں پائے جاتے تھے۔ تفصیلی اطلاعات جو ابھی تک موجود ہیں

---

x PETER MUNDY

خاص طور پر گجرات کے متعلق ہیں۔ لہٰذا فی الوقت ہم اپنی توجہ کو اسی صوبہ تک محدود رکھتے ہیں۔

گزشتہ تین موسموں سے بارش تھوڑی بہت کم ہو رہی تھی لیکن بہرحال اس قدر کم نہ تھی جس سے تجارت زیادہ متاثر ہو اور اپریل 1630 میں امکانات کو بہتر تصور کیا جا رہا تھا۔ لیکن مانسون کم رہی اور اس کے فوری اثرات کو ایک پرانے ولندیزی تاجر وین ٹوسٹ کے الفاظ میں بہترین طور پر درج کیا جا سکتا ہے۔ اس نے قحط کے حالات کو گجرات کے متعلق اپنے مختصر بیان میں جو بار اوّل 1638 میں بٹاویا سے شائع ہوا اور اس کے بعد ایمسٹرڈم سے دوبارہ جاری ہوا شامل کیا تھا[1] اس نے اپنے بیان کو ایک خشک اور عام طرز تحریر میں درج کیا ہے۔ یہ ایک کاروباری تحریر ہے جس کا لکھنے والا ایک ایسا شخص تھا جو اس علاقہ سے بخوبی واقف تھا اور جس کی صلاحیت اس امر سے ظاہر ہوتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اس کی تقرری ایک زیادہ اہم عہدے پر کردی گئی ان امور کے پیش نظر اس کے بیان میں مندرج ہولناکیوں کی اہمیت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ان کے وقوع کی مزید تائید متفرق انگریزی روایتوں اور نیز مسلم وقائع نویس کی مرصع تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔

وین ٹوسٹ کا بیان ہے کہ بارش اس قدر کم ہوئی کہ جو بیج بویا گیا وہ سب مرگیا اور گھاس تک نہ اُگی۔ چوپائے مرگئے۔ شہروں اور مواضعات میں، کھیتوں اور سڑکوں پر کثیر تعداد میں مُردے پڑے ہوئے تھے جس سے تعفن کا یہ عالم تھا کہ راستوں سے

---

[1] وین ٹوسٹ کے رسالہ کے سرورق سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ احمدآباد، کھمبات، بڑودچ اور بڑودہ میں بڑا تاجر رہ چکا تھا DAGH REGISTER میں 1631 اور اس کی بعد کی مدت کے دوران اس کا ضمنی ذکر ملتا ہے۔ 1636 میں وہ بیجاپور کے دربار میں ایک خاص کام پر معمور کیا گیا تھا۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ ملاکا کا گورنر مقرر ہوا اور پھر وہیں مرگیا۔ میری نظر سے بٹاویا سے شائع شدہ اس کے رسالہ کی نقل نہیں گذری لیکن BEGINENDE VOORTGAUGH ' میں اس کی دوبارہ اشاعت کے سرورق پر یہ لکھا ہوا ہے کہ 1638 کے بٹاویا کے مطبوعہ ایڈیشن سے یہ منقول ہے۔ اس قحط کے متعلق انگریزی روایات کو MUNDY II, APPENDIX A میں یکجا کیا گیا ہے جو ENGLISH FACTORIES IV میں بھی موجود ہیں عبدالحمید کے بیان کا ترجمہ ELLIST - VII میں ملتا ہے۔

گذرنا مُصیبت ہوگیا۔ گھاس کی کمی سے چوپائے لاشیں کھانے لگے اور انسانوں نے مُردار کو بطور غذا کے استعمال کیا۔ بعض لوگ عاجز آکر کتوں کی چھوڑی ہوئی ہڈیوں کو تلاش کرنے لگے . . .

جیسے جیسے قحط کی شدّت بڑھی لوگ شہروں اور مواضعات سے ترک سکونت کرکے بیچارگی کے عالم میں مارے مارے پھرنے لگے۔ ان کی حالت کو سمجھنا آسان تھا۔ آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی، ہونٹ پیلے اور رال سے لت پت، جسم کی کھال اکڑی ہوئی جس کے اندر سے ہڈیاں جھلکتی ہیں، پیٹ خالی، مثل ایک لٹکتے ہوئے تھیلے کے، اور انگلیوں کے جوڑ اور گھٹنوں کے بند واضح طور پر نمایاں۔ کوئی تو عالم گرسنگی میں چیختا اور چلاتا اور کوئی مُصیبت کا مارا زمین پر پڑا ہوا دم توڑتا۔ جہاں بھی جاییے، علاوہ لاشوں کے کچھ دکھائی نہ دیتا۔

لوگوں نے اپنی عورتوں اور بچّوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ عورتوں نے اپنے کو بطور باندیوں کے فروخت کیا۔ ماؤں نے اپنے بچّوں کا سودا کیا۔ والدین کے چھوڑے ہوئے بچّوں نے اپنے کو فروخت کر ڈالا۔ بعض کُنبوں نے زہر کھاکر ایک ساتھ جان دے دی۔ بعضوں نے خود کو دریا کے سُپرد کردیا۔ ماؤں اور ان کے بچّوں نے دریا کے کنارے پہنچ کر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ایک ساتھ اپنے کو غرق کردیا جس سے دریاؤں میں لاشیں تیرنے لگیں۔ بعضوں نے مُردار کا گوشت کھایا اور بعضوں نے انسانوں کی لاشوں کو پھاڑ کر اُن کی آنتڑیوں سے اپنا پیٹ پاٹا۔ ایسا بھی پیش آیا کہ سڑک پر پڑے ہوئے انسانوں کو جو ابھی تک مرے نہ تھے دوسروں نے کاٹ کر ان کا گوشت کھالیا اور سڑکوں پر اور اس سے زیادہ اثنائے سفر میں لوگوں کو مار کر کھالیے جانے کا خطرہ پیدا ہوگیا۔

روزانہ المناک واقعات پیش آتے تھے۔ خدا کے مُنکروں کو بھی اس اطلاع پر کہ ماؤں نے اپنے ننھے لڑکے کو مار کر پکایا ہے، حیرت ہوتی تھی اور وہ ترس محسوس کرتے تھے۔ اس سے بہت زیادہ عیسائی مذہب کے ماننے والوں کے ضمیر کو جب انھیں یہ معلوم ہوتا کہ شوہروں نے اپنی بیویوں کو اور عورتوں نے اپنے شوہروں کو اور بچّوں نے اپنے والدین کو کھایا ہے، ٹھیس لگتی تھی۔ لیکن جملہ تفاصیل کو بیان کرنا زحمت طلب ہوگا۔

سینکڑوں ہزاروں انسانوں نے بھوک سے جان دی[1] جس کے نتیجہ میں پورا علاقہ غیر مدفون لاشوں سے پٹ گیا تھا اور تعفن کا یہ عالم ہوا کہ پوری فضا میں غلاظت پھیل گئی۔ ہمارے چند ہم وطن ولندیزیوں کو احمد آباد سے آتے وقت کچھ لوگ ایسے ملے جو تھوڑی سی آگ جلا کر انسانوں کے ہاتھ اور پیر لٹکا رہے تھے۔ یہ ایک بہت ہی ہولناک منظر تھا سوسنترا گاؤں میں اس سے زیادہ کریہہ منظر یہ دیکھنے میں آیا کہ انسان کا گوشت کھلے بازار فروخت ہو رہا ہے۔ اس دردناک خداوندی سزا کے غربا خاص طور پر شکار ہوئے کیونکہ ان کے پاس کوئی ذخیرہ موجود نہ تھا۔ اس کے بعد آگے بیان میں قیمتوں کی تفصیل درج ہے جن پر کسی پچھلے باب میں بحث آچکی ہے۔ پھر یہ بیان 1631 کے موسم پر پہنچ جاتا ہے اس برس بارش کے متعلق اچھی امید تھی جس کے نتیجہ میں قیمتیں کم ہونا شروع ہوئیں لیکن وین ٹوسٹ اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ بحالی قائم نہ رہ سکی اور محسوس ہوا کہ ابھی سزا ختم نہیں ہوئی ہے۔ اب خدا نے ٹڈیوں، بڑے اور چھوٹے چوہوں اور دیگر کیڑے مکوڑوں کو مسلط کر دیا جنھوں نے نوخیز فصل کو شدید نقصان پہنچایا۔ اس کے بعد موسلادھار بارش نے فصل کے پکنے کے وقت آکر کثیر مقدار میں غلہ کو کھیتوں میں تباہ کیا۔ دریائی سیلاب نے شہروں، مواضعات اور علاقوں کو اس سے زیادہ نقصان پہنچایا اور قیمتیں ہمیشہ سے زیادہ بڑھ گئیں۔ پس قحط پورے سال رہا اور اس کے بعد مہلک وبائیں اور بخار کی بیماری نمودار ہوئی جس کے نتیجہ میں ایک متنفس بھی صحت مند نہ رہا۔ لاشیں راستوں میں اور مردے گھروں میں کئی کئی دن تک پڑے رہتے کیونکہ کوئی انھیں اٹھانے کی اجرت ادا کرنے والا نہ تھا چتا کے لیے لکڑی دستیاب نہ تھی مجبوراً بغیر جلائی ہوئی لاشوں کو دفن یا دریا کے سپرد کیا گیا۔ خدا عیسائیوں کی سرزمین کو ایسے ہولناک مصائب سے محفوظ رکھے۔

اس نوعیت کے قحط اب ہندوستان میں ناپید ہو چکے ہیں۔ ان کے مطالعہ کرنے والوں کو مذکورہ بیان کے اہم اجزاء پر حیرت نہ ہونی چاہیے۔ خاندانی معاشرت

---

[1] اس تعداد کو لفظی معنوں میں نہیں بلکہ محاورہ کے طور پر تصور کرنا چاہیے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ بے شمار موتیں واقع ہوئیں۔

کی شکست وریخت، زرعی سرمایہ کا اتلاف، خانہ بدوشی، اپنی مرضی سے غلام بننے کے واقعات، خودکشی یا محض فاقہ کشی کے نتیجہ میں اموات، مردم شماری ان سب کی مزید وضاحت اس نوعیت کے آفات کے متعلق موجود ہندوستانی اور نیز غیر ملکی بیانات سے کی جا سکتی ہے۔ واضح رہے کہ وین ٹوسٹ اس سلسلہ میں حکومت کے امدادی اقدامات کا کوئی ذکر نہیں کرتا لیکن ہندوستانی ماخذ کے مطالعہ سے ہم کو ان کی نوعیت اور پھیلاؤ کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ لنگرخانے کھولے جاتے، سرکاری ٹیکس معاف ہوتے اور مفت امداد کے لیے رقمیں مخصوص کر دی جاتیں لیکن تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ یہ امدادی کام نتائج کے اعتبار سے بے حقیقت ثابت ہوتے اور ان سے ایسے مواقع کی سب سے بڑی پریشانی یعنی غذا کی کمی کا دفعیہ نہ ہوتا تھا۔ ان سے موجود ذخیرہ کی تقسیم کے عمل کو تو بہتر بنایا جا سکتا تھا لیکن یہ ملک کے اندر غلّہ کی فراہمی کا ذریعہ نہ بن سکتے تھے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ امدادی کام ضرورت کے اعتبار سے ناکافی تھے مگر یہ تجویز کرنا کہ آخر ان حالات میں اس کے علاوہ اور چارہ کار ہی کیا تھا آسان نہیں 1631 اور 1632 کے خطوط میں مندرج ضمنی حوالوں سے واضح ہوتا ہے کہ انگریزوں نے فارس سے زیادہ مقدار میں غلّہ کی درآمد کی فرمائش کی تھی لیکن جہازوں کے ذریعہ مال کی آمدورفت کے طریقے یہاں سے زیادہ غلّہ کی فراہمی میں مانع تھے۔ سندھ اس کمی سے خود بھی متاثر تھا اور ساحل مالا بار بالعموم اپنی غذائی ضروریات کا ایک بڑا حصہ باہر سے درآمد کیا کرتا تھا۔ پوربی ساحل میں فاقہ کشی ہو رہی تھی اور یہ امر اگر ناممکن نہیں تو مشتبہ ضرور ہے کہ دنیا کی کوئی بھی ہمدرد حکومت اس کمی کو درآمدات کے ذریعہ پورا کر سکتی تھی۔ شمالی ہند میں غلّہ فاضل تھا لیکن پہلے گذر چکا ہے کہ اسے براہ خشکی منتقل کرنے کے اخراجات کثیر تھے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کسی بے آب و گیاہ علاقہ میں ضرورت کے لحاظ سے کافی تعداد میں باربرداری کے جانور کیوں کر نقل و حرکت کر سکتے تھے۔

لہٰذا مغلیہ انتظامیہ کو وقت کے حالات کے لحاظ سے ایک ناگزیر مصیبت کو دفع کرنے میں ناکام رہنے پر موردِ الزام قرار دینا بے انصافی کے مصداق ہوگا لیکن، بہرحال یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو اقدامات کیے گئے وہ ناکافی ہی نہیں بلکہ سست رفتار

بھی تھے، اور اس وقت عوام کے رہنماؤں نے جو طریق عمل اختیار کیا وہ مصائب میں کمی کا نہیں بلکہ اضافہ کا سبب ثابت ہوا۔ اس قول کا ماخذ پیٹر منڈی ہے جو سُورت سے برہانپور تک کے اپنے سفر کے مشاہدات کو بیان کرنے کے بعد اس امر پر زور دیتا ہے کہ مُصیبت کے دفعیہ کے لیے کوئی تدبیر اختیار نہیں کی گئیں اور" دولتمند اور طاقتور لوگ جبر یہ مسلّم ذخیرہ پر قبضہ کر رہے تھے "۔ اسی مشاہد کا قول ہے کہ شمالی ہند سے امداد کی فراہمی مایوس کُن تھی کیونکہ برہانپور میں متعینہ مغلیہ فوج اس راہ میں حائل تھی جس سے غلّہ پہنچ سکتا تھا اور باوجودیکہ سرِ ونج کے نواحی علاقہ میں غلّہ کا کافی ذخیرہ موجود تھا لیکن "بے بس گجرات کبھی بھی قریب (تر) نہ تھا، جہاں پر ضرورت سب سے زیادہ تھی۔ تمام غلّہ بادشاہ کے لشکر (فوج) کو فراہمی کی غرض سے برہانپور بھیج دیا جاتا" بہرحال یہ آخرالذکر رُکاوٹ عارضی ثابت ہوئی۔ 1631 کے ختم ہوتے ہوتے بنجارے غلّہ ڈھونے والے آنا شروع ہو گئے، سمندری تجارت سے مدد پہنچنے لگی اور اس کے بعد سے تخفیف شدہ آبادی کی ضروریات اس قدر زیادہ نہ رہ گئیں جو معمول کی تجارت سے نہ پوری ہو سکیں حالانکہ قیمتیں ابھی تک معمول سے بہت زیادہ تھیں۔

صنعت اور تجارت پر اس مُصیبت کے فوری اثرات کو ان ایام کے انگریزی مراسلات سے جمع کیے ہوئے چند واقعات سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ اکتوبر 1630 تک سورت میں نیل کی قریب الوقوع کمی کو محسوس کر لینے کے بعد احمد آباد کے بجائے آگرہ سے خریداری کے انتظامات شروع کیے گئے۔ اسی ماہ میں جہاز تک پہنچنے کے راستہ میں غلّہ کو "علاقہ کے غریب اور فاقہ کش لوگوں، کے حملہ، سے محفوظ رکھنے کے لیے خصوصی انتظامات ضروری تصوّر کیے گئے۔ نومبر میں مسولی پٹم سے سُوتی سامان کی کمی اور سونے اور دیگر درآمدات کی قیمتوں کے گرنے کی اطلاع آئی۔ سوتی سامان اور نیل کی قلّت کے باعث سورت کے آڑھتیے جنھیں فی الوقت اپنے پاس ضرورت سے فاضل سرمایہ کی موجودگی کا نادر تجربہ ہوا، مکسر سے چاول درآمد کرنے کا مشورہ دے رہے تھے اور ساتھ ساتھ انگریزی جہازوں پر راشن کی مقررہ مقدار میں تخفیف کی گئی۔ اس وقت تک شراب ناقابل حصول ہو چکی تھی کیونکہ اس کے کشید کرنے والے "ایسے مقامات پر منتقل ہو گئے تھے جہاں زیادہ افراط کی توقع پائی جاتی تھی اور یہی عمل ان کے علاوہ دوسرے ہزاروں اشخاص

نے بشمول بُنکروں، دھوبیوں اور رنگ سازوں وغیرہ کے اختیار کیا۔ اس کے باعث اگلے سال وطن واپس جانے والے جہازوں کی معقول لدائی سے ہم قریب قریب ناامید ہیں۔ یہ دسمبر میں ارماگون سے اطلاع موصول ہوئی کہ کپڑوں کے گھٹیا ہونے کا جزوی سبب کپاس کی قیمتوں میں چار گنے کا اضافہ تھا اور سال کے آخری دن سورت کی یہ خبر تھی کہ کاریگر کثیر تعداد میں اپنے گھروں کو چھوڑ کر کھیتوں میں مر رہے ہیں سونے کی قیمت اس وجہ سے کم ہو رہی تھی کہ غریب تو اسے فروخت کر رہے تھے لیکن امیر خریدنے کی استطاعت سے محروم تھے۔ نیل کی پیداوار معمول کی تقریباً بیسواں حصّہ رہ گئی تھی اور سوائے پُرانے رَدّی مال کے بازار میں اور کچھ نہ ملتا تھا۔ کپاس اور سُوت کی قیمتیں دوگنا ہوگئیں۔ راستے بیباک ڈاکوؤں کے جتّھے کی وجہ سے غیر محفوظ تھے اور خبر رسالوں کی جان تک کی خیر نہ تھی۔ قحط اور دکن کی جنگ نے مل کر "تجارت کے نظام کو بالکل درہم برہم کر دیا تھا"

نئے سال کے اوائل میں زمینی بار برداری کے اخراجات میں اضافہ کی اطلاعات ملتی ہیں۔ شکر کے نام پر شورہ کو اندرون ملک درآمدی محصول گھروں سے پار کرنے کی اس بنا پر ممانعت کی گئی کہ مبادا اسے رسد کے سامان کے دھوکے میں روک لیا جائے جو افشائے راز کا باعث ہو۔ انگلستان سے آنے والے جہازوں کو اثنائے سفر میں چاول کا ذخیرہ جمع کرنے کی ہدایت دی گئی۔ لیکن اس وقت تک غالباً آڑھتیے حالات سے مانوس ہوگئے تھے کیونکہ اب خط وکتابت میں اس کا چرچا کم ہونے لگا۔ جون میں بارش کے امکانات اچھے دکھائی دیے جس نے تجارتی مشاغل میں اضافہ کیا۔ کپڑہ بڑودچ اور بڑودہ میں "بُنکروں کے لائے ہوئے ہر تھان کے عوض ایک سیر غلّہ دیے جانے کی وجہ سے" آنا شروع ہوگیا تھا اور انگلستان کو بذریعہ جہاز بھیجے جانے کے لیے کسی نہ کسی قسم کے سامان کی فراہمی کی اب اُمید پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن ستمبر میں نیل اور سوتی سامانوں کی قیمتیں بیحد گراں ہوگئی تھیں اور غلّہ کی قیمتیں اپنے نقطہ عروج (تقریباً 6۔ ایل۔ بی۔ فی روپیہ) پر تھیں اور کوئی گھر لرزہ، بخار اور وبائی امراض سے خالی نہ بچا۔ انگریز تاجر تک نہ بچ سکے اور اکتوبر میں ان کے پریسیڈنٹ کے علاوہ ہر شخص یا تو مر گیا یا بیماری میں مبتلا ہو گیا اور خود پریسیڈنٹ بھی اگلے ماہ دنیا سے

رخصت ہوا۔ گجرات "دنیا کا گلزار علاقہ" ویرانہ میں تبدیل ہوگیا اور یہاں کاشتکار یا کاریگر بہت ہی تھوڑے یا بالکل نہ بچے۔ نیل کے جمع کرنے کے لیے آدمیوں کے نہ ہونے کے باعث یہ زمین پر پڑا سڑ رہا تھا اور ایسے مقامات پر جہاں روزانہ کپڑوں کی پندرہ پندرہ گانٹھیں تیار ہوا کرتیں اب صرف تین گانٹھیں ماہانہ تیار ہونے لگیں۔ اس وقت ایک ولندیزی آڑھتیے کی تحریر کے مطابق اگلے تین برسوں تک تجارت کی بحالی کی کوئی امید نہ پائی جاتی تھی۔ 1631 ویرانی ہی کے عالم میں ختم ہوا۔

1632 کے اوائل میں مصائب کے بادل چھٹنے لگے۔ وین ٹوسٹ کے بیان سے واضح ہوا ہوگا کہ گذشتہ برسوں کے مقابلہ میں 1631 کے آفات زیادہ مقامی نوعیت کے تھے۔ لہٰذا کم دور افتادہ علاقوں سے فراہمی ہونے لگی اور باہر سے غلہ کی درآمد نے قیمتوں کو کم کرنا شروع کیا۔ مصائب کا بدترین دور تو اب گذر چکا تھا لیکن صنعت اور تجارت کو بحال ہونے کے لیے برسوں درکار تھے۔ بحالی کی سست رفتاری کا اندازہ انگریز تاجروں کی رپورٹوں سے ہوتا ہے۔ فروری 1632 تک بڑوچ میں گیہوں ملنے لگا تھا لیکن سورت کے مسلّم ذخیرہ پر وہاں کے صوبیدار اور ایک یا دو تاجروں نے قبضہ کرلیا۔ پوربی ساحل پر امسال کافی بارش ہوئی اور سورت میں بھی بارش کی کوئی شکایت نہ تھی لیکن پھر بھی سال کے اختتام پر نیل، سوتی سامانوں اور دیگر اشیاء کی قیمتیں بہت گراں اور درآمد کیے ہوئے سامانوں کی فروختگی بند تھی۔ نومبر 1633 میں قیمتیں اس قدر گراں تھیں کہ انگلستان میں لوگ منافع کی طرف سے بالکل مایوس تھے اور اکتوبر 1634 میں، ہندوستان میں کوئی ایسا مال قابل حصول نہ تھا جس کی بنیاد پر کوئی نفع بخش تجارت قائم کی جاسکے۔ پوربی ساحل پر بھی تجارتی نقطۂ نگاہ سے قیمتیں بہت زیادہ تھیں لیکن اس سال اچھی فصل ہوجانے سے حالات کے معمول پر آجانے کی توقع تھی۔ دسمبر میں سورت کے آڑھتیوں نے کمپنی کو بے شمار خسارہ کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ تجارت بحال کرنے کے لیے کیا صورت اختیار کریں اور ان کے تخمینہ کے مطابق بحالی کے لیے مزید پانچ برس درکار تھے۔ لیکن 1634 میں بارش غیر معمولی طور پر اچھی رہی۔ کاریگر واپس آنا اور شہر آباد ہونا شروع ہوگئے۔ اس کے بعد کے حالات کا کچھ حصہ پچھلے

باب میں گزر چکا ہے مگر اسے دوبارہ لکھنا مناسب ہوگا۔
مواضعات بہت دھیرے دھیرے آباد ہوتے ہیں حالانکہ ان کی بہتری آبادی ہی پر منحصر ہے اور اگر ہر قسم کے حاکموں کے انتہائی مظالم اور طمع سے غریبوں کو سر اٹھانے کے لیے ایک برس کی بھی مہلت مل جائے تو وہ اپنے پاس جانوروں کو رکھ کر زمین سے افراط پیداوار حاصل کرلیں اور اس کے نتیجہ میں تمام چیزیں بہت کثیر مقدار میں ہونے لگیں گی اور بچوں کو اپنے باپ کا کام کرنے میں سوائے وقت کے کسی اور چیز کی کمی کا احساس نہ ہوگا۔

عبارت بالا کا آخری فقرہ قابل توجہ ہے۔ ان قحطوں کے دیرپا اثرات میں ایک یہ بھی تھا کہ کسانوں اور کاریگروں کی قلت کی وجہ سے ہنرمندی کا معیار گھٹ جاتا تھا اور اس بناپر گجرات کے سوتی سامانوں کی شہرت کئی برسوں تک متاثر رہی۔ تدریجی بحالی کے اثرات مختلف مقامات پر مختلف ہورہے تھے۔ ستمبر 1635 تک احمد آباد اور بڑودہ میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کی کوشش شروع کی گئی لیکن بڑوچ میں جہاں ابھی "بنکروں کی اچھی آبادی نہ ہوئی تھی،، ایک علیحدہ کوٹھی قائم کرنا فضول تصور کیا گیا۔

دسمبر 1635 کے ایک خط سے جس میں سورت کے آڑھتیوں نے غلہ کی ارزانی اور باشندوں کی واپسی کے باعث قیمتوں کے مسلسل کم ہونے کی اطلاع دی ہے، تجارت کی بحالی کا اندازہ ملتا ہے۔ خط میں یہ بھی اطلاع ہے کہ انھوں نے کاروبار کو از سرنو شروع کرنے کی غرض سے قرض پر کافی سرمایہ فراہم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن تنہا گجرات ان کی تمام مانگوں کو فراہم نہ کرسکتا تھا وہ کافی مقدار میں سامان کے حصول کی غرض سے اپنے دائرہ عمل کو سندھ اور شمالی ہندوستان کی طرف بڑھا رہے تھے جنوری 1636 میں، ہندوستانی تاجروں نے جہازوں پر سامان کو فارس بھیجنے کا ارادہ کیا اور ان ایام کے مراسلات میں قحط کے قبل کے ایسی سرگرمیوں کے تذکرے ملتے ہیں۔ مارچ میں غلہ کی قیمت اپنے سابقہ معمول سے بھی کم ہوگئی تھی اور اپریل میں غذائی اجناس اور خام کپاس سورت سے مسولی پٹم بھیجی جارہی تھیں، 1635 میں گولکنڈہ میں شروع ہونے والی خشک سالی کے اثرات ابھی تک محسوس کیے جارہے تھے

اب بڑودہ میں نفیس کپڑے اچھی خاصی مقدار میں تیار ہونا شروع ہو گئے تھے مگر بڑودچ "برباد" ہو گیا تھا کیونکہ ستمبر کے ایک خط میں تحریر ہے کہ "لوگ بھاگ گئے اور مر گئے ہیں اور اب روزگار کی قلت کے باعث وہ واپس ہونے سے خوف زدہ ہیں" 1637 کے مراسلات میں حالات کی رفتار کا بہت تھوڑا ذکر کیا گیا ہے لیکن دسمبر 1638 میں ایک آڑھتیے کی اطلاع کے مطابق یہ علاقہ قحط کے اثرات سے بحال ہو چکا تھا۔ سامان کافی مقدار میں قابل حصول تھے اور تجارت کے امکانات روشن ہو گئے تھے۔ پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ 1639 تک گجرات دوبارہ بحال ہو گیا تھا۔ لیکن آبادی کم ہو چکی تھی اور ہنرمندی کا معیار گھٹ گیا تھا جس سے ابھی تک سوتی سامانوں اور دیگر مصنوعات کا معیار متاثر ہو رہا تھا۔ لیکن آخر الذکر معاملہ میں مسلسل بہتری کے آثار نمایاں تھے اور بڑودچ کے حالات بھی کچھ سنبھلنا شروع ہو گئے تھے۔ مگر باہری ممالک میں شہرت کو جو نقصان پہنچ چکا تھا وہ ابھی تک برقرار رہا اور یورپی منڈیوں میں گجرات کو جو اوّلیت حاصل ہو چکی تھی وہ قطعی طور پر ختم ہو گئی۔

دکن میں اس قحط کے اثرات کی تفصیل کو قلمبند نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہاں تجارتی کوٹھیاں موجود نہ تھیں۔ لیکن یہ اندازہ ضرور ملتا ہے کہ وہاں پر تباہی کی شدت گجرات سے کم نہ تھی۔ 'بادشاہ نامہ' جو تقریباً 1650 کی تصنیف ہے دکن کے چاروں صوبوں اور گجرات کو مملکت مغلیہ کے عام حالات سے مستثنیٰ قرار دیتا ہے۔ اس کا مصنف اعداد و شمار سے واضح کرتا ہے کہ عہد شاہجہانی کے ابتدائی بیس برسوں میں شاہی مالگذاری میں بیحد اضافہ ہوا تھا لیکن ان پانچوں صوبوں میں کوئی فرق نہ ہوا بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے حاصلات میں کمی واقع ہوئی اور وہ واضح طور پر 33-1630 کے قحط کو اس کمی کا سبب قرار دیتا ہے۔ شاہزادہ اورنگزیب کے 1653 میں دکن کا نائب السلطنت مقرر ہونے پر معلوم ہوا کہ یہاں سرکاری مالگذاری کم کیے جانے پر بھی ابھی زیادہ ہے اور اس علاقہ کا شاہی خزانہ کو امداد فراہم کرنا تو درکنار یہ اس کے زیر نگرانی مقامی انتظامیہ کے اخراجات کو بھی پورا کرنے سے قاصر ہے۔ پس دکن بہرحال ایک پشت تک مفلس رہا۔

1630 کے قحط کے پھیلاؤ اور اس کے نتائج پر ایک طویل تبصرہ اس لیے

ضروری معلوم ہوا کہ ہندوستان کی تاریخ میں اس نوعیت کے سانحات بار بار پیش آئے ہیں قحطوں کی وسعت اور شدت میں فرق بہت زیادہ رہا کرتا تھا لیکن ہمارے پاس فی الحال جو معلومات ہیں ان سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ان کے اثرات کی نوعیت باوجود شدت کے اس فرق کے ایک ہی رہا کرتی تھی۔ یہ معلوم ہوجانے یا اس کا شبہ ہی پیدا ہوجانے کی صورت میں کہ غذا میں واقعی کمی ہوگئی ہے اور اسے کافی مقدار میں درآمد کرنا ممکن نہیں، لوگوں کا دوسرے مقام پر منتقل ہوجانا ضروری ہوجاتا تھا اور اس وقت کے حالات کے سخت انتقال مکانی کے نتیجہ میں "غذا کی تلاش میں مارے مارے پھرنا" ایک ایسا روایتی عمل ہوگیا تھا کہ موجودہ صدی میں بھی، اس کی پہلی علامت ظاہر ہونے پر فوری امداد رسانی لازمی تصور کی جاتی تھی[1] انتقال مکانی، بیماری اور اموات کے نتیجہ میں، کسی بھی گانوں، شہر یا ضلع کی معاشی زندگی کے ایک بار تباہ ہوجانے کے بعد اس کا بہ عجلت بحال ہونا ممکن نہ ہوا کرتا اور اس عہد کی تحریروں میں اس عمل کو تیز کرنے والے تعمیری امداد کے کاموں کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ موافق ہوجانے پر، بچی ہوئی خانہ بدوش آبادی اپنے اپنے مقامات پر تدریجاً واپس لوٹ آتی تھی جس کے نتیجہ میں حالات دھیرے دھیرے بحال ہونا شروع ہوجاتے لیکن بحالی اپنی بہترین شکل میں بھی ایک طویل عمل کے مرادف ہوا کرتی اور جیسا کہ گجرات سے متعلق گذر چکا ہے اس عمل میں "حکام کے مظالم اور ان کی حرص" کے باعث مزید تاخیر پیدا ہوسکتی تھی۔ سرمایہ خصوصاً کسان کے مصرف میں آنے والے مویشیوں کا اتلاف، ہنر اور کام کی واقفیت کے معیار میں تنزلی اور غیر ملکی منڈیوں میں شہرت کا نقصان یہ وہ موضوعات ہیں جن کا اہلِ معاشیات سے بالکل براہ راست تعلق ہے۔ ان کے بجائے جانوں کا نقصان اور شدید انسانی مصائب جو ان قحطوں کے نتیجہ میں مختلف پیمانہ پر پیش آیا کرتی تھیں، معاشرتی مورخ کی توجہ کی زیادہ مستحق ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو REPORT OF THE INDIAN FAMINE COMMISSION 1901

باب 7 کے ماخذ

فصل 1 : قحطوں کی فہرست کے لیے حسب ذیل حوالے ملاحظہ ہوں۔

1614-15 کے لیے ELLIOT VI. تزک ج ا ص 330 1618-19 کے لیے (HAGUE TRANS- 1635 کے لیے (CRIPTS I, FARIA SOUSA & METHOLD 993. DAGH REGISTER مورخہ 22/مارچ، 10/جون اور 31/اکتوبر 1636 ، 1640 کے لیے مذکورہ تصنیف مورخہ 31/مارچ 1641 ، 1641 کے لیے مذکورہ تصنیف مورخہ 26/دسمبر 1641 ، 20/جون، 3/نومبر 1642، 1642 کے لیے مذکورہ تصنیف (کورومنڈل) مورخہ 15/فروری اور 16/اکتوبر 1643، 1645-40 کے لیے ENGLISH FACTORIES viii-46. 540 ex 68 1647 کے لیے مذکورہ تصنیف 192 viii/57 1648 کے لیے مذکورہ تصنیف [illegible] 1650 کے لیے مذکورہ تصنیف 10, 28, 82 viii 322 1658 کے لیے مذکورہ تصنیف 196, 210، 1659-60 کے لیے مذکورہ تصنیف 401, 407 ، 306 ، x 257, 263, DAGH REGISTER مورخہ 13/جنوری، 17/فروری اور 16/مئی 1661 اور ELLIOT vii-263.

فصل 2 : 1630 کے قحط کے پھیلاؤ کے لیے ملاحظہ ہو ENGLISH FACTORIES میں جا بجا

ELLIOT vii-24 MUNDY ii- اس کے واقعات ENGLISH FACTORIES IV میں پھیلے ہوئے ہیں اور وین ٹوسٹ کا بیان iii.c میں ہے۔ امدادی کاموں کے لیے ملاحظہ ہو ETHERIDGE 39. 63. MUNDY 11. ELLIOT VII. صنعت اور تجارت پر قحط کے اثرات کے تفصیل کو ENGLISH FACTORIES iv سے اور تدریجی بحالی کے حالات کو تصنیف مذکورہ iv.v سے اخذ کیا گیا ہے۔ دکن کے متعلق معلومات 'بادشاہ نامہ' ج ص 710 سے اور SARKARS AURANGZEB سے ماخوذ ہیں۔

باب 8

نظم و نسق کے معاشی اثرات

فصل ۱ ۔ ہندوستانی صوبوں میں غیر ملکی تاجروں کی حیثیت

اب ہم اپنے مطالعہ کے آخری موضوع یعنی زیر بحث عہد کے دوران ہندوستان میں نظم و نسق اور مالیات کی جو ترتیب قائم تھی اس کی معاشی اہمیت پر غور کریں گے ۔ مختلف انتظامی ترتیبوں کے عملی طریقوں سے متعلق ہماری معلومات کا اس قدر زیادہ حصہ ولندیزی اور انگریزی تاجروں کے مشاہدات سے ماخوذ ہے کہ ہمارے لیے شروع ہی میں یہ سمجھ لینا کہ ان مشاہدین کی واقعی حیثیت کیا تھی ضروری ہوگا ۔ یہ اس لحاظ سے اور بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی کوئی چیز موجودہ ہندوستان میں نہیں پائی جاتی ۔ اگر کوئی غیر ملکی مثلاً امریکی یا جاپانی تاجروں کی کمپنی موجودہ کلکتہ یا بمبئی میں کسی ایجنسی کے قائم کرنے کا فیصلہ کرتی ہے تو اس سلسلے میں اس کے حقوق اور اس کی ذمہ داریاں پہلے سے واضح طور پر متعین رہتی ہیں ۔ وہ اپنے دفاتر یا گودام قائم کرنے کے لیے سرکاری اجازت کے محتاج نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص کاروبار کے سلسلہ میں درآمدی محصولوں، بندرگاہوں کے مطالبات یا راہداری کے محاصل کے سلسلہ میں حکام سے ابتدائی گفت و شنید کریں ۔ بندر اور شہر ان کے لیے کھلے رہتے ہیں ۔ البتہ نوآبادیاں قائم کرنے کی صورت میں انھیں ہندوستان کے بیشتر قوانین کی پابندی کرنی ہوتی ہے ۔ ایسی حالت میں وہ دیوانی یا فوج داری کی عدالتوں کے عمومی حدود اختیارات سے

مستثنیٰ نہیں ہوتے اور درآمدی محاصل کی شرحوں اور متعدد دیگر معاملات میں مروجہ ضابطوں کی پابندی ان کا قانونی فرض ہوتا ہے۔ یہ طریقہ جو ان دنوں جس قدر طبعی معلوم ہوتا ہے اسی قدر آسان بھی، کم از کم ایشیا کے لیے بالکل جدید ہے۔ اس زمانہ میں جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، بندروں اور شہروں میں غیر ملکی تاجر از خود اپنی نوآبادیاں قائم کرسکتے تھے۔ اس قسم کی نوآبادیاں خصوصی قول و قرار یا معاہدوں کی تابع ہوا کرتیں اور حکام کی نگاہ میں ان تاجروں کی حیثیت ملک کے عام قوانین کے بجائے ان معاہدوں سے متعین ہوا کرتی تھی۔ بعض اوقات اس بات کا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یورپی تاجروں نے یہاں اپنی پہلی آمد پر اپنے لیے غیر ملکی تاجروں کے حقوق بہ جبر حاصل کیے لیکن حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ یورپی جہازوں کے ہندوستانی سمندروں میں داخل ہونے کے قبل ہی سے ایشیائی تاجروں کو اس کے مماثل حقوق حاصل تھے اور نئے آنے والوں نے انھیں انتظامات کے ساتھ جو پہلے سے چل رہے تھے موافقت اختیار کی۔

ان تمام تر ایشیائی انتظامات کی نوعیت کو ان دو بندرگاہوں کی مثالوں سے جن کے متعلق تفصیلی معلومات تحریروں میں ملتی ہیں واضح کیا جاسکتا ہے۔ پہلا مشرق البعد کا سب سے بڑا بندرگاہ ملاکا اور دوسرا کالی کٹ جو کہ پرتگیزیوں کی آمد کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے قبل ہندوستان کا غالباً سب سے بڑا بندرگاہ تھا۔ 1511 میں البوقرق کے ملاکا پہنچنے کے پہلے ہی سے اس شہر میں متعدد غیر ملکی تاجروں کی نوآبادیاں موجود تھیں۔ ہر قوم کے افراد خود اپنے اپنے قوانین اور رسم و رواج کی پابندی کیا کرتے اور ہر قوم میں خود اپنا ایک سردار یا سربراہ ہوتا جو اپنے لوگوں پر ایک گورنر کے اختیارات استعمال کرتا۔ البوقرق کے پہنچنے پر ان غیر ملکی اقوام کے مفاد میں تصادم رونما ہوا۔ چین اور جاوا کے باشندوں نے تو اس کا خیر مقدم کیا لیکن ہندوستان کے پچھمی ساحل کے مسلمان جنھیں ملایا کے مسلمانوں کی حمایت حاصل تھی، پرتگیزی نوآبادی کے قیام کے سخت مخالف تھے اور چونکہ وہاں کا بادشاہ ان کے زیر اثر تھا لہٰذا جنگ و جدل شروع ہوگئی۔ دونوں فریقین جس مقصد کے تحت حرکت میں آئے اس کا تحریروں میں باضابطہ اندراج نہیں ملتا لیکن یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ نزاع کا سبب قطعی طور پر تجارت تھا۔ چونکہ ملاکا مشرق اور مغرب کے مابین تجارتی سامانوں کے جہازوں کی

بدلی کا بندر تھا، لہٰذا چینی اور اہلِ جاوا جو مشرق سے سامانوں کو وہاں بیچنے کی غرض سے لایا کرتے۔ قدرتی طور پر مقابلہ کرنے والے مغربی خریداروں کا خیر مقدم کرتے جب کہ ہندوستانی مسلمانوں کا پرتگیزیوں سے اپنی موجودہ نزاع کے علاوہ مغربی تجارت پر اپنی اجارہ داری کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کرنا ایک قدرتی عمل تھا۔ پرتگیزی ملاکا میں خود سے اپنی تجارت قائم نہ کر سکتے تھے بلکہ اس کے لیے انھیں وہاں کے بادشاہ سے اجازت حاصل کرنا ضروری تھا۔ دوسرے غیر ملکی تاجر جنھیں اپنے کاروبار کے سلسلہ میں ان کے مقابلہ کا خطرہ تھا ان کی نوآبادی کے قیام کے مخالف تھے لہٰذا وہ بادشاہ کے ساتھ کوئی معاہدہ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ بالآخر البوقرق نے طاقت کے استعمال سے وہاں اپنی نوآبادی قائم کی اور اس طرح شہر پر پرتگیزیوں کا قبضہ ہو گیا۔ انھوں نے غیر ملکی تاجروں کے سابقہ حقوق دھیرے دھیرے ختم کر دیے۔

اس کے چند برس قبل کالی کٹ میں بھی حالات بالکل ایسے ہی تھے جب پرتگالیوں نے یہاں اپنے قدم جمانے کی کوشش کی تو زمورن یعنی وہاں کے بادشاہ کی رعایا نے جو مشرق سے درآمدی تجارت میں مشغول تھی ان کی حمایت کی برخلاف اس کے عرب اور مصری تاجروں نے جو بحر قلزم کی برآمدی تجارت پر قابض تھے ان کی مخالفت کی۔ ملاکا کی طرح یہاں بھی سامان درآمد کرنے والے تاجر نئے گاہکوں کا خیر مقدم اور برآمد کرنے والے ان کی مخالفت میں پوری سعی کرتے۔ یہاں بھی برآمد کرنے والوں نے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کر کے پرتگیزیوں کو حکام کے ساتھ معاہدہ کرنے میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ پھر یہ عرب اور مصری تاجر کالی کٹ کے زمورن کی ماتحتی میں نہ تھے بلکہ ان کا خود ایک گورنر وہیں مقیم رہتا۔ اس طور پر ملاکا میں متعدد غیر ملکیوں کی خود مختار تجارتی نوآبادیوں کی طرح کالی کٹ میں بھی غیر ملکیوں کی ایک خود مختار اور مقامی قوانین سے آزاد تجارتی نوآبادی تھی۔

اوائل سولھویں صدی کے دوران ہندوستانی بندروں میں تنہا کالی کٹ ہی میں تاجروں کے ملکی قانون کی دسترس سے باہر ہونے کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا بلکہ باربوسا

کی تحریر کے مطابق یہ طریقہ ساحل کے دیگر وسیع علاقوں پر بھی رائج تھا۔ ملا بار کے متعلق تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشرقی ساحل کے "چیٹی لوگ" اپنے معاملات خود طے کرتے ہیں، بادشاہ کا ان کے جرائم کی تحقیقات سے تعلق نہ ہوا کرتا۔ وہ خود ایک دوسرے کی دادرسی کر لیتے ہیں جس سے بادشاہ مطمئن رہتا ہے" اسی علاقہ میں غیر ملکی مسلمان "شہر میں ایک مور قوم کا (مسلمان) صوبے دار رکھتے ہیں جو بادشاہ کی مداخلت کے بغیر ان پر حکومت کرتا ہے اور انھیں سزائیں دیتا ہے۔ البتہ صوبے دار کو صرف بعض معاملات کی خبر بادشاہ کو دینا ہوتا ہے یہ کیال میں بھی صدف گیری کا اجارہ دار بغیر بادشاہ کی مداخلت کے مور لوگوں (مسلمانوں) کی دادرسی اور ان کے درمیان مقدمات فیصل کرتا ہے" باربوسا کی تحریر کے مطابق عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پرتگیزی اثرات کے تحت ملکی قوانین کے تبدیل ہونے کے قبل ہی سے ہندوستانی ساحلوں پر تاجروں کے ملکی قوانین کے حدود اختیار سے باہر رہنے کا طریقہ رائج تھا اس میں شک نہیں کہ یورپ سے پہلے پہل آنے والے تاجر اس طریقہ سے مانوس تھے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ولندیزی اور انگریز تاجروں نے اسے ہندوستان اور نیز مشرق البعد کے جزیروں میں بلا تردد قبول کر لیا تھا اور یہ خیال کہ یہ لوگ اس طریقہ کو یورپ سے لائے تھے ایک غیر تاریخی حقیقت ہے۔

لیکن پرتگیزیوں کی ہندوستان میں ابتدائی نوآبادیات اس ایشیائی رواج کی پابند نہ تھیں کیونکہ ان کے مقاصد تجارت کے علاوہ اور بہت کچھ تھے۔ ان کی شروع کی مہموں کے سربراہ عموماً علاقائی مراعات پر اصرار کیا کرتے اور بصورت دیگر وہ علاقوں پر طاقت کے ذریعہ قابض ہو جایا کرتے۔ لیکن ان کا یہ عمل تاجروں کی حیثیت میں نہیں بلکہ شاہ پرتگال کے نمائندوں کی حیثیت میں ہوا کرتا۔ مگر ان کی بعد کی بعض نوآبادیات سے مثلاً ہگلی قریب قریب مذکورہ ایشیائی نمونہ پر تھیں لیکن یہاں پر بھی یہ لوگ اپنے علاقائی تسلط کا سہارا لیتے اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھاتے۔ وقائع نگار خافی خاں کی تحریر کے مطابق پرتگیزیوں نے ہگلی میں اپنے گودام اور رہائش کے لیے زمین کے حصول سے ابتدا کی لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی حدود سے تجاوز کیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ بیان عمومی اعتبار سے

درست ہے اور پرتگیزی تاجروں نے ایشیا میں اپنے ہم قوموں کے قائم کیے ہوئے بحری تسلط کے بل بوتے پر، اپنی نوآبادیوں میں فرمانروائی کے اختیارات غضب کر لیے۔

دوسری طرف، ولندیزیوں کی بالکل شروع شروع کی نوآبادیاں خالصتہً تجارتی نوعیت کی تھیں اور وہ مروجہ ایشیائی طریقوں کی پابند تھیں۔ ان کے سلسلہ میں کسی سابقہ باب میں سمندری سفر اور تجارتی کوٹھی کے درمیان جو امتیاز قائم کیا گیا ہے اسے ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ ایسے تجارتی سمندری سفر کے سلسلہ میں جس میں کسی بندر پر جہاز کا قیام محض خرید و فروخت کے لیے ضروری مدت تک رہا کرتا، کسی مستقل معاہدہ کی ضرورت نہ ہوتی اس کے لیے زیادہ سے زیادہ درآمدی اور بندر کے دیگر محاصل کے متعلق عارضی معاہدہ کافی ہوتا چنانچہ تجارتی سمندری سفر کے ایک مثالی نمونہ یعنی ہاؤٹمین کے زیر سرکردگی پہلے ولندیزی مہم کے احوال میں، باوجودیکہ اس امر کا اشارہ پایا جاتا ہے کہ ممکن ہے کہ چینی تاجروں کو وہ حقوق حاصل رہے ہوں جو غیر ملکیوں کو دیگر ایشیائی بندروں پر حاصل تھے، مگر ان میں جاوا کی غیر ملکی نوآبادیوں کی صورتِ حال کے متعلق کوئی[۵] براہ راست اطلاع نہیں ملتی۔ ولندیزیوں کے لیے اس نوعیت کے حقوق کا صرف اسی وقت سوال پیدا ہو سکتا تھا جب خالص تجارتی مقصد کے سمندری سفر کو خاطر خواہ نہ تصور کرتے ہوئے تجارتی کوٹھی کے قیام کا اگلا قدم اٹھایا جاتا چنانچہ کسی بندر پر ایک بار ولندیزی نوآبادی کے قیام کا فیصلہ کر لینے کے بعد ان کے اور مقامی حکام کے مابین تعلقات کو واضح طور پر متعین کرنا ضروری ہو جاتا کیوں کہ ان کے جہازوں کی غیر موجودگی کے دنوں میں انھیں اپنی حفاظت کے لیے حکام کے محتاج رہتی۔ ہاؤٹمین کے بعد کی مہم کے مطبوعہ حالات نامکمل ہیں اور میں پہلی ولندیزی تجارتی کوٹھی کے واقعی قیام کے حالات کا پتہ چلانے سے قاصر رہا لیکن

---

[۵] ہاؤٹمین کے سمندری سفر کے روزنامچہ (JOURNAL) میں مندرج بنتم کے حالات کے سلسلہ میں چینی تاجروں کی ایک علیحدہ بستی کا ذکر آیا ہے لیکن ان کی حیثیت کی تفصیلات نہیں دی گئی ہیں (HOUTMAN I, 108.)۔ اس امر سے کہ ولندیزی بٹاویا میں چینیوں کے ایک "کپتان" کو تسلیم کرتے تھے یہ پتہ چلتا ہے کہ جاوا میں چینیوں کی ابتدائی بستیاں خود مختار تھیں۔

ولندیزی آڑھتیے یقینی طور پر ستمبر 1602 کے قبل سے اشیٔن میں مقیم تھے اور اسی سال کے دسمبر میں بنتم میں بھی آڑھتیے مقرر کیے گئے۔ یہ تصور کرنے کے لیے معقول وجوہ پائے جاتے ہیں کہ شروع ہی سے یہ ملکی قانون سے مستثنیٰ تھے کیونکہ تجارتی کوٹھیوں کے لیے سب سے ابتدائی اور اب تک محفوظ ضابطے بحریہ 1603 میں کسی نئے طریقہ کے طور پر نہیں بلکہ ایک مروجہ دستور کی حیثیت سے تجارتی کوٹھیوں کے سربراہوں کے حاکمانہ اختیارات دیے گئے تھے اور وہ سزائیں دینے کے بھی مجاز تھے۔ لہٰذا 1603 میں اور غالباً اس سے تھوڑا قبل بھی، ولندیزیوں کو وہی حقوق حاصل تھے جو عربوں کو ہندوستان میں ایک صدی پہلے حاصل تھے۔ ان کی نوآبادی یا تجارتی کوٹھی قبل ہی سے ایک خود اختیار غیر ملکی بستی تھی۔ سب سے ابتدائی انگریزی بستیوں کے سلسلہ میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں پائی جاتی کیونکہ ان کے پہلے جہازی بیڑہ کے سربراہ نے اشیٔن میں ایک معاہدہ کا معاملہ کرنے کے بعد اپنے کاروبار کی ابتدا کی تھی۔ اس معاہدہ کی رو سے انھیں اندرونی خودمختاری حاصل تھی اور اس کے بعد کے جہازی بیڑوں کو انگلستان سے جو ہدایات جاری کی گئیں انھیں اشیٔن کے اس معاہدہ کو بطور ایک موزوں مثال کے قلم بند کیا تھا۔

ہندوستان کی دونوں سمتوں پر بھی یہی طریقہ رائج تھا۔ 1606 میں ولندیزیوں نے پولی کٹ میں ایک بستی قائم کرنے کی کوشش کی لیکن پرتگیزیوں کی مخالفت کے باعث کوئی معاہدہ نہ ہو سکا۔ مجبوراً ان کے جہاز کو مسولی پٹم جانا پڑا اور وہاں اوّلاً مقامی حکّام کے ساتھ گفت و شنید ہوئی اور بالآخر شاہ گولکنڈہ سے معاہدہ کرنے کے بعد تجارتی کوٹھیوں کا قیام عمل میں آیا۔ چند برسوں بعد اس سے مزید جنوب کے ہندو حکّام کے ساتھ ان کی گفت و شنید کی اطلاع ملتی ہے جس کے نتیجہ میں ٹگناپٹم اور پولی کٹ میں بستیاں قائم ہوئیں اور کالی کٹ سے بھی ایک معاہدہ ہوا۔ لیکن یہ معاہدہ برقرار نہ رہ سکا۔ مشرقی ساحل کے تجربہ سے سورت میں ایک ولندیزی بستی کے لیے شرائط کا مسودہ تیار کرنے میں فائدہ اٹھایا گیا اور اس میں بھی فوج داری کے حقوق جو حکومت کی خود اختیاری کی امتیازی تھے، بھی شامل کیے گئے۔ لیکن مملکت مغلیہ کے حدود میں انگریزوں نے پہل کی اور وہاں صورت

حال ایشیا کے سمندری ملکوں کے حالات سے مختلف تھی۔ کالی کٹ، سوالی، پٹم اور پولی کٹ کے حکام، بنتم اور اشین کے بادشاہوں کی طرح ملکی قوانین سے استثنار کے رویے سے مانوس تھے۔ لیکن مغلِ اعظم کے پیش تسلط وسطی ایشیا کا نظریہ حکمرانی تھا جہاں لوگ اس قسم کے طریقوں سے ناواقف تھے اور اس کے حدود مملکت میں ایسی رعائیتوں کا حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ سورت پہنچنے والے پہلے انگریزی جہاز کے سربراہ ہاکنس کو بتایا گیا کہ مقامی حکام اسے صرف تجارت کرنے کی اجازت دینے کے مجاز تھے اور تجارتی کوٹھی کے قیام کے لیے شہنشاہ کی اجازت ضروری ہوگی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے "خصوصی مراعات" حاصل کرنے کی غرض سے اس نے آگرہ کا سفر کیا مگر جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے اس کی کوششیں ناکامیاب رہیں اور 1612 میں بیسٹ اور آلڈورتھ کے مقامی حکام کے ساتھ ایک معاہدہ کرلینے کے بعد ہی معاملات طے ہو سکے۔ اس معاہدہ کے نتیجہ میں انھیں بزعم خویش شہنشاہ کی منظوری حاصل ہوگئی تھی۔ لیکن ان کی غلطی ظاہر ہونے پر از سرِ نو گفت و شنید کا سلسلہ شروع ہوا جن کی تفصیلات سر طامس رو کے 'جنرل' (روزنامچہ۔ مترجم) میں قلمبند ہیں۔ وہ عرصہ تک ایک واضح عہدنامہ پر مصر رہا لیکن اسے بالآخر صرف ایک رعایتی حق پر جو باعتبار نتیجہ تو ایک معاہدہ تھا لیکن رسمی طور پر اس کے ابتدائی منشار سے بہت کمتر چیز تھی، راضی ہونا پڑا۔ ہمارے موجودہ مقصد کے لیے اس کی اہم ترین دفعہ وہ اجازت تھی جو انگریزوں کو اپنی بستیوں میں بلا مداخلت غیرے اپنے مذہب اور قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے سلسلہ میں دی گئی تھی۔ اس طور پر انھیں ملکی قوانین سے استثنائی حقوق حاصل ہوئے۔

اسی طور پر یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ولندیزی اور انگریزی کمپنیوں کی قائم کی ہوئی دوسری بستیاں بھی ایسے ہی معاہدوں پر مبنی تھیں جن کی رو سے تاجروں کو تجارتی معاملات میں کچھ سہولتوں کے ساتھ ساتھ انھیں اپنی قوم کے افراد پر بلاشرکت غیرے حاکمانہ اختیارات حاصل تھے۔ لیکن اس بیان کے جواز میں کہ ہندوستان میں ولندیزیوں اور انگریزوں کی وہی حیثیت تھی جو ملاکا اور کالی کٹ ایسے مقامات میں دیگر ایشیائی ممالک کے رہنے والوں کی تھی، بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ ان تاجروں نے دورِ حاضر کے دستور کے خلاف ہندوستانی حاکمانہ

اختیار کو قبول نہ کیا تھا بلکہ وہ ملک کے اندر حکام کے ساتھ کی گئی شرائط کے تحت جن کی پابندی ہر دو فریق پر لازم ہوتی رہتے اور تجارت کرتے۔ یہ مسئلہ عملی اعتبار سے اہم ہے کیونکہ اس سے ہمارے عہد کی تحریروں میں بہ کثرت پائے جانے والے بعض ایسے معاملات کی توجیہ ہوتی ہے جو واقعی حالات کا علم حاصل کیے بغیر سمجھ میں نہیں آتے۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں حکام کے جانب سے متعدد مواقع پر معاہدہ شکنی عمل میں آئی اور ایسا ہونے کی صورت میں عام قاعدہ کے مطابق جنگ کا خطرہ پیدا ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہاں وہاں منتشر تجارتی کوٹھیوں کے چند ولندیزی یا انگریز، مغلیہ شہنشاہ یا گولکنڈہ کے بادشاہ سے زمینی جنگ نہ کر سکتے تھے۔ لیکن وہ کبھی کبھی سمندروں پر کامیابی کے ساتھ جنگ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ کیونکہ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے ہندوستانی صوبوں کے پاس سمندری فوجیں نہ ہوا کرتی تھیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے واقعات جنھیں انتقامی کاروائی کہا گیا ہے۔ کے نتیجہ میں وقتاً فوقتاً تجارت کے معمول کا سلسلہ منقطع ہو جایا کرتا تھا۔ یہ انتظام ہندوستانی مالکان جہاز کے خلاف تشدد آمیز کاروائیوں کی شکل میں رونما ہوا کرتا تھا۔ ان کاروائیوں کو جنگی اقدامات تصور کرنا چاہیے۔ کسی صوبہ کی جانب سے معاہدہ شکنی کی صورت میں نقصان اٹھانے والے اس وقت کے بین الاقوامی ضابطہ کی رو سے اپنے نقصان کی جبری تلافی کرنے میں اپنے کو حق بجانب تصور کرتے تھے۔ مثل دیگر جنگی کاروائیوں کے ہمیں ان پر خاص طور سے اس لحاظ سے رائے قائم کرنی چاہیے کہ یہ اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب رہے اور اس معاملہ میں ولندیزی قطعاً برتر ثابت ہوئے۔

24-1623 کے واقعات کو ہم انگریزوں کی ایک انتقامی کاروائی کی مثال سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان واقعات کو 23-1622 اور 29-1624 کی دی انگلش فیکٹریز ان انڈیا* کی جلدوں کے دیباچوں میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ غیر ضروری تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہوئے واقعہ یوں پیش آیا کہ سورت کے انگریز آڑھتیوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے ساتھ معاہدہ شکنی کر کے زیادتی کی گئی ہے۔ لہٰذا انھوں نے بحر قلزم سے واپس آنے والے قیمتی سامانوں سے لدے ہوئے چند گجراتی جہازوں پر جبریہ قبضہ کر کے انھیں اپنے نقصانات کی تلافی ہو جانے

* [illegible]

تک بطور ضمانت اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے اپنے منصوبہ پر کامیابی کے ساتھ عمل درآمد کیا اور اس میں کوئی شک نہیں ان کا یہ عمل مملکت مغلیہ کے خلاف ایک اعلان جنگ کے مرادف تھا۔ اس کے فوری نتیجہ میں تو مغلیہ حکام نے ان کی شرائط قبول کرلیں۔ لہٰذا ایک نیا معاہدہ مرتب ہو کر نافذ کیا گیا۔ اس کی رُو سے سابقہ نقصانات کی تلافی کی گئی اور مستقبل کے لیے خاطر خواہ شرطیں منظور ہوئیں۔ ہندوستانی جہاز ان کے مالکوں کو واپس ہوئے اور انگریزوں کے چاروں جہاز انگلستان، فارس اور سماترا کی طرف رُخصت کر دیے گئے لیکن یہ تماشے کا محض پہلا حصہ تھا۔ جیسے ہی جہازوں کے رُخصت ہو جانے کے بعد انگریز اپنی جارحانہ صلاحیت سے محروم ہوئے ویسے ہی مغلوں نے دوبارہ جنگ وجدل شروع کرکے 1624ء کے اوائل میں ان کی متعدد کوٹھیوں پر قبضہ کرلیا۔ اب پھر گفت وشنید شروع ہوئی اور بالآخر ایک معاہدہ عمل میں آیا جس کے تحت انھیں صرف تجارت کرنے کی اجازت اور نیز ان کی اندرونی خود مختاری بحال رہی لیکن ان کے علاوہ دیگر سابقہ مراعات کے بیشتر حصے سے وہ محروم ہوگئے۔ انگریزوں نے مزید اقدامات پر غور کرنے کے بعد اس خیال کو ترک کر دیا لہٰذا 1624ء کا معاہدہ نافذ رہا اور چند برسوں تک اس قسم کی کوئی پریشانی پیش نہ آئی۔ ہندوستانی جہازوں کو ضبط کرنے کی بنا پر سورت کے انگریز دست درازی کے ملزم قرار دیے جاتے ہیں لیکن بہ اعتبار ایک جنگی اقدام کے ان کا یہ عمل بالکل جائز تھا۔ ان سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ صورتِ حال کا صحیح اندازہ نہ کرسکے۔ انھیں یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ ان کی قوت کا سرمایہ صرف ان کے جہاز تھے اور چونکہ تجارتی ضروریات کے لحاظ سے وہ اپنے جہازوں کو بندر پر رکھنے سے معذور رہتے تھے لہٰذا ایک ایسے دشمن سے جنگ چھیڑنا جو جہازوں کی غیر موجودگی میں ان سے بہت زیادہ طاقت رکھتا تھا ان کا دانشمندی کے خلاف عمل تھا۔ یہ تو اطالوی سیاح ڈیلا ویلے کی جو ان دنوں گوا میں مقیم تھا اس مخصوص واقعہ کے متعلق رائے ہے۔ اسے پرتگالی ذرائع سے معلومات حاصل ہوئی تھیں جنھوں نے انگریزوں کے عمل کو ناموافق انداز میں پیش کیا تھا۔ لیکن اس عمومی مسئلہ پر اس کی رائے حسب ذیل ہے۔

میرا خیال ہے کہ اس معاملہ میں انگریزوں نے ہوشمندی سے کام نہیں لیا کیونکہ چند

DELLA VALLE X

اجنبی اور باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ ایک بڑے فرمانروا سے خود اس کی سرزمین پر جنگ کر کے اسے زیر کر سکیں۔ اور میرے خیال میں اس قسم کے اختلافات سے نپٹنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ فرمانروا سے شیریں کلامی اور صلح و آشتی کے ساتھ معاملہ طے کر لیا جائے ..... پھر بھی اگر حق رسی نہ ہو تو یہ بہتر ہوتا کہ اعلانیہ جنگ کے قبل اس کے حدود اختیار سے باہر ہو کر محفوظ طریقہ پر جنگ کی جائے اور خود اس کے ملک کے اندر ہرگز نہیں جہاں بہت سے لوگ رہتے ہیں اور بادشاہ بلاشبہ ان سب پر غالب ہے۔

پس معلوم ہوا کہ معصر غیر جانب دارانہ رائے اس قسم کے انتقامی اقدامات کے حق میں تھی مگر انگریزوں سے حماقت یہ ہوئی کہ انھوں نے ناموافق حالات میں اسے اختیار کیا۔ اس موقع پر انگریزوں کے عمل کا اس کے چند برسوں بعد ولندیزیوں کے طرز عمل سے موازنہ کیا جا سکتا ہے جب شاہ گولکنڈہ کی زیادتیوں سے عاجز آ کر پہلے انھوں نے مسولی پٹم سے اپنی تجارتی کوٹھی کو منتقل کر دیا اور پھر اپنے مستقر پولی کٹ سے دشمن کے جہازوں کی ناکہ بندی شروع کی۔ ان کی یہ کارروائی کامیاب رہی۔ حکام نے ناکہ بندی کرنے والے بیڑے کے سربراہ کے ساتھ گفت و شنید شروع کی، مسولی پٹم کے بندر کا صوبیدار معزول ہوا اور ایک شاہی فرمان کے ذریعہ ولندیزیوں کو واپس آ کر دوبارہ تجارت شروع کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس کارروائی کی کامیابی کا بالکل واضح سبب علاقہ گولکنڈہ کے باہر ایک موزوں مستقر کی موجودگی تھی۔ مملکت گولکنڈہ کے پاس کوئی سمندری فوج نہ تھی جس کے نتیجہ میں مسولی پٹم، پولی کٹ کے رحم و کرم پر تھا جہاں صرف چند چھوٹے جنگی جہاز ہی ساحل پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے کافی تھے۔ ولندیزی آڑھتیوں کے پاس وہ چیز موجود تھی جو سورت کے انگریزوں کے پاس نہ تھی یعنی وہ خود کوئی خطرہ مول لیے بغیر اپنے دشمن کو ان کے غیر محفوظ مقام پر خوف زدہ کرنے کے لیے کافی طاقت رکھتے تھے۔ پس وہ اپنے معاہدہ کی شرائط کی پابندی کرانے پر بھی قادر تھے۔

پولی کٹ کا قلعہ جو اس موقع پر اس قدر کارآمد ثابت ہوا، ہندوستان میں یورپی اقوام کے علاقائی تسلّط کے دوسرے دور کی علامت ہے۔ جس طور پر سمندری سفر کے نتیجہ میں کوٹھیاں قائم ہوئیں اسی طور پر تجارتی کوٹھیاں، قلعوں کے قیام کا سبب بنیں کیونکہ ایک غیر مسلح تجارتی کوٹھی اپنے اندر رہنے والوں کی حفاظت یا ان شرائط

کی جن کے تحت وہ وجود میں آئی تھی پابندی کی ضامن نہ ہو سکتی تھی۔ پس تجارتی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے قلعہ پولی کٹ کا قیام خصوصی دلچسپی کا حامل ہے کیونکہ یہ کسی بھی یورپی کمپنی کے تاجروں کا ہندوستان میں پہلا قلعہ تھا اور یہ ارماگون اور مدراس کے قلعوں کے قیام کا بھی براہ راست سبب بنا۔ مجھے اس قلعہ کے قیام کا کوئی مربوط تذکرہ نہیں ملتا لیکن ہمعصر تحریریں شاہد ہیں کہ اس کے قیام کو کسی بالارادہ کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ صرف ایک اتفاقی واقعہ تصور کرنا چاہیے۔ جیسا کہ باب 2 میں گذر چکا ہے کہ ولندیزیوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ دریائے کسٹنا کے ڈیلٹا میں واقع ان کی پہلی ہندوستانی کوٹھیاں ان کی دلچسپی کی تمام منڈیوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی نہ تھیں لہذا وہ مزید جنوب کا رُخ کرنے پر مجبور ہوئے۔ وہ سب سے پہلے ایک نائک یعنی سردار سے تگناپٹم میں اپنی نوآبادی قائم کرنے کی اجازت کے خواہاں ہوئے اور نائک نے اس کے بجائے انھیں قلعہ بنانے کی پیشکش کی۔ لیکن ولندیزیوں نے اس پیشکش کو قبول نہ کرتے ہوئے ان کی حفاظت ہی میں رہنا پسند کیا۔ بہ الفاظ دیگر اس وقت وہ صرف اپنی تجارتی کوٹھی قائم کرنے پر قانع تھے[1]۔ برس دو برس بعد انھوں نے اپنے کاروبار کو پولی کٹ تک بڑھانا چاہا اور اس مقصد کے تحت انھوں نے چندر گری کے راجہ سے اجازت لے کر تگناپٹم کے نمونہ پر وہاں اپنی بستی قائم کی۔ لہٰذا شروع میں پولی کٹ محض ایک تجارتی کوٹھی کی حیثیت میں تھا۔ سینٹ طوم میں جو خود بھی تقریباً اسی نوعیت کی ایک نوآبادی تھی پرتگیزیوں کی جارحانہ کارروائی ابتدا میں اس کوٹھی کے قلعہ میں تبدیل ہونے کا سبب بنی[2]۔ 1612ء میں پرتگیزیوں نے پولی کٹ پر حملہ کر کے وہاں سے ولندیزیوں

---

[1] جو تحریریں میری نظر سے گذری ہیں وہ یہ نہیں واضح کرتیں کہ آخر نائک نے قلعہ بنانے کی کیوں پیشکش کی لیکن اس نے قیاساً یہ سوچا ہوگا کہ پرتگیزیوں نے اس نواح میں جو مثال قائم کی تھی، ولندیزی بھی اس کی پیروی کریں گے۔ بہر حال، اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ پیشکش کی گئی تھی جو مسترد ہوئی۔

[2] میرا خیال ہے کہ سینٹ طوم ان مقامات میں تھا جہاں پرتگیزیوں نے منظور شدہ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کو خارج کر دیا۔ چندر گری کا راجہ ولندیزیوں کی حفاظت کے سلسلہ میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا چاہتا تھا لیکن پرتگیزیوں کے خلاف وہ کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے سے مجبور تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے ولندیزی گماشتے کے ساتھ ایک اور معاہدہ کیا جس کے تحت مقامی حکام کے خرچ پر وہاں ایک قلعہ کی تعمیر اور اس میں ان کے ساتھ ساتھ ولندیزیوں کا رہنا طے ہوا۔ لیکن مقامی حکام نے اپنی ذمہ داری کو پورا نہ کیا اور قلعہ کی تعمیر نامکمل رہی۔ ولندیزی گماشتوں نے پھر اسے کمپنی کے صرفہ پر مکمل کرایا۔ لہٰذا مشترکہ قیام کے سلسلہ میں نزاع کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ بالآخر ہندوستانی فوجیں وہاں سے ہٹا لی گئیں اور 1616ء کے ایک معاہدہ کی رُو سے ولندیزیوں کو اس پر تنہا قبضہ دے دیا گیا اور انھوں نے اسے قلعہ گلڈریا* کے نام سے موسوم کیا۔ کچھ عرصہ تک اس کی حیثیت ایک قلعہ کے علاوہ اور کچھ نہ تھی کیونکہ میتھولڈ جو کچھ عرصہ تک اس میں رہ چکا تھا کی اطلاع کے مطابق ولندیزی مقامی باشندوں پر حکومت نہ کرتے نہ محصول وصول کرتے اور نہ ہی قوانین تجویز کرتے بلکہ محض پرتگیزیوں سے مقابلہ آرائی اور اپنے کاروباری مشاغل میں مصروف رہتے۔ یہ صحیح ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے علاقوں کو وسیع کیا لیکن قلعہ پر قبضہ جس کے نتیجہ میں وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوئے کسی کوشش سے نہیں بلکہ صرف حالات کے تحت حاصل ہو گیا تھا۔ شروع میں تو انھوں نے چندر گری کے راجہ ہی سے پرتگیزیوں سے اپنی حفاظت کی استدعا کی تھی لیکن حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ مختلف مراحل سے گذرتے ہوئے انھوں نے ایک قلعہ پر قبضہ حاصل کر لیا جس نے پورے ہندوستان میں ایک نئے رواج کی بنیاد ڈالی۔

(صہ 84 سے آگے)
اختیارات سے تجاوز کیا تھا۔ COUTO میں سینٹ ٹامس اور پرتگیزیوں کے مغربی ساحل پر علاقوں کے درمیان امتیاز قائم کیا گیا ہے۔ یہ بادشاہ کی "میراث" کی جگہ نہ تھی بلکہ یہاں اس کے وہ آسامی آباد تھے، اور نہ اس کی مملکت کے قانون نافذ تھے۔ بقول میتھولڈ یہاں پرتگیزیوں کی حکومت تھی "مخصوص اس کے باوجود کسی درجہ میں نائک کی ماتحتی میں رہنا پڑتا تھا" خاص شہر میں بیشک پرتگیزیوں کی خود اپنی حکومت تھی لیکن وہ بہرحال اس علاقہ کے فرمانروا کی حیثیت میں نہ تھے

* FORT GELDRIA

مسولی پٹم کی نزاع کے سلسلہ میں پولی کٹ پر قبضہ جس طور پر کار آمد ثابت ہوا تھا اس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ 1626ء میں ولندیزی کمپنی سورت پر اپنا قابو رکھنے کی غرض سے اسی قسم کے مسلح بندر کے حصول کی خواہش مند تھی اور تقریباً انھیں ایام میں انگریز بھی کو پرتگیزیوں سے لینا چاہتے تھے[1]۔ بعد میں یہ منصوبہ ترک کر دیا گیا لیکن مشرقی ساحل پر ارماگون میں بنایا ہوا انگریزوں کا پہلا قلعہ پولی کٹ کی ایک نقل تھی اور اس کا مقصد گولکنڈہ کے حکمرانوں کو مرعوب کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی تجارت کے لیے بھی سہولتیں فراہم کرنا تھا۔ قلعہ ارماگون کے جانشین قلعۂ مدراس کی تعمیر کے بھی یہی مقاصد تھے۔ اس کا ایک بانی اینڈریو کوگن اس طور پر رقم طراز ہے۔

کمپنی کو چاہیے کہ وہ ہندوستان میں اپنی جائداد[2] کی حفاظت کے خیال سے ایک معقول جگہ کی تعمیر کا حکم دے۔ اس کے نہ ہونے سے جس قدر نقصان ہو رہا ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ اور کیا آپ کی جائداد سے جملہ مطالبات پورے نہیں ہوئے ہیں خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز؟ اور آخر میں کیا ہمیں اس کا یقین ہے کہ پرتگالیوں اور ولندیزیوں کے ساتھ مستقلاً صلح قائم رہے گی؟ ہرگز نہیں۔ کیونکہ اس وقت ان کی طرف سے جو صلح کا اعلان ہے اس میں ان کی خود غرضی وابستہ ہے۔ ان جملہ امور کے پیش نظر یہ انتہائی ضروری ہے کہ سب سے پہلے ایک مناسب جگہ تعمیر کی جائے جس سے یہ فوائد حاصل ہوں۔ آپ کی بیشتر جائداد محفوظ رہے گی اور اگر کوئی حملہ ہوتا ہے تو آپ اپنی حفاظت کر سکیں گے۔

اس طور پر ولندیزی اور انگریزی کمپنیاں مشرقی ساحل کے قلعوں پر قابض ہوئیں[3]۔ مدراس

---

[1] اس کے چند برس قبل طامس رو کو ساحل گجرات پر قلعہ کی تعمیر کا خیال پیدا ہوا تھا لیکن اخراجات کی بنا پر اس نے یہ خیال ترک کر دیا۔

[2] اس وقت تک لفظ ESTATE زمینی جائداد کے اپنے موجودہ مفہوم تک محدود نہ تھا بلکہ عام جائداد کے مفہوم میں استعمال ہوتا تھا۔ اس کا سابقہ مفہوم اب بھی PERSONAL ESTATE جیسے قانونی فقرہ میں شامل ہے۔

[3] اہل ڈنمارک نے بھی ٹرنکوئبار (TRANQUEBAR) میں ایک قلعہ حاصل کیا تھا لیکن کوئی ایسا تذکرہ نہ مل سکا جس میں اس کے حصول کی تفصیلات قلمبند ہوں۔

میں قلعہ کے قیام کے دس یا پندرہ برسوں بعد سورت کے انگریز یہاں بھی ایک قلعہ کے قیام کے خواہشمند تھے۔ اس کے بھی دو اہم مقاصد تھے۔ ایک طرف تو وہ ہندوستانی حکام سے بے نیاز ہونا چاہتے تھے اور دوسری طرف جس طرح پولی کٹ کے ولندیزی پرتگیزیوں سے حفاظت کے محتاج تھے اسی طرح یہاں کے انگریزوں کو ولندیزیوں کے خلاف حفاظت کی ضرورت تھی۔ 1653ء میں بمبئی پر قابض ہونے کے ایک منصوبہ کی ہمیں اطلاع ملتی ہے۔ 1654ء میں کمپنی نے سورت میں اپنے سربراہ (پریسیڈنٹ) کو بمبئی، بسین یا کسی دوسرے مناسب قیام کے متعلق گفت وشنید کا مجاز کیا اور حالانکہ اس سلسلہ میں زیر مطالعہ عہد کے دوران کوئی قطعی نتیجہ برآمد نہ ہوا لیکن اس کے اختتام کے چند برسوں بعد ہی انگریزوں نے بمبئی میں اپنے قدم جما لیے اور ولندیزیوں نے کوچین کا قلعہ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد سے ہم قلعہ کے قیام کو ہندوستانی ساحلوں پر یورپ کی تجارتی مہم کا ایک جزو لازم تصور کر سکتے ہیں اور جہاں تک علاقائی تسلط کے سلسلہ میں انگریزوں کے اس کے بعد کے اقدامات کا تعلق ہے وہ تصنیف ہذا کے حدود کے باہر ہیں۔

سطور بالا میں، میں نے سمندری سفر سے تجارتی کوٹھی کے قیام تک اور تجارتی کوٹھی سے قلعہ کے قیام تک کی تجارتی پالیسی کے تدریجی ارتقا پر بحث کی ہے۔ سولھویں صدی کے دوران یورپی تاجروں کی پرواز، جانے بوجھے سمندری سفروں کی حد سے آگے نہ بڑھی تھی لیکن مشرقی منڈیوں کے حالات، تجارتی کوٹھیوں کے قیام کے متقضی تھے اور جب تجارتی کوٹھیاں قائم ہو جاتیں تو اس وقت کے سیاسی اور انتظامی ماحول کے تحت ساحلوں پر قلعوں کی تعمیر لازمی ہو جاتی تھی۔ لیکن ولندیزی اور انگریز، تجارتی کوٹھیوں میں مقیم ہوں خواہ قلعوں میں، انھوں نے ہندوستانی حکومت کے حدود اختیار کو نہ تو تسلیم کیا اور نہ ان سے اس کا مطالبہ ہی کیا گیا۔ حکام کے ساتھ معاہدوں کے تحت انھوں نے خود اختیار آبادیاں قائم کیں اور وہ حکام کے طرز عمل کا ان کے حدود سے باہر رہتے ہوئے مشاہدہ کر سکتے تھے۔ وہ اور ہندوستانی صوبوں میں رہنے والی عام رعایا کسی مشترکہ سیاسی مفاد کی بندھنوں میں وابستہ نہ تھی اور اس وقت حکومت اور رعایا کے باہمی تعلقات کے متعلق ان کے قول آزاد عینی شاہد کے بیانات کی حیثیت میں واجب احترام ہیں لہٰذا وہ ہماری معلومات کے ایک اہم خلاء کو پُر کرتے ہیں کیونکہ ہمارے عہد کے متعلق ہندوستانی تحریریں قریب

بالکل سرکاری نقطۂ نگاہ سے لکھی گئی ہیں اور وہ اکثر حکمرانوں کی رسمی قصیدہ خوانی کے انداز میں تصویر کا صرف ایک رُخ پیش کرتی ہیں۔ دربار یا دارالحکومت کے ماحول میں اس وقت کے مروجہ قوانین کو جس نگاہ سے دیکھا جاتا تھا ان کے حالات کے لیے ہمارا انحصار انھیں تحریروں پر ہے لیکن یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ان قوانین پر واقعی عمل درآمد کیوں کر ہوا کرتا تھا اور ملک کے شہروں اور مواضعات میں انھیں کس نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، ہمیں ولندیزی اور انگریزی تحریروں کی ورق گردانی کرنی چاہیے۔

ابتداء ہی میں ایک اور بات کی نشان دہی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ میں آنے والی بحث میں ہندوستان کے مختلف انتظامی ضابطوں کا تجزیہ معاشی نقطۂ نگاہ سے کروں گا اور میرے اخذ کردہ نتائج اس امر پر دلالت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ سترھویں صدی کا ہندوستان عام انسان کے لیے جہنم کدہ تھا۔ غالباً یہ حجت پیش کی جاسکتی ہے کہ اس رائے کا اطلاق پورے ایشیا پر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ایشیائی ملکوں کے درمیان جہانگیر اور شاہجہاں کے نظام حکومت کو نسبتاً اونچا مقام حاصل تھا۔ یہ بلاشک چین سے کمتر درجہ کا تھا لیکن متعدد اقوام کے سیاحوں اور تاجروں کے بیانات شاہد ہیں کہ انتظامی معاملہ میں ہم مملکت مغلیہ کو فارس یا جاپان کا تقریباً مساوی اور بہ سمت مغرب حکومت ترکیہ، بہ سمت جنوب حکومت اشین اور بہ سمت مشرق حکومت اراکان، پیگو اور سیام سے کہیں بہتر قرار دے سکتے ہیں۔ اگر میرے مطالعہ کے حدود میں مختلف ممالک کے انتظامی ضابطوں کا تقابلی جائزہ شامل ہوتا تو میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کرتا لیکن ایک ایسی تصنیف کے لیے جو تنہا ہندوستان سے متعلق ہو صرف یہ عمومی بیان کافی ہونا چاہیے اور ان قارئین کو جو یہ تصور کرتے ہوں کہ ہندوستانی انتظامی ضابطوں کے متعلق میرا بیان اس درجہ ناموافق ہے کہ یہ صحیح نہیں ہوسکتا، میرا مشورہ ہے کہ مذکورہ بالا دیگر ممالک میں سے بعض کی صورت حال کا وہ خود جائزہ لیں۔

فصل 2۔ ہندوستانی نظم و نسق کے طریقے

جن تحریروں کی نوعیت پر پہلی فصل میں مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے ان کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ زیر مطالعہ عہد کے ہندوستان میں بارش کے بعد انتظام

حکومت کا طریقِ عمل ملک کی معاشی زندگی کا اہم ترین عنصر تھا۔ ملکی آمدنی کی تقسیم پر یہ اس درجہ میں براہ راست اثر انداز ہوتی تھی کہ اسے موجودہ دور میں سمجھنا دشوار ہوگا کیونکہ اس وقت کی متعدد حکومتیں زمین کی مجموعی پیداوار کے تقریباً نصف حصہ کا خود انتظام کرتی تھیں اور یہ انتظام کچھ اس نہج پر کیا جاتا تاکہ پیدا کرنے والے کے لیے صرف اس کی گذر بسر بھر کے لیے یا اس سے بہت تھوڑا زاید بچ جائے اور جس طبقہ کا پیدا کرنے کے عمل سے کوئی تعلق نہ ہوتا اس کی قوتیں پیداوار کے زیادہ سے زیادہ حصے کے حصول کی جدوجہد پر صرف ہوا کرتیں۔ اس طریقہ کا پیداوار پر ناموافق رد عمل ہونا لازم تھا۔ ان حالات میں پیدا کرنے والوں کے اندر محنت کرنے کا فطری حوصلہ مفقود ہو گیا تھا کیونکہ انھیں اس کی توقع نہ رہتی کہ ان کی آمدنی میں اضافہ کا کوئی معقول حصہ ان کے ہاتھ آئے گا۔ لائق اور باصلاحیت افراد پیدا کرنے کے عمل سے بددل ہو کر پیداوار کی تقسیم کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے تھے کیونکہ انھیں اس عمل میں زیادہ فوائد نظر آتے تھے۔ ان دنوں بمقابلہ کسان کے چپراسی بننا بہتر تصور کیا جاتا تھا اور وہ معترضین جو ہندوستان کے دماغی اور جسمانی قوت رکھنے والے افراد کے سرکاری ملازمت کو زیادہ پسند کرنے پر تعجب کرتے ہیں انھیں اس ذہنیت کی توجیہ کے لیے صدیوں کی اس قدیم روایت پر نظر رکھنی چاہیے جب سوائے اس کے کوئی اور ذریعہ معاش ممکن نہ تھا۔ لہٰذا ہمارا دورِ حاضر سے تعلق ہونے کی صورت میں جس قدر ضروری ہوتا اس سے زیادہ تفصیلی طور پر ہمیں اپنے عہد کے نظم و نسق کی نوعیت اور اس کے طریقوں کا جائزہ لینا چاہیے۔ میں پہلے مروجہ نظاموں کے خاکہ کو مجملاً بیان کرنے کے بعد ان کی واقعی کارکردگی پر تفصیلی بحث کروں گا۔

زیر بحث ہندوستانی حکومتیں سب کی سب مطلق العنان تھیں اور ایسے عوامی ادارے جو با اختیار نہ صحیح با اثر ہی ہوتے نہ پائے جاتے تھے۔ طاقت کا مرکز دار الحکومت ہوا کرتا اور جملہ عمل نظری اعتبار سے فرمانروا کے حکم ہی سے صادر ہوتے خواہ وہ کسی ماتحت ہی کا عمل کیوں نہ ہو جو اس نے اپنے ولی نعمت کے نام پر کیا ہو۔ تحریری قوانین کا کوئی ضابطہ جیسا کہ اس اصطلاح کا ان دنوں مفہوم سمجھا جاتا ہے نہ تھا اور نہ ہی حکومت کے احکام یا ضابطوں کو نافذ یا خوش اسلوبی کے ساتھ ترتیب

دینے والا کوئی عوامی نظم تھا۔ مذہبی فرائض کو چھوڑ کر بقیہ معاملات میں حکمراں ہر بازپرس سے بے نیاز ہوا کرتا۔ اور آج کا حکم کل ہی منسوخ ہو سکتا تھا[1] اور اگرچہ قانون ساز اور رائے مشورہ کہنے والے ادارے تو نہ تھے لیکن ہر صوبہ میں بادشاہ کے احکام کو نافذ کرنے کی غرض سے ایک باضابطہ انتظامی نظم موجود تھا۔ دربار میں وزراً درجہ بدرجہ مقامی عملہ کے کاموں کی رہنمائی اور نگرانی کرتے رہتے تھے۔ اس عملہ کا اولین فرض مالگذاری کی وصولی تھا لیکن جو بھی احکام دیے جاتے انھیں ان کی تعمیل کرنی ہوتی اور یہ رعایا کے نہیں بلکہ حکمراں کے تابعدار ہوا کرتے لہٰذا عملی اعتبار سے ہم اندرون ملک کی ہر حکومت کی بہترین تعبیر استبداد اور دفتر شاہی کے ایک مجموعہ سے کر سکتے ہیں اور یہ امر کہ کسی مخصوص دور میں سے کون سا عنصر غالب تھا بادشاہ وقت کے ذاتی افتاد مزاج پر منحصر ہوا کرتا۔ مثلاً عہد جہانگیری میں مقامی حکام عملاً بہت وسیع اختیارات کے مالک تھے کیونکہ بادشاہ تفصیلات میں جانا پسند نہ کرتا۔ گولکنڈہ میں ایسے دور آتے رہتے جب بادشاہ کسی شمار میں نہ رہتا اور اس کے دربار کے ایرانی وزرا ہی سیاہ و سفید کے مالک ہوتے۔ ہندو علاقوں کے حالات نائکوں یعنی مقامی سرداروں کی شخصیت کے لحاظ سے بظاہر تبدیل ہوتے رہتے۔ ان میں سے بعض بادشاہ کے فرمانبردار اور بعض عملاً خود مختار رہتے۔ حکم کہیں سے بھی جاری ہوا ہو رعایا کے لیے سرکاری عملہ کی جن سے ان کا براہِ راست سابقہ رہتا تھا، تابعداری ضروری تھی۔ تاجروں، کسانوں یا اہل صرفہ کو اس سے بحث نہ ہوتی کہ کوئی مخصوص حکم بادشاہ کا ہے یا وزیر کا یا کسی اور ماتحت عہدہ دار کا۔ اسے تو موقع پر موجود عملہ سے نپٹنا ہوتا تھا۔ تحریروں میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں افراد یا برادریوں کو مقامی حکام کے مظالم کے خلاف داد رسی میں کامیابی ہوئی لیکن اس کے ساتھ ساتھ غالباً اتنی ہی مثالیں ایسی بھی ہوں گی جن میں مشتبہ حکام رشوت دے کر یا اپنے اثر و رسوخ کے ذریعہ الزام سے بری ہو کر دوبارہ اپنے منصب پر واپس آ گئے۔ ان واقعات سے ہم یہ نتیجہ

---

[1] ہندوستان کے بیشتر حصہ میں شریعت اسلامی کے ضابطوں کو نظری طور پر تسلیم کیا جاتا تھا لیکن اس طور پر نہیں جو عمال حکومت کی آزادی عمل میں حارج ہو (ملیسارٹ۔ مخطوطہ ورق)

اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ مظالم کا دور دورہ تھا اور دادرسی کا نتیجہ غیر یقینی۔[1] پس لوگوں کی فلاح و بہبود، جزاً مقامی عمال کی سیرت پر، جزاً ان پر نگرانی کے نظم کی کارگردگی پر اور جزاً بادشاہ کے مطمع نظر پر منحصر ہوتی۔

نظام حکومت کے سلسلہ میں دو واضح طریقے رائج تھے۔ بعض صورتوں میں عوامی عہدے اجارہ پر دے دیے جاتے یعنی ایک عامل اپنے عہدہ کے لیے ایک مقررہ رقم ادا کرنے کا اقرار کرتا اور اپنی وصول کی ہوئی رقم کے باقیماندہ حصہ کا خود مالک ہوتا۔ یہ طریقہ جسے ہندوستان کی سرکاری اصطلاح میں 'پکا'، یا پختہ عہدہ دار کہتے تھے ہماری عہد کی پوری مدت میں جنوبی ہندوستان میں تقریباً عمومی طور پر رائج تھا[2] اور میرا خیال ہے کہ یہ مملکت مغلیہ میں جہاں اکبر "بلا واسطہ" نظم و نسق کا متبادل طریقہ قائم کرنا چاہتا تھا، تیزی سے داخل ہو رہا تھا۔ بلا واسطہ نظم و نسق کی صورت میں جسے ہندوستان کے لوگ 'کچا'، یا خام، عہدہ دار کہتے ہیں، عامل ایک مقررہ تنخواہ پاتا ہے اور

---

[1] باب 5 میں بیان کیے گئے ویرجی ورا کے معاملہ کو ہم مقامی عہدہ داران کے مظالم کے خلاف ایک کامیاب اپیل کی مثال تصور کر سکتے ہیں۔ اس کے بالمقابل اگلی فصل میں ایک صوبیدار کے متعلق بیان کیا ہوا یہ واقعہ رکھا جا سکتا ہے جسے دربار میں سزا کے لیے طلب کیا گیا تھا لیکن جو رشوت دے کر یا اپنے اثر و رسوخ سے بری ہو کر اپنے منصب پر واپس آیا اور اس نے اپنے اوپر الزام لگانے والوں سے انتقام لینے کی دھمکی دی۔ منگی نے شاہجہاں کے ایام اسیری کے اپنے تذکرہ میں بتایا ہے کہ بوڑھا بادشاہ اپنے سابقہ نظم و نسق کو اس بنا پر حق بجانب ثابت کرتا تھا کہ مہینوں گذر جاتے اور اس کے سامنے کوئی درخواست نہ گذرتی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ عہدہ داران کے خلاف لوگوں کو شکایات نہ تھیں اس عہد کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے مشکل ہی سے قابل قبول ہو سکتا ہے (منگی ج 2 ص 19)

[2] میں نے اپنی تصنیف انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر INDIA AT THE DEATH OF AKBAR میں جنوبی ہندوستان میں اجارہ داری کے رواج کو بالواسطہ شہادت سے ماخوذ نتیجہ کے طور پر بیان کیا ہے۔ اگلی فصل میں جو معلومات استعمال میں لائی گئی ہیں وہ اس وقت تک میری نظر سے نہ گذری تھیں۔ ان معلومات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طریقہ واقعی سترھویں صدی کے اوائل میں رائج تھا۔

وہ اپنے کل وصول کیے ہوئے محاصل کے لیے اپنے سے اونچے عہدہ دار کو جوابدہ ہوتا ہے
ہمارے عہد کے دوران ہندوستان میں تنخواہ کی ادائیگی کے اعتبار سے دو مختلف
شکلیں ہوتی تھیں۔ اکبر کا مطمع نظر یہ تھا کہ دور حاضر کے طریقے کے مطابق تنخواہ نقد
خزانہ سے ادا کی جائے لیکن اس کے جانشینوں نے بالعموم جاگیر کے ذریعہ ادائیگی
کے قدیم ہندوستانی طریقہ کو اختیار کیا۔ جاگیر زمین کے ایک علاقہ کی مالگذاری کا بطور
تنخواہ اور وظیفہ کے ایک عطیہ ہوتا تھا جسے عطیہ دار مثل اپنی ذاتی جائداد کے اپنے
زیر انتظام رکھتا تھا اور اس کی کوشش رہتی تھی کہ وہ اس سے کم از کم معینہ رقم وصول
کرنے اور بعض صورت میں وہ اس سے بہت زیادہ بھی وصول کر لیتا تھا۔ جاگیریں دیگر
مقاصد کے تحت بھی دی جاتی تھیں جنھیں ہم مبہم طور پر خیراتی مقاصد کہہ سکتے ہیں اس
میں زمین کے ایک علاقہ پر کسی مسجد یا مندر کا نگراں یا کوئی خاندان یا فرد جسے یہ
بطور گذارہ یا خدمات سابقہ کے انعام کے طور پر دی گئی ہو، قابض رہ سکتا تھا اور
بعض مغلیہ صوبوں میں ان خیراتی عطیات کی میزان نسبتاً زیادہ رہا کرتی تھی ۔ آخر
میں بڑے بڑے علاقوں کا انتظام سربرآوردہ افراد یا علاقہ کے بااثر لوگوں کے
جنھیں زمیندار کہتے تھے، سپرد کر دیا جاتا تھا جو جب تک معینہ مالگذاری ادا کرتے
رہتے وسیع اختیارات کے مالک رہا کرتے تھے۔ زمیندار کی صحیح معنوں میں حیثیت
ایک اجارہ دار کے قریب ہوا کرتی لیکن اس کے قبضہ کی میعاد معمولاً زیادہ ہوتی
اور میرا خیال ہے کہ یہ معمولاً موروثی ہوا کرتی تھی لیکن یہ بادشاہ کے حکم سے چشم زدن
میں ختم بھی کی جا سکتی تھی۔ بس ہندوستان کے کسان کا آقا ان پانچ زمروں میں
سے کوئی ایک ہو سکتا تھا ، مالگذاری کا اجارہ دار، تنخواہ دار عامل ، عارضی قبضہ
رکھنے والا جاگیردار، ایک غیر سرکاری شخص یا جماعت جس کے قبضہ کی میعاد نسبتاً
زیادہ بلکہ ممکن ہے موروثی ہو یا آخر میں زمیندار۔ اس کے آقا کے اختیارات اس
قدر وسیع اور اس میں اعلیٰ سطح سے مداخلت کے امکانات اس قدر قلیل ہوا
کرتے کہ اس کے بہبود کا بیشتر مدار اس کے آقا پر ہی رہا کرتا تھا۔

ملکی انتظام میں ترقی کے ساتھ اجارہ داری کا طریقہ تقریباً متروک ہو گیا
تھا۔ لہٰذا اس کی تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ یہ طریقہ

صرف ہندوستان ہی میں رائج نہ تھا بلکہ ایک زمانہ میں تو یہ تقریباً عام تھا۔ واضح رہے کہ انگریزی کمپنی کا لندن کے درآمدی محاصل کے اجارہ داروں کے ساتھ مستقل معاملہ رہا کرتا تھا اور اس کے آڑھتیوں کا سورت اور مسولی پٹم میں درآمدی محاصل کے اجارہ داروں سے سابقہ رہا کرتا تھا۔ اس طریقہ کا رواج دو باتیں ظاہر کرتا ہے، مفصل انتظام کی راہ میں رکاوٹیں اور انتظام کے فلاحی پہلو کے بالمقابل مالی پہلو کی زیادہ اہمیت۔ انتظام میں رکاوٹوں کا سبب رسل ورسائل کے ناقص وسائل تھے اور ملکی انتظام کے فن کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ نگرانی کے ذرائع کی تدریجی نشوونما پر جو دورِ جدید کے نظام ڈاک، تار اور ریل پر منحصر ہوتے ہیں، مشتمل ہے۔ کسی ماتحت کے فاصلہ کے باعث دور ہو جانے کی صورت میں تفصیلی نگرانی ممکن نہ تھی اور عملی اعتبار سے ایک ایسا طریقہ جو ناممکنات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی توجہ کو ایک مقررہ آمدنی کی وصولی پر جسے مرکزی نقطہ تصور کیا جاتا تھا، مرتکز رکھنا کسی نہ کسی درجہ میں لائق تعریف تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ امر ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ ملکی انتظام کا فلاحی پہلو بیشتر دورِ حاضر کی پیداوار ہے۔ ایک غیر ملکی مشاہد اگر دورِ حاضر کے ہندوستانی کلکٹر کے عہدہ کے نام کی ناموزونیت پر معترض ہو تو وہ قابل معافی ہوگا، مگر زیرِ مطالعہ عہد میں یہ چیز زیرِ بحث نہ لائی جا سکتی تھی کیونکہ اس وقت کے کلکٹر کی اولین ذمہ داری خزانہ میں روپیہ کی فراہمی تھی اور یہ آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بعض صورتوں میں اس مقصد کے حصول کا بہترین طریقہ یہ ہوتا کہ اس کو اس امر کا پابند کر دیا جائے کہ خواہ کچھ بھی ہو مگر وہ مقررہ رقم ادا کر دے اور جب تک وہ اپنی اس اولین ذمہ داری کو پورا کرتا رہے اسے پورے طور پر آزاد چھوڑ دیا جائے۔

اجارہ داری کا نظم عام صورتوں میں دورِ حاضر کے نظم ونسق کے ذمہ داروں کی نگاہ میں کوئی پسندیدہ طریقہ نہ تھا لیکن جہاں تک اس کے واقعی اثرات کا تعلق ہے یہ بہت زیادہ تبدیل ہوتا رہتا تھا۔ ہندوستان میں ابتدائی انگریز حکام کو اس مالی نظم کو جو انھیں ورثہ میں ملا تھا درست کرنے کے سلسلہ میں اس طریقہ کا کافی عملی تجربہ ہوا تھا اور جن نتائج پر وہ پہنچے تھے ان کے خلاصہ کو ایک

جملہ میں جواب روز مرّہ کا قول ہو چکا ہے، بیان کیا جا سکتا ہے۔ اجارہ داری کی خرابیوں کو مناسب اجارہ دار کے انتخاب اور مناسب شرح پر رقم کے تعین سے اور نیز میعاد اجارہ کو اس قدر طویل کر کے جس میں اجارہ دار کے لیے ایک تعمیری طریق کار پر عمل پیرا ہونا کم از کم کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف، اجارہ کے مختصر المیعاد اور خالص جلب منفعت کے جذبہ سے دیے جانے کی صورت میں، لوگ بے نیاز، مظالم کا شکار ہوتے کیونکہ اس حالت میں اجارہ دار کا مطمع نظر بجز اس کے اور کچھ نہ ہوتا کہ وہ کم از کم مدت میں زیادہ سے زیادہ جبری وصولیابی کر لے۔ اجارۂ مالگذاری کے سالانہ نیلام کا طریقہ جو جیسا کہ آگے ذکر آئے گا، مملکت گولکنڈہ میں رائج تھا ملکی انتظام کے اب تک وضع کیے ہوئے طریقوں میں سب سے زیادہ ظالمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب نہ ہوں گے کہ ملک کے دوسرے حصّوں کے کسان بھی اسی طور پر مظالم کے شکار ہوتے لیکن ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ جہاں جہاں اجارہ داری کا طریقہ رائج تھا وہاں مظالم کا ہونا لازمی تھا۔

جاگیرداری کے علاقہ کے کسان کی خوش قسمتی یا بدقسمتی کا انحصار اس امر پر ہوتا کہ اس کے آقا کی جاگیر کی نوعیت کیا ہے۔ جاگیر کے طویل المیعاد ہونے کی صورت میں جب جاگیردار کے لیے فلاحی طریقوں پر عمل پیرا ہونا ممکن ہوتا، کسان کی حالت نسبتاً بہتر رہتی جیسا کہ سولھویں صدی میں بنارس کے قریب فرید خاں کی جاگیر کی یا زیر مطالعہ عہد کے اختتام پر شائستہ خاں کے تحت بنگال کی حالت تھی لیکن جاگیر کے بار بار تبدیل ہونے کی صورت میں جیسا کہ عہد جہانگیری میں پیش آیا، عارضی جاگیردار کو صرف اس بات کی فکر رہتی کہ وہ کسان سے زیادہ سے زیادہ رقم وصول کرے یا بقول ہاکنس "وہ غریبوں کو آخری حد تک نچوڑ لیتا ہے اور خود اسے ہر لمحہ اپنے علاقہ سے بیدخل کر دیے جانے کی فکر لاحق رہتی ہے[1]"۔ وہ کسان جس کی زمین نہ تو اجارہ

---

[1] ہاکنس کا جاگیرات پر واضح بیان EARLY TRAVELS & PURCHAS III۔ میں موجود ہے۔ فرید خاں کی جاگیر میں کسانوں کی خوشحالی ELLIOT IV, 313 میں اور شائستہ خاں کے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

میں شامل ہوتی اور نہ کسی جاگیر میں خوش قسمت تصور کیا جاتا کیونکہ ایسی صورت میں اس کے آقا کے لیے اس پر ظلم کرنے کا کوئی براہ راست محرک نہ ہوتا لیکن عملی اعتبار سے نگرانی کے فقدان کے باعث وہ بھی مظالم سے محفوظ نہ رہتا۔ حالانکہ اس سلسلہ میں ہماری معلومات لازماً ناقص ہیں پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم خاندان کے زمینداروں کے کسانوں کی حالت سب سے اچھی رہتی تھی۔ لیکن یہ نہ تصور کرنا چاہیے کہ یہ کسان آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ برنیر کی شہادت کے مطابق جو کسی بعد کی فصل میں قلمبند کی جائے گی، زمینداروں کے تحت بمقابلہ حکام یا جاگیرداروں کے مظالم کا اوسط کم رہا کرتا تھا۔

ایک طرف کسان کا تعلق مالگذاری زمین کے محصل سے ہوا کرتا تو دوسری طرف تاجروں اور اہل صرفہ کا مفاد پیدا کرنے کے عمل اور باربرداری پر لامحدود تعداد میں محاصل وصول کرنے کے انتظامات سے وابستہ رہتا۔ درآمدی و برآمدی محاصل کے لیے بظاہر عام طور پر اجارہ داری کا طریقہ رائج تھا کیونکہ ہم اس کا رواج سندھ اور گجرات اور نیز مشرقی ساحل پر پاتے ہیں اور جیسا کہ آگے ذکر آئے گا اجارہ داری کی صورت میں مظالم ناگزیر ہوتے۔ پیدا کرنے کے عمل اور اندرون ملک حمل و نقل پر محاصل کی صورتِ حال کو ایک فقرہ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس موضوع پر اگلے باب میں بحث آئے گی اور فی الحال صرف اس قدر بتانا کافی ہوگا کہ یہ محاصل ہمہ گیر تھے اور ان کی تشخیص کا کام مقامی حکام کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا یہ تاجروں اور اہل صرفہ کی خوشحالی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوا کرتے۔

مذکورہ بالا خلاصہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیدا کرنے کے عمل پر ملکی انتظام اس درجہ حاوی تھا کہ دورِ حاضر کے برطانوی ہندوستان میں اس کی کوئی مثال نہیں

(صفحہ ۲۹۴ سے آگے)
بنگال کے کسانوں پر احسانات کا تذکرہ ایک ۔ گذشت میں جس کا ترجمہ SARKARS STUDIES (155ff) میں کیا گیا ہے، ملتا ہے۔ مگر ان دونوں تحریروں میں قصیدہ خوانی کی گئی ہے اور ان کی زبان میں مبالغہ آرائی کی بیحد گنجائش پائی جاتی ہے۔ پھر بھی دونوں میں ان خوشحال علاقوں میں مظالم کے پھیلاؤ کا ایک عمومی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ملتی۔ اگلی فصلوں میں اس موضوع پر تفصیلی بحث آئے گی اور ہم پورے جنوبی علاقوں میں اس وقت مروجہ نظام اجارہ داری کے طریق عمل سے ابتدا کرتے ہیں۔

فصل 3۔ جنوب میں اجارہ داری کا نظام

زیر مطالعہ دور میں گولکنڈہ کے نظم ونسق کا مفصّل ترین بیان "اے ڈسکرپشن آف دی ڈومینینس آف دی کنگ کوتے بیپالائی انگ آن دی کورومنڈل کوسٹ میں ملتا ہے۔ یہ بیان پیٹروین ڈین بُروک کے حالات سفر کے بعد کی طباعتوں میں شامل کیا گیا ہے[1]۔ اس کے متن کی ترتیب سے انداز ملتا ہے کہ یہ ایک دوسرے مُصنّف کی تحریر ہے اور داخلی شہادت سے بھی اس کی قطعی طور پر تائید ہوتی ہے کیونکہ اس کے مُصنّف نے ساحل پر چھ برس صرف کیے تھے جب کہ وین ڈین بُروک کی داستان کے تکلمہ کے لیے کورومنڈل کے تفصیلی بیان کو ضروری تصوّر کرتے ہوئے اسے شامل کر دیا۔ مصنّف کا نام ظاہر نہیں کیا گیا ہے لیکن ہم اس کی تاریخ تصنیف کو احمد نگر اور پرتگیزیوں کے درمیان چوُل بندر پر "پچھلے دو برسوں کے دوران" جنگ کے حوالہ سے متعین کر سکتے ہیں۔ یہ حوالہ اس واحد جنگ سے متعلق ہو سکتا ہے جو اس علاقہ میں 1612 اور 1614 کے درمیان لڑی گئی تھی اور ہم اس تصنیف کو مِیپالی (نظام پٹم) میں تقریباً 1608 اور 1614 کی درمیان مدت میں مامور ایک ولندیزی آڑھتیے کی جس

---

[1] یہ بیان مُصنّف کے ہالینڈ واپس پہنچنے پر 1634 میں مطبوعہ حالات سفر میں نہیں ملتا۔ یہ بظاہر BEGINENDE VOORTGAUGH کے طبع ثانی ج ص 77 پر بار اوّل ملتا ہے۔ اور 1648 میں یہ تنہا بھی دوبار شائع ہوا تھا۔ اس کا کوئی قلمی نسخہ اب محفوظ نہیں ہے۔ کوتے بیپا، بین طور پر قطب شاہ کی جگہ غلط طور پر لکھا گیا ہے۔ قطب شاہ کی زیادہ صحیح شکل قطب الملک ہے جو گولکنڈہ کے خاندانی فرمانرواؤں کا لقب تھا۔

کے فرائض منصبی میں جیساکہ اس کی سرگزشت سے ظاہر ہے، مواضعات کا دمدہ شامل تھا، تحریر تصور کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ پس ہمارے پیش نظر ایک ایسے شخص کی تحریر ہے جو ملکی انتظامات کے عملی طریقوں کا عینی شاہد تھا۔

اس کے بیان کے مطابق، اس وقت گولکنڈہ کے دربار میں ایرانی جو "ہندوستان میں مدبر ترین قوم تھی" اصل طاقت کے مالک تھے۔ یہ مقامی عہدے قبول نہ کرتے بلکہ اجارہ داروں کے سربراہ یا ماتحت حکام کے نگراں کی حیثیت سے ملازم تھے۔ پوری مملکت ضلعوں میں تقسیم تھی جن کے سربراہ صوبیدار کہلاتے تھے۔ ان کا خاص کام مالگذاری کی وصولی تھا اور یہ عہدے ہر سال سب سے اونچی بولی بولنے والے کو اجارہ پر دلائے جاتے۔ بیشتر مقامی صوبیدار برہمن اور بقال تھے جو "ہندوستان بھر میں عیاری اور شرارت میں بے مثال تھے"، اور وہ دربار میں بیش قیمت تحفے اس غرض سے پہنچاتے رہتے تھے تاکہ غریبوں کی فریاد بادشاہ تک نہ پہنچ پائے۔ کسانوں سے اس قدر کثیر رقمیں وصول کی جاتیں کہ بیان کرنے والے کو تعجب ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اکثر "میں مملکت میں سفر کرتے وقت یہ تعجب کرتا تھا کہ آخر اس قدر کثیر رقمیں کہاں سے آتی ہیں کیونکہ لوگ بیحد افلاس اور تنگدستی کے عالم میں زندگی بسر کرتے ہیں"، اور دیگر مقامات پر وہ صوبیداروں کے تشدد ان دقتوں کو جو انھیں اپنے ٹھیکہ کی رقوم کو پوری کرنے میں پیش آتیں اور نتیجۃً ملک کی تنگدستی وغیرہ کا حال بیان کرتا ہے۔ ہم مروجہ مالی انتظامات کے سلسلہ میں پٹیاپولی کی مثال کو لیتے ہیں یہاں کا زر اجارہ 58,000 پگوڈا مقرر تھا لیکن اس کا یہاں کے صوبیدار کے ساتھ 1000 پگوڈے زائد پر ذیلی انتظام کیا گیا تھا منجملہ اس رقم کے صوبیدار کو 800 پگوڈے اس کے ماتحتوں

لہ میں نے "صوبیدار" کے لفظ کو اس کے ہمعصر ماخذ میں مسلسل استعمال کی وجہ سے قائم رکھا ہے لیکن بہ اعتبار معنی یہ حاکم ضلع سے زیادہ قریب ہے۔ مغلیہ صوبہ کے سربراہ کو معمولاً نائب السلطنت کہتے تھے یا اس کا ہندوستانی لقب 'صاحب صوبہ' تھا۔ پرتگیزی بظاہر مقامی حکام کے سربراہ کو جس سے ان کا سابقہ پڑتا تھا اپنی اصطلاح میں 'گورنیڈر' GOVERNADOR کہتے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ پرتگیزی ترجمانوں کی وساطت سے اس کا استعمال ولندیزیوں اور انگریزوں کے یہاں بھی ہونے لگا۔ یہ مملکت مغلیہ میں معمولاً عامل کا جو صوبہ کے نائب السلطنت کا ماتحت ہوتا تھا معنی رکھتا ہے۔

کی تنخواہ کے طور پر چھوڑ دیے گئے تھے، جب کہ خود اس مقصد کے لیے اس کی طرف سے عاید کردہ محصول سے اسے 5000 پگوڈے ملتے تھے۔ تنخواہوں کا حساب کتاب تو نقد میں ہوتا مگر یہ بیشتر غلّہ اور گھٹیا درجے کے نمک کی شکل میں ادا کی جاتی تھیں اور اس کی قیمت اصل سے کم از کم ایک تہائی سے زائد رکھ کر نفع بھی کمایا جاتا۔ اس بیان میں تشخیص مالگذاری کا طریقہ قلمبند نہیں کیا گیا ہے اور دوسری سرگزشتیں بھی اس موضوع پر خاموش ہیں۔ پس ہمارے لیے بجز یہ نتیجہ اخذ کرنے کے اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ غالبًا وصولی مالگذاری کا معیار صوبیداروں کی ضروریات سے متعین ہوا کرتا تھا۔ یہ سخت ضابطوں کے پابند رکھے جاتے تھے۔ مقرّرہ سالانہ مطالبہ تین قسطوں میں واجب الادا ہوتا۔ عدم ادائیگی کی صورت میں شدید کوڑے بازی کی سزا دی جاتی۔ راوی کا بیان ہے کہ بعض بقایہ دار صوبیداروں کی سزاؤں کے ضرب سے مستقلاً ضرر کا پہنچنا اس کے ذاتی علم میں ہے۔ لیکن کوڑے کی سزا سے دربار کے ایرانی عہدہ داروں سے قرض لے کر بچایا جاسکتا تھا۔ یہ عہدہ داران سودی کاروبار کرتے تھے اور اگر انھیں معلوم ہوجاتا کہ کوئی صوبیدار پریشانی میں مبتلا ہے تو وہ اس سے 5 فیصدی ماہانہ شرحِ سود تک وصول کرنے میں " شرم نہ محسوس کرتے " اور وہ اس طرح انھیں " آخری حد تک چوس لیتے تھے "۔

مذکورہ بیان کے اصل مفہوم کی تصدیق ایک دوسرے ولندیزی تاجر انطونی شورزx کی مجمل رپورٹ سے ہوتی ہے جو اس نے 1615ء میں مسولی پٹم سے اپنے وطن بھیجی۔ اور اس کے اہم اجزا ولیم میتھولڈ کی مشرقی ساحل پر متعدد برسوں کی ملازمت کے بعد انگلستان واپسی پر اس سے قدرے بعد کی لکھی ہوئی ایک سرگزشت کے مطابق بھی ہیں۔ میتھولڈ کے خیال کے مطابق گولکنڈہ کے بادشاہ کے رعایا سب کے سب اس کے لگان دار تھے اور لگان بہت زیادہ تھی... انتظام حکومت کو خود بادشاہ کسی سربراوردہ شخص کو اجارہ پر دے دیتا ہے جو اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اپنے سے کمتر لوگوں کو اجارہ پر دیتا ہے اور پھر وہ لوگ گاؤں کے رہنے والوں کو اس قدر زیادہ رقموں پر دے دیتے ہیں۔ یہ تخیل کہ یہ بدبخت کس قدر مصائب اور پریشانیاں برداشت کرتے ہوں گے، انتہائی دردناک ہے۔ کیونکہ اگر وہ اپنے ذمّہ کی رقم ادا کرنے سے

---

x ANTONY SHORES

قاصر رہتے اور یہ ان کی جائداد سے بھی پورا نہ ہو سکتا تو اسے ان کے جسموں سے پورا کیا جاتا ہے۔ پس بعض اوقات ایسا پیش آتا کہ وہ مار کھاتے کھاتے مر جاتے اور ان کے غیر سا ہر رہنے کی صورت میں ان کی عورتیں بچے، باپ، بھائی اور دیگر تمام رشتہ دار بقائے کی علت میں پکڑ لیے جاتے۔ انھیں یا تو یہ رقم ادا کرنا پڑتی یا پھر سزا بھگتنی پڑتی اور بعض اوقات ایسا پیش آتا کہ بادشاہ اصل اجارہ دار کو بھی بقائے کی علت میں ایسی ہی سزائیں دیتا ہے جیسا کہ ببل راؤ (جو انگریزوں کے مسولی پٹم میں تجارت شروع کرنے کے وقت سے وہاں کا صوبیدار تھا) کو دی گئی۔ اسے پوری رقم کے بقایہ کی علت میں بیٹھ، پیر اور پیٹ پر اس قدر بیت مارے گئے کہ وہ مر گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ یہ لوگ اجاروں پر زیادہ دن قابض نہیں رہ پاتے بلکہ ہر سال جولائی میں اس کا نیلام ہوتا ہے اور اسے سب سے زیادہ بولی بولنے والے کو دے دیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہر صوبیدار اپنے عہد میں غریب آبادی سے راہداری کے محاصل اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی بہ ظلم وصول کرنا ممکن ہوتا وصول کرتا ہے اور وہ اپنے اس عمل میں جس قدر بھی سختی مناسب تصور کرے اختیار کرتا ہے۔ یہ اپنے عہد کے دوران ان پرادنیٰ درجہ کے بادشاہ کی طرح حکمرانی کرتے ہیں۔

جیسا کہ میں پچھلی فصل میں قلمبند کر چکا ہوں، ملکی انتظام کا یہ طریقہ جملہ دیگر وضع کیے ہوئے طریقوں میں غالباً سب سے زیادہ ظالمانہ تھا۔ اس کی ایک سالہ میعاد، عہدوں کا سالانہ نیلام، اور بقایہ داروں کے ساتھ سختی کا برتاؤ، جبری وصولیاں اور دارالحکومت میں اجارہ داروں کے ساتھ سودی لین دین یہ سب اس طریقۂ انتظام کے اجزائے ترتیبی تھے جو پیدا کرنے والوں کو تقریباً ننگا کر دینے والا تھا۔ ایسی صورت میں ہمیں ولندیزی راوی کے اس بیان پر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ کوئی بھی دولتمند اپنی دولت کو ظاہر کرنے کی جرأت نہ کر سکتا اور نہ ہی وہ اپنے معیارِ زندگی کو اعلانیہ اونچا کر سکتا کیونکہ اس صورت میں صوبیدار اس کو تباہ کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ تراش لیتا۔ اس سرگزشت کی تائید عام طور پر دیگر مشاہدین کے ضمنی اقوال سے بھی ہوتی ہے۔ دربار میں صورتِ حال کے متعلق ایک مقام پر یہ آیا ہے کہ "وکیل،، مملکت اور دیگر اکابرین انگریزوں کی ایک درخواست کی رشوت حاصل کرنے کی غرض سے مخالفت کر رہے تھے۔ رشوت ایک ایسی چیز ہے" جو اس اطراف میں ہر راستہ کو کھول دیتی ہے . . . یہ اس علاقہ کی زبول حالی

کا عالم ہے جہاں سے حق و انصاف عرصہ ہوا رُخصت ہو چکے ہیں، غربا، امیروں کے مظالم کو بغیر کسی واد رسی کے برداشت کرتے ہیں۔" اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ درباری عہدہ داران بادشاہ کو تاریکی میں رکھتے ہیں اور بادشاہ یقین رکھتا تھا کہ وہ مطالبات جو تشدّد کے ساتھ وصول کیے جا رہے تھے پورے ہو چکے ہیں ایک ولندیزی تحریر میں بیان کیا گیا ہے کہ بادشاہ کے پاس ایک مقامی عہدہ دار کے خلاف شکایت پہنچنے پر وہ کیوں کر تحفوں اور اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کر کے بری ہو گیا اور اپنی جائے ملازمت پر واپس آ کر شکایت کرنے والوں سے انتقام لینے کی دھمکی دینے لگا۔ ہمیں اس بیان کی بھی تصدیق ملتی ہے کہ مقامی حکّام انتظامی معاملات میں انتہائی تشدّد سے کام لیتے تھے۔ 1632ء میں پٹیاپولی کے صوبیدار نے خود اپنے ہاتھوں ایک گانوں کے مکھیا کے جسم کے زمین کو نہ بونے کی سزا میں دو ٹکڑے کر ڈالے۔ اور اس نے اپنی اس اور دیگر زیادتیوں سے علاقہ کے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد مسولی پٹم میں تجارتی اشیاء کی فراہمی میں کمی کو صوبیدار کی ناقابل برداشت وصولیوں سے منسوب کیا گیا۔ حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ گولکنڈہ میں کسی صوبیدار کے لیے بجز اس کے کوئی اور چارۂ کار نہ تھا کہ وہ پورے علاقہ کی بچت کی آمدنی کو بہ جبر وصول کرے اور وہ معمولاً آمدنی کے ہر امکانی ذریعہ کو اس کی سب سے زیادہ بولی بولنے والے کو اجارہ پر دے دیا کرتا تھا چنانچہ مسولی پٹم کے انگریز آڑھتیوں نے سونے اور چاندی کے کاروبار کی اچانک اجارہ داری کی توجیہ ان الفاظ میں کی "یہاں پر ملک کا انتظام بہت زیادہ رقم پر اجارہ پر دیا گیا ہے اور اصل ذمّہ دار شخص (اجارہ دار یا ٹھیکہ دار) ایسے لوگوں کو جو آمدنی کے نئے ذرائع پیدا کریں سب سے زیادہ پسند کرتا ہے۔" یہ ایک واضح توجیہ اس واقعہ کی بھی ہے جو کسی پچھلی فصل میں بیان کیا گیا ہے یعنی یہ کہ ولندیزی تجارت کو اجارہ کا موضوع بنا کر ان کے تجارتی مقامات تک بجز تجارت کی اس انجمن کے لائسنس داروں کو جس نے یہ حق خریدے تھے دوسروں کو داخل نہ ہونے دیا گیا تھا۔ ولندیزی نفع کما رہے تھے اور گولکنڈہ میں منافع اوّلاً حکّام کے فائدہ کے لیے کمایا جاتا تھا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اکثر ولندیزی اور انگریز منفرد مواضعات اور شہروں کو اجارہ پر لیا کرتے تھے یہ اجارے کبھی اپنی کمپنی کے جانب سے اور کبھی اپنے نجی منافع کی خاطر لیے جاتے تھے۔ اس واقعہ سے میتھولڈ کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ اجارہ داری

پورے ملک میں سرایت کر چکی تھی اور صوبیدار نے ایک کثیر رقم ادا کرنے کا قرار کر کے اپنی ذمہ داری کو اپنے حدود اختیار میں کثیر التعداد ذیلی اجارہ داروں پر منتقل کر دیا تھا۔ اس طریقہ میں منتقلہ لوگوں کو جو صعوبتیں پیش آتی تھیں اس کی آخری مثال خود مسولی پٹم کے اجارہ کے متعلق بعض مراسلات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ 1626 میں ہالینڈ کے حکام بندر پر پیش آنے والی پریشانیوں سے عاجز آ کر اس کے مالی انتظام کو ٹھیکہ پر لینے کے خواہشمند ہوئے لیکن بٹاویا کے گورنر جنرل نے ان کی اس تجویز کو اس بنا پر مسترد کر دیا کہ حکومت گولکنڈہ اس قدر زیادہ رقم طلب کرتی ہے جسے ولندیزی تاجر بہ ظلم وصول کر کے ادا کرنے سے معذور رہیں گے اور یہ فیصلہ تاریخ کے ان مطالعہ کرنے والوں کے لیے جو ولندیزیوں کی مشرقی ممالک میں انتظامی کارکردگی سے مانوس ہیں معنی خیز ہے۔

اوپر قلمبند کیے گئے واقعات ہمارے عہد کی پوری مدت پر پھیلے ہوئے ہیں اور ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس موت کی ابتدا کے وقت جو انتظامی نظم چل رہا تھا تقریباً وہی آخیر تک مملکت گولکنڈہ میں قائم رہا۔ تجارتی تحریریں اس کی نواحی مملکت بیجاپور میں مروجہ انتظامی نظم کے متعلق کوئی خاص معلومات فراہم نہیں کرتیں لیکن تھوڑی بہت جو جھلکیاں نظر آجاتی ہیں وہ یہی ظاہر کرتی ہیں کہ یہاں بھی اس نوعیت کا نظم چل رہا تھا۔ مقامی صوبیداران اسے براہ راست آقاؤں کی ہدایت کے بغیر بادشاہ کے احکام کو خاطر میں نہ لاتے۔ ایک ولندیزی اطلاع مظہر ہے کہ "ایک اعلیٰ صوبیدار" تین سال میں ایک لاکھ پگوڈے کی ادائیگی کا ٹھیکہ لے کر ونگورلا پہنچا اور وہ ابھی چند ہی دن مستعدی کے ساتھ اپنی جبری وصولیاں کر پایا تھا کہ اسے اچانک ایک ایسے حریف کے بالمقابل جو اس سے 25 فیصدی زائد ادا کرنے پر آمادہ تھا بیدخل کر دیا گیا۔ ایسے واقعات سے ہم یہ نتیجہ ہرگز اخذ نہیں کر سکتے کہ مشرقی دکن کے بمقابلہ مغرب میں لوگوں کی حالت بہتر تھی۔ بقول پروفیسر جادو ناتھ سرکار، بیجاپور کی ہندو رعایا کو محمد عادل شاہ کے عہد حکومت میں ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت کچلا جاتا تھا۔

جہاں تک جنوب کے ہندو علاقوں کا تعلق ہے، ہمیں ولندیزیوں کے کثیر

VENGURLA X

تحریری حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم پولی کٹ سے نیگا پٹم تک کے علاقوں میں اجارہ داری عام طور پر رائج تھی۔ کم از کم بعض صورتوں میں اجارہ کم میعادی ہوا کرتے مثلاً تنجور کے نائک کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ تقریباً ہر ماہ نئے صوبیدار مقرر کیا کرتا (یہ اطلاع بیشک مبالغہ آمیز ہے) اور تنجور و نیز پولی کٹ میں سب سے اونچی بولنے والے کو بالعموم یہ عہدہ سونپا جاتا تھا۔ وقتاً فوقتاً تشدد اور جبری وصولی کے واقعات بھی سننے میں آتے ہیں۔ کیال کا تجارتی کاروبار سرکاری حکام کے مظالم سے تباہ ہوگیا تھا۔ پولی کٹ کے نواحی اضلاع کے متعلق اطلاع تھی کہ یہ ذلیل اور عیار لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کی اجارہ داری میں تھا جس کی وجہ سے لوگ اپنے کو غیر محفوظ تصور کرتے تھے۔ اسی علاقہ میں صوبیدار کے مطالبات کے باعث بہت سے کاریگر بھاگ گئے تھے اور تنجور میں محاصل اور جبری وصولیوں کی کثرت سے سینکڑوں بُنکر بھاگ کر بہتر سلوک کی امید میں دوسرے علاقوں کو منتقل ہوگئے تھے۔ ان معلومات کی بُنیاد پر ہندو اور مسلم نظام حکومت کے درمیان تفریق کرنا آسان نہیں ہے لیکن مرکزی اقتدار کے کمزور ہو جانے سے لوگوں کے لیے مزید خطرات پیدا ہوگئے تھے۔ پس بعض شہروں میں بیک وقت دو یا زائد صوبیداروں کی موجودگی کی اطلاعات ملتی ہیں جن میں ہر ایک، ایک دوسرے کے مدمقابل فریق کا مقرر کردہ ہوتا اور وقت وقت پر ولندیزیوں کی اجارہ داری کے مواضعات ان نائکوں کے مسلح سپاہیوں کے حملوں کا شکار ہوا کرتے جو ان مواضعات کے قبضہ پر اپنا کچھ حق رکھتے۔ ایسی صورتوں میں کسی دادرسی کا سوال نہ پیدا ہوا کرتا۔ ایک بار جب سپاہی ایک گاؤں کو جلاکر وہاں کی پیداوار اُٹھالے گئے اور انھوں نے وہاں کے باشندوں کو بھی بھگا دیا تو ولندیزیوں نے راجہ چندر گری سے اس کی شکایت کی لیکن جواب میں محض شائستہ الفاظ میں ایک خط موصول ہوا جس کا مفہوم یہ تھا کہ بادشاہ اپنے تاجروں کے اس نوعیت کے نقصان کو برداشت نہیں کرسکتا اور یہ کہ اس نے نائک کو اس عمل کی تکرار سے منع کردیا ہے۔ مجھے اس میں شک نہیں کہ افراد کے درمیان اختلاف رہا کرتا تھا اور غالباً اس معاملہ میں بعض صوبیداروں اور نائکوں کی حالت دوسروں سے

بدتر تھی ۔ لیکن اس پورے علاقہ میں جس قسم کا نظام رائج تھا اس نے جبری وصولیوں اور مظالم کو تقریباً ناگزیر بنا دیا تھا۔ دربار کا زرنقد کی فراہمی پر اصرار رہتا جس کے انتظام کی ہر حال میں مقامی حکام پر ذمہ داری رہتی اور بالآخر پیدا کرنے والوں و تاجروں کو ہی اسے ادا کرنا پڑتا۔ اس قسم کے رواج کے ایک بار چل پڑنے کے بعد اس کی شدّت میں اضافہ ہوتا رہتا۔ کیونکہ کوئی بھی ایسی صورت جو نفع بخش ہو اٹھا نہ رکھی جاتی بلکہ وقتاً فوقتاً نت نئی ترکیبیں اختیار کی جاتی تھیں۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا کہ آبادی کے پاس صرف اس قدر بچتا جو اسے زندہ رکھنے کے لیے کفالت کر سکے۔ ان حالات میں متبادل امکانی صورت انقلابی تبدیلی کا بروئے کار لانا تھا اور سوائے اس کے کہ کسی لائق اور خیر مطلق العنان فرمانروا کا ظہور ہو، پرامن اصلاح کی کوئی اور صورت نظر نہ آتی۔

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، ہمارے ماخذ یہ نہیں بتاتے کہ حکومت مجموعی پیداوار میں کس قدر حصہ کی دعویدار ہوتی اور غالباً ان کی یہ خاموشی معنی خیز ہے۔ صوبیدار جسے اپنے ضلع کے لیے ایک کثیر رقم بطور مالگذاری ادا کرنی ہوتی، منفرد مواضعات کے اجارہ داروں سے اتنی ہی کثیر رقم وصول کرنے پر مجبور تھا اور صوبیدار و نیز اجارہ دار دونوں ہی اس کاروبار میں منافع کے خواہاں رہتے اور اپنا معاہدہ پورا نہ کرنے کی صورت میں ان کی جان کو خطرہ لاحق رہا کرتا۔ ان حالات میں یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ مالگذاری کا کوئی روائتی معیار عملاً نافذ رہ سکتا تھا۔ اجارہ داروں کی ضرورت اور ان کی طمع غالب عناصر تھے اور وصولیوں میں حد بندی کا واحد سبب یہ خوف ہوتا کہ مبادا زراعت میں رکاوٹ پیدا ہو جائے یا کسان بغاوت یا فراری پر آمادہ ہو جائیں۔ اجارہ داروں کے مختصر المیعاد ہونے کی وجہ سے کسی تعمیری طریق کار پر عمل ممکن نہ تھا اور میرا خیال ہے کہ ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ فی الجملہ جنوبی ہندوستان کے لیے سترھویں صدی کا نصف اوّل ایک ایسا زمانہ تھا جس میں نظامِ حکومت کی خرابی سے عوام فاقہ کشی یا بغاوت کی سرحد پر اپنی زندگی بسر کر رہے تھے۔

فصل 4 ۔ مملکت مغلیہ میں انتظامی تبدیلیاں

ہم جب ہندوستان کے شمال کا رُخ کرتے ہیں تو ہمیں ابتدا ہی میں سترھویں صدی

کے آغاز پر مغلیہ نظام حکومت کے طریقِ عمل کے متعلق ایک حد تک غیر یقینی حالات کا علم ہوتا ہے۔ اکبر نے اپنی مملکت کے بیشتر حصہ میں ایک ایسا مالی نظام جاری کیا تھا جو بلاشک موجودہ معیار کی رو سے سخت مگر نظری اعتبار سے کافی حد تک مبنی بہ انصاف تھا۔ یہ نظام کڑی نگرانی کا محتاج تھا اور ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے بانی کے دوران حیات ہی میں اس کے اصولوں پر عمل میں تھوڑی بہت تساہلی شروع ہو چکی تھی۔ پھر بھی ہمیں بہ حیثیت ایک باصلاحیت منتظم کے اکبر کی قدر و منزلت کو کم نہ کرنا چاہیے۔ اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کے روایتی تخمینوں کی، آزاد شہادتوں سے بخوبی تائید ہوتی ہے اور میرے لیے یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ میں اس رائے سے اتفاق کروں کہ اس کے ضابطے محض کاغذی حیثیت رکھتے تھے۔ زیادہ معقول رائے یہ ہوگی کہ اس کے ضابطوں کو مکمل طور پر تو نہیں مگر زیادہ تر عملی جامہ پہنایا گیا اور متعدد سابقہ خرابیوں کے انسداد کے باوجود ممکن ہے کچھ خرابیاں باقی رہ گئی ہوں۔ اس کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ بے ایمان ماتحتوں نے پُرانے ظالمانہ طریقوں کی جگہ نئے ایجاد کر لیے ہوں۔ اس سلسلہ میں ہمیں اکبر کے ضابطوں کی سرکاری تحریر آئین اکبری کو نہ تو ان ضابطوں کے عملی رواج کا ایک حتمی رہنما تصور کرنا چاہیے اور نہ ہی محض نظری دلچسپی کی کوئی تصنیف بلکہ ہمیں اسے اکبر جس نظام کو نافذ کرنا چاہتا تھا اس کے معیار کا ایک مستند مظہر شمار کرنا چاہیے۔ ہم بہر حال یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے کہ ہر جگہ مالگذاری ٹھیک اس کے ضابطوں کے مطابق تشخیص اور وصول کی جاتی تھی لیکن ہم بے خوف و خطر ان کا اُن ضابطوں سے موازنہ کر سکتے ہیں جو اس کے بعد کے فرمانرواؤں نے جاری کیے۔ اس قسم کے موازنہ سے معیار میں تبدیلیوں کا اندازہ ہو سکے گا اور ساتھ ساتھ ضمنی مشاہدات، تاریخ کی مختلف منزلوں میں معیار اور عمل کے درمیانی فرق کی وسعت کا ایک سرسری تخمینہ لگانے میں ہمارے معاون ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک امر مسلم ہے کہ بحیثیت ایک منتظم کے اکبر بمقابلہ جہانگیر اور شاہجہاں کے جیسا کہ یہ دونوں اپنے عہد کے آخری زمانہ میں تھے اور بمقابلہ اورنگزیب کے جیسا کہ وہ اپنے عہد حکومت کے زیادہ حصہ میں تھا بہت برتر تھا[1] لہٰذا ہم یہ نتیجہ

---

[1] بحیثیت ایک منتظم کے جہانگیر کی حیثیت کو تزک جہانگیری میں خود اس کے بیان اور نیز

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ وہی معیار بمقابلہ 1600 کے 1660 میں زیادہ ظالمانہ ثابت ہو سکتا تھا اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس اثنا میں بمقابلہ سابق کے ایک جدید اور نسبتاً بہت زیادہ ظالمانہ معیار وجود میں آچکا تھا تو یہ نتیجہ لازم ہو جاتا ہے کہ زیر مطالعہ عہد عوام الناس کے لیے اضافہ پذیر افلاس کا دور تھا۔

اکبر کا انتظام حکومت، اس کی پوری مملکت میں بالکل ایک سا نہ تھا[1] اس کا ڈھانچہ اس طور پر تھا کہ مملکت کو صوبوں میں، صوبوں کو ضلعوں (سرکاروں) میں، ضلعوں کو محالوں میں تقسیم کیا گیا تھا محال اور سابقہ مقامی علاقے (پرگنے) ہمیشہ تو نہیں مگر معمولاً ایک ہی ہوا کرتے تھے۔ تشخیص کے طریقوں کو مقامی حالات کے موافق بنایا گیا تھا اور یہ ایک ہی صوبہ بلکہ ایک ہی ضلع کے حدود میں مختلف ہو سکتے تھے۔ بنگال، برار، خاندیش اور سندھ کے دور افتادہ صوبوں[2] کو

(ص 304 سے آگے)

طامس رو اور دیگر معصر مصنفوں کی تحریروں سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ پلسارٹ کے (ص 2) قول کے مطابق آگرہ میں تجارت کو اس وقت سے زوال ہوا جب سے بادشاہ انتظامی امور میں دلچسپی لینے کے بجائے لہو و لعب میں مصروف ہوا اور حق و انصاف کی جگہ ظلم و زیادتی نے لے لی میرا خیال ہے کہ اس خیال کی تائید کے معقول وجوہ پائے جاتے ہیں کہ شاہجہاں کی صلاحیتیں اس کی عمر کے ساتھ انحطاط پذیر ہوئیں۔ لیکن اس امر پر تفصیلی شہادتوں کی فراہمی ہمیں اصل موضوع سے بہت دور ہٹا دے گی۔ 1636 کی ایک اطلاع کے مطابق "ہر کس و ناکس بادشاہ کا احترام کرتا ہے مگر اس کا حکم کوئی نہیں مانتا" 1645 کی ایک اطلاع ہے کہ اعلیٰ عہدہ داروں کی تقرری اور معزولی روزانہ عمل میں آتی ہے اور پھر اس کے ایک برس بعد "بادشاہ کے بادنما کی طرح ہوا کے رُخ پر چلنے والے دماغی تذبذب" کی اطلاع ہے (ENGLISH FACTORIES V. 204)۔ بادشاہ کے متعلق منکی کا موافق بیان (ج ا ص 199) واضح طور پر وقت کے تقاضوں کے مطابق تھا۔ اورنگزیب کے متعلق اس کا طعن آمیز بیان (ملاحظہ ج صفحہ 382) غالباً صحیح واقعات کا مظہر ہے۔

[1] آئین اکبری میں کشمیر اور اس ملک کے جو اب افغانستان کہلاتا ہے مروجہ نظام کا کوئی ذکر نہیں ملتا وہاں کے طریقے بہت پیچیدہ تھے اور اس سے متاثر ہونے والی آبادی اس قدر قلیل تھی کہ اس پر بحث ضروری نہیں معلوم ہوتی۔

[2] بنگال کی صورت حال قدرے غیر واضح ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدیوں پر طویل بحث

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ان کی فتح کے وقت وہاں جو نظام رائج تھا انھیں کے تحت رہنے دیا گیا تھا۔ سندھ میں پیداوار کی واقعی تقسیم سابقہ طریقوں ہی کے مطابق چلتی رہی اور بقیہ تین صوبوں میں نسبتاً زیادہ آسان اور سرسری طریقے جن کی صحیح نوعیت تحریروں میں نہیں ملتی رائج تھے۔ ملتان سے بہار تک شمالی میدانی علاقوں میں اور نیز راجپوتانہ، مالوہ، گجرات کے زیادہ حصوں میں مالگزاری ایک مخصوص طریقہ پر تشخیص کی جاتی تھی جسے اکبر اور ٹوڈرمل سے منسوب کیا جاتا ہے اور جس کا اصطلاحی نام 'ضبط' تھا۔ لیکن تقریباً ہر صوبہ میں ایسے علاقہ پائے جاتے تھے جہاں اس سے مختلف طریقہ کے رائج ہونے کی اطلاع ملتی ہے یا اس کا شبہ پایا جاتا تھا۔ ایسے بیشتر علاقوں کو قبائلی سرداروں یا دیگر مقامی اثرات رکھنے والے اشخاص کی موجودگی سے ممیز کیا جا سکتا تھا جنھیں زمیندار کہتے تھے اور جن سے مالگذاری بالمقطع وصول کی جاتی تھی جن کی شرح بعض صورتوں میں 'نظام ضبط' کی تشخیص شرح سے کم ہوتی تھی۔ اس طریقہ کا مرکزی نقطہ مستقل نقدی شرحوں کا تعین تھا جو پیداوار کے ایک گھٹتے بڑھتے ہوئے حصہ کے بجائے ہر فصل کے زیر کاشت رقبہ کی ہر اکائی پر واجب الادا ہوتی تھی۔ اس طور پر کسان حکومت کے تئیں اپنی ذمہ داری کی معین رقم سے پہلے ہی سے واقف رہتے اور وہ اپنی فصلوں کی ترتیب کو ہر صورتِ حال کے بشمول مالگذاری کی تفریقی شرحوں کے مطابق کر سکتے تھے۔ ان شرحوں کے ایک بار متعین ہو جانے پر، تشخیص کا کام، ہر فصل میں زیر کاشت آنے والے علاقہ کی پیمائش اور ان کے متعلق تحریروں کی جانچ تک محدود رہ جاتا تھا۔ شرحوں اور رقبوں

(صفحہ 305 سے آگے)
(جس کا الیسکولی میں خلاصہ ہے) کا آغاز 1582 میں ٹوڈر (ٹورل) مل کے رائج کردہ نظام سے ہوتا ہے لیکن اس نے وہاں جو کارروائی کی اسے ابھی تک واضح نہیں کیا گیا ہے۔ آئین اکبری کی جس عبارت میں اسے بیان کیا گیا ہے (ترجمہ (2) ص 120) مبہم اور اس کے قلمی نسخے متناقص ہیں اور ان میں مجھے کوئی بھی ایسا نہ مل سکا جس کا مفہوم قابلِ قبول ہو۔ بہر حال یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اکبر نے وہاں موجودہ نظام ہی کو قائم رکھا اور شماریات کے جدول ظاہر کرتے ہیں کہ، ٹوڈرمل نے بنگال میں جو کچھ بھی کیا ہو مگر اس نے وہاں وہ طریقہ نہیں رائج کیا جو اس سے منسوب کیا جاتا ہے ممکن ہے اٹھارھویں صدی میں اس وقت کے محفوظ بعض قلمی نسخوں میں جعلسازی کی گئی ہو کیونکہ اس وقت کے ہندوستانی حکام نظم مال کی تفصیلات کو صیغۂ راز میں رکھنا چاہتے تھے

کے معلوم ہو جانے پر ہر کسان کے ذمہ مالگذاری کی رقم کو معمولی حساب کے ذریعے معلوم کیا جا سکتا تھا یہ شرحیں، مقامی تحقیقات سے قطعی طور پر معلوم کی ہوئی اوسط مجموعی پیداوار کا ایک ثلث حصہ ہوا کرتی تھیں۔ لہٰذا مطالبۂ مالگذاری کا معیار اس سطح سے جسے فی زمانہ معقول تصور کیا جاتا ہے بہت زیادہ تھا۔ لیکن دیگر پہلوؤں سے نظام ضبط کے اصول کو ہم درست تصور کر سکتے ہیں۔ اس پر عمل درآمد کرنے میں جو دِقت محسوس ہوئی اس کا سبب عملہ کی خرابی تھی۔ ایک ایک کھیت کی فصل کا ہر موسم میں درج کرنا ایک محنت اور خرچ طلب عمل تھا۔ اس کے اخراجات کا بیشتر بار کسانوں ہی پر پڑتا تھا جو مطالبۂ مالگذاری کے علاوہ ہوا کرتا۔ لیکن اس کی خاص خرابی، ناجائز وصولیوں کے وہ مواقع تھے جو پیمائش کرنے والے عملہ کو حاصل رہتے۔ مزید براں درمیانی درجہ کے حکام کی زائد وصولیوں پر عملاً کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ اس موضوع پر اکبر کے احکام کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس کا ان دو عام اصولوں پر بہت زیادہ زور تھا۔ تشخیص کا کوئی بھی طریقہ ہو اس کی خواہش تھی کہ زمین کی جاگیر کے بجائے حکام کو نقد تنخواہیں دی جائیں اور اس کا اس امر پر بھی اصرار رہتا کہ جہاں کہیں ممکن ہو حکام منفرد کاشتکاروں سے براہِ راست ربط قائم کریں۔ اس کے جانشینوں کے طریقوں کے متعدد پہلوؤں پر ہماری معلومات نامکمل ہیں لیکن یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اکبر کے یہ دونوں اصول اگلی نصف صدی کے دوران ترک کر دیے گئے۔ جاگیروں کی تعداد میں بیحد اضافہ ہوا، اجارہ داری کا رواج پھیلا اور تشخیص مالگذاری کے سرسری طریقہ میں ترقی نے مواضعات کے اندر مظالم کے مواقع کو بڑھایا۔ یہ تینوں تبدیلیاں عام کسانوں کی زبوں حالی کی نشان دہی کرتی ہیں۔ اس پر مستزاد، زیر کاشت زمین کے رقبہ میں اس وقت کے معاشی امکانات سے زیادہ اضافہ کرنے کی شہادتیں پائی جاتی ہیں اور آخر میں ہم دیکھتے ہیں کہ تشخیص کے معیار کو بھی ایک تہائی سے بڑھا کر نصف کر دیا گیا۔ ان کارروائیوں کے مجموعی اثرات کو واضح اعداد میں نہیں دِکھایا جا سکتا۔ لیکن واقعات اس نتیجہ پر دلالت کرتے ہیں کہ اکبر نے کسانوں کے لیے جو تھوڑی بہت گنجائش چھوڑی تھی اب وہ بھی شاہی خزانہ یا حکام کی جیبوں میں جانے لگی، جس نے کسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو قوتِ لایموت کی خطرناک سرحد پر پہنچا دیا۔ ہم اب ان تبدیلیوں کی شہادتوں کو پیش کرتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ جاگیروں کی شکل میں عہدہ داروں

کو مشاہرہ دینے کا طریقہ قدیم سے چلا آتا تھا۔ اکبر نے اسے ختم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں پورے طور پر کامیاب نہ ہوسکا اور اس کا ذاتی اثر ختم ہوتے ہی یہ دوبارہ رائج ہوگیا۔ تزک جہانگیری میں جاگیروں کے بکثرت حوالے ظاہر کرتے ہیں کہ یہ طریقہ اس کے نظم و نسق کے معمولات میں داخل تھا اور ولیم ہاکنس کے اس کے دربار میں تجربات سے بھی یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔ اگر نقد ادائیگیوں کا عام رواج رہا ہوتا تو ظاہر ہے کہ ایک غیر ملکی سیاح کے معاملہ میں اسے ضرور اختیار کیا گیا ہوتا لیکن حقیقت یہ تھی کہ ایک شاہی عہدہ پر تقرری کے فوراً بعد ہی ہاکنس کو حصول جاگیر کی جد و جہد میں مشغول ہونا پڑا جسے اس نے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کی سرگذشت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان دنوں جاگیروں میں تبدیلیاں بہ کثرت ہوا کرتی تھیں "کوئی شخص اپنی روزی پر نصف سال بھی قائم نہیں رہ پاتا کہ وہ اس سے چھین کر دوسرے کو دے دی جاتی ہے"، لہٰذا جاگیردار کا مفاد اپنی سلسلہ وار جاگیروں سے زیادہ سے زیادہ روپیہ چوس لینے ہی میں ہوا کرتا۔ ٹیری نے بھی تبادلوں کی کثرت کا یہ لکھتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ عہدہ داران معمولاً ہر سال تبدیل کر دیے جاتے تھے۔ غالباً ہاکنس کے الفاظ مبالغہ آمیز ہیں۔ لیکن اس کی سرگذشت میں نفس معاملہ کی صداقت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

شاہجہاں نے جاگیروں کی منظوری کے دستور کو قائم رکھا جیسا کہ پیٹر منڈی کے دریائے گنگا کے میدانی علاقوں کے حالات سفر سے واضح ہوتا ہے۔ اس نے متعدد جاگیروں کا جن سے اس کا گزر ہوا، ذکر کیا ہے۔ اس کی تحریر کے مطابق ان دنوں جاگیروں کے تبادلے نسبتاً کم ہوگئے تھے جو تین یا چار برسوں کے وقفہ سے کیے جاتے۔ لیکن انھیں دنوں 'ڈین ٹوسٹ'، کی تحریر کے مطابق گجرات میں تبادلوں کی کثرت تھی اور تجارتی مراسلات کے بعض ضمنی اقوال اس امر پر شاہد ہیں کہ بادشاہ کی قوت ارادی کے کمزور پڑ جانے سے، کسانوں کے لیے پریشانی کی یہ صورت بڑھتی چلی گئی تھی۔ یہ امر واضح ہے کہ عہد شاہجہانی میں مالگذاری کا ایک بڑا حصہ جاگیروں میں دے دیا گیا تھا۔ مملکت کے جو محتاط حالات تقریباً 1650 میں عبدالحمید نے اپنی تصنیف 'بادشاہ نامہ' میں درج کیے ہیں ان میں

مجموعی مالگذاری کو 880 کروڑ دام منجملہ جس کے خالصہ یعنی شاہی خزانہ کی آمدنی کو صرف 125 کروڑ بتایا گیا ہے۔ اس طور پر ان ایام میں جملہ محاصل کا تقریباً $\frac{7}{8}$ حصہ جاگیرداروں یا دیگر درمیانی افراد کے ہاتھ آتا تھا اور عہد عالمگیری کے شماریات میں یہ تناسب اس سے بھی زائد دکھایا گیا ہے۔ پس عام کسان بجائے حکومت کے عمل کے جاگیردار کا تابع رہتا۔

مجھے دور اکبری کے اواخر میں، مالگذاری زمین کے اجارہ پر دیے جانے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ حالانکہ کسی شہادت کی غیر موجودگی بجائے خود فیصلہ کن نہیں ہو سکتی لیکن یہ امر اس پس منظر میں کہ یہ طریقہ بادشاہ کے منفرد کسانوں سے براہ راست ربط قائم رکھنے کے اصول کے بالکل خلاف تھا، اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے۔ مملکتِ مغلیہ میں اجارہ داروں کے دستور کا پہلا حوالہ جو مجھے مل سکا، وہ 1615 میں گجرات کے حالات پر وین ریوسٹین× کی تحریر میں درج ہے۔ اس میں مختلف "حکومتوں" (یا ضلعوں) کی اجارہ داری کا باضابطہ اندراج ملتا ہے۔ طامس رو کی ان ہی دنوں کی ایک تحریر میں "سورت کے صوبیدار کے بجائے نئے اجارہ دار" کا حوالہ دیا گیا ہے اور اس کی بعد میں بادشاہ کے نائب سے باضابطہ ملاقات کے تحریری بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقریباً 1616 میں صوبوں کا انتظام اسی دستور کے مطابق چل رہا تھا۔ اس ملاقات میں اسے بتایا گیا کہ "ہر صوبہ کی حکومت ہر سال ایک معینہ جمع ادا کرتی ہے۔ وہ شہنشاہ کو اپنی حکومت کے لیے بادشاہ کو 11 لاکھ روپیے دیتا ہے۔ بقیہ جملہ منافع اس کا ہے جس میں سے بادشاہ کے تفویض کردہ اختیارات کے تحت وہ جس قدر چاہے تصرف کر سکتا ہے۔" اس موضوع پر کہ آیا یہ دستور عام ہو گیا تھا مجھے کوئی براہِ راست سند نہ مل سکی لیکن گجرات [illegible] مملکت کا ایسا واحد صوبہ ہے جس کے تفصیلی حالات موجود ہیں۔ یہ دستور دو [illegible] میں قطعی طور پر پایا جاتا تھا۔ بٹاویا جرنلس کی اطلاع کے بموجب 1636 میں کھمبات اور سورت دونوں مقامات اجارہ کے تحت تھے۔ سورت کے اجارہ دار کے ذمہ 5 لاکھ کا بقایا تھا جسے اس کو "کسی نہ کسی طریقہ پر" وصول کرنا تھا۔ کسان اس کی ناقابلِ برداشت ناجائز وصولیوں کے شاکی تھے اور زیرِ کاشت زمین کا رقبہ بھی گھٹ رہا تھا۔ اس کے دو برس

VAN RAVESTEYN ×

بعد سورت کے انگریزوں کی اطلاع کے مطابق مقامی صوبیدار کو "ابھی حال ہی میں میرزا ملکی، (معز الدین المعروف بہ میر موسیٰ) نے حکومت سے بیدخل کر دیا ہے جس کو اس نے نکال بھی دیا اور وہ سورت کا زیادہ جمع پر اجارہ لے کر اس کی جگہ قابض ہو گیا" بعد کا ایک مراسلہ مظہر ہے کہ اس اجارہ کا اطلاق "اس نواحی علاقہ اور اس کے ٹکسال اور درآمدی و برآمدی محصول کے دفتر پر ہے" اور ان معاملات میں بادشاہ کا کوئی وزیر دخیل نہیں ہوتا۔ میر موسیٰ بہرحال اپنے اجارہ کو پورا نہ کر سکا اور 18 لاکھ کے قرض کے ساتھ اسے چھوڑنے پر مجبور ہوا" اس کے ذمہ بادشاہ کا یہ قرض ابھی تک چل رہا ہے۔ لہٰذا حساب کی صفائی کے لیے اسے شاہی دربار میں طلب کیا گیا ہے جو معلوم ہے کہ وہ ادا نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس کی معذوری کے پیشِ نظر بادشاہ کوئی دوسرا اسود مند طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہوا" پس اس نے بعض حکام وہاں کے انتظام پر مقرر کیے" اور ان سب کے لیے بادشاہ کی طرف سے سالانہ وظیفہ مقرر ہوا اور اب جو کچھ بھی اس علاقہ اور یہاں کے ٹکسال اور درآمدی و برآمدی محصول گھر سے آمدنی ہوتی ہے وہ سب کچھ بادشاہ کے حساب میں جمع ہوتی ہے" آڑھتیوں کی مزید اطلاع ہے کہ بادشاہ کے براہِ راست انتظام کے باعث قدرے تاخیر اور کام میں مزید اضافہ تو ضرور ہوا لیکن وہ اور دیگر جملہ تاجر بید خوش تھے۔ ولندیزی آڑھتیوں نے بھی اسی مفہوم کی اطلاع بٹاویا بھیجی اور اس امر سے کہ ولندیزی اور انگریز دونوں نے براہِ راست انتظام کے طریقہ کی تفصیلی وضاحت کی ہے، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ان کے لیے ایک نئی چیز تھی۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس دور میں اجارہ داری گجرات کے لیے کوئی مخصوص چیز تھی۔ 1640 میں سندھ کے لہاری بندر کا انتظام قطعی طور پر اجارہ پر دیا گیا تھا اور اگر دوسرے صوبوں کے لیے اس قسم کی دوسری شہادتیں دستیاب نہیں ہوتیں تو ماخذ کے نامکمل ہونے کے باعث ہمارے لیے کسی نتیجہ پر پہنچنا ناممکن ہے۔ جن صوبوں کے بارے میں معلومات موجود ہیں وہ ان میں اجارہ داری کے رواج کو ظاہر کرتی ہیں لیکن مملکت کے بقیہ حصوں کے حالات کے متعلق ہمارے پاس تفصیلی اطلاعات تقریباً نہیں کے برابر ہیں۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ عہدِ جہانگیری کے اختتام پر، جاگیرداران اکثر اپنی زمینوں کو اجارہ پر "اجارہ داروں یا کروڑیوں کو" سونپ دیتے تھے جنھیں اچھی یا بُری فصل کے خطرات کو برداشت کرنا ہوتا تھا"

ابھی تک ہم نے یہ دیکھا ہے کہ حکام کی تقرری کی میعادیں تبدیلیوں کی نوعیت ایسی

تھی جو مرکزی اقتدار کی طاقت کو گھٹانے والی تھی اور نیز اس کے باعث کسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کے رحم وکرم پر منحصر رہتی جن کا خاص مقصد زیادہ سے زیادہ تعداد میں کسب زر تھا۔ ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس اثنا میں تشخیص مالگذاری کے طریقوں میں ایک انتظامی انقلاب کے رونما ہو جانے سے جاگیرداروں اور اجارہ داروں کے لیے اپنے مطالبات کے معیار کو بڑھانا نسبتاً آسان ہو گیا۔ مجھے اس انقلاب کے تحریری حالات اس دور کی تاریخی کتابوں میں نہ مل سکے لیکن اس کا واقع ہونا اکبر کے 'نظام ضبط' کا عہد عالمگیری کے ابتدائی احکامات سے موازنہ کرنے سے ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ اکبر کا حکم تھا کہ منفرد آراضیوں پر پہلے سے معین کی ہوئی شرحوں کے مطابق مالگذاری تشخیص کی جائے اور اس کے عہد میں مالگذاری کی تشخیص کے طریقہ کی واضح طور پر ممانعت تھی۔ سرسری طریقۂ تشخیص میں گاؤں کا مکھیا پورے موضع کے لیے ایک مجموعی رقم ادا کرنے کا پابند ہوتا اور اس طریقہ کی اس سبب سے کہ اس کے تحت زیادتی کرنے والوں کے اختیارات بہت زیادہ ہو جاتے، مذمت کی گئی ہے[1]۔ اورنگزیب نے جو احکام اپنے ۸ سنہ جلوس (1665-66 ب 40) میں نافذ کیے وہ مظہر ہیں کہ اکبر کا ممنوعہ طریقہ ہی اب معمولات میں داخل تھا۔ مشخصین مالگذاری ہر سال عام حالات کے لحاظ سے ایک بالمقطع رقم تجویز کر دیتے تھے اور اکبر کے طریقوں کو صرف اس صورت میں اختیار کرتے جب کوئی مسلم موضع یا ایک بڑا علاقہ اس تجویز کو قبول نہ کرتا۔ پہلے گذر چکا ہے کہ اکبر کے طریقوں پر خاص اعتراض کا سبب اس طریقہ میں ناجائز وصولیوں کا خطرہ تھا اور عام خطرات انسانی کے رمز شناس واقف ہیں کہ ان طریقوں کو دھمکی کے طور پر استعمال کرنے کی حالت میں یہ خطرہ عملاً ایک حقیقی صورت اختیار کر لیتا تھا پس ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ان دنوں سالانہ تشخیص کے طریقہ پر عام عمل شروع ہو گیا تھا جس نے کم اثر رکھنے والے کسانوں کے لیے پورے موضع کے مطالبہ میں اپنے حصہ سے زائد ادا کرنے کا خطرہ جس کا اکبر کو خوف تھا پیدا کر دیا۔ اب مواضعات فی الجملہ، تشخیص کرنے والوں کے زیادہ قابو میں اور منفرد کسان

---

[1] اس طریقہ کا مطبوعہ ترجمہ (آئین اکبری ج ۲ ص 45) صحیح مفہوم نہیں ظاہر کرتا۔ اصل میں مکھیا کے سپرد کنکوت کا کام کیے جانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ متن میں صرف اس قدر ہے کہ وہ مکھیا کے ساتھ سرسری جمع بست (نسق) نہ کرے گا۔

اپنوں میں سے زائد طاقت رکھنے والوں کے زیادہ دباؤ میں آ گئے۔

اس اثنا میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تشخیص کرنے والوں پر بھی دباؤ میں اضافہ ہوا ان کے آقا خواہ وہ اجارہ دار ہوں یا جاگیردار اپنے لیے زیادہ رقمیں طلب کرنے لگے اور ساتھ ساتھ حکومت کی ضروریات میں بھی اضافہ ہو رہا تھا اور یہ تشخیص کرنے والے کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس دوگونہ مطالبہ کے لیے گنجائش نکالے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ شاہجہاں کے ذوق اور طریقوں نے اخراجات عامہ میں بیحد اضافہ کر دیا تھا اور اس سلسلہ میں وقائع نگار نے اس کے لیے جو توصیفی کلمات استعمال کیے ہیں ان کو نقل کرنا ہی کافی ہوگا" سابقہ عہدِ حکومت کے اخراجات بمقابلہ عہد زیر بحث کے ایک و چار کی نسبت بھی نہیں رکھتے تھے[1] پھر بھی اس بادشاہ نے ایک قلیل مدت میں اس قدر دولت جمع کر لی ہے جیسے اس کے پیشرو متعدد برسوں میں جمع کرتے"۔ پس جب خرچ میں اضافہ ہوا اور آمدنی کی بچت جمع ہوئی تو یہ صورت دو علتوں سے خالی نہیں۔ یا تو نئے محصول عائد کیے گئے یا موجودہ وسائل ہی سے آمدنی بڑھائی گئی۔ نئے محصولوں کے عائد کیے جانے کی ہمارے پاس کوئی اطلاع نہیں اور جیسا کہ آگے ذکر آئے گا متفرق چنگیاں صوبجاتی اور مقامی اخراجات کے لیے مخصوص تھیں۔ پس مالگذاری زمین ہی تھی جس نے بڑھے ہوئے مطالبات کی کفالت کی۔

مالگذاری زمین کو بڑھانے کا پہلا بدیہی طریقہ تھا کہ زیر کاشت رقبہ کی توسیع کی جائے۔ یہ امر کہ اس سلسلہ میں بلیغ کوششیں کی گئیں، مذکورہ توصیفی حوالہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ کاشتکاری میں توسیع کرنے والے حاکموں کے ساتھ خصوصیت کا معاملہ کیا جاتا تھا لیکن ان کی کوششوں کی نوعیت کو اورنگزیب کے 1668 میں جاری کیے ہوئے احکام میں تفصیل سے واضح کیا گیا ہے۔ حکام مال کے مروجہ طریقے ان احکام میں حسب ذیل الفاظ میں بیان کیے گئے ہیں، شروع میں جہاں تک ممکن ہو سکے تم لوگ ہر کسان کی حالت کے متعلق معلومات حاصل کرو، آیا وہ کاشت کر رہے ہیں یا اس سے گریز کرتے ہیں۔ اگر وہ کاشتکاری کا سامان رکھتے ہیں تو انھیں ترغیب دو اور اپنے

---

[1] یہ تناسب غالباً مبالغہ آمیز ہے لیکن اخراجات میں زیادہ اضافہ کا ہو جانا ایک یقینی امر ہے۔

لطف وکرم کا یقین دلاؤ اور وہ جو مراعات چاہیں انھیں فراہم کرو لیکن اگر یہ معلوم ہو کہ کاشتکاری کی استطاعت رکھنے کے باوجود وہ کاشت کرنے سے گریز کر رہے ہیں تو تم کو چاہیے کہ تم انھیں مجبور کرو اور دھمکی دو اور تشدد اور کوڑوں سے کام لو۔ بہ الفاظ دیگر کاشتکاری کا معیار خود کاشتکار نہیں بلکہ مالگذاری تشخیص کرنے والے متعین کرتے تھے جن کا فوری مفاد اس میں ہوتا کہ یہ جس قدر زیادہ ممکن ہو سکے ہو اور وہ مجاز ہوتا کہ اگر ضرورت ہو تو وہ کوڑوں کے استعمال سے اپنے احکام کی تعمیل کرائے۔ اگر ہم اس ضابطہ کا اسی موضوع پر اکبر کی جاری کی ہوئی ہدایات سے موازنہ کریں تو طریقۂ کار کی تبدیلی منکشف ہو جائے گی۔ اکبر دوستانہ طریقوں پر زور دیتا تھا اور اورنگزیب کوڑوں پر۔

ایک طرف تو زیر کاشت رقبہ کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش کی گئی اور دوسری طرف مالگذاری میں مطلوبہ اضافہ کو سرکاری مطالبہ کے معیار کو مجموعی پیداوار کے ایک تہائی سے بڑھا کر ایک نصف یعنی 50 فیصدی کا اضافہ کر کے حاصل کیا گیا۔ بظاہر اس اضافہ کا فوری طور پر عمومی نفاذ نہیں کیا گیا کیونکہ احکام عالمگیری مجریہ 1668 میں جس میں نئے معیار کو ایک مسلمہ حقیقت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے، یہ ہدایت ملتی ہے کہ اب بھی پُرانے معیار کو بعض علاقوں میں یا بعض زمرہ کے کسانوں سے قبول کیا جا سکتا ہے لیکن ان احکام کی عمومی روش یہ ظاہر کرتی ہے کہ محصل یا جاگیردار کو عام صورتوں میں پیداوار کا نصف ہی وصول کرنا چاہیے۔ مجھے کسی وقائع میں اس اضافہ شدہ معیار کی ابتدا کا کوئی ذکر نہیں ملتا لیکن مجھے شبہ ہے کہ یہ تبدیلی عہد شاہجہانی کے اوائل میں کی گئی تھی[1]۔ کیونکہ وین ٹوسٹ کی 1638 سے قبل کی ایک تحریر مظہر ہے کہ گجرات میں حکام پیداوار کا نصف یا اس سے بھی زاید وصول کرتے تھے۔ غالباً اس معیار کا مفہوم اس فقرہ میں پوشیدہ ہے "زراعت کی ترقی اور مالگذاری کی وصولی پر خصوصی توجہ"، جس پر وقائع نویس مذکور نے اس قدر زور دیا ہے۔ عہدِ عالمگیری میں 50 فیصدی کے عام معیار سے منتی اور دیگر مصنفین بخوبی مانوس تھے اور یہ اگلی صدی کے ضابطوں میں دوبارہ ظاہر ہوتا ہے لہٰذا ہم اسے کوئی

---

[1] اگلی فصل میں مندرج بعض اعداد یہ امکان ظاہر کرتے ہیں کہ جہانگیر نے اپنے عہد کے آخری برسوں کے دوران دو صوبوں میں بڑھی ہوئی شرح نافذ کر دی تھی لیکن ان اعداد کے ایک سے زاید مفہوم نکل سکتے ہیں۔

عارضی چیز تصور نہیں کر سکتے اور چونکہ یہ بمقدار پیداوار کے بیان کیا گیا ہے لہٰذا ہمیں اسے قیمتوں کی سطح سے بے نیاز تصور کرنا چاہیے۔

پس ہم عام کسانوں کی حالت میں تبدیلی کو حسب ذیل الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں۔
حکومت کے تئیں اس کی ذمہ داری اس کی پیداوار کے ایک تہائی سے بڑھ کر ایک نصف ہو گئی تھی۔

اس سے یہ مطالبہ اس شرح کی مطابق ان زمینوں پر وصول کیا جا سکتا تھا جسے وہ موثر طور پر کاشت کرنے سے معذور تھا۔ اس طور پر اس کی صحیح معنوں میں ادائیگی پیداوار کے نصف سے بھی زاید تھی۔

یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے سے زاید با اثر اشخاص کی مالگذاری میں بھی جو موضع کی کل جمع کو منفرد کسانوں پر تقسیم کرتے تھے، شریک ہونے پر مجبور ہو۔

ان انتظامی تبدیلیوں کی بنا پر جن کا پہلے ذکر آیا ہے زاید محصولوں کے امکانات میں خاصہ اضافہ ہو گیا تھا۔

عام کسانوں کی زبوں حالی کو بخوبی سمجھنے کے لیے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مطالبہ مالگذاری در اصل کہ مجموعی پیداوار پر تشخیص کیا جاتا مگر در حقیقت اس کی ادائیگی خالص آمدنی یعنی پیداوار کے اس جزو سے کی جاتی جو زراعت اور کسان اور اس کے کنبہ کے افراد کے اخراجات ادا کرنے کے بعد اس کے پاس بچتا۔ میں نے اپنی ایک سابقہ تصنیف[1] میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ بحیثیت ایک موثر کاشت کرنے والی اکائی کے ایک "مثالی" کاشتکار کے اخراجات کے لیے ناموافق موسم میں فصل کے نقصانات کے لیے قدرے گنجائش رکھتے ہوئے، اس کی مجموعی پیداوار کا تقریباً نصف لازمی طور پر درکار تھا۔ اس نظریہ کے تحت، مالگذاری کو بڑھا کر پیداوار کا نصف کر دینا کسان کو عام دنوں میں قوت لایموت کی سرحد سے خطرناک حد تک قریب پہنچا دینے کے مرادف تھا اور اس صورت میں اس کے پاس زندگی سے لطف اندوز ہونے کے لیے کچھ بھی باقی نہ بچتا اور کاشتکاری کا تھوڑا بہت نقصان بھی اس کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہوتا۔ اکبر کے "نظام ضبط" کے تحت زمین کی جملہ پیداوار کی تقسیم

---

[1] انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر INDIA AT THE DEATH OF AKBAR

اس طور پر تھی۔ تقریباً نصف ضروری اخراجات کے لیے، ایک تہائی حکومت کے لیے اور تقریباً ⅙ حصہ یا اس سے قدرے زاید کسان کے آرام و آسایش یا ناموافق موسم کے لیے۔ عہد شاہجہانی میں تقریباً نصف ضروریات کے لیے، نصف یا اس سے زاید حکومت اور درمیانی دعویداروں کے لیے اور کسان کے لیے تقریباً کچھ بھی نہ بچتا۔ موجودہ معیار سے حساب کرنے پر اکبر کسانوں کے پاس ٹھیک اس قدر چھوڑ دیتا، جو کاشتکاری کی بقاء کے لیے ضروری ہوتا لیکن شاہجہاں کے زمانہ میں یہ صورت نہ تھی اور اگر صرف سرکاری ضابطوں پر نگاہ رکھی جائے تو ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ زراعت کا مشغلہ غیر مقبول اور کسان جو زندگی کی آسایشوں سے کلیتہً محروم تھے اس پیشہ کو چھوڑ کر دوسرے کاروباروں کی طرف منتقل ہو رہے تھے۔

اس امر کی براہِ راست شہادت موجود ہے کہ عہد زیر مطالعہ کے دوران اس قسم کی تبدیلی رونما ہو چکی تھی۔ احکام عالمگیری کے متعدد تفصیلی شرائط مظہر ہیں کہ کسانوں کی اپنی زمینوں سے فراری نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی، جو انتظامیہ کے لیے دردسر بن گیا تھا۔ لیکن برنیر کے کولبرٹ کے نام مراسلہ[1] میں جو لگ بھگ 1656 کے تجربات پر مبنی تھا۔ اس قسم کے واقعہ کو بہت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اس مراسلہ میں مغلیہ حکام کے تشدد پر نکتہ چینی کے بعد وہ اس طور پر آگے بڑھتا ہے۔

پس ایسا پیش آتا کہ بہت سے کاشتکار، جہاں مسلسل مظالم کے باعث مایوسی کے عالم میں دیہاتوں سے ترک سکونت کر کے بوجھ ڈھونے، پانی پہنچانے یا گھوڑ سواروں کی ملازمت، ایسے آسان کاموں کے حصول کی غرض سے فوجی چھاؤنیوں یا شہروں کو منتقل ہو جاتے۔ بعض اوقات وہ کسی راجہ کے علاقہ میں بھاگ کر چل دیتے کیونکہ انھیں وہاں مظالم کم اور آرام زیادہ ملتا۔۔۔۔

اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ "مظالم، زمین کے کاشتکار کو اس کے ٹوٹے پھوٹے گھروں سے کسی نواحی علاقہ میں بہتر سلوک کی امید پر، یا فوج میں جہاں وہ کسی فوج کی ملازمت اختیار کرتا ہے بھگا دیتا ہے۔ چونکہ زور و زبردستی کے بغیر زمین مشکل ہی سے کاشت کی جاتی ہے اور نیز یہ کہ پانی کی فراہمی کی غرض سے گڈھوں اور نہروں کی مرمت پر نہ تو کوئی شخص تیار

---

(1) BERNIER'S LETTERS TO COLBERT

ہوتا ہے اور نہ کوئی اس کام کے لائق ہی ہے۔ لہٰذا پورے ملک میں کاشتکاری کی حالت خراب ہوگئی ہے اور آبپاشی کی قلت کے باعث زمین کا بیشتر حصہ غیر نفع بخش ہوگیا ہے۔ ان کے چھوڑے ہوئے مکانات بھی خستہ حالت میں ہیں کیونکہ ایسے لوگ بہت ہی تھوڑے ہیں جو نئے مکانات بنائیں یا گرتے ہوئے مکانات کی مرمت کریں۔ کسان اپنے تئیں یہ سوال کرتے ہیں کہ ہم مظالم کے لیے اپنی جان کیوں کھپائیں۔ وہ کل ہی آکر ہمارے جملہ مقبوضات اور تصرف کی چیزوں کو غارت کرے گا اور اگر اس کے دل میں آگیا تو ہمیں اپنی مصیبت زدہ زندگی گذارنے کے لیے کچھ بھی نہ چھوڑے گا۔ تمار دارانؔ (جاگیرداران۔ مترجم) صوبہ داران اور اجارہ دارانِ مال اپنی جگہ اس طرح سوچتے ہیں" ملک کی زبوں حالی سے ہم کیوں پریشان ہوں اور اس کو سرسبز بنانے میں ہم اپنی دولت اور دقت کیوں صرف کریں؟ ہم چشم زدن میں اس سے بیدخل کیے جاسکتے ہیں اور اس کے بعد ہماری محنت کے ثمرات سے ہم اور ہماری اولاد محروم ہوجائے گی۔ ہمیں چاہیے کہ ہم زمین سے زیادہ سے زیادہ دولت کھینچ لیں خواہ کسان فاقہ سے مرے یا فرار ہوجائے اور حکم ملنے پر ہم اس کو ویرانی کے عالم میں چھوڑ کر چل دیں۔

یہ قدرے طویل اقتباسات بہ اعتبار اپنی اہمیت کے قلم بند کیے گئے ہیں کیونکہ ہم نے سرکاری ضابطوں اور دیگر بالواسطہ شواہد سے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ انھیں چشم دید واقعات کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ اس عہد کی واضح خصوصیات یعنی تمام کی توجہ کا فوری نفع پر مرکوز رہنا، ان کا کسانوں پر تشدد، جبری کاشتکاری، زراعت کی طرف سے غفلت، کاشت کی زمین چھوڑ کر [illegible] پیشے اختیار کرنا اور ملک کا [illegible] افلاس یہ سب کی سب غیر ملکی مشاہدین کی توجہ کا [illegible] تھیں۔ درحقیقت [illegible] برنیئر کے بیان میں مبالغہ آرائی کا رجحان پایا جاتا ہے [illegible] ہر واقعہ [illegible] درست نہیں تو کم از کم ہر واقعہ بذات خود قطعی [illegible] کا لازمی نتیجہ ہے جو [illegible] اور دو مختلف ذرائع سے حاصل کردہ [illegible] کے درمیان مطابقت کی وجہ سے

لہ تمار دار ترکوں کی مملکت میں فوج کے ایک معیاری حق کو کہتے ہیں DICTIONAIRE DE ACADEMIE میں اس کا جو مختصر بیان میری نظر سے گذرا ہے ظاہر کرتا ہے کہ یہ مملکت مغلیہ کے جاگیردار کے تقریباً مماثل عہدہ تھا اور متن کے اس فقرہ کو ہم "جاگیرداران، صوبیداران اور اجارہ داران" کے طور پر پڑھ سکتے ہیں۔

بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ عہدِ شاہجہانی کے اواخر تک مملکت مغلیہ کا معاشی نظام تباہی کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا۔ کیونکہ ملک کے خاص مشغلہ (زراعت۔ مترجم) پر ناقابلِ برداشت بار پڑ رہا تھا اور پیداواری کا عمل نفع بخش نہیں رہ گیا تھا جس نے پیدا کرنے والے کی زندگی کو اجیرن بنا دیا تھا۔

مذکورہ بالا اقوال ان علاقوں کے متعلق ہیں۔ جو زیرِ مطالعہ دور کے آغاز پر مملکتِ مغلیہ میں شامل تھے اور ضرورت ہے کہ شاہجہاں کے فتح کیے ہوئے جنوبی علاقوں میں تبدیلیوں کا ان میں مختصراً اضافہ کر دیا جائے۔ مملکت احمد نگر کی خود مختاری کو برقرار رکھنے کی جنگ کے دوران ملک عنبر نے وہاں بظاہر اکبر کے نمونہ پر مرتب کیا ہوا ایک مالی نظام نافذ کیا تھا لیکن مملکت کے خاتمہ کے بعد یہ قائم نہ رہ سکا۔ 1630 کے قحط سے یہ علاقہ بری طرح تباہ ہوا اور تقریباً 20 برس تک اس کی حالت افسوسناک رہی۔ اس اثنا میں مطالبۂ مالگذاری کم ہونے پر بھی وصولیوں سے بہت زیادہ تھا۔ شاہزادہ اورنگ زیب کو 1653 میں دکن میں بادشاہ کی نیابت کا عہدہ سنبھالنے پر معلوم ہوا کہ سابقہ احمد نگر کے علاقے مقامی نظم و نسق کے اخراجات کے بار کا بھی تحمل نہیں کر سکتے۔ بادشاہ نے کاشتکاری کو توسیع دینے کے لیے بار بار احکام صادر کیے تاکہ مالگذاری میں اضافہ ہو اور اورنگ زیب کے شعبۂ مال کے عہدیدار مرشد قلی خاں کی زیرِ نگرانی نظم و نسق کی از سرِ نو تشکیل عمل میں آئی۔ اس نے اکبر کی پسندیدہ تشخیص کے طریقوں کو دوبارہ جاری کیا۔ اس کے جو نتائج برآمد ہوئے ان کا ہمارے عہد سے کوئی تعلق نہیں، لیکن یہ ایک خاص بات ہے کہ اس علاقہ کے دو ممتاز منتظمین نے اکبر کے نظامِ ضبط، ہی کو اپنا نمونہ بنایا۔ شیواجی نے اپنے حاصل کیے ہوئے علاقوں میں جو نظام قائم کیا ہم اس میں بھی اسی نمونہ کی جھلک دیکھتے ہیں اور یہ ایک قابلِ ذکر بات ہے کہ اس نے شروع میں سرکاری مطالبہ کو کل پیداوار کا ایک تہائی معین کرنے میں اکبر کی تقلید کی تھی حالانکہ بعد میں یہ تناسب بڑھا کر نصف کر دیا گیا تھا۔

یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شیواجی کی مملکت (یا سوراج) کو ان علاقوں سے جن کے وسائل کو وہ چوستا رہتا تھا مگر ان پر اپنی حکومت نہ قائم کرتا تھا، علیحدہ رکھا جائے۔ وہ اپنی رعایا کے ساتھ نسبتاً اچھا سلوک کرتا تھا لیکن ایسا محض اس لیے ممکن ہو سکا کہ وہ اپنے پڑوسی حکمرانوں کی رعایا سے کافی آمدنی حاصل کر لیتا تھا۔ مغلیہ علاقوں

ہے چوتھ اور 'سر دیش مکھی' کی وصولیابی ہمارے عہد سے تعلق نہیں رکھتیں[1] اور ان کے سلسلہ میں محض اس قدر لکھنا کافی ہوگا کہ وہ کسانوں کے لیے جو پہلے ہی سرکاری تشخیص کے بوجھ سے پامال ہو رہے تھے یہ وصولیاں ناقابلِ برداشت ثابت ہوئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سیواجی کا شروع کیا ہوا نظام، مملکت مغلیہ کی برعجلت معاشی شکستگی کا ایک بڑا سبب بنا لیکن وہ شہادتیں جو اوپر پیش کی گئیں مظہر ہیں کہ مرہٹوں کے میدان میں آنے کے قبل ہی سے خرابیوں کا بیج پڑ چکا تھا اور مجھے اس میں ذرا شک نہیں کہ قومی دیوالہ جو بعد میں پیش آیا اس کا ابتدائی سبب مالگذاری زمین میں اضافہ اور وہ انتظامی طریقے تھے جس کے تحت اس کی تشخیص اور وصول عمل میں آتی تھی۔

مغلوں کے زمینی نظام کے موضوع کو ختم کرنے کے قبل لگان کے جدید نظام کی نشوونما کے متعلق مختصراً ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔ اکبر کے 'نظامِ ضبط' کے تحت مالگذاری کے کسی ایسے مفہوم کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ محض زمین پر قبضہ کے حق کے عوض ادا کی جانے والی کوئی رقم تھی۔ اس کی مالگذاری قبضہ پر نہیں بلکہ کاشتکاری پر وصول کی جاتی تھی۔ غیر مزروعہ آراضی پر کوئی مطالبہ نہ ہوا کرتا اور اس کا نظام اصلاً وہی روایتی نظام تھا جس کے تحت زیرِ کاشت زمین کی پیداوار کا ایک حصہ وصول کیا جاتا تھا۔ یہی طریقہ عہدِ عالمگیری میں بھی برقرار رہا مگر اس کے ساتھ ایک متبادل صورت بھی وجود میں آگئی تھی جس کے تحت کوئی کسان اپنی زیرِ کاشت زمین کی مالگذاری کو حکام کی اتفاق رائے سے نقد ادا کر سکتا تھا اور اس صورت میں اس سے کوئی بھی بحث نہ ہوتی کہ اس کی واقعی آمدنی کیا تھی۔ اس طریقہ کو خراجِ موضف، کہتے تھے اور اس کے تفصیلی شرائط

---

[1] 'چوتھ'، دکن میں ایک قدیم لگان داری کا حق تھا۔ اس کے چند سولھویں صدی کے حوالے [illegible] (میں ملتے ہیں۔ ان سے یہ اندازہ ملتا ہے کہ یہ ابتداً مجموعی پیداوار ایک چہارم ادا کرنے کی ذمہ داری کو ظاہر کرتا تھا لیکن عملاً یہ تناسب کم و بیش ہوا کرتا تھا۔ مگر مرہٹوں کے تحت اس لفظ سے بظاہر مالگذاری کے ایک چوتھائی کا مفہوم سمجھا جاتا تھا۔ 'سر دیش مکھی'، مالگذاری پر دس فیصدی کا مزید مطالبہ پا چکی تھی۔ مثلاً (رچرڈ مصنف) کا دعویٰ ہے کہ شیواجی نے 1650 ہی میں مغلیہ دکن میں چوتھ کی منظوری حاصل کرلی تھی لیکن یہ دعویٰ سرکار کی تصنیف 'شیواجی' (ص ۶۶) میں شامل اس معاملہ کے پر احتیاط بیان سے متناقض ہے۔

جو احکام عالمگیری میں درج ہیں مظہر ہیں کہ یہ طریقہ عملی اعتبار سے اہمیت اختیار کر چکا تھا مجھے اس کے اصل کا پتہ نہ چل سکا لیکن میرا قیاس ہے کہ اس طریقہ کی کم از کم توسیع کا خاص سبب تشخیص کا وہ ظالمانہ طریقہ تھا جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ مالگذاری کے کاشتکاری سے بے نیاز ہو جانے کی صورت میں، کاشتکاری پر اصرار کرنے کی ضرورت باقی نہ رہ جاتی تھی اور تشخیص کرنے والوں اور نیز کسانوں کے لیے فی الوقت اسی میں سہولیت تھی کہ معینہ برسوں کی کسی میعاد کے لیے باہمی معاہدہ ہو جائے خواہ اس کا آخری نتیجہ کتنا ہی مایوس کن کیوں نہ ثابت ہو۔ اسباب جو بھی رہے ہوں عہد عالمگیری کے اوائل میں یہ نظام موجود تھا اور یہ اکبر کے طریقوں اور حکومت برطانیہ کے قائم ہو جانے پر جو طریقہ رائج ہوا ان کے درمیان ایک سلسلہ کی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغلیہ جاگیرداروں یا حکام کے زمیندار کی شکل اختیار کرنے پر مالگذاری کی معینہ رقوم جو ا سے ادا کی جاتی تھیں وہی اپنے جدید اصطلاحی مفہوم میں لگان کے نام سے موسوم ہوتی تھیں

فصل 5۔ مغلیہ مالگذاری زمین کے شماریات

پچھلی فصل میں ہم نے دو مختلف مگر ایک ہی نتیجہ کی طرف رہبری کرنے والے دلائل پیش کیے تھے یعنی یہ کہ زیر مطالعہ عہد میں کسانوں پر انتظامیہ کے دباؤ میں زیادہ اضافہ نے مملکت مغلیہ کے پیداواری وسائل کو متاثر کیا تھا۔ یہ اضافہ مطالبۂ مالگذاری کے بعض اب تک محفوظ شماریات میں بھی نمایاں ہے اور اس موضوع کی ایک مکمل تصویر پیش کرنے کی غرض سے ان شماریات کی جانچ ضروری معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ان میں مندرج اعداد کی تفصیلی تعبیر میں متعدد دقتیں محسوس ہوتی ہیں۔ ان پر بحث کی نوعیت لازمتہً فنی ہوگی لہٰذا اس سے صرف ان قارئین کو دلچسپی ہو سکتی ہے جو اس موضوع کا ایک تفصیلی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اس کی بہترین صورت یہ سمجھ میں آئی کہ ان تفصیلی اعداد اور ان کی توضیحات پر ضمیمہ نسل میں بحث آئے کہ اسے یہاں صرف وہ عمومی نتائج پیش کر دیے جائیں جو میرے خیال میں ان سے مسلم طور پر برآمد ہوتے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں ذہن نشین رہنا چاہیے کہ میں نے جن مخطوطات کو استعمال کیا ہے ان کی ابھی تک معتبرانہ طباعت نہیں ہوئی ہے لہٰذا ان پر مبنی نتائج کبھی کلی طور پر حتمی تصور نہیں کیے جا سکتے۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم ایک نصف صدی سے زاید مدت پر پھیلے ہوئے اعداد و شمار کا باہمی موازنہ کریں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن سکوں کی اکائی میں وہ دکھائے گئے ہیں ان کے متعلق یہ معلوم کر لیا جائے کہ آیا وہ معقول حد تک مستحکم تھے یا نہیں کیونکہ قیمتوں کا ایک عمومی نشیب و فراز کسانوں کی مالی حیثیت پر کافی حد تک اثر انداز ہوا کرتا تھا کسی پچھلے باب میں ہم اس عارضی نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ ہمارے عہد میں چاندی اور زرعی پیداواروں کی درمیانی نسبت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اور اگر مالگذاری زمین کی تشخیص اور وصولی صرف چاندی میں ہوتی تو محض اس نتیجہ ہی کو دوبارہ لکھ دینا کافی ہوتا۔ حقیقت میں جو تشخیص ہم استعمال کرتے ہیں وہ تقریباً سب کی سب قطعاً بمقدار تانبہ کی گئی تھیں اور چونکہ پہلے گذر چکا ہے کہ ہمارے عہد میں تانبہ کی بمقدار چاندی کی قیمت میں تقریباً 30 فیصدی کا اضافہ ہوا تھا لہٰذا ہم بادی النظر میں یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مالگذاری میں کسی رسمی اضافہ کے علاوہ، اس کا حقیقی بار بھی قیمت کے اس اضافہ کی نسبت سے بڑھا تھا۔ لیکن سرکاری ضابطوں کی تحقیقات سے بظاہر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نتیجہ غلط تھا کیونکہ کسان کو ان دو میں سے کسی بھی دھات میں مالگذاری ادا کرنے کی آزادی حاصل تھی اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے درمیان سرکاری نسبت کو تبدیل کر کے بازاری نسبت کے مطابق نہیں کیا گیا تھا۔ اکبر کے سرکاری خزانچیوں کے نام مجریہ احکام مظہر ہیں کہ کسان اپنے ذمہ مطالبات کو سونے، چاندی یا تانبہ میں سے جس میں بھی چاہیں ادا کر سکتے تھے اور احکام عالمگیری مجریہ 1665 سے واضح ہوتا ہے کہ ابھی تک چاندی قابل قبول تھی کیونکہ ان کے تحت موجودہ عہد کے سکوں کے دستیاب نہ ہونے کی صورت میں شاہجہانی روپیوں میں ادائیگی ہو سکتی تھی۔ عہد اکبری میں سرکاری نسبت ۴۰ دام۔ ایک روپیہ تھی۔ مجھے اس میں تبدیلی کے متعلق کوئی تحریر نہیں ملتی بلکہ عہد شاہجہانی کی سرگذشتوں میں اس کا بہ تکرار ذکر آتا ہے اور ہمارے عہد کے اختتام کے متعدد برسوں بعد تک کی یہ واضح تحریر ملتی ہے کہ ان دنوں تنخواہوں کی رقم کی تحویل کے سلسلہ میں اب تک پرانی ہی شرحیں رائج تھیں۔ ظاہر ہے کہ جب تک سرکاری شرحیں تبدیل نہ ہوں بازار میں روپیہ کی قیمت ۴۰ دام سے گھٹ جانے کی حالت میں کاشتکار خزانہ میں تانبہ کی ۴۰ دام ہرگز نہ جمع کرتا بلکہ بازاری نرخ پر ایک روپیہ خرید لیتا اور اسے نتیجتہً چاہے اپنے تانبہ کے عوض میں بمقابلہ پہلے کے زیادہ پیداوار دینا پڑے لیکن اسے

اپنے روپیہ کے لیے تانبہ کی کم مقدار دینا پڑتی تھی۔اس طرح اس پر بار کا صحیح معنوں میں انحصار چاندی اور اشیار کی درمیانی نسبت پر رہا کرتا جو جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے تبدیل نہ ہوئی تھی۔ ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ تانبہ کی قیمت کے ترقی پذیر ہونے کی صورت میں، کسان کا بار بڑھ جاتا تھا کیونکہ قدرتی طور پر جیسا کہ اب بھی ہوتا ہے وہ بازار میں نقصان اٹھاتا تھا لیکن یہ نقصان ترقی پذیر نہ ہوتا اور جب اس دھات کی قیمت نسبتاً ایک اونچی سطح پر پہنچ کر مستقل ہو جاتی تو اس کی ادائیگی بمقدار پیداوار سابق کے تقریباً مساوی ہی رہتی۔ لیکن ہم مختلف سنوات کے اعداد و شمار کا باہمی موازنہ ان کی اکائیوں کی قیمت میں زیادہ اضافہ کی گنجائش رکھے بغیر کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ایسے شواہد دستیاب ہوں جو یہ ظاہر کریں کہ تانبہ کی قیمت میں اضافہ کا بار کسان کو برداشت کرنا ہوتا تھا تو میں زیر مطالعہ عہد میں کسانوں کی زیادہ زبوں حالی کے ثبوت میں جو دلائل پیش کر چکا ہوں انھیں تقویت بہم پہنچے گی۔

شروع ہی میں ایک اور امر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ان شماریات کی قدر و قیمت کو متعدد موجود جدولات میں تناقص کی موجودگی کے باعث زیر بحث لایا گیا ہے لیکن یہ اعتراض کرتے وقت یہ امر ملحوظ خاطر نہیں رکھا جاتا کہ ان دنوں تشخیص مالگذاری دورِ حاضر کی طرح متعدد برسوں کی ایک میعاد کے لیے نہیں بلکہ ہر برس عمل میں آیا کرتی تھی۔ پس، اگر مالگذاری کے دو جدول بالکل یکساں ہوں تو ہمیں یہ نتیجہ لازمی اخذ کرنا ہوگا کہ دونوں ایک ہی برس کے ہیں اور کسی ضلع یا پرگنہ کے اندراجات میں معتد بہ تناسب اختلافات پر بھی ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیے کیونکہ جنگ، قحط یا بغاوت سے ایک وسیع علاقہ کے معاشی حالات یکایک تبدیل ہو جایا کرتے تھے۔ میری رائے میں ان جدولات کو استعمال کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہوگا کہ پہلے ان کے سنوات کا تعین کر لیا جائے حالانکہ ایسا کرنے میں کبھی کبھی دِقت محسوس ہو سکتی ہے اور پھر انھیں تاریخ وار مرتب کر کے دیکھا جائے کہ آیا وہ کوئی معقول نقشہ پیش کرتے ہیں یا نہیں۔ فی الوقت میں صرف چھ جدولات پر اپنی بحث کو محدود رکھوں گا۔ ان میں سے پہلا تقریباً 1594 میں اکبر کے مطالبہ مالگذاری سے متعلق ہے۔ دوسرا شاہجہاں کی تختِ نشینی کے وقت کا مطالبہ ہے تیسرا 1647 یا اس سے غالباً برس دو برس قبل کا ہے۔ چوتھے اور پانچویں کی صحیح تاریخیں معلوم نہیں ہیں

لیکن یہ عہدِ شاہجہانی کے اختتام کے بالکل قریبی برسوں کے ہیں اور چھٹا اس سرگذشت سے ماخوذ ہے جو 1668 پر ختم ہوتی ہے لہٰذا ہم قیاساً یہ تصور کر سکتے ہیں کہ یہ عہدِ عالمگیری کے کسی ابتدائی برس کا رہا ہوگا۔ اگلے صفحہ کے جدول میں، جنوبی صوبوں کو ان کے حدود میں تبدیلیوں کی اطلاع کی بنا پر، صوبۂ بنگال کو اس سبب سے کہ اس کی مالگذاری کے ابتدائی اندراجات واضح طور پر انتظامی واقعات کے مطابق نہیں ہیں، اور سندھ کے چھوٹے صوبہ کو اس سبب سے کہ اس کے اعداد مشتبہ اور نامکمل ہیں خارج کر دیا ہے۔

سب سے اوّل ان تبدیلیوں پر غور کرنے سے جو 1594 اور شاہجہاں کی تختِ نشینی کی درمیانی مدت میں پیش آئیں، ہم دیکھتے ہیں کہ نو صوبوں میں مالگذاری بقدر 29 فیصدی بڑھی لیکن یہ اضافہ کسی طور پر بھی یکساں نہ تھا۔ ان میں سے چار میں اضافہ 20 فیصدی سے کم تھا۔ ہم اس اضافہ کو کسی غیر معمولی دباؤ کا نتیجہ نہیں تصور کر سکتے کیونکہ اس کا سبب کاشتکاری میں ایک معمولی اضافہ بھی ہو سکتا ہے جن صوبوں میں زیادہ اضافہ ہوا ان میں سے الہ آباد اور بہار کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ تقریباً 1594 میں یہاں کاشت کا کام بہت کم تھا اور کاشتکاری کی بحالی ان صوبوں میں اضافہ کا سبب ہو سکتا ہے۔ اجمیر میں بھی 48 فیصدی کا اضافہ غالباً اسی سبب سے ہو سکتا ہے۔ عہدِ اکبری میں اس صوبہ کا نظم و نسق جب کہ یہاں مالگذاری کا معیار پیداوار کا محض ساتواں یا آٹھواں حصہ تھا موثر نہ تھا۔ اور عہدِ جہانگیری میں مغلیہ اقتدار کی جو توسیع عمل میں آئی اس کے نتیجہ میں مالگذاری میں ضرور اضافہ ہوا ہوگا جو اس قسم کی توسیعات کا بنیادی مقصد ہوا کرتا تھا۔

مغلیہ مطالبۂ مالگذاری میں متناسب اضافہ

اکبر کی تقریباً 1594ء کی مالگذاری کے بمقدار جسے 100 کے عدد سے ظاہر کیا گیا ہے درج ہے۔

صوبہ	اکبر تقریباً 1594	شاہ جہاں				اورنگ زیب قبل 1668	اورنگ زیب قبل 1668 خانہ 3 کے اعداد کو 100 کے مساوات میں ظاہر کیا گیا ہے۔
		تختِ نشینی	تقریباً 1647	اواخر	اواخر		
1	2	3	4	5	6	7	8
بہار	100	138	176	173	175	؟	؟
الہ آباد	100	146	194	202	214	208	142
اودھ	100	114	147	136	155	157	138
آگرہ	100	151	165	158	196	193	128
مالوہ	100	119	170	174	166	181	152
گجرات	100	117	122	117	105	102	87
اجمیر	100	148	212	213	229	224	151
دہلی	100	110	168	205	200	196	178
لاہور	100	147	161	160	153	162	110
ملتان	100	؟	187	147	144	164	؟
میزان	100	129	166	170	175	175	136 (8 صوبے)

نوٹ :- جیسا کہ ضمیمہ میں بتایا گیا ہے کہ ملتان کے خانہ 3 اور بہار کے خانہ 7 کے اعداد میں شبہات پائے جاتے ہیں اور ان دونوں صوبوں کو ان دو خانوں کی میزانوں کی نسبتوں کا حساب لگانے میں چھوڑ دیا گیا ہے۔

اب یہ بے ترتیبی رہ جاتی ہے کہ آگرہ اور لاہور میں زیادہ اضافہ ہوا کہ دہلی میں جس کا جائے وقوع اور غالباً معاشی حالات بھی اوسط درجہ کے تھے سب سے کم اضافہ ہوا۔ ان اعداد کی مختلف قیاسی توجیہات پیش کی جاسکتی ہیں لیکن ان میں سے کسی کے بھی بارے میں مجھے مُثبت بنیاد نہ مل سکی لہٰذا یہ بے ترتیبی اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک مزید واقعات سامنے نہ آجائیں۔ لیکن تمام صوبوں پر فی الجملہ غور کرنے سے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اعداد اس بیان کو حق بجانب ثابت کرتے ہیں کہ عہدِ جہانگیری میں مالگذاری کا کوئی زاید عمومی اضافہ رونما ہوا تھا حالانکہ بعض صوبوں میں مطالبات بڑھادیے گئے تھے اور لاہور اور آگرہ میں اس قسم کا زیادہ غیر توجیہہ اضافہ ملتا ہے۔

عہدِ شاہجہانی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نوصوبوں میں اشاریہ اس کی جانشینی کے وقت کی 129 کی عدد سے بڑھ کر اس کے جانشین کے ابتدائی سنوات میں 175 پر پہنچ گیا اور خود اس کے عہد کے مندرجہ اعداد ثابت کرتے ہیں کہ اضافہ اس کے عہد کے دوران ہی میں پیش آیا کیونکہ اس کے عہد میں اشاریہ پہلے ہی سے اس سطح پر پہنچ چکا تھا۔ پس اس عہد کے اضافہ کو معلوم کرنے کی غرض سے ہم شاہجہاں کی تختِ نشینی کے اعداد کو بنیاد تصور کر کے اورنگ زیب کے اعداد کا فیصدی کے طور پر دوبارہ حساب لگا سکتے ہیں جیسا کہ جدول کے آٹھویں خانہ میں صرف آٹھ صوبوں کے لیے کیا گیا ہے کیونکہ اس برس میں ملتان کے اور دوسرے برس میں بہار کے اعداد مشتبہ تھے۔ اس خانہ میں پہلی بے ترتیبی گجرات کی مالگذاری میں واقعی کمی کا ہونا ہے لیکن 1630 کی قحط سالی کے مسلسل اثرات سے جس کا کسی پچھلے باب میں تفصیلی بیان آچکا ہے، اس کی معقول توجیہ فراہم ہو جاتی ہے۔ اس صوبہ کی معاشی زندگی کی بحالی کے لیے ایک نسل کی درمیانی مدّت کافی تھی لیکن اب بھی اس کی مالگذاری بمقابلہ عہدِ اکبری کے کچھ زیادہ نہ بڑھی تھی۔ آٹھ صوبوں میں عہدِ شاہجہانی کا اضافہ 36 فیصدی آتا ہے لیکن گجرات کو علیحدہ کر دینے پر بقیہ صوبوں کا اضافہ تقریباً 44 فیصدی ہو جاتا ہے۔ دیگر بے ترتیبیاں لاہور اور آگرہ میں اضافہ کی نسبتاً کمی اور دہلی میں نسبتاً زیادتی ہے اور یہ بیک نگاہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ان کے اثرات عہدِ جہانگیری کی بلا وجہ بے ترتیبیوں کو کافی حد تک زائل کر دینے والے ہیں۔ پس عمومی انداز میں کہا جا سکتا ہے کہ عہدِ شاہجہانی میں مالگذاری بقدر 40 سے 50 فیصدی تک بڑھی اور دہلی میں جہاں مالگذاری اس

کی تخت نشینی کے وقت کم تھی یہ اضافہ نسبتاً زیادہ اور آگرہ اور لاہور میں جہاں مالگذاری غیر معمولی طور پر زیادہ تھی یہ اضافہ کم ہوا۔

زیر تشخیص لائے گئے علاقہ کے 1594 کے بعد کے شماریات موجود نہیں ہیں۔ بظاہر یہ اعداد صرف اکبر کے نظام ضبط کے تحت تحریر میں لائے گئے تھے اور اس کے متروک ہو جانے کے بعد یہ لاپتہ ہو گئے لہٰذا کاشتکاری پر مالگذاری کے بار کا موازنہ کرنا ناممکن ہے لیکن اس تفصیل کے باوجود میرا خیال ہے کہ یہ دعویٰ قطعاً کیا جا سکتا ہے کہ میرے دیے ہوئے اعداد معقول اور اغلب ہیں۔ عہد جہانگیری میں بجز دو صوبوں کے مالگذاری کا بار بہت زیادہ نہیں بڑھا۔ عہد شاہجہانی میں اضافہ ان دونوں صوبوں اور گجرات کے علاوہ جو اس عہد میں قحط سالی سے ویران ہو گیا تھا بقدر نصف ہوا۔ ہم مالگذاری میں اضافہ کے کسی جزو کو بھی پیداوار کی قیمتوں میں اضافہ کا نتیجہ قرار نہیں دے سکتے بلکہ اس کا سبب جزاً کاشتکاری میں توسیع اور جزاً تشخیص کے معیار میں اضافہ تھا۔ لیکن آج کل کی طرح، ان دنوں کاشتکاری میں توسیع ملک کی آبادی یا اس کے وسائل میں ترقی کی مظہر نہ ہوا کرتی بلکہ حکومت اسے زبردستی کراتی تھی اور بقول برنیر در حقیقت عہد شاہجہانی کے اواخر میں کاشتکاری رُو بہ زوال تھی۔ لہٰذا اگر پورے طور پر نہیں تو اس کا بیشتر حصّہ قطعاً انتظامیہ کے عمل کا نتیجہ تھا۔ پہلے گذر چکا ہے کہ معیار تشخیص بقدر نصف بڑھ چکا تھا اور مطالبہ مالگذاری میں بھی تقریباً اسی تناسب سے اضافہ ہوا تھا۔ یہ مطابقت بالکل ٹھیک نہیں ہے کیونکہ ایسا شاذ ہی ہوتا ہے کہ کسی بھی جدید نافذ کردہ معیار سے برآمد ہونے والے نتائج علم ریاضی کے اعتبار سے بالکل متناسب ہوں۔ لیکن عمومی انداز میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو شماریات اب تک محفوظ ہیں وہ سرکاری احکام اور ہمعصر شہادات میں بیان کیے ہوئے کسانوں پر دباؤ میں اضافہ کی واضح طور پر عکاسی کرتی ہیں۔

اپنی بحث کے اس موضوع کو ختم کرنے کے قبل اس قول کے متعلق جو کبھی کبھی سُننے میں آتا ہے کہ چونکہ واقعی وصولیاں مطالبہ مالگذاری سے کم رہا کرتی تھیں لہٰذا یہ جدولات سرکاری دباؤ کی ایک مبالغہ آمیز تصویر پیش کرتے ہیں، کچھ کہنا مناسب ہوگا۔ اس قول کو کہ پوری مالگذاری کی وصولی ممکن نہ تھی ہر اس شخص کے لیے جو ان ایام کے حالات سے واقف ہے کم از کم بطور ایک اغلب حقیقت کے قابل تسلیم ہونا چاہیے لیکن اصل مسئلہ یہ نہیں ہے

بلکہ یہ ہے کہ یہ مطالبہ اپنی جگہ پر قائم رہا کرتا تھا۔ مجھے خود یہ تسلیم نہیں کہ شاہجہاں کے مطالبہ مالگذاری کو مسلسل متعدد برسوں تک پورا وصول کرنا ممکن تھا، لیکن یہ امر بجائے خود وباؤ کی زیادہ مقدار کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک متعدد متصل خود پورے مطالبہ کی وصولی کی امید نہ رکھ سکتا تھا لیکن وہ بقایہ کو قلیل ترین سطح پر رکھنے کی اپنی جدوجہد میں پورے علاقہ کو روند ڈالا کرتا تھا۔ دوسری طرف، وصولی کے مروجہ طریقوں میں تشدد و بشمول بقایہ دار کے افراد کنبہ کو بطور غلام فروخت کیے جانے سے یہ تقریباً یقینی ہو جاتا ہے کہ رشوت سے بھی کوئی زیادہ بچت نہ کی جا سکتی تھی کیونکہ رشوت کی رقم کا مطالبہ کے قریب قریب ہونا امر مسلم تھا۔ میرے دیے ہوئے اعداد کو بمنزلہ وصول شدہ رقم کے تصور کرنا غالباً غلط ہوگا لیکن ہم انھیں بلا تامل ایک ایسے مقررہ خطرہ کے طور پر جو ہر فصل میں زرعی آبادی کے سروں پر لٹکا رہتا تھا قبول کر سکتے ہیں۔

باب 8 کے ماخذ

فصل 1 : ملاکا میں غیر ملکی تاجروں کی حیثیت کے بیان کے لیے ALBUQUERQUE.

iii ملاحظہ ہو نیز JOURNAL R.A.S., BARROS, ii CORREA ii CASTENHEDA, iii-

1920, P-517 کالی کٹ کے لیے ملاحظہ ہو CAMPOS ,ELLIOT, vii SMITH'S AKBAR, 137

55 ff, مجھے ولندیزی تجارتی کوٹھیوں کا سب سے ابتدائی حوالہ (BEGINENDE VOORTGA-

NEN) میں ملا ہے۔ اشین کی کوٹھی کا بیان SPILBERG کے سمندری سفر کے صفحہ 44 پر ہنتم کا

HARMANSZ. کے سمندری سفر کے صفحہ 23 پر ہے۔ تجارتی کوٹھی کے پہلے ضابطے WARWIJK,

اور DE WEERT کے سمندری سفروں میں طبع ہوتے ہیں۔ اشین میں انگریزوں کا معاہدہ

1-LETTER BOOK, 69 & PURCHAS میں ہے۔ مشرقی ساحل پر ولندیزیوں کی تاریخ TERPSTRA'S

KOROMONDEL, 35-123, میں اور ولندیزیوں اور مغلوں کا معاہدہ TERPSTRA'S

SURAT APPENDIX vi. میں ہے۔

انگریزوں کی مغلوں سے گفت و شنید کے حوالے PURCHAS 1-206, LETTERS RECEI-

VED (INTRODUCTION TO ii); ROE, PASSIM & ENGLISH FACTORIES, 1-

(iii & iv) انگریزوں کی انتقامی کارروائیوں کے لیے ملاحظہ ہو تصنیف مذکورہ 24, 270 (ان واقعات

کا خلاصہ دیباچوں میں درج ہے) DEVALLE, 418 ولندیزیوں کی انتقامی کارروائیاں

DAGH REGISTER اور HAGUE TRANSCRIPTS, 1-284, 291-298. مورخہ 16/جون 1628 سے ماخوذ ہیں۔

قلعہ پولی کٹ کی تاریخ METHWOLD 994, TERPSTIAS KOROMONDEL, 85 HAGUE TRANSCRIPTS, 1-69, 36; VAN DIJK, 20-25, ELIAS, 11 سے مرتب کی گئی ہے۔ مغربی ساحل پر قلعوں کی ابتدائی تجاویز کے حوالے HAGUE TRANSCRIPTS, 11-73 & ENGLISH FACTORIES 111 میں ملتے ہیں۔ ارماگوں کی بنیاد کے قیام کا بیان اسی جلد میں (صفحہ بجا مخصوصاً صفحات 128-134) ہے۔ مدراس کی بنیاد کا قیام INTRODUCTION, 61. اور اس کے بعد کی مغربی ساحل کے متعلق تجاویز 1x/70 & x-151-208 etc میں ہیں۔

فصل 2 :۔ یہ فصل بیشتر ان نتائج کا خلاصہ ہے جو تصنیف 'INDIA AT THE DEATH OF AKBAR' میں اخذ کیے گئے ہیں اور اگلی فصلوں میں جو نتائج سامنے آتے ہیں ان کے متعلق یہاں پیش بینی کی گئی ہے۔ ان کے تفصیلی حوالے اگلی فصلوں میں آئیں گے۔ لہٰذا انھیں یہاں لکھنا غیر ضروری معلوم ہوا۔

فصل 3 :۔ چوٹل کی جنگ کا حوالہ FARIA Y SOUSA, 111-8 LETTERS RECEIVED 11, 239 میں آیا ہے۔ نظم و نسق کے متعلق SCHORE کا بیان اوراق 3، 4 پر ہے۔ گولکنڈہ کے متعلق میتھولڈ کا بیان صفحہ 996 پر ہے۔ گولکنڈہ میں مظالم وغیرہ کی مثالوں کا بیان DAGH REGISTER اور ENGLISH FACTORIES, 11-46, 1v مورخہ 12/مارچ 1625، 31/مارچ اور 23/اکتوبر 1633، 23/نومبر 1636 اور 14/مارچ 1637 سے ماخوذ ہے۔ یورپی اجارہ داروں کے لیے ملاحظہ ہو DAGH REGISTER مورخہ 31/اکتوبر 1636 اور ENGLISH FACTORIES, v-45; vi-188; iii — 54 مسولی پٹم کے اجارہ پر HAGUE TRANSCRIPTS 1-261, میں بحث آئی ہے۔ بیجاپور کے حالات کے حوالے DAGH REGISTER مورخہ 30/اپریل، 11/جولائی 1661 اور سرکار کی تصنیف SHIVAJI, P.34 ہے۔ ہندو علاقوں کے نظم و نسق کا مجھے کوئی باضابطہ بیان نہ مل سکا۔ جو واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ ENGLISH FACTORIES vi-1 اور DAGH REGISTER مورخہ 19/فروری

1641 ، 23/24ء/اپریل اور 16/جولائی 1642ء ، 20/نومبر1643 ، 21/جون اور 29/جولائی 1644 ، 18/جنوری 1945/اگست اور 17/ستمبر1646 سے ماخوذ ہیں۔

فصل 4 :- اس فصل کا بیشتر حصہ JOURNAL R.A.S کے ان دو مضامین پر مبنی ہے THE DEVELOPMENT (2)-1918 مورخہ جنوری AKBAR'S LAND REVENUE SYSTEM OF LAND REVENUE SYSTEM مورخہ جنوری 1922ء۔ اکبر کے نظام کا ابتدائی ماخذ آئین اکبری ہے۔ اس دور کی تبدیلیاں عالمگیر کے دو فرمانوں سے ماخوذ ہیں جس کا متن جون 1906 کے JOURNAL A.S.B. کے ترجموں کے ساتھ طبع ہوا ہے 168 SARKAR'S STUDIES' میں بھی ملتے ہیں۔ اکبر کی صلاحیتوں کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو DR.VINCENT SMITHSS, & AKBAR, THE GREAT MOGHUL میں جا بجا۔

جاگیروں کے حوالے تصنیف مذکورہ صـ121ـ ، اکبر نامہ (ترجمہ) ج 2 صـ95ـ ، تزک جہانگیری میں جا بجا۔ ہاکنس کا بیان PURCHAS, 1-221، اور EARLY TRAVELS114 میں ملتا ہے۔ ٹیری کا بیان PURCHAS 11-IV.1480 میں ہے۔ شاہجہاں کے تحت اس طریقہ کے رواج کے لیے ملاحظہ ہو MUNDY, 11,85 میں جا بجا۔ تبدیلیوں کی کثرت کے لیے MUNDY-11 اور VAN TWIST,xviii, اور اعداد و شمار کے جدولات کے لیے بادشاہ نامہ 2(2) 710 اور صفحات مابعد۔

گجرات میں اجاروں کے متعلق REVESTEYN کا بیان TERPSTRA'S SURAT کے ضمیمہ 6 میں ملتا ہے۔ اس موضوع پر طامس رو کا بیان صـ129-239ـ پر ہے ملاحظہ ہو نیز DAGH REGISTER مورخہ 31/اکتوبر 1636 ، 28/جنوری 1642 (سورت) ENGLISH FACTORIES,vi,100,276 & vii-23 اور PELSART,M.S.F.20 شاہجہاں کے اخراجات کا بیان ELLIOT, vii-171-172 میں ہے۔ پیداوار کے نصف کا مطالبہ VAN TWIST,XLI; MANUCCI,ii-451,OVINGTON,197 اور دیگر تصنیفوں میں بیان کیا گیا ہے۔ مالگذاری کے سلسلہ میں کسان کی حالت کو زیادہ تفصیل کے ساتھ INDIA AT THE DEATH OF AKBAR,295 میں بیان کیا گیا ہے۔ کسان کی فراری کو SARKARS STUDIES 172,189 میں مندرج فرمان عالمگیری سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اس موضوع پر برنیئر

کی بحث 205 اور صفحات مابعد پر ملے گی۔

دکن کے نظم ونسق کے لیے ملاحظہ ہو سرکار کی تصانیف AURANGZEB ، خصوصاً ج (۱) 179 اور صفحات مابعد اور SIVAJI ص 470 اور کلکتہ یونیورسٹی کے جرنل (صیغہ مراسلات) ص 1921 میں مطبوعہ ایس سین کا ایک مقالہ۔ نظام لگان کے متعلق عبارت اورنگ زیب کے مذکورہ فرمان پر مبنی ہے۔

فصل 5 :۔ اس فصل میں جن شماریات پر بحث آئی ہے ان کے ماخذ ضمیمہ 'س' میں درج ہیں۔ چاندی یا تانبہ میں سے کسی ایک میں مالگذاری ادا کرنے کا اختیار آئین اکبری (ترجمہ) ج 2 ص 49 اور SARKAR'S STUDIES, 193 میں درج ہے۔ سرکاری نسبت کا قائم رہنا' بادشاہ نامہ' ج (2) ص 172-715 ، مجالس السلاطین اوراق 115 - 118 اور منوکی (2) 363 اور صفحات مابعد میں بیان کیا گیا ہے۔ بہار اور الہ آباد میں کاشتکاری کی کمی پر JOURNAL U.P.HISTORICAL SOCIETY, 1919. میں بحث آئی ہے۔ اجمیر کی حالت آئین اکبری (ترجمہ) ج (2) ص 267 پر بیان کی گئی ہے۔

باب 9

نظامِ محصول

فصل ۱ - مالی نظام کا ایک عمومی جائزہ

اس باب میں ہمیں مالگذاریٔ زمین کے علاوہ ان دوسرے مالی نظاموں کے معاشی پہلوؤں کا جائزہ لینا ہے جو زیرِ مطالعہ عہد میں ہندوستان میں رائج تھے اور ہمارے لیے سب سے زیادہ سہولیت کی یہ صورت ہوگی کہ ہم اپنے جائزہ کا آغاز مملکت مغلیہ کے مالی نظام سے کریں۔ اس نظام کو سمجھنے کے لیے ان دنوں مرکزی اور صوبجاتی یا مقامی آمد و خرچ کے نام سے جو مدات مشہور ہیں ان کے درمیانی فرق کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ بادشاہ اپنے تصرف کے لیے آمد کے چند مسلمہ مدات پر بھروسہ کرتا تھا جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق خرچ کرتا تھا اور صوبجاتی اور مقامی حکام اپنے حدود اختیار کے اندر اپنی ضروریات کے لیے محصولات عائد کرنے کے معاملہ میں کافی حد تک آزاد تھے۔ معلومات کے موجود ذرائع کی نوعیت ایسی ہے کہ ہمارے علم میں بمقابلہ مقامی کے مرکزی مالیات کی زیادہ اطلاعات آتی ہیں سترھویں صدی کے وقائع نویسوں اور نیز ملک کے یورپی سیاحوں کے لیے مرکزی حکومت کی آمدنی کے وسائل ایک فرسودہ موضوع بحث تھا۔ لیکن مقامی نظم و نسق کی تفصیلات ان میں سے کسی بھی زمرہ کے مصنفین کے لیے کوئی خاص کشش نہ رکھتی تھیں اور ان کے متعلق ہماری معلومات بیشتر تجارتی مراسلات کے ضمنی بیانات سے ماخوذ ہیں۔

مرکزی آمد کے یہ مدات تھے۔ مالگذاریٔ زمین، درآمدی محصولات، ٹکسال، وراثت اور

تحائف جنھیں ہم عام مدات کہہ سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ وقتاً فوقتاً مخصوص آمدنیاں مثلاً اجارہ داریاں یا جنھیں ہم قیاساً تاوانی رقوم کہہ سکتے ہیں ہوا کرتی تھیں۔ مالگذاری زمین پر پچھلے باب میں بحث آچکی ہے اور دیگر عام مدات کا ہم اگلی فصل میں جائزہ لیں گے۔ جہاں تک غیر معمولی مدات کا تعلق ہے، ان کے متعلق کوئی عمومی بات نہیں کہی جا سکتی۔ اس سلسلہ میں صرف اس قدر کافی ہوگا کہ ہم مثالاً 1633 میں نیل کی اجارہ داری کا ذکر کر دیں جس کے نفاذ کا مقصد چند لاکھ روپیوں کا حصول[1] تھا یا اسے 1636 کی فوجی کاروائی کے بعد گولکنڈہ پر عاید کیا ہوا اخراج تصور کیا جا سکتا ہے۔ مجموعی مرکزی آمدنی کے قابل اطمینان اعداد تو موجود نہیں ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ہم یہ بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ اس میں ایک بہت بڑا حصہ تنہا مالگذاری زمین ہوتا تھا اور پچھلے باب میں گذر چکا ہے کہ ہمارے عہد کے دوران پُرانے صوبوں میں اس کا بار بقدر 75 فیصدی بڑھا تھا۔ اس کی مجموعی میزان میں نئے علاقوں کی فتح سے مزید اضافہ ہوا اور ہم آئین اکبری میں مندرج 363 کروڑ داموں کا بادشاہ نامہ کے 880 کروڑ سے موازنہ کر کے اس کے اضافہ کا ایک سرسری تخمینہ لگا سکتے ہیں۔

پہلے گذر چکا ہے کہ مالگذاری زمین کا بہت بڑا حصہ فوج کے عمومی اخراجات اور نظم و نسق عام پر صرف ہوتا تھا۔ ہم اخراجات کی ان مدوں کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کر سکتے کیونکہ تقریباً ہر جاگیردار کے لیے فوج رکھنا لازم تھا اور فوجی عہدہ دار ہی نظم و نسق کے ہر شعبہ کو چلاتے تھے[2]۔ ان دو مدوں کے علاوہ دربار کے اخراجات جس میں توپ خانہ اور دیگر خصوصی افواج کی کفالت بھی شامل ہوتی اور خیراتی اور متفرق کثیر التعداد مدیں یہ سب بالعموم مرکزی اخراجات میں شامل رہتے۔ مرکزی محاصل سے پورے کیے جانے والے غیر معمولی اخراجات کی مدیں اولاً فوجی کاروائیوں کے اور ثانیاً عمارات اور رفاہ عامہ اور نام و نمود کے کاموں کے اخراجات شمار کیے جاتے۔ عہد شاہجہانی میں اخراجات کے اضافہ کی تائید عام شواہد کے علاوہ اس مد میں مزید

---

[1] اجارہ داروں کے ذمہ جو رقوم واجب الادا تھیں انھیں مختلف طور پر چار و چھ لاکھ بتایا گیا ہے یہ رقوم خزانہ کے قرض کی واپسی کے علاوہ تھیں۔ ENGLISH FACTORIES VI-324

[2] یہاں مغلوں کے ملکی انتظام کی جزویات کا جو خلاصہ بیان کیا گیا ہے ان کی INDIA AT THE DEATH OF AKBAR کے ابواب 2، 3 میں بہ تفصیل وضاحت کی گئی ہے۔

سے بھی ہوتی ہے جس کا حوالہ پچھلے باب میں آچکا ہے اور جو اخراجات میں چار گنے اضافے کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس میں اخراجات کی رقم کے تعین میں تو غالباً مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے لیکن جنگوں اور عمارات جیسے اندراجات بجائے خود بادشاہ کے میزانیہ کی غیر معمولی مقدار کو ظاہر کرتے ہیں اور بار بار ہونے والے اخراجات میں زیادتی کا سبب گو شورۂ تنخواہ میں اضافہ تھا۔ اکبر اپنے عہدہ داروں کو غیر محتاط پیمانہ پر مشاہرے دیتا تھا لیکن عہدِ شاہجہانی میں اونچے عہدوں کی تعداد اور نیز سربراہوں کی آمدنیاں دونوں غیر معمولی طور پر بڑھیں۔ 1594 کے قریب ایک ہزاری یا اس سے زاید سواروں کے "منصبداروں" کی تعداد 58 سے زاید نہ تھی جو[1] 1647 کے قریب بڑھ کر 218 ہوگئی تھی۔ ان دونوں فہرستوں کے تفصیلی موازنہ سے واضح ہوتا ہے کہ مشاہرہ کے پیمانہ میں چند تخفیفوں کے لیے گنجائش رکھتے ہوئے اس نصف صدی کے دوران مشاہرہ کے مجموعی اخراجات میں تین گنے کا اضافہ ضرور ہوا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ سر فہرست اس قدر کثیر اضافہ کا سبب مملکت کی توسیع تھی بلکہ اس کے ایک بڑے حصہ کی ذمہ داری بادشاہ کی فضول خرچیوں اور نیز مالی معاملات میں موثر نگرانی کی کمی پر عائد ہونی چاہیے۔

پس ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مرکز کی مجموعی آمدنی بہت ہی کثیر تھی مگر اس کا ایک بہت بڑا جز ایک انتہائی گراں نوکرشاہی اور ایک ایسی فوج جس کی واقعی تعداد اس کے تحریری شمار سے بہت کم تھی کے اخراجات کے لیے وقف تھا۔ بقیہ کا بادشاہ مالک ہوتا اور اس میں سے جس قدر رقم ممکن ہوتی وہ خاص طور پر جارحانہ جنگوں پر صرف کرتا تھا[2] ان اور ان کے علاوہ

---

[1] مغل عہدہ داروں کے منصب، سواروں کی با اعتبار تعداد درجہ بندی کے مطابق ہوا کرتے تھے مثلاً "یک ہزاری منصبدار" کا عہدہ ان دنوں قسمت کے ایک کمشنر کے تقریباً مساوی ہوتا تھا یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ منصب کی تعداد سواروں کی اس تعداد سے بہت زیادہ ہوتی تھی جس کا رکھنا ضروری تھا۔

[2] ہندوستانی روایتی طریقہ یہ تھا کہ آمدنی کو کثیر تعداد میں بچا کر خزانہ میں بشکل نقد یا جواہرات کے جمع کر دیا جائے جس وقائع نگار کا پچھلے باب میں ذکر آیا ہے اس کا دعویٰ ہے کہ شاہجہاں اس روایتی طریقہ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

دیگر کاموں کے لیے سرمایہ کی فراہمی کی غرض سے پورے ملک میں شاہی خزانہ کی شاخیں قائم تھیں اور ہر صوبہ میں شاہی مالیہ کا ایک عہدہ دار جسے دیوان کہتے تھے مقرر ہوتا۔ جو محاصل ان ذیلی خزانوں میں جمع ہونے ان کا مالک بادشاہ کا نائب یا مقامی صوبیدار نہ ہوتا صوبے کے اندر خرچ ہونے والی بادشاہ کی منظور کردہ رقم دیوان کے حکم سے خزانہ سے برآمد ہوا کرتی اور باقیماندہ رقم پابندی کے ساتھ دربار شاہی میں یا ان مخصوص خزانوں میں جو مختلف قلعوں میں قائم کیے گئے تھے بھیج دی جاتی۔ اس دور کے وقائعوں میں منتشر بعض بیانات سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہر صوبہ کو کچھ رقم بھیجنے کے لیے بچا کر رکھنا ہوتا تھا اور شاہجہاں کے دکن کے مالیات پر خصوصی توجہ کا سبب یہ تھا کہ وہاں 1630 کے قحط کے بعد سے آمدنی میں غیر معمولی خسارہ چل رہا تھا لیکن بہرحال حقیقت حال جو بھی رہی ہو یہ امر واضح ہے کہ بچی ہوئی رقم کی بشرطیکہ کچھ بچت ہوئی ہو مسلم مالک مرکزی حکومت رہا کرتی اور بقیہ بادشاہ کی واضح منظوری کے بغیر صوبجاتی یا مقامی ضروریات پر صرف نہ ہو سکتی تھی۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کار صوبہ کی ان ضروریات کے پورا ہونے کی کیا صورت ہو سکتی تھی۔ صوبہ کے انتظامی حکام کو بلا شک جاگیروں کے ذریعہ مشاہرے ادا کیے جاتے تھے[1] اور ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ پولیس اور ماگذاری پر جو فوج تعینات رہتی وہ انھیں دستوں سے حاصل کی جاتی تھی جنھیں حکام اپنے صرف پر رکھنے کے ذمہ دار ہوتے۔ یہ مزید تصور کیا جا سکتا ہے، حالانکہ مجھ سے اس کی تائیدی شہادت فراہم نہ ہو سکی، کہ لکھنے پڑھنے والے عملہ اور معمولات کے کام کے اخراجات بھی بالعموم عطا کردہ جاگیروں

(صفحہ 332 سے آگے)
میں بہت کامیاب رہا۔ دوسری طرف برنیر (صفحہ 322) کا قول ہے کہ اس کی اندوختہ رقم چھ کروڑ روپیہ سے کم تھی۔ یہ اس کے عہد کی میعاد کے پیش نظر ایک تھوڑی سی رقم تھی۔ لیکن برنیر نے قیمتی جواہرات اور دیگر قیمتی سامانوں کو اپنے حساب سے خارج کر دیا ہے جنھیں قیاس ہے کہ وقائع نگار نے شامل کیا ہوگا۔ لہٰذا ان دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں آتا۔

[1] یہ جاگیریں معمولاً اس نوعیت کی ہوا کرتیں جن کا پہلے ذکر آچکا ہے۔ ان میں جاگیردار کو آمدنی وصول کرنا ہوتا تھا لیکن ساتھ ساتھ نقدی جاگیریں بھی ہوا کرتی تھیں جو دیوان کے حکم کے تحت خزانہ سے ادا کی جاتیں۔ چنانچہ دکن میں اورنگ زیب بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے متعین تھا تو اس کے قبضہ میں وسیع زمینی جاگیریں تھیں جن کے علاوہ اسے ایک معینہ رقم بھی نقد ملا کرتی تھی۔

سے پورے ہوتے تھے لیکن ہمیں پھر بھی ان امور کا لحاظ رکھنا چاہیے اول یہ کہ عہدہ داران بالا کو اکثر قیمتی تحائف کا پیش کیا جانا عملی طور پر ضروری تھا اور دوسرے یہ کہ انتظامی ملازمتیں ذاتی منفعت کے جائز وسائل تصور کیے جاتے تھے۔ زیر مطالعہ عہد کے اواخر میں مغلیہ حکام فی الجملہ غریب تھے کیونکہ ان کے مشاہروں میں اضافہ کے ساتھ اگر کچھ اور نہیں تو کم از کم ان کی فضول خرچیوں میں بھی اضافہ ہوا تھا اور اونچے عہدہ داروں کے متعلق برنیر کے قول کے مطابق "ان میں سے بیشتر پریشان حال اور بے حد مقروض ہیں۔ ایسا نہیں کہ دوسرے ملکوں کے امرا کی طرح یہ اپنے دستر خوان کی وسعت کے باعث برباد ہوتے ہوں بلکہ ان کی بربادی کا سبب بعض سالانہ تہواروں کے مواقع پر بادشاہ کو بیش قیمت تحفوں کا پیش کرنا اور ان کی عورتوں، ملازمین، اونٹوں اور گھوڑوں کے لوازمات تھے"۔ ایسے ماحول میں ظاہر ہے کہ فوجی یا انتظامی عہدوں سے کسب منفعت کو اوّلین اہمیت دی جاتی تھی اور یہ کہ محاصل کے مقامی ذرائع کو بڑھانے کے لیے قوی محرکات پائے جاتے تھے۔ میری نظر سے کوئی ایسا شاہی حکم نہیں گذرا جس کے تحت بادشاہ کے نائب یا صوبیدار کو مقامی محصول عائد کرنے کی واضح منظوری دی گئی ہو لیکن اس امر کی کثیر شہادتیں ملتی ہیں کہ درحقیقت یہ عہدہ داران شاہی خزانہ میں داخل ہونے والے محصولوں کے علاوہ دیگر محصولات بھی عائد کرتے تھے۔
پس یہ نتیجہ اخذ کرنے میں ہم حق بجانب ہوں گے کہ یہ عہدہ داران مقامی ضروریات یا اپنے ذاتی منافع کے خاطر محصول وصول کرنے میں عملاً آزاد تھے بشرطیکہ وہ اپنی وصولیوں کو علم بغاوت بلند کرنے میں صرف نہ کریں یا ان کے اس عمل کے نتیجہ میں کوئی ایسی رسوائی کی صورت نہ پیدا ہو جائے کہ بادشاہ کی مداخلت ضروری ہو جائے۔ اس نتیجہ کے پیش نظر تجارتی مراسلات میں حالات کی جس گوناگونی کا ذکر کیا گیا ہے ان کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ شاہی محاصل سے بالکل جداگانہ بہت سے مقامی محصول تھے جنھیں مقامی گنجائشوں کے مطابق وصول کیا جاتا تھا۔ لیکن ان میں سے بیشتر کی نوعیت بے حد سخت ہوا کرتی۔ اور اس امر کی تحریری مثالوں سے کہ ہر صوبیدار کے تبدیل ہونے پر ان محصولات کے پیمانے تبدیل ہو جاتے تھے میرے ذہن میں مذکورہ نتیجہ کو قطعیت حاصل ہوتی ہے۔

پس آنے والی فصلوں میں ہمیں اولاً مالگذاری زمین کے علاوہ دیگر شاہی محاصل کے ذرائع کا اور ثانیاً ان صورتوں کا جائزہ لینا ہے جو مقامی صوبجاتی مقاصد کے لیے آمدنی

فراہم کرنے کی غرض سے اختیار کی جاتی تھیں لیکن پیشتر اس کے کہ ہم ان موضوعات کی تفصیلی تحقیقات کا آغاز کریں مناسب ہوگا کہ مملکت مغلیہ کے جنوب میں واقع علاقوں کے مالی نظام کو ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ یہاں اجارہ داری مالگذاری کی ہمہ گیری نے معاملہ کو آسان بنا دیا تھا۔ اجارہ دار اعلیٰ کی خالص ادائیگیاں بمنزلہ مرکزی محاصل کے ہوا کرتیں جن کا مالک بادشاہ اور اس کے وزرا ہوتے اور حکومت یا ضلع کے حدود میں اجارہ دار اعلیٰ محاصل کے کسی بھی ذریعہ کو اجارہ پر دے سکتا تھا۔ زر معاہدہ ادا کرنے کے بعد آمدنی کی جو بچت ہوتی اس کا وہ خود مالک ہوتا۔ پچھلے باب میں مذکورہ مثال کو پھر سے دہرایا جاتا ہے پٹاپولی کے صوبیدار کو اپنے عہدہ کے لیے خالص 000، 48 پگوڈے ادا کرنا ہوتا تھا اور اس کے عہدہ سے مرکزی حکومت کی اسی قدر مجموعی آمدنی تھی۔ یہ اور بات ہوتی کہ منفرد وزیر اس رقم پر مستزاد کچھ اور بطور رشوت یا تحفہ کے وصول کر لیتے۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے بعد صوبیدار ضروری اخراجات سے جملہ زاید وصولیوں کو اپنے تصرف میں لا سکتا تھا اور اس کا واحد مطمع نظر یہ ہوتا کہ جس قدر زیادہ ممکن ہو وصولیاں کر لی جائیں اور زیر حوالہ بیان کے مطابق انتظامی اخراجات کو اپنے مختصر المیعاد عہدہ کے دوران کم سے کم سطح پر رکھا جائے۔ اس طور پر جنوبی ہندوستان کا مالی نظام غالباً سب سے زیادہ سہل اور ساتھ ساتھ جو بھی انتظامات وضع کیے جا سکتے تھے ان میں سب سے زیادہ ظالمانہ تھا۔

فصل 2 مغلوں کی مرکزی آمدنی کے وسائل

مالگذاری زمین کے علاوہ، شاہی میزانیہ میں، اگر ان دنوں اس قسم کی کسی تحریر کا وجود تھا، آمدنی یہ چار معمولی مدیں شامل ہوا کرتیں۔ درآمدی و برآمدی محاصل۔ ٹکسال۔ وراثت اور تحفے۔ معلوم ہوتا ہے کہ درآمد و برآمدی محصولات کا انتظام بالعموم مالگذاری زمین کے ساتھ کیا جاتا کیونکہ ضلع کا صوبیدار، بندرگاہ کا بھی اجارہ دار ہوا کرتا لیکن یہ کوئی ایسا طریقہ نہ تھا جو تبدیل نہ ہو سکے۔ یاد ہوگا کہ ہاکنس کو سورت پہنچنے پر معلوم ہوا تھا کہ بندرگاہ تو دکن میں متعینہ بادشاہ کے نائب کے زیر انتظام اور اس کا زمینی علاقہ صوبیدار گجرات کے تحت ہے۔ درآمدی اور برآمدی محاصل خود بادشاہ معین کیا کرتا اور اس کی وصولی کے حق کو صوبیدار یا کسی اور عہدہ دار کو اجارہ پر یا کبھی جاگیر میں دے دیا جاتا رہا ہے

جن کا اندراج تحریروں میں آتا ہے نمایاں طور پر کم تھیں۔

1609 میں سورت کی شرحیں اسباب پر ½2 فیصدی، سامان رسد پر 3 فیصدی اور سکوں پر 2 فیصدی تھیں۔ میں اس اصطلاح میں مسکوک یا غیر مسکوک سونے چاندی کو شامل خیال کرتا ہوں۔ شرحوں کو ہمارے عہد کے دوران قدرے بڑھا دیا گیا تھا لیکن پھر بھی یہ اس عہد کے اواخر پر 5 فیصدی سے کم ہی تھیں اور ہم سورت کے نرخ عام کی مثالی تصور کر سکتے ہیں۔ اس طریقے کے تحت غیر ملکی تجارت میں زیادہ سے زیادہ ترقی اجارہ دار کے لیے سود مند ثابت ہوتی کیونکہ اس کے زر اجارہ کے ایک مستقل رقم ہونے کے باعث اس سے تمام زاید وصولیاں اس کا کھلا ہوا منافع ہوا کرتا اور تجارت کا زیادہ گرنا اس کی بربادی کا سبب ہو سکتا تھا اور حقیقت میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حکام کے اندر بالعموم غیر ملکی تاجروں کا خیر مقدم کرنے کا میلان پایا جاتا تھا۔ لیکن انتظامی تسلسل کے نہ ہونے کے باعث کسی تعمیری طریقِ کار پر عمل ممکن نہ تھا۔ مثلاً ہو سکتا تھا کہ کسی بندرگاہ کو بحری قزاقوں سے محفوظ رکھنے کے لیے مناسب انتظامات کی ضرورت ہو مگر اس کے لیے سرمایہ درکار ہوتا اور اس سے فوری فائدہ اجارہ دار کے بجائے اس کے جانشین کو پہنچتا۔ زیرِ مطالعہ عہد کی تحریروں سے ایسے دور رس اقدامات کے اختیار کیے جانے کا جو تجارت کے لیے مفید ہوں پتہ نہیں چلتا بلکہ برخلاف اس کے زر اجارہ کو وصول کرنے کی ضرورت اور فوری منفعت کی قدرتی خواہش اجارہ دار کو ایسی قابلِ اعتراض تدابیر اختیار کرنے پر مجبور کرتی جن میں سے بعض مستقبل میں قطعاً ضرر رساں ثابت ہوتے۔

غالباً ان میں سب سے کم ضرر رساں وہ ترکیب تھی جو تجارت میں ترقی کرتے ہوئے کسی بندر سے تاجروں کو ورغلا کر بھگا لے جانے کے سلسلہ میں اختیار کی جاتی۔ اس قسم کے ایک عمل کی مثال سر طامس رو کی تحریروں میں ملتی ہے۔ ایک موقع پر جب وہ سورت میں کسی دقت میں مبتلا تھا تو کھمبات کے حکام نے جن کا تاجروں کو ایک دوسرے سے لڑانے کا مشغلہ تھا اس سے خواہش ظاہر کی کہ وہ انگریزوں کو ادھر متوجہ کردے۔ اس کے تھوڑے عرصہ بعد ہمیں گجرات کے مختلف بندروں کے درمیان اسی قسم کی مقابلہ آرائی کی اطلاع ملتی ہے۔ اور حالانکہ ابھی تک معاملہ بیشتر وعدے وعید ہی تک محدود تھا لیکن اس کا امکان پایا جاتا ہے کہ تجارت کے ہاتھ سے نکل جانے کا

خوف زیادہ جبری وصولیوں میں مانع ہوا کرتا اور یہ کہ احمد آباد کے ہندوستانی تاجروں کا سورت میں مظالم سے تنگ آکر اپنے تجارتی سرمایہ کو وہاں سے لہاری بندر کی طرف منتقل کر دینا اس وقت کا ایک مسلمہ طریقِ عمل تھا۔ جو ترکیبیں واضح طور پر ضرر رساں تھیں انھیں ہم ان زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں تاخیر، زیادہ مالیت کی تشخیص، اور جبری فروختگیاں۔ سامانوں کو راہداری کا پروانہ دیے جانے میں تاخیر کا بکثرت حوالہ ملتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طریقہ پورے ہندوستان میں عام طور پر رائج رہا ہوگا اور اس کا واضح مقصد رشوتوں کی وصولی یا تاخیروں سے سرکاری حکام کے منصوبوں پر جبر یہ عمل کرانا تھا انگریز تاجر ایسی تاخیروں کو حکام کی "فطری اور حسب معمول رذالت" کا نتیجہ تصور کرتے تھے ان کا یہ بھی قول تھا کہ حکام "بغیر رشوت کے کوئی کام نہیں کرتے۔ ایک بار رشوت وصول کرنے کے بعد اسے ایک مستقل دستور کی شکل دے دی جاتی ہے اور اسے سرکاری محصول کے طور پر وصول کیا جاتا ہے۔" اور ہم یہ بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ معینہ چنگیوں میں ان وصولیوں کے ذریعہ کافی اضافہ کر لیا جاتا تھا۔

اس سے زیادہ سنگین طور پر مضر سامانوں کی زیادہ مالیت تشخیص کرنے کا طریقہ ہوتا۔ سرکاری شرحنامے سامان کی مالیت کے اعتبار سے معین کیے گئے تھے جو حکام بالا مرتب کیا کرتے لیکن سامانوں کی مالیت تشخیص کرنے کا کام موقع کے افسروں کے اختیار تمیزی پر منحصر کر دیا گیا تھا۔ یہ اپنی مرضی سے سامانوں کی معینہ مالیت کو روکنے پر تشخیص کر کے درآمدی و برآمدی محاصل کے مطالبہ کو دوگنا کر دیتے تھے یہ طریقہ بالکل عام نہ تھا کیونکہ لہاری بندر کی چھوٹی بندرگاہ پر سامانوں کی مالیتیں مستقل رہا کرتی تھیں لیکن یہ طریقہ سورت میں بہت زیادہ رائج تھا یہاں سے ایک انگریز تاجر اس طور پر لکھتا ہے:

یہاں صوبیدار کی مرضی بمنزلہ قانون کے ہے۔ پس وہ چیزوں کی جو مالیت چاہتا ہے معین کر دیتا ہے جس کی وجہ سے یہ صورت پیدا ہو گئی ہے کہ ہم جہاں $3\frac{1}{2}$ فیصدی کی ادائیگی کو واجب سمجھتے ہیں وہاں ہمارے ذمہ اس کا دوگنی شرح پر محصول عائد کیا جاتا ہے کیونکہ اکثر سامانوں کی مالیت زرِ خرید سے دوگنی تشخیص کی جاتی ہے جیسا کہ آگرہ میں ہماری خرید کی ہوئی نیل کے ساتھ پیش آیا جسے ہم نے 16 روپیہ فی من کے نرخ پر خریدا تھا لیکن عزّ الملک (معزّ الملک۔ مترجم) نے اس کا نرخ 35 روپیہ قائم کیا کیونکہ (بقول اس کے) اس کا فارس میں یہی نرخ تھا۔ لیکن بندر لاری (لہاری) میں یہ حالت نہیں ہے کیونکہ وہاں مالیتیں

معلوم اور شرحنامہ میں درج رہتی ہیں جنھیں ہر لالچی اور غیر منصف مزاج صوبیدار کی مرضی پر ترمیم یا تبدیل نہیں کیا جاتا۔

ہمیں سورت میں زیادہ مالیت کی تشخیص کی 1615 ہی میں اطلاع ملتی ہے اور اس کے بعد بھی اس کا اکثر ذکر آتا ہے۔ 1641 میں ایک ولندیزی تاجر کے دیے ہوئے اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ مالیت کم از کم دوگنے پر تشخیص کی جاسکتی تھی (½ 1 روپیہ کے نرخ پر خریدے ہوئے شورہ کی مالیت 4 روپیہ کے نرخ پر اور 9 روپیہ کے نرخ پر خریدے ہوئے سوتی سامان کی مالیت 18 روپیہ کے نرخ پر تشخیص کی گئی)۔ اس کا بیّن نتیجہ یہ تھا کہ محصولات کا بار سرکاری شرحنامہ سے بہت زیادہ ہوا کرتا۔ علاوہ اس کے محصول کی شرحوں کا غیر یقینی ہونا کاروبار کے لیے ایک سنگین رکاوٹ کا درجہ رکھتا تھا۔

اجارہ دار کے پروانۂ راہداری کے اجرا میں عجلت یا تاخیر کرنے اور نیز مالیت کو بڑھانے یا گھٹانے کے اختیار کی وجہ سے اس کو صرف رشوت ستانی ہی کا موقع نہیں بلکہ محصول کے دفتر میں لائے ہوئے سامانوں کی جبری خریداری کے ذریعہ نفع کمانے کا بھی موقع حاصل رہتا تھا۔ 1615 میں ہم انگریز تاجروں کو اس امر کی شکایت کرتا ہوا پاتے ہیں کہ ان کے سامانوں پر صوبیدار یا درآمدی و برآمدی محاصل کے نگراں (صاحب تحصیل۔ مترجم) قبضہ کر لیتے ہیں اور ان کی یا تو قیمت بالکل ہی ادا نہیں کی جاتی یا کم نرخوں پر ادا کی جاتی ہے۔ اس کے پینتیس برس بعد ان کے جانشینوں کی اطلاع ہے کہ اگر وہ درآمدی و برآمدی محاصل کے نگراں کی تشخیص کی ہوئی قیمتوں کو قبول نہ کرتے تو ان کے سامانوں کو دو دو سال یا اس سے بھی زیادہ مدت تک راہداری کے پروانے نہ دیے جایا کرتے۔ ان کے علاوہ اس قسم کی دیگر متعدد شکایات ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی صورت نہ تھی۔ اس قسم کے دعوے کبھی کبھی رشوت کے ذریعہ طے ہو جاتے تھے جیسا کہ 1620 میں پیش آیا جب درآمد کیے ہوئے مونگے کو کم قیمت پر بیچنے کے مطالبہ سے صوبیدار کو 1000 ریال آف[+] ایٹ اور دلّال کو 100 عدد لینے ہی ریال بطور رشوت دے کر اور شاہزادہ کے گودام کے لیے 2000 من سیسہ[1] اپنی قیمت

---

[1] ان دنوں شاہزادہ شاہجہاں بندر کے محاصل کا اجارہ دار تھا۔

+ RIAL OF EIGHT

فروخت سے ایک محمودی فی من کم کے نرخ پر بیچ کر بچایا جا سکا۔ بہر حال کسی نہ کسی طور پر روپیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اور اگر رشوتوں، جبری فروختگیوں اور زیادہ مالیت کی تشخیص کو شمار میں لایا جائے تو جس قدر مطالبات عملی طور پر پورا کرنے ہوتے تھے ان کے مقابلہ میں محصولوں کے نرخنامے بے حقیقت نظر آئیں گے۔ مجھے زیر مطالعہ عہد کے دوران ان مطالبات کے بارے میں کسی خاص تبدیلی کی اطلاع نہ مل سکی۔ یہ منفرد اجارہ داروں کی طمع کے مطابق وقتاً فوقتاً تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ 1615ء کی اطلاع میں جس کا پہلے حوالہ آچکا ہے جیسے حالات بیان ہوئے ہیں ان سے بدتر حالات مشکل ہی سے کبھی رہے ہوں گے اور مجھے ان کے مستقلاً بہتر ہونے کی کوئی اطلاع نہیں ملتی۔[ش۵]

محاصل کے ایک وسیلہ کے اعتبار سے، ٹکسالوں کی درآمدی و برآمدی محصولات کے مقابلہ میں بہت کم اہمیت تھی۔ یہ ظاہر ہے کہ ان سے بھی آمدنی ہوتی تھی کیونکہ یہ اجارہ پر دیے جاتے تھے لیکن سکہ سازی کے معیار کے برقرار رہنے کی حالت میں ان سے زیادہ مقدار میں جائز منافع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مرکزی عہدہ داران اس کے انتظام کی تفصیلی نگرانی کیا کرتے اور ہمیں اسے مالی اعتبار کے مقابلہ میں سیاسی اعتبار سے زیادہ اہم تصور کرنا چاہیے۔ سکوں کا اجرأ فرمانروائی کا حق خصوصی اور نیز اس کی سب سے زیادہ بیّن علامت ہوا کرتی لہٰذا یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کوئی بھی مقامی حاکم یا کوئی بھی شخص بغیر بادشاہ کے خصوصی احکام و فرمان کے ان میں تبدیلیاں کرنے کی جرأت نہ کرے گا۔ تجارتی مراسلات کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گجرات کے ٹکسالوں کا انتظام درآمدی و برآمدی

ش۵ میرے بیان کیے ہوئے طریقوں کے رائج ہونے کا اس امر سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مسافروں کے ذاتی اسباب تک ان سے مستثنیٰ نہ تھے۔ منڈلسلو کے *ترجمہ کے موجودہ نسخوں پر اعتماد کرنا خطرہ سے خالی نہیں کیونکہ اس کے مدیروں نے ان میں بعد میں اضافہ کر دیے ہیں لیکن حسب ذیل عبارت صفحہ ۱۳ میں اس نے بظاہر سورت میں اپنے تجربات بیان کیے ہیں "سلطان یا صوبیدار ہی نہیں بلکہ درآمدی و برآمدی محاصل کے نگراں بھی تاجروں اور مسافروں کو ان کی اپنے ذاتی استعمال کی غرض سے لائی ہوئی اشیاء کو منہ مانگے داموں فروخت کرنے پر مجبور کرتے ہیں لہٰذا سلطان کو میری چیزوں میں زرد عنبر کا ایک ہار اور ایک ہیرا پسند ہے وہ ان دونوں اشیاء کو مجھ سے ضرور خرید لے گا۔"

MANDELSLO'S JOURNAL *

حاصل یہ انتظام سے بہتر تھا کیونکہ ایک موقع پر سورت کی ٹکسال میں عارضی طور پر کام بڑھ جانے کے باعث سکوں کے بہ تاخیر ملنے کی شکایت کے علاوہ جس کا کسی پچھلے باب میں ذکر آچکا ہے ٹکسالوں کے متعلق کوئی اور شکایت تحریروں میں نہیں ملتی۔ لہٰذا ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ زیر مطالعہ عہد کے دوران تاجروں کو خالص سکوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع حاصل تھا مجھے اندرون ملک کی ٹکسالوں کے طریق کار کے معاصر تذکرے نہیں ملتے لیکن زیر مطالعہ عہد کے اختتام کے بعد ہم فوراً ولندیزیوں کو بنگال میں رائج عمل کی ٹکسال میں تاخیر اور بدعنوانیوں کی بیحد شکایت کرتا ہوا پاتے ہیں۔ لہٰذا ہم یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ گجرات کا اعلیٰ میعار کارکردگی عام طور پر پایا جاتا تھا۔

مجھے کسی سرکاری تحریر میں مغل بادشاہوں کے اپنے رعایا کی جائداد کی وراثت میں حق طلب کرنے سے متعلق قطعی اطلاعات نہ مل سکیں۔ یورپی سیاحوں کے تذکرے ایک دوسرے سے مختلف حالات بیان کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے دعوں کے مطابق یہ حق عمومی تھا، بعض اسے سرکاری امرا کی جائداد تک محدود رکھتے تھے اور بعض اس کے دائرہ میں زیادہ دولتمند تاجروں کو شامل کرتے تھے لیکن ان ذرائع سے قانونی صحت کی ہم توقع نہیں کر سکتے۔ لیکن ان بیانات پر دیگر ماخذ میں مندرج واقعات کی روشنی میں غور کرنے پر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس قاعدہ پر اغلباً پوری شدت کے ساتھ عمل درآمد نہ کیا جاتا تھا۔ بادشاہ بے شک اپنے اُمرا کی جائداد کا دعویدار ہوا کرتا تھا اور کبھی کبھی ہم بادشاہ کو تاجروں کی جائداد پر بھی دعویٰ کرتا ہوا پاتے ہیں۔ غالباً ایسی ہر صورت میں جو عملی سوالات پیدا ہوا کرتے وہ یہ تھے کہ کسی مخصوص جائداد کی مالیت کیا تھی اور اسے ضبطی سے بچانے کے لیے کس قدر رشوت پیش کی جا رہی تھی۔ یہ خیال اورنگ زیب کے شاہجہاں کے نام ایک خط کے مندرجات کے مطابق ہے جس کے ایک جز کو برنیر نے محفوظ کر لیا تھا۔ اورنگ زیب کی تحریر ہے کہ "ہمارا طریقہ ہے کہ جیوں ہی کوئی امرا (امیر) یا دولتمند تاجر دم توڑتا ہے بلکہ اکثر ایسی زندگی کی شمع کے گل ہونے کے قبل ہی ہم اس کے خزانوں کو مہر بند کر دیتے ہیں اور اس کے ملازمین یا خانہ داری کے دار وغہ کو اس وقت تک مقید رکھتے ہیں اور مارتے ہیں جب تک کہ وہ پوری املاک کو معہ حقیر ترین، جواہرات کے ظاہر نہ کر دیں۔ یہ طریقہ بے شک نافع ہے لیکن کیا ہم اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی بے انصافی اور ظلم سے انکار کر سکتے ہیں!" میں اس عبارت میں فقرہ "دولتمند تاجر" کو اہم اور اس امر کا مظہر تصور کرتا ہوں کہ عام طور پر بحیثیت ایک طبقہ

سے تاجروں کی جائداد پر تو دعویٰ نہ کیا جاتا، لیکن کامیاب تاجروں کا ذہن اس خطرہ سے ہرگز خالی نہ رہا کرتا تھا۔ اورنگ زیب نے جس تشدد کا ذکر کیا ہے وہ کوئی انوکھی بات نہ تھی کیونکہ عہدِ جہانگیری میں مروجہ طریقہ کے متعلق پلسارٹ کے تذکرہ کے حسب ذیل اقتباس میں بھی یہ بات نمایاں ہے۔

کسی امیر کے مرنے پر فی الفور، خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا بغیر کسی استثنا کے بعض اوقات تو اُس کی جان نکلنے کے قبل ہی شاہی حکام موقع پر پہنچ کر جملہ املاک کی ایک فہرست تیار کر لیتے ہیں (بشرطیکہ یہ چھپا نہ دی گئی ہو)۔ وہ اس فہرست میں ہر چیز، ایک پیسہ تک کی، عورتوں کے کپڑوں اور زیورات تک درج کر لیتے ہیں۔ بادشاہ جملہ مملوکات پر خود قابض ہو جاتا ہے لیکن اگر متوفی نے اپنی زندگی میں پسندیدہ خدمات انجام دی ہوں تو عورتوں اور بچوں کا گذر بسر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ لیکن اس سے زاید نہیں ــــ ایسا سوچا جا سکتا ہے کہ متوفی کی بیوی یا بچوں یا احباب نے اس کے دوران حیات ہی میں اس کے کنبہ کے افراد کی پرورش کے لیے کافی مال پوشیدہ رکھ لیا ہو گا لیکن یہ ایک بہت مشکل کام ہوتا کیونکہ اُمرا کو ہر فصل اور ان کے مقبوضات کی پوری واقفیت رہا کرتی تھی ــــ ہر محل میں ایک دیوان (داروغۂ جائداد) ہوتا ہے جس کی وساطت سے ہر سامان گذرتا ہے اور اس کے متعدد ماتحت بھی ہوا کرتے ہیں جن میں سے ہر ایک کی متعین ذمہ داری ہوتی ہے جس کے لیے وہ جواب دہ ہوتا ہے۔ (امیر کے مرنے پر) ان تمام ماتحتوں کو حراست میں رکھا جاتا ہے اور انھیں مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے رجسٹروں اور کاغذات کے حوالہ سے ظاہر کریں کہ جملہ نقد یا سامان کہاں جمع کیا گیا ہے اور ان کے آقا کی جائداد کا کیوں کر انتظام کیا گیا ہے۔ اور اگر وہ صحیح حال نہیں بتلاتے تو ان سے جسمانی سزائے ذریعہ حقیقت معلوم کی جاتی۔ شاہی خزانہ کو اس ذریعہ سے جو آمدنی ہوتی اس کا صحیح تعین ممکن نہیں لیکن یہ ضرور اچھی خاصی رہی ہوگی۔ ایک ولندیزی اطلاع کے مطابق شاہجہاں نے 1641 میں مصروف (وزیر۔ مترجم) آصف خاں کی وفات پر 19 کروڑ روپیے وصول کیے تھے۔ یہ رقم مقبول علم مگر صریحاً مبالغہ آمیز ہے کیونکہ اس جائداد کی جو تفصیل بادشاہ نامہ میں درج ہے اس کی مالیت محض ½2 کروڑ آتی ہے۔ لیکن بہرحال یہ ایک غیر متوقع دولت تھی جو زیادہ مقدار میں ہاتھ آئی اور بقول فادر سیبسٹین مینریق+ ہندوستان سے باہر جانے والے

FATHER SEBASTIN MANRIQUE +

خشکی کے تمام راستوں کو اس خیال سے بند کر دیا گیا تھا تاکہ املاک کا کوئی حصہ بیرون ملک نہ جا سکے۔ اس قدر لمبی چوڑی جائدادیں بلاشک بہت شاذ ہوا کرتیں۔ لیکن بقول اورنگ زیب نسبتاً کم مقدار کی اندوختہ دولت سے حاصل ہونے والی منفعت زیادہ "فائدہ مند" ہوتی اور واضح رہے کہ باوجودیکہ وہ اس طریقہ کی مذمت کرتا تھا۔ لیکن اس نے اسے عملاً ترک نہ کیا کیونکہ بقول منگی ہرچند کہ اس کے عہد میں اس طریقہ کو ضابطہ کے اندر تو متروک قرار دے دیا گیا تھا لیکن پھر بھی عہدہ داروں کی چھوڑی ہوئی جائداد کو حکومت کے قرض کے نام پر ضبط کر لیا جاتا تھا۔

تجارتی مراسلات میں بعض اتفاقی اندراجات اس اصول کے طریق کار کی ضمنی تشریح فراہم کرتے ہیں چنانچہ 1646ء میں ہم سنتے ہیں کہ دربار میں اونی کپڑے نہیں خریدے جا رہے ہیں۔ اس کا جزوی سبب یہ تھا کہ بادشاہ کے پاس "اس کے بعض امرا کے مر جانے سے اس چیز کی افراط ہو گئی تھی۔ ایک موقع پر ملک کے اندر مرنے والے غیر ملکی تاجروں کی چھوڑی ہوئی جائدادوں پر بھی وراثت کے قاعدہ کا اطلاق کرنے کی کوشش کی گئی اور احمد آباد میں انگریز سربراہ کی وفات پر تجارتی کوٹھی کے اندر جملہ املاک کو بغیر اس امر کا لحاظ کیے کہ اس میں کمپنی کے بھی سامان شامل ہیں مہر بند کر دیا گیا لیکن 1624ء میں جب انگریزوں سے نزاعات کا تصفیہ ہو تو ان کے معاملہ میں اس حق کو بالآخر ترک کر دیا گیا۔ 1647ء کے ایک معاملہ سے ہندوستانی تاجروں کی جائدادوں کا ضبط کیا جانا ظاہر ہوتا ہے۔ اس ضمن میں اس کے بھائی کے ساتھ برا سلوک کیا گیا جو علاقہ کے لوگوں کی خفگی کا سبب ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ نے اس پر ایک لاکھ روپیہ کا جرمانہ کیا جو ٹرٹہ (ٹھٹھہ مترجم) میں واجب الادا ہے۔ اس کے علاوہ شاہزادہ اور دوسرے بڑے لوگوں کی دستوری کی رقم میں مزید پچاس ہزار روپے خرچ ہوں گے۔ اس کے خلاف تمام لوگ اس بنا پر شور مچا رہے ہیں کہ (ان کے قول کے مطابق) تمام برے طریقوں میں جو کبھی بھی سامنے آئے یہ سب سے زیادہ خراب طریقہ ہے۔ کیونکہ اب اگر کوئی کامیاب تاجر یا کوئی بھی دولتمند شخص مرتا ہے تو اس کی دولت ضبط کر لی جائے گی خواہ اس کے بچے اور بھائی اس کے وارث کیوں نہ ہوں حالانکہ ایسی صورت میں بادشاہ کو اپنا حق نہ قائم کرنا چاہیے۔

اسی خط میں یہ بھی ذکر آتا ہے کہ ایک مقامی صوبیدار کے مرنے پر شاہی حکام نے اس کے پورے اثاثہ کو ضبط کر لیا "جیسا کہ کسی امرا (امیر) کے مرنے پر دستور ہے" اور واوین کے اندر قلمبند کیے ہوئے فقرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری عہدہ داروں کی جائداد کی ضبطی کو

تو معمول کا ایک عمل تصور کیا جاتا، لیکن کسی تاجر کی وراثت پر دعویداری، سندھ کے لوگوں کے لیے ایک انوکھی بات تھی۔ ایک لاکھ کے "جرمانہ" کو دورِ حاضر کا زرِ تصفیہ قیاس کیا جاسکتا ہے[8]۔ زیرِ مطالعہ عہد کے دوران سرکاری مطالبات کے دائرہ میں نئے علاقے شامل کیے جانے کے علاوہ کوئی اور خاص تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ اس نظام سے پیدا ہونے والی معاشی خرابیوں پر تفصیلی بحث غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ جہاں تک سرکاری حکام کا تعلق ہے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اس قسم کی ضبطیاں ان کی ملازمت کے معاہدہ کا ایک جزو تھیں اور چونکہ ملکی نظم و نسق کے حالات انھیں لوٹ مار پر مجبور کرتے تھے لہٰذا ان کے منافعوں کے حکومت کی طرف واپس ہونے کے اصول میں کچھ معقولیت نظر آتی ہے۔ لیکن زیادہ دولتمند تاجروں کے معاملہ میں ایسے موقع پر جب کہ ان میں سے کسی کی موت پہلے ہی سے اس کی تجارت میں غالباً عارضی تعطل پیدا کر دیتی تھی، آنکھوں کو نظر آنے والے اس کے جملہ سرمایہ پر حکومت کے ناگہانی طور پر قبضہ کر لینے سے ظاہر ہے کہ اس کے کاروبار کو خسارہ کا پہنچنا اور پیدا کرنے کے حوصلہ کا متاثر ہونا امر لازم تھا۔ جو مثالیں سطور بالا میں پیش کی گئی ہیں وہ ظاہر کرتی ہیں کہ یہ ایک ایسا حقیقی خطرہ تھا جو مملکت مغلیہ کے معاشی حالات کا جائزہ لیتے وقت ہمارے پیشِ نظر رہنا چاہیے۔ جب تک حکومت کا یہ حق قائم رہتا اس وقت تک نہ تو ایسے دولت رکھنے والے خاندان جو حکومت سے بے نیاز ہوں وجود میں آسکتے تھے اور نہ سرمایہ دارانہ پیداوار کی کسی شکل میں بھی ترقی ہو سکتی تھی[9]۔

---

[8] 1635ء تک سندھ میں پرتگیزیوں کے علاوہ دوسرے دولتمند تاجر نہ تھے۔ تجارتی کاروبار پر ان کی تقریباً مسلّم اجارہ داری تھی۔ پس ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اگر یہ واقعہ آگرہ یا گجرات میں پیش آیا ہوتا تب بھی اس کے خلاف اسی قدر احتجاج ہوا ہوتا۔

[9] یہ سطور زیرِ طباعت تھیں کہ مجھے مسٹر بینی پرشاد کی تصنیف 'ہسٹری آف جہانگیر' موصول ہوئی جس میں انھوں نے یہ لکھا ہے (نوٹ صہ 95) کہ مجھ سے اپنی تصنیف 'انڈیا ایٹ دی ڈیتھ آف اکبر' میں یہ غلطی ہوئی ہے کہ میں نے یہ تصور کر لیا ہے کہ تاجروں کا اثاثہ بھی ان کی وفات پر بحق حکومت ضبط کر لیا جاتا تھا۔ میں اپنی اس تصنیف میں اس قسم کا کوئی بیان نہیں پاتا لیکن صہ 51 پر میں نے یہ لکھا ہے کہ بادشاہ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

مرکزی محاصل کی آخری اہم مد وہ تحائف تھے جو بادشاہ کی خدمت میں ہر ممکن موقع پر پیش کیے جاتے۔ یہ پورے ایشیا کا ایک عمومی دستور معلوم ہوتا ہے اور ہمیں یہ بھی اطلاع ملتی ہے کہ بعض ایسے مقامات تھے جہاں مساوی مالیت کے تحائف واپس کیے جاتے تھے لیکن مملکت مغلیہ یا دکنی بادشاہتوں میں مساوات کے قاعدہ کا رواج نہ تھا۔ یہاں بدلہ میں دی ہوئی اشیاء کبھی کبھی نسبتاً کم مالیت کی ہوا کرتی تھیں۔ مزلیق شاہجہاں کے متعلق لکھتا ہے کہ بادشاہ کو سونے چاندی میں تولنے کی رسم کے موقع پر اس کو جو تحفہ ملتے تھے وہ اس کے دیے ہوئے تحفوں اور اخراجات سے بہت زاید ہوا کرتے تھے۔ بٹاویا جرنل میں آمد و خرچ کے اندراجات ظاہر کرتے ہیں کہ بادشاہ کو تحفوں سے کثیر بچت ہوتی کیونکہ ایک تحفہ جس کی مالیت چند ہزار روپیہ تھی اور جس میں ایک ہاتھی، تانبہ کا ایک فرشی جھاڑ، ٹٹو، اور متعدد دیگر اشیاء شامل تھیں کے عوض میں ایک گھوڑا اور ایک خلعت جس کی مجموعی مالیت 520 روپیہ تھی دی گئی۔ ایک دوسرے موقع پر ہم یہ سنتے ہیں کہ انگریز تاجروں نے تقریباً 13,000 روپیہ مالیت کے تحائف پیش کیے جس کے عوض میں انھیں صرف 3,500 روپیہ کے تحائف ملے۔ پس تزک جہانگیری جس میں بہت سے تحائف کی قیمتیں درج ہیں کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس مد میں کثیر خالص بچت ہوا کرتی تھی لیکن اس طریقہ کے رائج ہونے سے جو بار غیر ملکی تاجروں پر عائد ہوتا تھا وہ اس کے برابر شاکی رہا کرتے۔ لیکن بہر حال یہ نہ تصور کرنا چاہیے کہ مالی اعتبار سے بادشاہ کے لیے یہ بچت قطعاً نفع بخش ہوا کرتی۔ حکام معمولاً جلد ترقی کی لالچ میں قیمتی تحفے پیش کیا کرتے اور چونکہ عہدوں کی کوئی باضابطہ درجہ بندی یا ان کی تعداد کی کمی و بیشی پر کوئی بندش نہ تھی لہٰذا اس قسم کے بہت سے تحفوں سے جو فوری نفع ہوتا اس کے نتیجہ میں بادشاہ پر عائد ہونے والی ذمہ داری زیادہ ہوتی تھی۔ اسی طور پر غیر ملکی تاجر بھی اپنے قیمتی تحائف کے بدلے میں بعض مراعات کے متوقع رہا کرتے۔ جو معاملہ اوپر بیان کیا گیا ہے اس میں ولندیزیوں نے تجارتی نقطۂ نگاہ سے متعدد سود مند مراعات حاصل کیں اور ہم سرسری طور پر اس طریقہ کو دورِ حاضر

(صہ 343 سے آگے)

زیادہ دولتمند تاجروں کے چھوڑے ہوئے اثاثہ کا بیشک حق دار ہوتا تھا۔ اس موضوع پر موجود شہادتیں جن میں سے چند کے حوالے اس تصنیف میں آئے ہیں میرے خیال میں اس بیان کی تائید کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اگر واقعی کوئی غلطی ہے تو وہ بنیادی طور پر اورنگ زیب سے منسوب ہوئی ہے۔

کے اس طریقہ کے مشابہ قرار دے سکتے ہیں جس میں حکومت کو کوئی بالمقطع رقم کسی سالانہ وظیفہ کی ادائیگی کی شرط پر فوری مل جاتی ہے۔ لیکن اس خاص فرق کے ساتھ کہ وظیفہ کی ادائیگی کسی طور پر بھی حتمی نہ ہوا کرتی کیونکہ دی ہوئی مراعات کسی وقت بھی منسوخ ہو سکتی تھیں یا کوئی عہدہ دار ترقی حاصل کرنے کے بعد یک لخت برخواست کیا جا سکتا تھا۔ یہ تخمینہ لگانا ناممکن ہے کہ مملکت کے لیے یہ طریقہ فی الجملہ نفع بخش تھا یا ضرر رساں۔ اس طریقہ سے آنکھوں کو نظر آنے والی آمدنی ضرور حاصل ہو جاتی تھی مگر ساتھ ساتھ اس سے حکومت پر ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی تھیں۔ لیکن اس دور کے مالی حالات کے پیشِ نظر فوری آمدنی کے حصول کی ضرورت سے غالباً اس طریقہ کے رواج کے لیے جواز پیدا ہوتا تھا۔

شاہی محاصل کے عام ذرائع کے جائزہ کی تکمیل کے لیے مناسب ہوگا کہ آئین اکبری میں دیے ہوئے ان چند اندراجات کا ذکر کر دیا جائے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی کبھی متفرق آمدنیاں بھی مالگذاری زمین کی مد میں شامل کر دی جاتی تھیں۔ ان میں کی تقریباً سب ہی بنگال سے متعلق ہیں۔ یہ "بازاروں"، "نمک"، "محاصل راہداری" وغیرہ کے تحت نسبتاً کم مالیت کے قریب قریب بیس اندراجات پر مشتمل ہیں۔ مگر اس نظریہ کے پیشِ نظر جس کا پہلے ذکر آچکا ہے کہ بنگال کے اعداد مملکت کے ان مطالبات کو ظاہر کرتے ہیں جو اکبر کو ورثہ میں ملتے تھے، ہم ان اعداد سے مملکت کے مالی نظام کے متعلق کوئی نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب نہ ہوں گے۔ بنگال کے باہر مجھے اس نوعیت کی صرف تین مثالیں مل سکی ہیں، ایک برار کے کسی موضوع میں سڑک کے محصول کی، دوسری پنجاب کے مقام اٹک میں گھاٹ کے محصول کی اور تیسری صوبہ گجرات میں بحری درآمدی و برآمدی محصول کی۔ ان میں سے آخری مثال صرف یہ ظاہر کرتی ہے کہ گجرات میں یہ محاصل مالگذاری زمین کے حسابات میں شامل کیے گئے تھے۔ پہلی دو مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دو صورتوں میں اندرون ملک محاصل شاہی خزانہ میں داخل کیے گئے۔ یہ شماریات جن تفصیلات کو پیش کرتے ہیں ان کے مطالعہ سے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یہ اپنی نوعیت کی تنہا دو ایسی مثالیں ہیں جو عام طریقہ سے مستثنیٰ ہیں۔ پس بنگال کے علاوہ اکبر کی پوری مملکت میں صرف دو ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں پہلے بیان کیے ہوئے محصولات کے علاوہ دوسرے محصول علیحدہ علیحدہ حساب میں دکھائے گئے۔ ممکن ہے بعض متفرق آمدنیاں، مالگذاری زمین کی میزان میں شامل کر دی گئی ہوں

لیکن اعداد کے تفصیلی مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ایسا ہوا بھی، تو ان کی رقم بہت ہی معمولی تھی۔[5] لہٰذا ہمیں شاہی محاصل کے متعلق جو نتائج اخذ کیے جا چکے ہیں انھیں اگر مسلم طور پر نہیں تو کافی حد تک مکمل تسلیم کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہونا چاہیے۔ بادشاہ دولتمند لوگوں کی جائداد سے جس قدر چاہتا لے سکتا تھا۔ تجارتی کاروبار سے اس کی براہِ راست آمدنیاں درآمد و برآمدی محصولات اور ٹکسال سے تھیں۔ اور وہ اپنی مملکت کی زمین کی کل پیداوار کا پہلے تو ایک تہائی اور بالآخر نصف کا حقدار ہو گیا تھا۔ اہلِ صرفہ اور چھوٹے تاجروں کی آمدنی اور کسانوں کے پاس ان کی پیداوار سے جو کچھ بھی بچ رہتا یہ سب مقامی اور صوبجاتی ضروریات کے لیے ممکن الحصول تھیں۔

فصل 3۔ صوبجاتی اور مقامی آمدنی کے وسائل

ہمیں اپنے ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبجاتی اور مقامی حکام اپنی ضرورت کے لیے ان مدات سے آمدنی جمع کر سکتے تھے، مرکزی محصولات پر اضافہ کی شکل میں یا خود محصول عائد کر کے اس کے ساتھ وہ اپنی آمدنیوں کو تحفوں، جرمانوں اور رشوت ستانیوں کے ذریعہ بہت بڑھا سکتے تھے۔ دورِ حاضر میں بھی ہم مالگذاری میں مقامی ضروریات کے تحت محصول کے اضافہ سے مانوس ہیں اور زیرِ مطالعہ عہد میں اس رواج کی موجودگی کی پوری تائید اورنگ زیب کے ان احکام سے ہوتی ہے جو اس نے اس کو بند کرنے کے لیے جاری کیے۔ درآمدی و برآمدی محصولات کے سلسلہ میں مملکت گولکنڈہ سے ایک ایسے ہی رواج کی مثال کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو بجائے خود قدرے تاریخی اہمیت رکھتی تھی۔ 1606 ولندیزیوں کے مسولی پٹم میں تجارت کے متعلق گفت و شنید شروع کرنے پر شاہی محصولات کی عمومی شرحوں کے متعلق تو کوئی نزاع پیدا نہ ہوئی لیکن مقامی حکام سوتی سامانوں پر 3/4 فیصدی کے برآمدی محصول کی ادائیگی کے طالب ہوئے جسے انھوں نے اپنی ملکیت قرار دیا۔ ولندیزیوں نے اس معاملہ کو بادشاہ سے رجوع کر کے وہاں سے 8 فیصدی پر اپنے حق میں فیصلہ حاصل کیا

---

[5] میں نے یونائیٹڈ پراونسز ہسٹوریکل سوسائٹی کے جرنل میں مطبوعہ اکبری مملکت کے زرعی شماریات پر ایک مقالہ میں اس مسئلہ کا مطالعہ کیا ہے۔

اور صرف انھیں کو سُوتی سامانوں پر ۱۵ فیصدی کے محصول (جو چھاپہ ۔ ولآلہ کے نام سے موسوم تھا) کی ادائیگی سے جسے رعایا اور غیر ملکی دونوں ہی ادا کرتے تھے واضح طور پر مستثنیٰ کیا گیا۔
اس معاملہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مرکزی انتظامیہ کے مطالعہ کو اس کے ساتھ ساتھ مقامی ضروریات کے تحت ایک محصول عائد کر کے چار گنا کر دیا گیا تھا اور اگلے چند برسوں کے واقعات مظہر ہیں کہ دلندیزیوں کو بادشاہ کی دی ہوئی چھوٹ مقامی حکام کی خفگی کا سبب ہوئی اور انھوں نے مختلف تدبیروں سے اپنے نقصان کی تلافی کی کوشش کی۔ یہ امر خود ہی اس کشمکش کا ایک کافی سبب تھا جس کی اس بندرگاہ پر ہمیں اطلاع ملتی ہے۔

ان حکام کے خود عائد کیے ہوئے محصول، ٹیکسوں، اور چنگیوں کی تعداد اور ان کی نوعیت کا اندازہ ان احکام سے لگایا جا سکتا ہے جن کے ذریعہ ان میں سے بعض کو رسمًا کبھی کبھی رد کا جاتا تھا۔ جہانگیر نے اپنی تختِ نشینی پر جو فرمان جاری کیے ان میں ہر صوبہ اور ضلع کے جاگیرداروں کی اپنی ذاتی منفعت کے لیے عائد کی ہوئی چنگیوں اور دیگر محصولوں کی مذمت کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نوعیت کے محصولوں کا بہت زیادہ رواج تھا۔ اس کے تقریبًا 70 برس بعد اورنگ زیب نے اس موضوع پر اس سے زیادہ تفصیلی احکام جاری کیے[۵۸] اس کے احکام کے متن تفصیلات میں ایک دوسرے سے قدرے مختلف ہیں۔ لیکن پروفیسر سرکار نے چودون محصولوں کا چھ خاص مدوں کے تحت شمار کیا ہے۔ اس فہرست کے مکمل ہونے کا یقین نہیں ہے لیکن یہ ان تمام معاملوں پر حاوی معلوم ہوتی ہے جس سے عام آبادی کا تعلق ہو سکتا تھا، مثلاً فروختگیاں، یا خریداریاں، اسباب کا حمل و نقل، یا مسافر وغیرہ علاوہ اس قسم کے واقعات کے مثلاً لڑکے کی پیدائش، یا نئے چودھری کا تعین۔ اس طریقہ کے متعلق ایک ہمعصر رائے شہاب الدین طالش کے تذکرہ کے حسب ذیل اقتباس میں موجود ہے جس کا پروفیسر سرکار نے ترجمہ کیا ہے۔

مسلمانوں کے ہندوستان اور اس کے بندروں پر ابتدائی تسلط سے کیا عہدِ

---

[۵۷] واضح طور پر چھاپنے (چھاپ بمعنی نقش یا مہر) اور دلآلی (دلآل بمعنی بروکر) کی فیس۔

[۵۸] اورنگ زیب کے محصولوں کی معافیوں پر پروفیسر سرکار کے لکچرز آن مغل ایڈمنسٹریشن میں اور مابعد صفحات پر بحث کی گئی ہے۔

شاہجہانی کے اختتام تک ہر تاجر، گل فروش سے لے کر میٹی فروش تک سے، نفیس کپڑوں سے لے کر موٹے کپڑوں کے بنکر تک سے حاصل (مالگذاری) وصول کرنے کا اور نو وارد اور پھیری والوں سے گھر کا محصول، مسافروں تاجروں اور اصطبل خانوں کے ملازمین سے زکوٰۃ وصول کرنے کا طریقہ تھا۔

بقول سعدی ابتداً ظلم کی بنیاد کم تھی لیکن ہر آنے والی نسل میں یہ بڑھتی گئی، یہاں تک کہ بالآخر صوبہ خصوصاً بنگال کی ایسی حالت ہوگئی کہ بیوپاری اور تاجروں نے اپنا کاروبار ترک کر دیا اور گھر والے یہ کہتے ہوئے جلا وطن ہوگئے ؎

لے گیا ایسی جگہ ظلم زمانہ کا مجھے
لاکھ کھوجا کیا پر وقت نے پایا نہ مجھے

حکمران حاصل کی طمع میں انھیں کوئی امداد فراہم نہ کرتے۔ سڑکوں اور گھاٹوں پر یہ حالت تھی کہ کوئی سوار بغیر ایک دینار اور کوئی پیدل مسافر بغیر ایک درہم[ہ] ادا کیے نہ گذر سکتا تھا۔ دریائی راستوں پر اگر محصل چنگی کو اس بات کی بھنک لگ جاتی کہ کوئی ٹوٹی ہوئی کشتی بھی دریا سے بغیر حاصل، ادا کیے ہوئے گذر رہی ہے تو وہ دریا میں روک لگا دیتے تھے . . . . وہ لوگ جسم پر پہنے ہوئے پھٹے کپڑوں پر اگر مرمت کیے ہوئے کپڑوں سے زیادہ محصول نہ وصول کرتے تو اسے ایک بے مثال نرمی کا عمل اور پکے ہوئے کھانے پر اگر کچے غلہ سے کم محصول وصول کرتے تو اسے اپنی غایت درجہ کرم فرمائی تصور کرتے۔ دہلی کے فرمانرواؤں میں سے کوئی بھی باوجود دین کے احکام اور شریعت محمدی کی پیروی میں اپنی کوشش کے ان ناجائز طریقوں کو بند نہیں کرتا بلکہ ان سے چشم پوشی کرتا ہے۔ مصنف کی مرصع طرز تحریر کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی ہم اس بیان کو خاصی حد تک درست تصور کر سکتے ہیں۔ ہر چیز پر محصول وصول کیا جاتا تھا

۳ہ زکوٰۃ، جو کبھی کبھی تجارتی مراسلات میں "جگات" کی طرح لکھا ہوا ملتا ہے کا اسلامی شریعت میں مفہوم آمدنی کے محصول کا ہے لیکن زیرِ مطالعہ عہد میں اس سے مراد ایسا محصول ہوگیا تھا جو وقت کے کسی معینہ وقفہ پر نہیں بلکہ غیر معینہ وقفہ پر عائد کیا جائے۔

ہ دینار اور درہم مسلمانوں کے روائتی سکے۔ ان کی صحیح قیمتیں اس عبارت سے مقصد کے لیے جو صریحاً مبالغہ آمیز ہے غیر ضروری ہیں۔

اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ طریقہ شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ شہاب الدین اس کے بعد یہ کہتا ہے کہ اورنگ زیب نے اس بُرائی کو ختم کر دیا لیکن اس کا یہ بیان قبل از وقت ثابت ہوا اور اٹھارویں صدی کے دوران بنگال میں واقعی عائد کیے ہوئے متفرق محصولوں کی فہرست ان محصولوں سے بہت زیادہ مشابہ ہے جنھیں یکے بعد دیگرے مغل شاہنشاہوں نے بند کرنے کا حکم دیا۔

اورنگ زیب کی ممانعتوں کا ان ممانعتوں سے موازنہ جس کا اکبر اس کے قبل حکم دے چکا تھا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے مشابہ ہی نہیں بلکہ تقریباً مماثل تھیں۔ ان ممانعتوں کا قصہ اس کے قبل یعنی کم از کم بادشاہ فیروز شاہ سے شروع ہوتا ہے پس یہ بات ثابت ہوئی کہ مرکزی انتظامیہ جوان محصولوں کو وقفہ وقفہ پر بند کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا اور مقامی حکام کے درمیان جوان کو قایم رکھتے اور انھیں سرمایہ کی ضرورت کے تحت بڑھاتے رہتے تصادم رہا کرتا۔ اس مسئلہ پر بحث کہ یہ ضرورت عوامی ہوا کرتی یا ذاتی ضروری نہیں معلوم ہوتی کیونکہ ان ایام میں ان دونوں ضروریات کے درمیان کوئی واضح حد فاصل نہ تھی لیکن ضرورت کی نوعیت جو بھی رہتی ہو ہمیں یہ تسلیم کرنے میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ اس آویزش کا فیصلہ مقامی حکام کے حق میں ہوا کرتا اور وہ درحقیقت ممنوعہ محصولوں کو صرف اس امر کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ بات اتنی نہ بڑھے کہ بادشاہ کی ذاتی مزاحمت ضروری ہو جائے وصول کرتے رہتے ایسے متعدد واقعات قلمبند کیے جا سکتے ہیں کہ بادشاہ کی مداخلت محض اس صورت میں ہوا کرتی تھی جب لالچ اور ظلم عوام کی قوت برداشت سے زیادہ ہو جاتا لیکن عوام برداشت کرنے کے عادی تھے لہٰذا اس حد میں رہتے ہوئے ناجائز وصولیں میں کافی اضافہ کیا جا سکتا تھا۔

اہل حرفہ، خوردہ فروشوں اور صارفین پر محصولوں کے معاملہ کی نوعیت ایسی تھی کہ اس سے متعلق زیادہ تفصیلات کا علم ممکن نہیں۔ یہ لوگ غیر ملکی تاجروں کے کاروبار پر براہِ راست اثر انداز نہ ہوا کرتے اور ہماری بیشتر معلومات کا ماخذ انھیں تاجروں کی رپورٹیں ہیں جوان کے جانب صرف ایسی صورت میں جب کہ ان کا وجود برآمدی تجارت کے لیے اہمیت اختیار کر لیتا جیسا کہ متعدد وقتاً فوقتاً قایم کی گئی اجارہ داریوں کے سلسلہ میں پیش آیا متوجہ ہوتے۔ اندرون ملک راہداری کے محصول کی حیثیت مختلف ہے کیونکہ یہ انگریز

اور ولندیزیوں سے وصول کیے جاتے تھے۔ ہمیں ان کے تجربات کو اس محصول کے عمومی طریقہ کار کی ایک شہادت کے طور پر قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے۔ یہ محصول تجارتی رپورٹوں کا ایک بہت ہی عام موضوع ہے۔ انھیں رپورٹوں میں راہداری یا جگات[1] کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور اس کے عائد کیے جانے کے سلسلہ میں جو مسلسل آویزش کی صورت پیش آیا کرتی تھی وہ ظاہر کرتی ہے کہ یہ تجارت میں ایک بہت بڑی رکاوٹ کا سبب تھے۔ اس رکاوٹ سے غیر ملکی تاجر ہی نہیں جو اس سے بچنے کی کوشش میں رہا کرتے تھے بلکہ ہندوستانی بھی جو اسے ایک ناگزیر حقیقت کے طور پر تسلیم کرتے متاثر ہوتے۔ 1615ء میں ہی ہم انگریزوں کو احمد آباد سے سورت لائے ہوئے برآمدی مال پر تین علیحدہ علیحدہ محصولوں کے وصول کیے جانے کی شکایت کرتا ہوا پاتے ہیں اور اس کے چند برسوں بعد ہی سے انھوں نے برہانپور میں اور وہاں سے سورت جانے والی سڑک پر مانگے جانے والے محصولوں کے خلاف احتجاج شروع کیا۔ سورت میں جو معاہدہ 1624ء میں ہوا اس کی رو سے یہ طے ہوا کہ شاہی علاقوں میں زمینی محصول نہ طلب کیے جائیں جس کی تصدیق فرمان جہانگیری کے ذریعہ بھی ہوئی لیکن اس کے باوجود یہ محصول وصول کیے جاتے رہے اور 1627ء میں تاجروں نے بادشاہ سے زیادہ موثر احکام حاصل کرنے کے لیے لاہور تحریر بھیجی۔ انھوں نے لکھا کہ "مگر اب ہم شاہی فرمان حاصل کرنے کے لیے مزید رشوت نہ دیں گے"، مگر پھر بھی ان محصولوں کا مطالبہ بند نہ ہوا۔ مجبوراً 1644ء میں ایک وفد دربار شاہی میں حاضر ہوا جس کا مقصد اس محصول سے اپنے کو بچانا نہیں بلکہ تشخیص محصول کی غرض سے سامانوں کی مالیت کے تعین کے لیے حکم جاری کرانا تھا۔ وقتاً فوقتاً ہمیں مخصوص علاقوں میں محصول کی معافیوں کی اطلاع ملتی ہے لیکن یہ منفرد حاکموں کی کرمفرمائی ہوا کرتی جو ان کے اپنے عہدوں سے ہٹ جانے پر ختم ہو جاتی اور 1650ء میں عمومی استثناء کے حصول کے لیے از سر نو کوششیں شروع ہوئیں جس کے نتیجہ میں دوسرا فرمان پھر جاری ہوا جو کبھی موثر ثابت

---

[1] جگات، زکوٰۃ کے لیے ملاحظہ ہو نوٹ 3 صفحہ 282 ابتداً راہداری سے سفر کے محافظین کے لیے ادائیگی کا مفہوم تھا لیکن زیر مطالعہ عہد میں اس کے معنی آمد و رفت کے محصول ہیں خواہ محافظین ہمراہ ہوں یا نہ ہوں۔

ہوتا حالانکہ ایک کارواں سے اُسی قدر وصول کیا گیا جس قدر پہلے وصول کیا جاتا تھا اور حکام انفرادی طور پر ان احکام کی پرواہ نہ کرتے۔ پس زیرِ مطالعہ عہد کے اختتام پر برہانپور اور نیز مملکت مغلیہ کے دیگر مقامات پر بھی ان وصولیوں کا سلسلہ قایم رہا۔

ولندیزیوں کے تجربات بھی اسی طرح کے تھے۔ 1634 میں سورت جانے والی سڑک پر جملہ محصولوں کی معافی کا ایک فرمان جاری کیا گیا تھا لیکن اس کے سات برس بعد تاجر اس مسئلہ پر غور کر رہے تھے کہ کیا جدید احکام کے اجرا کے لیے کوشش کرنا سودمند ہوگا کیونکہ سابقہ فرمان بے اثر ثابت ہوئے تھے اور محصولوں کی وصولی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ چنانچہ فی الوقت یہی مناسب تصور کیا گیا کہ مقامی حکام کو راضی کرنے پر قناعت کی جائے۔ بہرحال 1643 میں ایک نیا فرمان حاصل کیا گیا جو قدرے موثر ثابت ہوا کیونکہ آگرہ میں جہاں سے یہ جاری ہوا تھا اس کے بے اثر ثابت ہونے پر جب بادشاہ کے حضور میں ذاتی عرض داشت پیش کی گئی تو وصول شدہ رقم واپس ہو گئی۔ اس اثنا میں ہندوستان کے دوسری سمت شکایتوں کی کثرت تھی۔ ریشم کی چُنگی پہلے ہی سے زیادہ تھی بنگال میں بادشاہ کے نئے نائب مقرر ہونے پر اور بڑھا دی گئی۔ دوسری طرف اڑیسہ کے بعض حکام تجارت کو ترقی دینا چاہتے تھے اور وہاں چُنگیوں کو کم کر کے تین چوتھائی کر دیا گیا تھا لیکن تھوڑے ہی وقفہ کے بعد شرح پھر بڑھا دی گئی اور ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ محصولوں میں اضافہ کی بنا پر ہندوستانی تاجر سامان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے پر رضامند نہ تھے۔

مذکورہ بالا تجربات سے واضح ہوتا ہے کہ راہداری کے محصول شاہی چھوٹ کے باوجود بھی وصول کیے جا رہے تھے لہٰذا ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ہندوستانیوں کے لیے جنھیں یہ چھوٹ حاصل نہ تھیں ان محصولوں کا بار اور گراں رہا ہوگا۔ اس طریقہ کی موجودگی کے لیے ہم مغل انتظامیہ کو مورد الزام قرار نہیں دے سکتے کیونکہ یہ طریقہ کوئی ایسا نہ تھا جو ان کی مملکت ہی تک محدود رہا ہو بلکہ واقعات شاہد ہیں کہ خود مختار علاقوں میں محصولوں کی گرانباری اور کثرت یہاں سے بھی زیادہ تھی۔ یہ امر کہ مغلیہ مملکت کے حدود میں واقع ہندو سرداروں یا راجاؤں کے علاقہ میں شاہی چھوٹ کو منطبق کرنا حکومت کے منشا کے مطابق نہ تھا، سورت میں انگریزوں کی دشواریوں کے اول اور آخری تصفیہ

کے موازنہ سے واضح ہے۔ ابتدائی تصفیہ میں مغلوں کی کسی وقتی کمزوری کے باعث علاوہ دیگر مقامات کے راج دھیتا کا علاقہ بھی محصولوں سے مستثنیٰ کیا گیا تھا لیکن آخری تصفیہ کے وقت جب مغل ایک آزاد عامل کی حیثیت میں تھے تو یہ علاقہ اس استثنار میں شامل نہ کیا گیا تھا اور اسے صرف "اس بادشاہ کی قلمرو" تک محدود رکھا گیا واوین کے اندر کے فقرہ سے واضح ہے کہ سرداروں کے زیرانتظام علاقے اس سے خارج کر دیئے گئے تھے۔ حقیقتاً یہ امتیاز چند برس پہلے ہی قایم کیا جا چکا تھا جب دھیتا میں محصولوں سے استثنار کی درخواست کا یہ جواب دیا گیا کہ چونکہ یہاں کا راجہ معینہ خراج پابندی سے ادا کر رہا ہے لہٰذا اس کے علاقہ کی وصولیوں میں مداخلت ممکن نہیں۔ اس کے بعد کے متعدد واقعات مظہر ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ انگریز اس بات کو بخوبی سمجھ چکے تھے کہ سرداروں کے خصوصاً راجپوتانہ میں اور مغل حکام کے مطالبات ایک دوسرے سے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن واضح رہے کہ صرف سرداران ہی راہدری کے محصول نہ طلب کرتے بلکہ بعض اوقات گاؤں کے رہنے والے بھی اس کے دعویدار ہوا کرتے تھے۔ 1637 میں اس نوعیت کا ایک مطالبہ آگرہ سے محض چند میل کے فاصلہ پر کیا گیا جس کے نتیجہ میں جو جھگڑا ہوا اس میں ایک انگریز تاجر جان سے مارا گیا۔ ساتھ ساتھ پیٹر منڈی بھی متعدد ایسے واقعات کا راوی ہے کہ گاؤں والے ازراہ بغاوت اپنے حکم سے محصول وصول کیا کرتے۔ مملکت مغلیہ کے حدود کے باہر غالباً یہ طریقہ نسبتاً زیادہ ظالمانہ تھا تھیونیو کا مملکت گولکنڈہ میں داخل ہونے پر بسبب 43 لیگ کے سفر میں 16 عدد محصول وصول کرنے والی چوکیوں سے گذر ہوا تو اسے حالات کی اس تبدیلی پر سخت حیرت محسوس ہوئی بینگی بیجاپور میں محصولوں کی وصولی میں تشدد پر نکتہ چینی کرتا ہے یسولی پٹم کے انگریزوں کو جو متعدد فرمان دیے گئے تھے ان میں اس محصول سے جسے مقامی طور پر جن کن[1] کہتے تھے استثنار پر زور دیا گیا ہے اور ان مطالبات سے جنوب کے ہندو علاقہ میں اکثر وقت پیش آیا کرتی تھی۔ پس ہم بجا طور پر یہ تصور کر سکتے ہیں کہ محصول

---

[1] 'جن کن' بظاہر تامل زبان کا لفظ 'چنگم' بمعنی چنگی ہے۔ مشرقی ساحل کے مراسلات میں یہ محصولوں کی اسی قسم کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے جنھیں شمال اور مغرب میں راہداری کہتے تھے۔

راہداری محض مغلوں ہی کا نہیں بلکہ پورے ہندوستان کا طریقہ تھا۔ ملک کے ہر حصہ میں کوئی بھی شخص جو انتظامی اختیار کا مالک یا مدعی ہوا سے طلب کر سکتا تھا[1]۔ ایک انگریز آڑھتیے نے اپنے راستہ کے تبدیل کرنے کا جو سبب بیان کیا ہے ہمیں اس سے اس محصول کے اصل کا غالباً اندازہ مل سکتا ہے۔ 1822 میں جان[x] پار کر نے لکھا کہ "میرا ارادہ ہنڈیہ کے راستہ سے آنے کا تھا مگر میرا خیال ہے کہ اس علاقہ کا سابق راجہ جو پہلے صرف محصول وصول کرتا تھا اب تاجروں اور مسافروں کے پاس جو اثاثہ ہوتا ہے وہ سب لوٹ لیتا ہے۔ ان آٹھ دنوں کے اندر اندر ایک تاجر کے سامان سے لدے ہوئے آٹھ اونٹ لوٹ لیے گئے اور وہ خود بھی معتین آدمیوں کے جان سے مارا گیا۔" لوٹ مار سے شروع ہو کر بذریعہ دھمکی رشوت ستانی اور پھر راہداری کی منزل، یہ اس وقت کے حالات کا قدرتی ارتقاء تھا اور دورِ حاضر میں بھی ان میں سب سے اوّل عمل کی طرف مراجعت سے ہم نامانوس نہیں ہیں۔ اس کی اصل جو بھی ہو۔ اس طریقہ کے عمومی رواج کے باعث مسلسل ممانعتوں اور چھوٹ کے باوجود اس کا برقرار رہنا آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے حقیقت یہ تھی کہ لوگ محصول راہداری ادا کرنے کے عادی ہو چکے تھے اور باوجودیکہ ضابطہ کے اندر اس کی ممانعت رہتی پھر بھی لوگ اس کے خلاف کوئی موثر احتجاج کرنے پر مائل نہ ہوتے۔

ان حالات میں اس محصول کا تجارت پر جو بار پڑتا اس کی مقدار کا تعین ممکن نہیں کیونکہ کوئی شخص بھی کسی مقدار میں محصول کا مطالبہ کر سکتا تھا خواہ اسباب پر کسی نواحی علاقہ میں پہلے محصول ادا کیا جا چکا ہو۔ ہمیں جن مطالبوں کی اطلاع ملتی ہے ان میں سے بعض کی مقدار واجب ہوتی اور بعض بظاہر بہت زیادہ ہوتے۔ ایک موقع پر ہم دو روپیہ فی گاڑی اور کسی دوسرے موقع پر 65 روپیہ فی گاڑی محصول کی وصولی سنتے ہیں پس یہ امر واضح ہے کہ ان کی شرحیں ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہوا کرتیں لیکن اس محصول کی سب سے بڑی خرابی ان کے مطالبہ کا غیر یقینی ہونا اور اس کی وصولی میں تشدد کا استعمال کیا جانا

---

[1] مملکت موریہ میں تاجر سے سرحد پر سڑک کا محصول وتہہ بازاری اور شہر کے دروازہ پر چنگی کے محصول وصول کیے جاتے تھے۔

[x] John Parker

تھا۔تاجر پہلے سے صحیح طور پر یہ متعین نہ کر سکتے تھے کہ کس سفر میں ان کو کس قدر ادا کرنا ہوگا۔ظاہر ہے کہ تجارتی سامان کی اس وقت تک آمد و رفت نہ ہو سکتی تھی جب تک کہ تخمینی منافع اس قدر زیادہ نہ ہو جس سے غیر متوقع مطالبات پورے ہو سکیں۔ درحقیقت ان محاصل کو بالآخر صارفین ہی کو ادا کرنا ہوتا تھا لیکن اس نظام کے طریقہ کار کے غیر یقینی ہونے سے جب تجارتی کاروبار مندا پڑ جاتا تو اس کا خمیازہ صارفین اور پیدا کرنے والوں دونوں ہی کو بھگتنا پڑتا تھا۔[1]

اس امر کی نشاندہی غالباً مفید ہوگی کہ ہرچند کہ راہداری کے محصول شاہی خزانہ کے کھاتہ میں جمع نہ ہوتے مگر پھر بھی کم از کم بعض صورتوں میں ان سے مرکزی آمدنی کو فائدہ پہنچتا۔ راجہ دھیتا کے معاملہ سے جس کا پہلے ذکر آچکا ہے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہجہاں راجاؤں کے محصول وصول کرنے میں مزاحم نہ ہو سکتا تھا کیونکہ یہ خراج ادا کرتے تھے اور مورّخ خافی خان کے بعض بیانات ظاہر کرتے ہیں کہ جاگیرداروں کے مطالبات کے ساتھ بھی یہی صورت ہوتی۔ بقول اس مورخ کے اورنگ زیب نے 1660ء کے قحط کے دوران محصول راہداری اور نیز دیگر چنگیوں کی موقوفی کے احکام صادر کیے لیکن اس کے باوجود حکام اور جاگیرداروں نے ان کی وصولی جاری رکھی۔ اس کا جزوی سبب تو یہ تھا کہ بادشاہ کا احترام نہ کیا جاتا تھا اور جزاً

"..... اس لیے کہ حکام مال عدم توجہی یا مروت کی کمی کے باعث یا نفع کے خیال سے (احکام کے۔ مترجم) منشاء کے خلاف جاگیرداروں کی تنخواہ کے حساب سے (ان محصولوں کے لیے) منہائیاں کر لیتے تھے۔ پس جاگیرداران اس بہانہ سے کہ یہ محصول ان کے کاغذات تنخواہ میں درج ہیں راہداری کے محاصل اور نیز دیگر ممنوعہ محصولوں کو وصول کرتے بلکہ ان میں

---

[1] گجرات رپورٹ، (ورق 19) سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ 1628ء کے قریب احمد آباد کو دوسرے شہروں پر اس معاملہ میں برتری حاصل تھی کہ یہاں مقامی محصول کم اور ان کی نوعیت یقینی تھی اور مصنّف یہاں کی وسیع اور خوشحال تجارت و صنعت و حرفت کو اسی امر سے منسوب کرتا ہے۔ غالباً دوسرے مقامات کو بھی وقتاً فوقتاً یہ برتری حاصل رہا کرتی تھی لیکن یہ ایک عام قاعدہ میں مستثنیات کا درجہ رکھتا تھا۔

اضافہ بھی کرتے۔ ان احکام کی خلاف ورزی کی اطلاعات حکومت کو موصول ہونے پر حکم عدولی کرنے والے کو سزائیں ملتیں لیکن تھوڑی ہی مدت بعد ان کے عہدے بحال ہو جاتے لہٰذا "بیشتر محصولوں کی موقوفی کے ضابطے بے نتیجہ ثابت ہوئے" مذکورہ بالا قول کی جس کی عبارت حد درجہ اصطلاحی ہے اس طور پر وضاحت کی جا سکتی ہے کہ ایک عہدہ دار کو جاگیر میں زمین دی گئی تاکہ اس کو ایک معین آمدنی حاصل ہو سکے۔ اس نے جاگیر سے معینہ آمدنی سے زاید کمانے کی پوری کوشش کی۔ دوسری طرف حکام کی یہ کوشش رہتی کہ وہ ایسا نہ کر سکے۔ وہ اس کی وصولیوں کی اندراجات (کاغذات تنخواہ) محفوظ رکھتے تاکہ ان کی زاید وصولیوں کا حساب کیا جا سکے پس اگر کوئی جاگیر دار راہداری سے محصول وصول کرتا تو ان کاغذات میں درج کر دیا جاتا۔ اس بنا پر جاگیر دار یہ حجت پیش کرتا کہ اس کی وصولی کو حکام تسلیم کرتے ہیں لہٰذا وہ اس کو عوام سے وصول کرنے کا حق رکھتا ہے۔ درحقیقت جاگیر داروں اور محاسبین کے درمیان مسلسل نزاع چلتی رہتی اور منجملہ دیگر مدوں کے راہداری کا محصول ایک ایسی مد تھی جس میں دونوں فریق اپنی پوری پوری حکمتیں صرف کرتے۔

خافی خاں مذکورہ بالا بیان کے بعد اس پر اپنے تبصرہ کا اضافہ کرتا ہے یہ ان محصولوں[1] پر ایک واقف کار ہندوستانی کے تاثرات کا درجہ رکھتے ہیں لہٰذا ذیل میں قلمبند کیے جاتے ہیں۔ بقول اس کے "راستباز اور منصف مزاج اشخاص راہداری کی خاص طور پر مذمت اور اس کو ایک انتہائی پریشان کن اور مسافروں کے لیے ظالمانہ محصول قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس محصول کے ذریعہ ایک کثیر رقم جمع کی جاتی ہے۔ شاہی علاقوں کے بیشتر حصہ میں فوجدار اور جاگیر دار اسے بزور وظلم پہلے سے زیادہ مقدار میں تاجروں اور نادار اور حاجتمند مسافروں سے وصول کرتے ہیں۔ زمیندار بھی یہ دیکھتے ہوئے کہ اس سلسلہ میں کوئی روک ٹوک نہیں ہے اپنے حدود کی سڑکوں پر بمقابلہ ان سڑکوں کے جو شاہی

---

[1] خافی خاں کا ذاتی تجربہ زیر مطالعہ عہد کے بعد کا ہے اور وہ جب زمانۂ حال میں لکھتا ہے تو غالباً اس کا مفہوم اٹھارہویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے جبکہ نظم و نسق کا انحطاط ترقی پر تھا اور مقامی برائیوں کو روکنے کی طاقت کمزور پڑ چکی تھی۔ عہدِ شاہجہانی کے نسبتاً اس کی تحریر کے وقت حالات قطعاً زیادہ خراب تھے لیکن نظام ایک ہی سا تھا۔

حکام کے زیرانتظام ہیں زیادہ جبری وصولیاں کرتے ہیں۔ دھیرے دھیرے حالات اس حد پر پہنچ گئے ہیں کہ تجارتی کوٹھی یا بندرگاہ سے منزل کے درمیان تک مال تجارت پران کی قیمت خرید سے دوگنا بطور محصول وصول کرلیا جاتا ہے۔ محصول کے وصول کرنے والوں اور زمینداروں کی بدی اور مظالم سے ہزاروں مسافروں اور امن پسند راہ گیروں کی جائداد، ننگ وناموس، اور زندگیاں برباد ہو رہی ہیں؛ خافی خاں بیشتر وقائع نگاروں کی طرح، صارفین اور مسافروں کے نقطۂ نگاہ سے لکھتا ہے لیکن ولندیزی اور انگریزی مراسلات جو حوالے پہلے آچکے ہیں ظاہر کرتے ہیں کہ اس نے محاصل راہداری کے پورے نظام کی جو مذمت کی ہے وہ اہل تجارت کے رائے سے اچھی خاصی مطابقت رکھتی تھی اور اس نظام کے موافقت میں، بجز اس کے کہ چونکہ لوگ اسے برداشت کرتے تھے لہٰذا حکام کے لیے نفع بخش تھا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے، تجارت اور صنعت و حرفت پر عائد کیے گئے دیگر محصولوں کے متعلق ہمارے معلومات بہت کم تفصیلی ہیں۔ ہم یہ قدرتی طور پر قیاس کر سکتے ہیں کہ اہل حرفہ اور معمولی تاجروں سے جو وصولیاں کی جاتی تھیں انھوں نے کم و بیش ایک دستور کی حیثیت اختیار کرلی تھی لیکن اس بیان کی تائید میں کہ جب بھی تجارت نمایاں طور پر ترقی کرتی تو اس کے نتیجہ میں حکومت یا اس کے احکام اپنے مطالبات میں اضافہ کر دیتے تھے کافی شہادتیں پائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے کہ 1633 میں نیل کو شاہی اجارہ داری کے تحت لے لیا گیا تھا۔ اس اجارہ داری کے نتیجہ میں اس کے پیدا کرنے پر عملاً 33 فیصدی کا محصول عائد ہوا کیونکہ اس کے پیدا کرنے والوں کو اسے 27 روپیہ کے نرخ بازاری کے بجائے 18 روپیہ پر فروخت کرنا پڑتا تھا۔ اس کے قبل گجرات میں نیل پر جو محصول عائد کیا گیا تھا وہ بادی النظر میں اس سے بھی زیادہ تھا کیونکہ اس کا حساب 16 روپیہ کی نیل پر 10 روپیہ کا آتا ہے لیکن اس محصول کے سلسلہ میں ایسا سوچا جا سکتا ہے کہ ابتدأ میں مطالبہ کو مصلحتاً زیادہ رکھا گیا تھا تاکہ بعد میں گفت وشنید میں سہولیت ہو اور جو رقم بالآخر وصول کی گئی وہ غالباً اس سے کم تھی۔ ہم اس کے بعد پھر یہ دیکھتے ہیں کہ مغل بادشاہ نے 1655 میں جب شورہ کی برآمدی تجارت میں ابھی زیادہ اضافہ شروع ہی ہوا تھا کہ اسے شاہی اجارہ داری میں لے لیا۔ اس کے دس برس قبل ایک ولندیزی

اطلاع کے مطابق شورہ پر ایک نیا محصول عائد کیا جا چکا تھا۔ اس سلسلہ میں ہمیں بنگال میں میر جملہ کے عائد کیے ہوئے ایک نئے محصول کی بھی اطلاع ملتی ہے۔ ایک ولندیزی تذکرہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ڈھاکہ میں غلہ کے تاجروں کو ایک ساتھ طلب کر کے ان سے اس بناء پر کہ انھوں نے اس کے یہاں فوج کے طویل قیام کی وجہ سے دوگنا زاید منافع کمایا ہے پچاس ہزار روپیہ طلب کیا۔ تاجروں نے دس ہزار روپیہ پیش کیا اور باوجود کوڑوں کی سخت سزا کے وہ اس سے زاید ادا کرنے پر رضامند نہ ہوئے اور یہ عذر پیش کیا کہ وہ محض خوردہ فروش تھے۔ اس پر ان کے دو سربراہوں کو گرفتار کر کے ہاتھیوں کے سامنے ڈال دیا گیا تب انھوں نے مجبوراً موت کے خوف سے 25 ہزار روپیہ پر معاملہ طے کر لیا۔ اس کے بعد اس قسم کے تشدد کے بغیر ہی شہر کے ساہوکاروں نے تین لاکھ روپیہ ادا کر دیے۔ ان واقعات کے تحت میرا خیال ہے کہ ہم اس نتیجہ پر پہنچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ کاروبار کی کسی بھی نفع بخش ترقی کی صورت میں نت نئے مطالبات کی وصولی کا خطرہ صنعتی مہموں یا تقسیم زر کے عمل کو بُری طرح متاثر کرتا تھا[1]

مقامی محصولوں کے موضوع سے رُخصت ہونے کے قبل، محاصل کے ان تین ذرائع کو مختصراً بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، چُنگی، آبکاری اور نمک۔ ہم موجودہ دور میں بھی ان سے واقف ہیں۔ ہمارے ماخذ چنگی اور راہداری کے محصولوں میں کوئی امتیاز قایم نہیں کرتے اور غالباً ہندوستانیوں کا فی الجملہ نقطۂ نگاہ بھی ایسا ہی تھا لیکن کسی بھی شہر میں جو سامان استعمال کے لیے آتا اس پر محصول کی وصولی ایک مسلمہ طریقہ تھا — سولھویں صدی میں وجے نگر میں یہ محصول رائج تھے اور یہاں کوئی بھی چیز انھیں ادا کیے

---

[1] میر جملہ نے بنگال میں جو نام پیدا کیا اسے DAGH REGISTER میں 3 ستمبر 1663 کے تحت بیان کیا گیا ہے جس خط میں اس کے "آخری دشمن یعنی موت" سے اس کی ملاقات کو بیان کیا گیا ہے اسی میں آگے چل کر کہا گیا ہے کہ "یہ ہے اس شخص کا انجام جس نے اپنی زندگی گمنامی کے عالم میں شروع کر کے ترقی کے اس قدر مدارج طے کیے کہ اس کا ملک کے ممتاز ترین افراد میں شمار ہونے لگا۔ اس کے دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ اس کا ولی نعمت مغل فرمانروا بھی اس سے سہما رہتا تھا۔ لیکن اب اس کا کوئی ماتم کرنے والا نہیں ملتا بلکہ ہر شخص اس کے مرنے پر بیحد مسرور معلوم ہوتا ہے۔"

بغیر نہ آسکتی تھی یہاں تک کہ لوگ جو اپنے سروں پر بوجھ لاتے وہ بھی ان محصولوں سے مستثنیٰ نہ تھے۔ اکبر کے شہری نظم ونسق کے ضابطوں میں کوتوال یا شہری صوبیدار کے محصول عائد کرنے کے اختیار کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی صراحت کی گئی ہے۔ پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زیر مطالعہ عہد میں چنگی مقامی محصولوں کا ایک جز تھی اور غالباً اس کا بار عملاً اس کے منتظمین کی انفرادیت کے لحاظ سے کم وبیش ہوا کرتا تھا۔

ہمیں ان دنوں آبکاری کے کسی عمومی نظم کی موجودگی کا پتہ نہیں چلتا اور اس قسم کا کوئی نظم اسلامی شریعت کے سخت قوانین کے خلاف بھی ہوتا۔ عہد جہانگیری میں شراب کی فروختگی پر کوئی کڑی بندش نہ تھی لیکن عہد شاہجہانی میں یہ ممنوع قرار پائی۔ منڈی اپنے 1632 کے 'جرنل' میں شراب کی کشید یا اس کی بکری پر کثیر جرمانہ کا حوالہ دیتا ہے۔ الہ آباد کے نواح میں یہ چوری کرکے ہی حاصل کیا جا سکتا تھا لیکن، اس کے مزید مشرق میں یہ کسی بھی قیمت پر نہ مل سکتا تھا کیونکہ "یہ بالکل منع تھا اور اس کی سزا موت تھی اور جس مکان میں یہ پائی جائے اس کو مسمار کیا جاتا تھا۔"

لیکن اسی مصنف کی تحریر ہے کہ صوبیدار سورت نے کھجور کے درخت جن سے نشہ آور شراب پیدا ہوتی ہے ٹھیکہ پر دیے اور 1630 میں اس نواح میں شراب کی کشید کو ایک فنی کام کی حیثیت میں تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ ایک واضح امر ہے کہ بادشاہ کے احکام بیحد سخت تھے مگر اس کے نفاذ کا انحصار مقامی انتظامیہ پر تھا جس نے جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا ہے اس کے استعمال کی اجازت دے کر اسے اپنی آمدنی کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ مغلوں کے تحت نمک پر محصول وصول کیا جاتا تھا لیکن اس کی شرحوں کا تحریری اندراج بجز پنجاب کی کانوں کے جہاں عہد اکبری میں یہ اس کی بنیادی قیمت کے دوگنے سے بہت زاید تھیں کہیں اور نہیں ملتا۔ اس کے محصول کی ادائیگی "دیوان" کے نام بتائی گئی ہے جو ایک غیر واضح فقرہ ہے لیکن اس سے غالباً شاہی حکام مراد ہیں۔ ان دنوں نمک کی کانیں مقامی سرداروں کے قبضہ میں تھیں اور آئین اکبری میں ان کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ گجرات اور خلیج کچھ× میں اس کی جس قدر فراہمی تھی اس میں

RAN OF CUTCH ×

سے اگر سب پر نہیں تو بیشتر حصہ پر مقامی سردار محصول وصول کیا کرتے۔ بنگال کے شاہی محصولات کے جدولوں میں نمک کے بعض محصولوں کا ذکر ملتا ہے لیکن جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے یہ جدولات اس دور کے انتظامی حقائق کے مظہر نہیں ہیں۔ پس ہم عمومی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ نمک پر محصول تو ضرور وصول کیا جاتا تھا لیکن اس کے نظام کا کوئی یکساں طریقہ نہ تھا اور اس کا محصول مرکزی آمدنی میں نہیں بلکہ معمولاً مقامی یا صوبجاتی آمدنی میں شامل ہوا کرتا تھا۔ دورِ حاضر کے ہندوستانی میزانیہ میں نمک کی اہمیت کا سبب یہ ہے کہ اس کا محصول بعض میونسپلٹیوں میں عائد ہونے والی چنگیوں کو چھوڑ کر، زیرِ مطالعہ عہد کے دوران تقریباً ہر قسم کے کاروبار کو متاثر کرنے والے جو بے شمار محصول و چنگیاں عائد تھیں ان کی واحد یادگار ہے۔

محصولوں کے علاوہ مقامی حکام کے لیے تحفوں، جرمانوں اور رشوتوں کے ذریعہ بے شمار آمدنی کے دروازے کھلے رہتے تھے۔ ان میں سے تحفوں پر تفصیلی کلام کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ تحفوں کا پیش کیا جانا ایک عمومی اور ناگذیر طریقہ تھا اور اس موضوع پر پچھلے باب کے مندرجات کو ہر درجہ کے حکام پر منطبق کیا جاسکتا ہے۔ جرمانوں کے متعلق ولندیزیوں کی اطلاع کے مطابق جو افسران انھیں عائد کرتے وہی ان کے مالک ہوتے۔ پلسارٹ کی خاص طور پر آگرہ کے متعلق اطلاع ہے کہ وہاں غیر مفلس ملزمین کو پھانسی کی سزا شاذ ہی دی جاتی۔ ایسے ملزمین کی جائداد صوبیدار اور کوتوال کے افادہ کی غرض سے ضبط کرلی جاتی تھی۔ وہ اپنی اس اطلاع کے بعد ان بیچاروں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے جو" ایسے خبیث اور خدا ناترس حکام جولالچ میں اندھے ہوچکے تھے۔ اور جو شکار کے متلاشی بھیڑیے کے مثل اپنے منہ پھاڑے رکھتے تھے، جن کے شکم غربا کی روٹی کے بھوکے رہتے اور جن میں ہر شخص کا دستِ طلب دراز رہا کرتا کیونکہ کوئی شخص بھی بغیر کچھ ادا کیے ہوئے ان کے رحم وکرم کا مستحق نہ ہوسکتا" کے سامنے حاضر ہونے کے لیے مجبور تھے۔ اسی طرح گجرات کی اطلاع بھی مظہر ہے کہ پوری مملکت میں جرمانے بالعموم ہلکے جرائم ہی کے لیے نہیں بلکہ قتل، چوری اور ڈاکہ زنی تک کے لیے عام سزا تھی کیونکہ جرمانے مسلّم طور پر صوبیدار کو ملتے اور ان ملزموں کے پھانسی پانے کی صورت میں ان کے جیب نہ بھر سکتے تھے۔ پس جرمانوں اور رشوتوں کی درمیانی حد غیر واضح تھی۔ اس اطلاع میں یہ بھی

بتایا گیا ہے کہ صوبیداروں کی چشم پوشی سے بعض اہم شہروں کے نواحی علاقے ڈاکوؤں کی
مسلح جماعتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ صوبیدار اس طور پر دوہرا فائدہ اُٹھاتے اول تو
رشوت ستانی کے ذریعہ، دوسرے پولیس کے اخراجات سے بچ کر۔ حکام شہریوں سے
بھی بلا خوف و خطر جبری وصولیاں کر سکتے تھے۔ ایک فرضی الزام میں انھیں ماخوذ کر کے
جرمانہ یا رشوت وصول کی جا سکتی تھی اور قانون کو حرکت میں لانے کے لیے مخبروں کی کوئی
کمی نہ تھی کیونکہ بقول پلسارٹ یہ آگرہ میں مکھیوں کی طرح کثیر تعداد میں پائے جاتے تھے۔
ساتھ ساتھ اسلامی شریعت کے ضابطوں پر بھی اعتماد نہ کیا جا سکتا تھا۔ قاضی جس کا
[illegible] قانون کی تشریح کرنا ہوتا عدالت میں بیٹھا رہتا لیکن عملاً صوبیدار مطلق العنان ہوا
[illegible] بقول اسی شاہد کے کہ "پوپ کو کون سزا دینے والا ہے؟ اور صوبیدار کے فیصلہ کو
کون معرض بحث لا سکتا ہے!" اپیل کرنے کے مواقع حاصل رہا کرتے اور جیسا کہ کسی پچھلے
[illegible] میں گذر چکا ہے ویرجی وُرا ایسے کثیر دولت رکھنے والے بادشاہ کے حضور میں کامیاب
[illegible] ہو سکے۔ ہم یقین نہیں، یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس موقع پر ویرجی وُرا کو کس قدر رقم
[illegible] کرنا پڑی، لیکن اس کی کامیابی کی بنیاد پر یہ سوچنا کہ متوسط وسائل رکھنے والے افراد بھی
[illegible] حرص و طمع سے محفوظ تھے ایک عاجلانہ فیصلہ ہوگا۔ میرے خیال میں صحیح فیصلہ وہی
[illegible] پہلے بیان کیا جا چکا ہے یعنی یہ کہ ہر قسم کے محصولوں کے سلسلہ میں خواہ وہ کسی طبقہ پر عائد
[illegible] ہوں [illegible] افراد پر حکام کو صرف اس قدر احتیاط کرنی ہوتی ہو کہ معاملہ کوئی ایسی بد
[illegible] اختیار کر لے کہ [illegible] سے مداخلت ضروری ہو جائے۔ لیکن اس صورتِ حال
[illegible] ہوئے انھیں کسب زر کے سلسلہ میں ایسے طریقے اختیار کرنے کے لیے جنھیں
[illegible] عامہ برداشت کرنے پر ہرگز تیار نہیں ہو سکتی اور جو معاشیین کے نقطۂ
[illegible] ضرر رساں تھے پورے مواقع حاصل تھے۔

باب 9 کے ماخذ

فصل ۱: مجھے مغلوں کے مالی نظام کا کہیں پورا پورا بیان نہیں ملتا۔ میں
نے اس کی جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ اس وقت کے متعدد تذکروں اور سرکاری
تصنیف AURANGZEB, میں جا بجا پائی جاتی ہیں۔ محاصل کی مدات ملتی (ج 2 ص 415)

میں انتہائی وضاحت کے ساتھ درج ہیں۔ لیکن اس کی فہرست میں ایسے مدات بھی شامل
ہیں جن کا زیر مطالعہ عہد کے بعد اضافہ ہوا تھا۔ مالگذاری زمین کی مجموعی آمدنی کے لیے ملا
حظہ ہو آئین اکبری (ترجمہ) ج 2 ص 115 اور "بادشاہ نامہ" ج (2)۔ 710 اور اس کے بعد
کے صفحات۔ ان رقوم کی نوعیت جو شاہی دربار کے حساب میں جمع ہوتی، آئین اکبری، حصہ
اول سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ شاہجہاں کے بڑے اخراجات۔ ELLIOT vii- پر مشاہروں
کا موازنہ آئین اکبری (ترجمہ) ج (1)۔ 308 اور اس کے مابعد صفحات اور "بادشاہ نامہ" (2)
712 اور اس کے مابعد صفحات پر مبنی ہیں۔ بقایہ آمدنی کی ترسیل کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو
سرکار کی تصنیف "AURANGZEB (2) 171 اور صفحات مابعد حکام کی غربت کا بدیز
ص 213 پر ذکر آیا ہے۔ جنوبی ہندوستان کے نظام مال کے ماخذ باب 8 کے تحت قلمبند کیے جا
چکے ہیں۔

فصل 2: سورت کے درآمدی و برآمدی محصولوں کے لیے ملاحظہ ہو HANKINAS
EARLY TRAVELS: 171, PURCHAS I. iv-423 & THEVENOT 7 بندرگاہوں کے
درمیان مقابلہ کے لیے ROE 45. 57 & ENGLISH FACTORIES iii-192, viii-134
تاخیر کے بہ کثرت واقع ہونے کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔ LETTERS RECEIVED IV, 78.
اور نیز ENGLISH FACTORIES i.137, ii-311, iii-29, viii- RCHORER f 8,
میں زیادہ مالیت کی تشخیص بھی ایک عام موضوع تھا جس کی مثالیں ENGLISH FACTORIES
اور درآمدی و برآمدی ترسیل نے ترقی مرکی جبری LETTERS RECEIVED iv-ROE, 152,
وصول کی مثالیں iv- DAGH REGISTER JULY 31.1641 LETTERS RECEIVED
میں ملاحظہ ہوں 78, ENGLISH FACTORIES i-187, viii-302
سورت کی ٹکسال کے حوالے ENGLISH FACTORIES iv, 103. v. 18, vi-84,
vii-23, viii-185, x-120 راج محل میں خرابیوں کا ذکر DAGH REGISTER مورخہ
31 ستمبر 1663 اور اس کے بعد کے برسوں کے متعدد اندراجات میں آیا ہے مغلوں کی
وراثت پر دعویداری کا ذکر PURCHAS i,218, ix.1480, ROE 110ff, BERNIER 164
اور دوسرے مقامات پر آیا ہے۔ اس موضوع پر اورنگ زیب کا خط BERNIER 167

میں موجود ہے۔ جہانگیر کے طریقہ کو پلسارٹ کے مخطوطہ ورق 21 کا ترجمہ کرکے بیان کیا گیا ہے۔ آصف خاں کی جائداد کے لیے ملاحظہ ہو DAGH REGISTER مورخہ 4 / ستمبر 1642 اورنگ زیب کے نقطۂ نگاہ کے لیے ملاحظہ ہو ELLIOT vii-68 & MENRIQUE ii-i تجارتی مراسلات میں اس کے تذکروں کے لیے ملاحظہ ہو ELLIOT-vii-1618 MENRIQUE ii-415ff ENGLISH FACTORIES ii-125, iii. 29, viii.7,102, 119,

تحفوں کے رواج کا بیشتر مصنفین ذکر کرتے ہیں۔ کتاب کے متن میں جن مخصوص عبارتوں کے حوالے آتے ہیں وہ MENRIQUE lxiv & DAGH REGISTER (SURAT) APRIL, 27,1643 JANUARY 18 & JUNE 9,1645 سے ماخوذ ہیں۔ شاہی محاصل کی متفرق مدیں آئین اکبری (ترجمہ) 2 کے جدولات میں ملیں گی۔

فصل 3 :۔ باضابطہ محصولوں پر اضافہ کے عائد کیے جانے کے حوالے SARKAR'S STUDIES 194 میں آتے ہیں۔ مسولی پٹم کے مقامی محصول-TERPESTRAS KOROMEN DAL ii & BENNEVILLE V میں ملتے ہیں۔ مقامی محصولوں کے متعلق جہانگیر کی ممانعت تزک جہانگیری (1) 7 میں اور احکام عالمگیری پر SARKAR'S ADMINISTRATION 120 میں بحث آئی ہے۔ اس نوعیت کے محصولوں کے باقی رہنے کو بعد کی متعدد تصانیف میں بھی دیکھا جا سکتا ہے مثلاً TAYLOR'S DACCA 197 راہداری کے محاصل کے سلسلہ میں جن عبارتوں کے حوالے آتے ہیں وہ LETTERS RECEIVED iv-79;ENGLISH FACTORIES i.88,331;iii,20,126,270: vii- 160; viii.58,71,103, ix.10,26,38,84,x-63& DAGH REGISTER FEB 24,1634, MARCH 31,MAY 20,1641 APRIL 27,DEC.12,1643 (SURAT) APRIL 17,1643, سے ماخوذ ہیں مغلوں کے علاوہ دیگر حکام کے محصولوں کے لیے ملاحظہ ہو MUNDY ENGLISH FACTORIES i. 331, MANUCCI ii-171, ii-96, 310, v-17, vi-13,150 & 58 ; vii-360; LETTERS RECEIVED v.128, ii- THERENOT 279 خافی خاں کا بیان ELLIOT vii-246-248 میں ملتا ہے۔

دیگر محصولوں کے سلسلہ میں مذکورہ اجارہ داریوں پر باب 4 میں بحث آچکی ہے

مشورہ کا محصول ENGLISH FACTORIES xx-& DAGH REGISTER AUG.19,1645 میں بیان کیا گیا ہے۔ میر جملہ کے عائد کردہ محصولوں کے لیے ملاحظہ ہو تصنیف مذکورہ مورخہ 29 نومبر 1661۔ شہری محصول SRIVELL 364 اور آئین اکبری (ترجمہ) (2) ص 42 میں۔ آبکاری کے محصول MUNDY 11,32,97,134 میں اور نمک کے محصول آئین اکبری (ترجمہ) (2) ص 315، 249، 242 میں درج ہیں۔ جرمانوں اور رشوتوں کے اقتباسات، پلسارٹ (مخطوطہ اوراق 22، 24) اور گجرات رپورٹ اوراق 20، 21 سے ماخوذ ہیں۔

باب 10

خلاصہ اور خاتمۂ کلام

پچھلے ابواب میں، میں نے ان معلومات پر بحث کی ہے جو میں عہد جہانگیری اور عہد شاہجہانی کے دوران ہندوستان کے معاشی حالات کے متعلق فراہم کر سکا۔ اس دور میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کا تعین اور نیز ایک ایسے تخمینی گوشوارہ کی ترتیب جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ ان دنوں ملکی آمدنی میں اضافہ ہو رہا تھا یا کمی اور یہ کہ اس کی تقسیم کا عمل دور حاضر کے اصول عدل کے معیار سے قریب ہو رہا تھا یا دور، یہ دو کام اب باقی رہتے ہیں بادی النظر میں تو ہالینڈ اور انگلینڈ میں قایم شدہ بڑی بڑی کمپنیوں کے گماشتوں کا ہندوستان میں ظہور اور ان کا ملک کے سب سے زیادہ پیدا کرنے والے حصوں میں داخلہ، ان ایام کے اہم واقعات معلوم ہوتے ہیں لیکن زیادہ تفصیلی تحقیقات کے بعد اہل معاشیات ان واقعات کے دور رس اثرات کے ساتھ ساتھ اس عہد کی ان انتظامی تبدیلیوں کی نسبتاً زیادہ اور فوری اہمیت کو بھی تسلیم کرنے پر اپنے کو مجبور پاتے ہیں جنھوں نے نظام تقسیم کے موجود نقائص میں اضافہ کر کے پیدا کرنے والی صنعت میں ایک نمایاں اور اضافہ پذیر رد عمل پیدا کیا۔ ایک طرف اگر خرید و فروخت کے نئے نئے وسائل کی کارکردگی میں ترقی سے ہندوستان کو فائدہ پہنچا تو دوسری طرف معاشی کاسہ لیسی میں اضافہ سے جو اس کی پیدا کرنے والی صلاحیتوں کو برباد کر رہا تھا اسے نقصان اٹھانا پڑا بعض علاقوں اور پیدا کرنے والے

طبقوں نے تو جدید بیرونی سہولتوں سے فائدہ اُٹھایا لیکن اندرونی قوتوں کے عمل سے ملک مجموعی طور پر غریب ہوا اور مجھے اس میں ذرا شک نہیں کہ آخری میزان ہندوستان کے خلاف رہی۔

ملک کے اندر کام کرنے والی بیرونی ایجنسیوں میں ولندیزی کمپنی سب سے زیادہ اہم تھی۔ ہندوستان کے مشرقی جانب ولندیزیوں نے پیش قدمیاں کیں اور زیرِ مطالعہ عہد کی پوری مدت میں انھیں اس سمت غلبہ حاصل رہا مغرب میں انگریزوں نے جس قدر پیش قدمی کی تھی ولندیزی جلد ہی اس سے آگے بڑھ گئے۔ ہندوستانی نقطۂ نگاہ سے دو باہم متقابل کمپنیوں کی موجودگی نفع بخش ثابت ہوئی۔ زیرِ مطالعہ عہد کے دوران انگریزوں نے وقتاً فوقتاً انھیں جو خسارہ ہوتا رہا اس کا لحاظ رکھتے ہوئے بہت قلیل نفع اٹھایا لیکن اس کے باوجود انھوں نے ہندوستانی تجارت میں اپنے مقام کو برقرار رکھا۔ اور خاص طور پر یہ ان کی کوششوں ہی کا نتیجہ تھا کہ ملک اس نوعیت کی تجارتی اجارہ داری سے محفوظ رہ سکا جیسا کہ ولندیزیوں نے ایشیا کے بعض حصوں میں قایم کر لیا تھا۔

ہندوستان میں جو حالات چل رہے تھے وہ درآمدی تجارت کے کسی وسیع پھیلاؤ میں مانع تھے۔ ملک کی عام آبادی اس قدر غریب تھی کہ انھیں ان غیر ملکی سامانوں سے جو اس وقت قابلِ حصول تھے، کوئی دلچسپی نہ ہو سکتی تھی۔ متوسط طبقہ اول تو تعداد میں بہت ہی کم تھا دوسرے سرکاری حکام کے لالچ کے باعث وہ نمائشی اشیار کی خریداری پر اپنا روپیہ خرچ کرنے سے مجبور تھا اور درباروں اور ان پر منحصر امرار کی خریداریوں کی مقدار قلیل ہونے کے ساتھ ساتھ بیشتر فیشن اور ان کی تلوّن مزاجی کے تابع رہا کرتی۔ ہندوستانی صارفین، درآمد کرنے والوں کے درمیان مقابلہ کی صورت میں، فائدہ میں اور اجارہ داری قایم ہو جانے کی صورت میں نقصان میں رہتے اور بیشتر نئی برآمدگیوں کی قیمتیں بیش قیمت دھاتوں میں وصول کی جاتیں۔ لیکن سونے اور چاندی کی زاید درآمد ملک کی مجموعی کھپت سے فاضل نہ تھی اور اس سبب سے قیمتوں کی عمومی سطح میں کوئی نمایاں فرق رونما نہ ہو سکا حالانکہ بنگال کی تجارت میں ناگہانی اضافہ نے وہاں کی منڈی کو دیگر ساحلی مقامات کی منڈیوں کی قریبی سطح پر پہنچا دیا تھا۔

جہاں تک برآمدات کا تعلق ہے، ولندیزیوں اور انگریزوں کی سرگرمیوں سے

نیل، کیلیکو، شورہ، خام ریشم اور انفرادی اعتبار سے کم اہمیت کی دیگر اشیا کے پیدا کرنے والوں کے لیے نئی اور وسیع منڈیاں فراہم ہوئیں۔ ہندوستانی تاجروں نے ان منڈیوں کو مصرف میں لانے کے لیے کوئی موثر کوشش نہ کی تھی جب کہ پچھلی صدی کے دوران پرتگیزیوں کی مساعی کے محض محدود نتائج برآمد ہوئے تھے۔ ہندوستانی ریشم جاپان میں اور ہندوستانی کیلیکو اور شورہ کی مغربی یورپ میں زیادہ کھپت قطعی طور پر نئے تجارتی حقائق ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مغربی یورپ میں نیل کی کھپت کا اضافہ اس قدر زیادہ تھا کہ ہم قطعی طور پر اسے بھی اسی زمرہ میں شامل کر سکتے ہیں۔ سیاہ مرچ کی برآمد میں عارضی تخفیف کے لیے تھوڑی گنجائش رکھنی ہوگی لیکن ہم اس تخفیف کو نئی تجارت کے ایک مختصر سے حصہ سے زاید تصور نہیں کر سکتے۔ ان تجارتی سرگرمیوں سے ہندوستان کو براہِ راست پہنچنے والا فائدہ صرف مخصوص علاقوں تک محدود رہا جو اب زیادہ مقدار میں سامان فروخت کرنے کے لائق ہو گئے اور یہاں کے رہنے والوں کے بعض طبقوں کے لیے نفع بخش روزگار بھی فراہم ہو گیا۔ ان علاقوں کی آمدنیوں کو ہم بغیر کسی مبالغہ کے اچھا خاصہ کہہ سکتے ہیں لیکن اگر ہم اسے ملک کی پوری آبادی پر تقسیم کر دیں تو اس سے کوئی خاص فرق ظاہر نہ ہوگا۔

ہندوستانیوں کے بیش قیمت دھاتوں کے مطالبہ پر اصرار نے یورپی تاجروں کو مجبور کیا کہ وہ ایشیا میں جہازی باربرداری کے کاروبار میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں۔ ایسا ممکن تو ہو سکتا ہے لیکن مجھے یہ زیادہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ اس سمت میں ان کی سرگرمیاں ہندوستان کی ایشیا کے دیگر حصوں کے ساتھ ہونے والی برآمدی تجارت میں ایک متناسب اضافہ پر منتج ہوئیں۔ مگر اس کا ضرور یقین ہے کہ اس کے نتیجہ میں جہازی باربرداری کے کاروبار میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان تبدیلیوں سے خاص طور پر پرتگیزی مالکان جہاز متاثر ہوئے اور انھوں نے پچھلی صدی کے دوران کاروبار پر قبضہ کر لیا تھا اس کا بیشتر حصہ ان کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ لیکن ہندوستانی مالکان جہاز کو بھی اس سے نقصان پہنچا جو مختلف علاقوں میں مختلف پیمانہ پر لیکن گجرات میں سب سے زیادہ محسوس ہوا۔ دوسری طرف ہندوستان کے برآمدی تاجروں کو بھی باربرداری کے ایک بہتر نظم سے جس کے حصول باہمی مقابلہ

کی وجہ سے زیادہ نہ تھے فائدہ اُٹھانے کا موقع ملا۔

پس یورپ کے لوگوں کی سرگرمیوں کے فوری اثرات مقامی اور جزوی ثابت ہوئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سرگرمیاں، نیل اور کپاس کے کاشتکاروں، بُنکروں، ریشم اور شورہ تیار کرنے والوں اور زمینی بار برداری کے کاروبار کے لیے معاشی اعتبار سے کافی مفید ہیں، لیکن برآمدی تاجروں، ایسے طبقے جو فی الجملہ سیاہ مرچ کے کاشتکاروں سے بہت زیادہ اہم تھے، مالکان جہاز اور جہاز سازوں پر ان سرگرمیوں کے بُرے اثرات مرتب ہوئے ہوں گے۔ پس اس طور پر فائدہ کی میزان ہندوستان کے لیے خاصی موافق رہی مگر میرے خیال میں فائدہ کی مقدار اس قدر زیادہ نہ تھی جس سے ملک کی مجموعی آمدنی میں کوئی متناسب زیادہ اضافہ ظاہر ہوا ہو۔ علاوہ اس کے ایک نئے تجارتی نظام کے وجود میں آجانے کا بھی فائدہ تھا جس کے نتیجہ میں ہندوستانی پیدا کرنے والوں کا مغربی ممالک کی منڈیوں سے قریبی رابطہ قائم ہوا۔ زیر مطالعہ عہد کے نصف آخر میں یہ ایک یقینی امر تھا کہ ہندوستان کا جملہ سامان فروختنی لندن، پیرس اور ایمسٹرڈم کی منڈیوں میں کھپ سکتا تھا اور فروخت کرنے والے، کمپنیوں کے باہمی مقابلہ کے باعث معقول قیمتوں طرف سے بھی مطمئن رہا کرتے تھے۔ پس بیرونی تعلقات کے قیام سے فوری طور پر خاصہ فائدہ برآمد ہوا اور مستقبل میں اس سے بھی زیادہ فائدہ کی توقع کی جا سکتی تھی۔

دوسرے سمت کارفرما اندرونی قوتیں بیحد ضرر رساں ثابت ہو رہی تھیں۔ پیدا کرنے والوں پر مختلف ملکی حکومتوں کے مطالبات اس قدر بڑھے ہوئے تھے کہ بلا کسی مبالغہ کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملکی آمدنی کی تقسیم کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والا عامل، یہاں کے نظم و نسق کے طریقے تھے۔ عمومی طور پر ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اس کے نتیجہ میں پیدا کرنے والوں کے لیے اگر کچھ بچتا بھی تھا تو وہ ان کے گذر بسر سے بمشکل بہت ہی تھوڑا زیادہ ہوتا تھا اور مزید یہ کہ یہ بچت غیر پیداوارانہ طریقوں پر صرف ہونے والی قوتوں اور حکمتوں کے صلے کے طور پر خرچ ہو رہی تھی۔ ہندوستان کے جنوب میں ملکی انتظام، زیر مطالعہ عہد کی پوری مدت کے دوران یکساں طور سے مذکورہ نہج پر چل رہا تھا اور یہاں نسبتاً بہت کم تبدیلیاں ظہور میں آئیں۔ پیدا کرنے والوں پر دباؤ اضافہ پذیر

تھا کیونکہ وہاں مقامی حکام کے لیے ایسے شدید محرکات موجود تھے جو انھیں آمدنی کی نت نئی صورتیں ایجاد کرنے کے علاوہ مروجہ ذرائع سے بھی اپنی آمدنی کو انتہائی نقطۂ عروج پر پہنچانے کے لیے مجبور کرتے لیکن خود یہ نظام تبدیل نہ ہوا اور زیرِ مطالعہ عہد کے آغاز ہی پر تشدد اس حد پر پہنچا ہوا تھا کہ بار میں کسی مزید اضافہ کے نتیجہ میں فاقہ کشی یا بغاوت کے علاوہ اور کوئی صورت نہ تھی۔ اس کے برعکس یہ سمت شمال کے نظام میں ایک واضح تبدیلی رونما ہوئی۔ اکبر کا مالی نظام جو موجودہ معیار سے تو سخت لیکن عمل کے اعتبار سے لازمتہً غیر منصفانہ یا تباہ کن نہ تھا اس کے جانشینوں کے عہد میں ڈھیلا پڑ گیا اور پیدا کرنے کے عمل پر براہِ راست مطالبات زیادہ بڑھا دیے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ نظم و نسق میں جو انحطاط رونما ہوا اس نے حالات کو دھیرے دھیرے جنوبی ہند کے حالات کے قریب پہنچا دیا۔ براہِ راست ہمعصر شہادتیں مظہر ہیں کہ ان تبدیلیوں نے قوتوں کو پیدا کرنے والے مشاغل سے ہٹا کر غیر پیداوارانہ کاموں پر لگایا۔ اس عمل کے اثرات لازمتہً اضافہ پذیر تھے اور میرے خیال میں یہی اس نصف صدی کی نمایاں معاشی صورتِ حال ہے۔ تقریباً پورے ہندوستان میں ان دنوں پیدا کرنے کے عمل کے معاوضہ کو لوگوں کے اندر سے اس کام کے شوق کو مفقود کر دینے کی حد تک کم کر کے ان کی دماغی اور جسمانی قوتوں کو دوسروں کی پیدا کی ہوئی اشیاء کو غصب کرنے کی جدوجہد کی طرف متوجہ کر دینے کا رجحان پایا جاتا تھا جس نے بالآخر پیش آنے والے دیوالہ کے لیے راہ ہموار کی۔

یہ ہیں وہ نتائج جو میں نے شہادتوں کی جانچ پڑتال کے بعد اخذ کیے۔ پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ آیا یہ روداد درحقیقت مکمل ہے یا ان کے علاوہ اور بھی ایسے واقعات پیش آئے جو تحریروں میں قلمبند نہ ہو سکے۔ جہاں تک پیدا کرنے کے عمل اور باربرداری کے مسائل کا تعلق ہے ہم اس سوال کا تقریباً پورے یقین کے ساتھ جواب دے سکتے ہیں۔ ولندیزیوں اور انگریزوں کی تجارتی سرگرمیوں کے متعلق تحریریں اس موضوع پر پوری طرح حاوی ہیں۔ ان کے باصلاحیت افراد نے اندرون ملک تجارت کے لائق ہر چیز کی اور باربرداری کے ہر امکانی وسیلہ کی محض رسمی طور پر نہیں بلکہ ہر امکانی نفع بخش طریقہ کی کھوج پر پوری محنت صرف کرتے ہوئے جانچ پڑتال کی تھی اور اس کا کوئی امکان

نہیں پایا جاتا کہ انھوں نے حقیقی معنوں میں معاشی اعتبار سے اہم کسی بھی پہلو کو نظر انداز کر دیا ہوگا۔ غیر ملکی تاجروں کے درآمد کیے ہوئے سامانوں پر بھی ہم اسی نتیجہ کا بلا تامل اطلاق کر سکتے ہیں۔ پیش قیمت دھاتوں کے استعمال میں تخفیف کی ضرورت انھیں درآمدی تجارت کو ہر ممکن طریقہ سے ترقی دینے پر مجبور کرتی تھی اور اس کے جو تھوڑے بہت نتائج ہمارے علم میں آئے ہیں انھیں ہم بلا تردد اس موضوع کی ایک مکمل تصویر تصور کر سکتے ہیں ہندوستانیوں کے ہندوستانی سامانوں کے صرف میں ایسی تبدیلیوں کے واقع ہونے کا امکانی باقی رہ جاتا ہے جو تحریروں میں نہ آئی ہوں۔ باوجودیکہ ولندیزی اور انگریز ساحلی تجارت کی بیشتر مدوں سے واقف تھے مگر وہ ابھی تک اندرون ملک کی زمینی تجارت میں شریک نہ ہوئے تھے اور ایسی تبدیلیوں کا پیش آنا جوان کے مراسلات میں درج نہ ہوئی ہوں قابل قیاس ہے لیکن بہر حال اس قسم کی کچھ اہم تبدیلیوں کے متعلق اندازہ لگانا دشوار ہے۔ مجھے ان ایام کے تذکروں یا 'جرنلوں' میں ان کے کوئی سجھاؤ نہیں ملتے معیار زندگی میں کسی نمایاں تبدیلی کے آثار بھی مجھے نہ مل سکے اور بہر حال آبادی کے خرچ کرنے کی قوت اس قدر معمولی تھی کہ قیاس یہی ہے کہ اس قسم کی کوئی تبدیلی پیش نہ آئی۔ ہم یہ تو نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ بعض بنکروں شورہ سازوں یا نیل کے کاشتکاروں کو اب زیادہ کھانا اور کپڑوں اور دھاتوں کی خریداری کے لیے زیادہ روپیہ ملنے لگا تھا اسی طور پر ہم یہ بھی تصور کر سکتے ہیں کہ کسانوں کے لیے زندگی اب زیادہ دشوار ہوگئی تھی لیکن اس کے آگے ہمارے لیے قیاس آرائی کی کوئی گنجائش نہیں۔

بہر حال ادنیٰ معیار زندگی اور آبادی کی معمولی قوت خرچ ایسے حقائق ہیں جو براہ راست شہادتوں سے ثابت ہیں اور اس بحث کو اختتام پر پہنچانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم ایسے واقعات کو ظہور میں لانے والے معاشی نظام کی تحلیل کر کے اسے سب سے نچلی شکل میں تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ پس اس مقصد کے تحت ہم ایک ایسے خود کفیل کنبہ کا تصور کرتے ہیں جو تقریباً مساوی آمدنی کے پانچ پیدا کرنے والوں اور ایک نہ پیدا کرنے والے صارف جیسے ہم پولیس کے آدمی یا کسی اور طفیلی کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں مشتمل تھا علم ریاضی کے ایک معمولی حساب سے ظاہر ہے کہ اس کنبہ کے جملہ افراد کو مساوی آمدنی فراہم کرنے کی غرض سے ہر پیدا کرنے والے کو اپنی آمدنی کے $\frac{1}{6}$ حصہ سے اس طفیلی یا پولیس

کے آدمی کے حق میں دستبردار ہونا پڑے گا۔ اب اگر ہم مساوات کے اصول کے بجائے اس
مالی نظام پر جو عہد شاہجہانی میں نافذ تھا حساب کریں تو ہر پیدا کرنے والے کو بجائے
⅙ حصہ کے ½ حصہ سے دستبردار ہونا پڑے گا اور اس صورت میں اس پولیس کے سپاہی
یا طفیلی کی آمدنی ہر منفرد پیدا کرنے والے کی آمدنی کا 5 گنا ہو جائے گی اور اگر دیگر پہلوؤں سے
اس کی زندگی کے حالات قابلِ اطمینان طریقہ پر چل رہے ہوں تو ہر پیدا کرنے والے کے
دل میں اس نہ پیدا کرنے والے کی جگہ پر پہنچنے کا شدید داعیہ پیدا ہوگا۔ اس برداری کے
افراد کے عدد کو تقریباً 40 لاکھ[1] سے ضرب کرنے پر ہمیں زیرِ مطالعہ عہد کے ہندوستان کا ایک
تخمینی ڈھانچہ حاصل ہوتا ہے۔ کسان اور ہر طبقہ کے اہلِ حرفہ تقریباً ایک ہی سطح پر زندگی
گذارتے تھے۔ اور ہنرمندی اور قسمت کے انفرادی تفاوت کے لیے گنجائش رکھتے ہوئے
ہم یہ بجا طور پر تصور کر سکتے ہیں کہ ان کے حالات معمول سے اِدھر یا اُدھر تقریباً مساوی حد
میں منحرف ہوتے رہے ہوں گے لہٰذا ایسا سوچا جا سکتا ہے کہ ان کی بہت بڑی تعداد
ایک ہی جنس سے تعلق رکھتی تھی۔ پیدا کرنے والوں اور طفیلیوں کے درمیانی متناسب کا
صحیح تعین بیشک دشوار ہے لیکن میں نے جو اعداد اختیار کیے ہیں وہ غالباً زیادہ ہیں[2]
زیرِ مطالعہ عہد میں نہ تو شہروں کی اور نہ ہی فوجوں کی تعداد میں زیادہ اضافہ ہوا تھا کیونکہ
اگر کہیں مقامی اضافہ ہوا بھی تو دوسری جگہ کی تنزل نے اسے پورا کر دیا اور اس میں کوئی
کلام نہیں کہ آبادی کا بہت بڑا حصہ کسانوں پر مشتمل تھا حالانکہ اہلِ حرفہ کا تناسب بھی خاصہ
تھا اور عددی صحت کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم یہ بلا تردد کہہ سکتے ہیں کہ پیدا کرنے والوں
کی نسبتاً زیادہ تعداد اپنی مجموعی آمدنی کے نصف حصہ سے معاشی اعتبار سے طفیلیوں کی
نسبتاً کم تعداد کی امداد کرتی تھی طفیلیوں کا یہ طبقہ معاشی اعتبار سے ہم جنس نہ تھا کیونکہ
اس میں بڑے سے بڑے امیر سے لے کر ادنیٰ سے ادنیٰ غلام تک شامل رہا کرتے۔ امر
واقعہ کے اعتبار سے طفیلیوں کی بیشتر تعداد تقریباً پیدا کرنے والوں کی سطح ہی پر اپنی

---

[1] یعنی تقریباً 2 یا ½2 کروڑ کنبے جیسے میں اس وقت کے ہندوستان کی آبادی تصور کرتا ہوں۔
[2] 1911ء کی مردم شماری کے اعداد میں میرے مفروضہ 1:5 کے تناسب کے بالمقابل "طفیلیوں" اور پیدا کرنے والوں کے درمیان 1:9 کا تناسب درج ہے۔

زندگی گذارتی تھی اور ان کی محض ایک قلیل تعداد کسانوں کی پیداواری بچت سے حصول کی جدوجہد میں سرگرم رہا کرتی۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بہت ہی قلیل تعداد کے باہم متقابل افراد کے درمیان ایک بہت کثیر رقم تقسیم کی جاتی تھی اور چونکہ بچت کا انجام اس کے جمع کرنے والے کی موت پر ضبطی کی شکل میں ظاہر ہوا کرتا لہٰذا یہ منافع حاصل ہونے کے بعد بہ عجلت صرف کر دیا جاتا تھا۔ پس امراء کی غیر محتاط عیش و عشرت جس نے بیرونی مشاہدین کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا اور نیز ملک کی بچی ہوئی آمدنی کا غیر پیداوارانہ مشغلوں میں ضائع ہونا ملکی حالت کا ناگزیر نتیجہ تھا۔ ان سے کمتر حیثیت والے طفیلی جو پیدا کرنے والوں کی سطح ہی پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے بعض اہم پہلوؤں سے ان سے کہیں بہتر حالت میں تھے۔ مثلاً اگر موسم ناموافق رہا تو چپراسیوں (ادنیٰ ملازمین ۔ مترجم) کی مزدوری سے خریدے غلّہ کی مقدار محض کم ہو جاتی، لیکن برخلاف اس کے کسان عورتیں اور بچے غلام بنا کر فروخت کر دیے جاتے اور زیر مطالعہ عہد میں جو انتظامی تبدیلیاں پیش آئیں ان کے عمومی اثرات نے اس عدم مساوات میں اس قدر اضافہ کر دیا کہ پیدا کرنے والے کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ وہ قدرتی آفات کے خلاف جدوجہد کے شدائد برداشت کرتا لیکن اس کے حاصل سے بہرہ ور ہونے کی توقع نہ کرتا۔ یہ منافع چند طفیلیوں کی عیش و عشرت اور ان سے بہت زیادہ تعداد کے لوگوں کے با اطمینان زندگی بسر کرنے پر صرف ہوتا تھا۔

آبادی کا وہ حصہ جو پیدا نہ کرتا تھا خاص طور پر شہروں اور چھاؤنیوں میں آباد تھا اور پیدا کرنے کا عمل بیشتر دیہات میں انجام پاتا تھا پس ایک دوسرے نقطہ نگاہ سے ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ زیر مطالعہ عہد کا معاشی نظام شہری آبادی کو لاگت سے کم خرچ پر کھانا فراہم کرتا تھا۔ فصل پر غلہ کی بھرمار سے ہم ہندوستان میں ان دنوں بھی مانوس ہیں۔ فصل کی پیداوار کے ایک غیر متناسب حصہ کو نقد ادائیگیاں کرنے کی ضرورت کے تحت چند ہفتوں کے اندر اندر فروخت کرنا ضروری ہوا کرتا اور مجبور بیچنے والوں کو بمقابلہ ان بازاروں کے جہاں پہنچنے کا انھیں موقع نہ ملتا کم قیمت پر قناعت کرنا ہوتا تھا۔

زیر مطالعہ عہد میں فصل پر غلہ کی یہ بھرمار دورِ حاضر سے بھی زیادہ شدید

رہی ہوگی [۵] کیونکہ اس وقت بیچے جانے والی پیداوار کا تناسب بمقابلہ ان دنوں کے بہت زیادہ اور عدم ادائیگی کی سزا بھی نسبتاً بہت زیادہ سخت ہوا کرتی تھی پس ہر فصل کے موقع پر سکوں کی ضرورت بہت بڑھ جاتی تھی اور جن تاجروں کے پاس اس کا ذخیرہ موجود رہتا وہ اپنے شرائط پر خریداریاں کرتے۔ لیکن انھیں بھی اگلی فصل کے لیے سرمایہ کی فراہمی کی غرض سے اپنے خریدے ہوئے غلہ کو فروخت کرنے کی عجلت رہا کرتی اور چونکہ شہری آبادی کا تناسب کم تھا لہٰذا انھیں غلے اور دیگر پیداواری اشیاء آزاد منڈی کی قیمتوں کے مقابلہ میں ارزاں ملا کرتی تھیں۔ ہندوستانی شہروں میں غلہ کی ارزانی نے شروع شروع میں غیر ملکی سیاحوں کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کیا اور وہ معمولاً زمین کی زرخیزی کو اس کا سبب تصور کر لینے پر قناعت کرتے لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ گاؤوں میں کمائے ہوئے منافع کے ایک بڑے تناسب کی شہروں کو منتقلی میں اس وقت کے مالی نظام کے طریقِ عمل کو کم از کم مساوی اہمیت حاصل تھی۔

یہ تھا وہ معاشی نظام جو زیرِ مطالعہ عہد کے اختتام پر جاں بہ لب ہو رہا تھا۔ بنکر خود تو ننگے رہتے مگر دوسروں کو کپڑا پہنانے کے لیے مشقت کرتے۔ اسی طور پر کسان خود بھوکے رہتے مگر قصبوں اور شہروں کو کھانا کھلانے کے لیے محنت کرتے۔ ہندوستان فی الجملہ سونے اور چاندی کے عوض اپنی کارآمد اشیاء کو علیحدہ کر دیا کرتا یا بالفاظِ دیگر پتھر کے بدلہ میں روٹی دیا کرتا تھا۔ فصل بہ فصل بھوک کی سرحد کے قریب رہنے والے مرد اور عورتیں جب تک غلہ کی فراہمی کا سلسلہ قایم رہتا مطمئن رہا کرتے لیکن جب یہ سلسلہ منقطع ہو جاتا جیسا کہ اکثر پیش آتا تو یہ خود کو ہلاکت سے محفوظ رکھنے کی غرض سے اپنے کو غلاموں کے تاجر کے سپرد کر دیتے اور اس کی متبادل صورتیں مردم خوری،

---

[۵] متن میں کہی ہوئی بات درست ہے، مالگذاری خواہ نقد میں ادا ہو خواہ غلہ میں۔ خزانہ چاندی طلب کرتا تھا اور بعض صوبوں میں غلہ کی آمدنی کو مقامی ضروریات پورا کرنے کی غرض سے دے دیا جاتا تاہم اس کے ایک معتدبہ حصہ کو چاندی بھیجنے کی غرض سے فروخت بھی کرنا پڑتا تھا اور قیمتیں متعین کرتے وقت تاجر اس بات کو ذہن میں رکھتے تھے۔ اس عہد کے ضابطوں کے تحت نقد ادائیگیوں کا عام اصول تھا لیکن غالباً استثنائی صورتیں بھی ہوا کرتی تھیں۔

خودکشی اور فاقہ کشی ہوا کرتی۔ اس نظام کی سختیوں سے بچنے کی واحد صورت پیداوار میں اضافہ اور معیارِ زندگی کا بلند کرنا تھا مگر یہ راہیں مروجہ ملکی نظام کے طریقوں کی وجہ سے جو پیدا کرنے کے عمل کو تاوان کا متوجب ٹھہراتا اور جیسے صرف ہیں ہر اضافہ نئی جبری وصولیوں کی دعوت دیتا، مسدود تھیں۔ زیر بحث عہد کی بنیادی خصوصیت ان طریقوں کی توسیع اور ان میں مزید شدت کا پیدا کرنا تھا۔ آنے والی صدی کا قصہ اوّلاً اس نظام کی آخری شکست و ریخت اور بعیدہ، اس تدریجی تبدیلی کا جو آگے چل کر ایک نئے معاشی نظام کو جنم دینے والی تھی، کا قصہ ہے۔

ضمیمہ الف

یورپی تجارتی کمپنیوں کے بنیادی ضابطے اور ان کا نظم ونسق ایسے موضوعات ہیں جن کے لیے کسی ایسی تصنیف میں جس کا موضوع ہندوستان کی معاشی تاریخ ہو کوئی گنجائش نہیں لیکن زیرِ مطالعہ عہد کی تجارت کے اہم ترین ماخذ کو بخوبی سمجھنے کے لیے ان موضوعات کی تھوڑی بہت واقفیت ضروری ہوگی۔ یہ ماخذ ان کمپنیوں کی تحریروں پر مشتمل ہیں اور ان میں ایسی تفصیلات ملتی ہیں جن کی واقفیت دورِ حاضر کے علم مطالعہ کرنے والوں سے توقع نہیں کی جاسکتی پس ان کی تھوڑی بہت وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے اور اسِ ضرورت میں اس امر کے پیشِ نظر کہ تین صدیوں کی مدت کے دوران متعدد اصطلاحوں کے مفہوم تبدیل ہو گئے ہیں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔ خود "کمپنی" ہی کا لفظ ایک غلط تصور پیش کرتا ہے۔ "شیئر ہولڈرس[x]" کے لفظ کا بھی استعمال بعض اعتبار سے گمراہ کن ہے اور یہی صورت الفاظ "کیپٹل" اور "مقسوم" کی ہے۔

محدود ذمہ داری کی جوائنٹ[0] اسٹاک کمپنی کا ارتقا ایک طویل عمل رہا ہے اور ایسی کمپنیاں ۱۶۰۰ء میں جب کہ اس سال کی آخری تاریخ کو "جزائر شرق الہند کی تجارت کی کھوج لگانے کی غرض سے بعض مہم بازوں" کو متحد کیا گیا تھا، انگلستان میں نسبتاً بہت کم پائی جاتی تھیں۔ اس وقت کوئی کمپنی ایکٹ، ان کے کوئی مقررہ دستور العمل یا حساب کتاب کا کوئی مسلمہ ضابطہ موجود نہ تھا اور ہر چند کہ یہ کوئی بالکل انوکھی چیز نہ تھی لیکن ہم بلا تردد اسے جدید اصطلاحی معنوں میں بھی ایک مہم کہہ سکتے ہیں۔ واقعہ اس طور پر پیش آیا

---

x SHARE HOLDERS

0 JOINT STOCK COMPANY

کر چند تاجر ایک ایسی تجارت میں جس کا انھیں پہلے سے کوئی تجربہ نہ تھا اپنا تھوڑا سا سرمایہ خطرہ یا جوکھم کے کام میں لگانے پر آپس میں متفق ہوئے۔ انھوں نے درخواست دیکر بادشاہ سے سند شاہی جسے ان دنوں 'چارٹر' کہتے ہیں حاصل کیا۔ اس کے ذریعہ انھیں ایک کمپنی کی شکل میں متحد کر کے ایک قانونی حیثیت دی گئی اور کمپنی کے لیے ایک دستور العمل مرتب کر دیا گیا۔ انھیں چند حقوق عطا کیے گئے خصوصاً چند بدسوں کے لیے تجارت کی اجارہ داری۔ اس چارٹر کے ذریعہ اولین مہم جو افراد کمپنی کے ابتدائی ممبر قرار پائے لیکن یہ انفرادیت قایم نہ رہ سکی۔ چارٹر کی تحریر کے مطابق، کمپنی ایک فیلوشپ* اور اس کے ممبر برادرس یا 'فری مین'× کہے جاتے تھے۔ کمپنی میں داخلہ یا فریڈم ان معروف طریقوں سے حاصل کی جا سکتی تھی مثلاً وراثت یا ملازمت یا ایک رقم جسے 'فائن' کہتے تھے ادا کر کے کسی 'فری مین' پر سرمایہ کو اس جوکھم کام میں لگانے کی لازمتہ پابندی نہ تھی۔ پس کمپنی ایسے ممبروں پر مشتمل تھی جنھیں حقوق تو حاصل رہتے لیکن ان کے لیے اس کی مہموں میں شرکت ضروری نہ ہوتی[1]۔ جن ممبروں کا جن ایام میں سرمایہ لگا رہتا ان ایام میں وہ 'مہم جو' کے نام سے موسوم رہتے۔ کمپنی کے پاس خود اپنا کوئی مستقل سرمایہ نہ تھا اور جس سرمایہ سے تجارت کی جاتی وہ اس کے ممبروں کی ایک 'بدلتی ہوئی جماعت' کی ملکیت ہوتی۔ چونکہ ابتداً مہمیں مختصر مدت کے لیے اور صرف کسی مخصوص مقصد کے تحت روانہ ہوتیں لہٰذا یہاں لفظ 'بدلتی ہوئی' کا استعمال مناسب ہے۔ ابتدائی مہم ایک مفرد سمندری سفر پر محدود تھی۔ جمع کیا ہوا کل سرمایہ جہازوں اور مال پر خرچ کر دیا گیا اور جہازوں کی واپسی پر انھیں فروخت کر کے یہ مہم ختم کر دی گئی۔ اس طور پر کل بارہ سمندری سفر کیے گئے۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ

---

[1] کوئی بھی مہم لازمتہ موجودہ ممبروں یا 'فری مین' تک محدود نہ رہتی پس کورٹ نے 1607ء میں فیصلہ کیا کہ اگر پرانے شرکائے مہم نے چوتھے سمندری سفر کے لیے پورا سرمایہ فراہم نہ کیا تو بادشاہ کی کسی رعیت کو بھی اس میں شرکت کی اجازت دے دی جائے گی COURT MINUTES MAY 12, 1607 غالباً اس زمرہ کے شرکائے سرمایہ کو آگے چل کر 'فری مین' کا درجہ دے دیا جاتا ہوگا۔

* FELLOWSHIP

× FREEMEN

سرمائے جمع کیے گئے تھے جو اختتام سفر پر اگر کچھ منافع ہوتا تو معہ اس کے واپس کر دیا جاتا۔

علیحدہ علیحدہ سمندری سفروں کا یہ طریقہ خاص طور پر ایشیائی منڈیوں کے حالات کی وجہ سے انتہائی زحمت طلب ثابت ہوا۔ ان حالات کا جو باب ۵ میں گذر چکے ہیں تقاضہ تھا کہ درآمدات کو وقت اور موقع کے لحاظ سے فروخت کرتے اور جہازوں کی آمد کے قبل قبل برآمدات کو یکجا جمع کر لینے کی غرض سے موقع پر آڑھتیے مقرر کیے جائیں لہٰذا 1613 میں ایک مشترکہ سرمایہ اکٹھا کیا گیا جو 1616 تک کے جملہ کاروبار پر صرف ہوا اور 1616 سے 1640 تک کی مدت میں دو مزید مشترکہ سرمائے فراہم کیے گئے۔ انگریزوں کو تجارت سے جو ابتداً دلچسپی تھی وہ 1640 تک ختم ہو گئی۔ ولندیزیوں کی جانب سے مقابلہ شدید اور کامیاب رہا۔ شاہ چارلس اوّل نے ابتدائی کمپنی کے مقابلہ میں "کوٹینس ایسوسیشن" کی مہم کی ہمت افزائی کی۔ انگلستان کے سیاسی حالات اس وقت سرمایہ کے طویل المیعاد قیاسی نوعیت کے کاروباروں میں پھنسے رہنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ اس کے بعد ایک نئے مشترک سرمایہ* کے لیے چندہ جمع کرنے کی کوشش ناکامیاب رہی۔ 1642 میں مجبور ہو کر مفرد (جو اب 'عام' کہے جاتے ہیں) سمندری سفروں کے پرانے طریقوں کو پھر اختیار کیا گیا۔ اسی سال بعد میں چوتھا مشترکہ سرمایہ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن جمع شدہ سرمایہ بالکل ناکافی ثابت ہوا۔ 1646 میں دوسرا عام سمندری سفر اختیار کیا گیا اور 1650 میں بعض ان تاجروں کو شامل کر کے جنھوں نے ابھی تک کمپنی میں شرکت نہ کی تھی "متحدہ سرمایہ بالاشتراک" (یونائیٹڈ جوائنٹ اسٹاک) وجود میں آیا۔ یہ بھی چند برسوں میں صرف ہو گیا۔ 1655 میں پھر یہ سرمایہ اکٹھا کرنے کی کوشش ناکامیاب رہی اور تھوڑے عرصہ تک تجارت تقریباً کھلی ہوئی رہی یعنی اسے منفرد اشخاص چلاتے رہے۔ لیکن 1657 میں نیا چارٹر منظور ہو جانے پر سرمایہ کی دوبارہ وصولی شروع کی گئی اور تقریباً ساڑھے سات لاکھ اسٹرلنگ کی رقم سے "نیا جنرل اسٹاک" قایم کیا گیا جس میں سے بالآخر نصف استعمال میں آیا۔ یہ مہم سابقہ مہموں کے برخلاف ایک معین مدت کے لیے شروع کی گئی اور چونکہ اس کے حصوں کے لیے لندن میں ایک مستقل منڈی وجود میں

---

* JOINT STOCK -

آگئی تھی لہٰذا اسے مستقل کر دیا گیا۔ اب مہم کے شرکا اپنے حصّوں کی واپسی کے بجائے انھیں فروخت کرنے لگے۔ اس طور پر کمپنی کے سرمایہ کی حصہ داری وجود میں آگئی۔

کمپنی کا دستور العمل کچھ اس نوعیت کا تھا کہ یہ حساب لگانا کہ زیرِ مطالعہ عہد میں ادا کیے ہوئے "مقسوم" کی صحیح رقم کیا تھی ممکن نہیں۔ دریائے ٹیمس میں ایک یا اس سے زاید جہاز پہنچ جانے پر مہم کے شرکا کے درمیان تقسیم (جسے ڈیویڈن کہتے تھے) عمل میں آتی بعض اوقات نقد اور بعض اوقات سیاہ مرچ، نیل کیلیکو، یا جو سامان بھی موجود ہوتا تقسیم ہوتا۔ اس کے بعد غیر معین دفعوں پر دیگر تقسیمیں عمل میں آتی رہیں اور بعض صورتوں میں ہمیں یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ سرمایہ کے کاروبار میں واقعتہً لگے رہنے کی صحیح مدت کیا تھی۔ بہرحال اس کا یقین ہے کہ گویا کہ پہلے دس یا بارہ سال کی تجارت بہت زیادہ تو نہیں لیکن معقول حد تک نفع بخش رہی [1] لیکن پہلے مشترک سرمایہ [x] کا نفع بے حد گھٹ گیا، دوسرے اور تیسرے میں نفع بہت ہی قلیل اور چوتھے میں سرمایہ کے نصف کا خسارہ ہوا کمپنی کی تحریروں میں تفصیلات اس طرح بیان کی گئی ہیں۔

پہلے اور دوسرے سمندری سفروں کو بالآخر یکجا کیا گیا اور ان سے ابتدائی سرمایہ سے 95 فیصدی زاید بطور "ایڈوانس [*]" حاصل ہوئے جسے سرمایہ کی مدت استعمال پر پھیلانا تھا۔ منافع کی شرح سالانہ صرف مجموعی مدت پر ہی نہیں بلکہ اس امر پر کہ سرمایہ کا منافع پہلے ہی محسوب کر لیا جاتا ہے یا بہ اعتبار تناسب ہر تقسیم پر اور اس کے علاوہ دیگر باتوں پر بھی منحصر ہوا کرتا۔ تیسرے اور پانچویں سمندری سفر بھی یکجا کر دیے گئے تھے اور ان سے 234 فیصدی حاصل ہوا لیکن چوتھا سفر تقریباً پورا خسارہ میں رہا کیونکہ جہازوں کو ردّی قرار دے دیا گیا تھا اور ہمیں اس واقعہ کو منافعوں کا اوسط نکالتے وقت پیشِ نظر

---

[1] میکفرسن MACHERSON نے اپنی تصنیف HISTORY OF EUROPEAN COMMERCE WITH INDIA (P.92) میں سمندری سفروں کے علیحدہ علیحدہ سالانہ حاصل کا حساب 40 فیصدی سے مدسے کم پر لگایا ہے جسے وہ "تجارت کے خطرات کے پیشِ نظر مشکل ہی سے کافی نفع" قرار دیتا ہے۔

x JOINT STOCK

* ADVANCE

رکھنا چاہیے۔ اگلے سات سمندری سفروں (چھٹے سے بارہویں تک) سے جو "ایڈوانس" حاصل ہوا وہ 120 سے 220 فیصدی تک تھا اور یہ امر کہ ان معاوضوں کو قابلِ اطمینان تصور کیا جاتا تھا، پہلے جوائنٹ اسٹاک[x] کے لیے جمع شدہ کثیر رقم (16 لاکھ پونڈ) سے واضح ہوتا ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر منافع کا اضافہ ولندیزیوں کے ساتھ کشمکش کے باعث کم ہونے لگا۔ اس جوائنٹ اسٹاک نے، تقریباً چار سال کی مدت میں $87\frac{1}{2}$ فیصدی کا "ایڈوانس" فراہم کیا لیکن دوسرے سے صرف $12\frac{1}{2}$ فیصدی اور تیسرے سے 35 فیصدی حاصل ہو سکا۔ لہٰذا ان دو آخر الذکر کو یکجا کر کے موجودہ اصول کے تحت حساب کرنے پر 'مقسوم'، صرف تقریباً 2 فیصدی آتا ہے۔ اس اثرات اس وقت نمایاں ہوئے جب نئی مہموں کے لیے سرمایہ اکٹھا کرنے میں دقت پیش آئی۔ چوتھے مشترکہ سرمایہ کی ناکامیابی پر دقتیں بڑھیں اور اس اسٹاک کا بالآخر نصف حصہ ضائع ہو گیا اور درآنحالیکہ 'یونائیٹڈ جوائنٹ[+] اسٹاک' کی کارگذاری قدرے بہتر (مجموعی نفع 45 فیصدی) تھی لیکن یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی حقیقتاً تجارتی اعتبار سے کامیاب نہ تھی۔

ولندیزی کمپنی بعض اعتبار سے لفظ 'کمپنی' کے موجودہ مفہوم سے زیادہ قریب تھی کیونکہ یہ ابتدا ہی سے پانچ لاکھ پچاس ہزار پونڈ کی رقم کی جسے ہم بجا طور پر اس کا مستقل سرمایہ کہہ سکتے ہیں، مالک تھی لہٰذا ہم اس کی ان رقموں کا جسے وہ اپنے شریک داروں کو ادا کرتی تھی دورِ حاضر کے 'مقسوم' سے موازنہ کر سکتے ہیں، حالانکہ ہمیں منافع کی ٹھیک ٹھیک شرحوں کا تعین کرتے وقت اس امر کی گنجائش رکھنا ہو گی کہ یہ ادائیگیاں بعض اوقات نقد میں، بعض اوقات تمسکات[+] میں اور بعض اوقات مسالوں میں کی جاتی تھیں[1]۔ لیکن اس کمپنی کا نظام بھی عجیب و غریب تھا۔ حصہ داروں کا اس کی جماعت منتظمہ پر جو مختلف الاجزاء تھی ابھی قابو نہ تھا۔

---

[1] ابتدائی چارٹر کی شرائط کی رو سے، شریک دار ہر سال حساب فہمی کے بعد اپنا سرمایہ واپس لے سکتے تھے لیکن حصوں کے معمولاً نفع پر فروخت ہو جانے کے باعث اس قاعدہ کی عملی اہمیت ختم ہو گئی تھی۔

x JOINT STOCK

+ BOND

مختلف اداروں نے جن کے اتحاد سے کمپنی وجود میں آئی تھی اپنی اپنی انفرادیت کو اس طور پر برقرار رکھا کہ متعدد واضح "چیمبرس" بنائے گئے جن میں کا ایک ہر بڑے بندرگاہ پر قایم کیا گیا۔ ہر چیمبر کے متعدد ڈائرکٹر (BEWINDHEBBER) ہوتے جو ابتدًا نامزد کیے جاتے۔ بعد میں جو جگہیں خالی ہوتیں انھیں موجودہ ڈائرکٹروں کی نامزدگی پر صوبجاتی حکومت پُر کرتی۔ مرکزی انتظام سترہ (افراد بمترجم) کے ایک "کالج" کے سپرد تھا جو ایک معینہ تناسب میں چیمبرس کی نمائندگی کرتا۔ اس کے ممبروں کو اکثر "دی سیونٹین" کہتے تھے یہی کالج کمپنی کی پالیسی مرتب کرتا جسے یہ چیمبرس اپنے اپنے بندرگاہوں کے حدود میں نافذ کرتے۔ لہٰذا "کالج" سالانہ جہازی بیڑوں کی تعداد اور ساز و سامان اور اس میں ہر "چیمبر" کا حصہ متعین کرتا، چیمبر اپنے اپنے حصہ کے جہازوں کو باہر بھیجتے اور ان کے لائے ہوئے سامانوں کو منڈیوں میں فروخت کرتے۔ پس کمپنی کا کاروبار ایک اجارہ دارانہ گروہ کے ہاتھ میں تھا جو اپنے وجود کے تسلسل کو خالی جگہوں کے لیے خود نامزدگیاں کرکے قایم رکھتا۔ کمپنی کے چارٹر کی رو سے کالج کے سنگین مناقشوں کا فیصلہ مرکزی حکومت (دی اسٹیٹس جنرل) کے سپرد کیا گیا تھا لیکن کمپنی کا مورخ یہ لکھنے میں حق بجانب ہوگا کہ ڈائرکٹر عملاً مطلق العنان اور کسی طور پر بھی خود کو حصہ داروں کا جواب دہ نہ تصور کرتے تھے اور ان کی حکومت کو بھی جوابدہی برائے نام ہی تھی۔ کمپنی کے حسابات شائع نہ کیے جاتے۔ انگریزی کمپنی کے جنرل کورٹ* کے طور پر ممبروں یا حصہ داروں کے جلسے نہ ہوا کرتے اور کہا جاتا ہے کہ "کالج" کی کاروائیوں کی کوئی روئیداد نہ رکھی جاتی تھی لہٰذا کمپنی کی پالیسی اور غرض و غایت کے متعلق ہماری معلومات نامکمل ہیں۔ بعد کے برسوں میں اس کے مالی طریقے بھی مشتبہ ہوگئے تھے اور بظاہر تھوڑے مقسوم سرمایہ سے ادا کیے گئے لیکن اس پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ زیر مطالعہ عہد میں تقسیم کی ہوئی رقمیں واقعتہً کمائی ہوئی تھیں۔

ولندیزی کمپنی کے ابتدائی منافع زیادہ تھے۔ مختلف مصنفین کے قلمبند کیے ہوئے اعداد باہم متناقص ہیں لیکن 1605 سے 1609 کا سالانہ اوسط مقسوم قطعاً 25 فیصدی

CHAMBERS x

*GENERAL COURT *

بلکہ غالباً اس سے بہت زیادہ تھا۔

1610 سے 1619 تک کمپنی نے اپنے وسائل بیشتر مسالوں کے جزائر میں اجارہ داری کے حصول کی جدوجہد پر صرف کیے اور ان برسوں میں مقسوم کی تقسیم 21 اور ایک دوسری روایت کے مطابق 28 فیصدی تھی۔ 1620 سے 1669 تک کی پانچ دہائیوں کے "مقسوم" کے سالانہ اوسط 12½، 20¾، 29، 18 اور 14¾ فیصدی آئے۔ ان میں سے بیشتر برسوں میں ادائیگیاں کی گئیں لیکن رقم ادا شدہ میں تفاوت زیادہ تھا اور اگر ہم یہ یاد رکھیں کہ اس مدت کے ایک جزو کے دوران لندن کی منڈی میں قرضوں کی شرح 7 سے 9 فیصدی تک تھی[1] تو ہم ولندیزیوں کے حاصل کو قابلِ اطمینان تصور کرنے میں حق بجانب ہوں گے لیکن انھیں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کمپنی کی وہ اہم خصوصیت جس کا ہمیں لحاظ رکھنا چاہیے اس کی قومی حیثیت تھی[2]۔ یہ حکومت کے ایما پر جملہ موجود مہموں کو متحد کر کے وجود میں لائی گئی تھی۔ ہر اہم بندرگاہ کے مفاد کو اس کی انتظامی جماعت میں نمائندگی حاصل تھی۔ اسے ولندیزی حکومت کے نام پر غیر ملکوں کے ساتھ معاہدے کرنے کے اختیارات تفویض کیے گئے تھے اور 1609 میں جب اس کا پہلا گورنر جنرل مقرر ہوا تو اسے ایک

---

[1] 1609 میں انگریزی کمپنی 9 فیصدی یا اس سے کم پر قرض کی تلاش میں تھی اور 1616 میں اسے 10 فیصدی پر قرضہ کی پیشکش کی گئی لیکن اس نے 9 فیصدی پر قرض لیا COURT MINUTES (FEB 13, 1609, JAN. 24, 1614) دس برسوں بعد کمپنی 7 اور 8 فیصدی ادا کر رہی تھی، (تصنیف مذکورہ 25 اگست 1634) اور 1635 میں شرح 6½ سے 7 فیصدی تک تھی (تصنیف مذکورہ یکم فروری 1635)۔

[2] لندن اور ہالینڈ میں وقتاً فوقتاً جو گفت و شنید ہوئی، ان کی تحریروں میں ولندیزی کمپنی کی طاقت کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً 1627 میں جب انگریزی کمپنی اپنے منصوبہ کو ترک کر دینے پر غور کر رہی تھی تو ایک "مخلوط کورٹ" نے اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ ولندیزیوں نے جو نقصان پہنچایا ہے اس کے ازالہ کی بہت ہی کم امید ہے کیونکہ "نشیبستان (ہالینڈ۔ مترجم) کی حکومت کے ڈائرکٹروں سے اس قدر ساز باز ہے کہ مقدمہ کی صورت میں وہی فریق ہوں گے اور وہی فیصلہ کرنے والے

سرکاری عہدیدار کے قریب قریب کا درجہ دیا گیا اور وہ ایشیائی پالیسی کے معاملات میں عملاً آزاد رکھا گیا۔ انگریزی اور ولندیزی حکومتوں کے درمیان طویل گفت وشنید ان دونوں کمپنیوں کی حیثیتوں کے درمیان ایک بہت بڑے فرق کو ظاہر کرتی ہے۔ سرکاری کاغذات کے مطالعے کے بعد میرا یہ تاثر ہے کہ جیمس اول مشرقی تجارت کے مفاد کے تحفظ کو اہم مگر ناگزیر نہ تصور کرتا تھا۔ برخلاف اس کے اسٹیٹس جنرل، اور ولندیزی کمپنی متحدہ طور پر کمپنی کے مقاصد کی تکمیل کی غرض سے ہر چیز کو بازی پر لگا دینے کے لیے تیار رہا کرتی تھی۔ یہ درست ہے کہ صوبوں نے امبوائنیا کے معاملہ میں کمپنی کے حکام کے عمل کی مذمت کی تھی لیکن اس سلسلہ میں انگریزوں کے مطالبات پورا کرنے کے بجائے وہ اپنی حکمت عملی سے حاصل شدہ چیز کو برقرار رکھنے ہی کے لیے کوشاں تھے اور تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ ان کی یہ کوشش کامیاب رہی۔ انگریزی کمپنی کو اسٹوارٹ خاندان کے دو بادشاہوں سے واجبی وعدوں کے علاوہ اور کچھ نہ مل سکا لیکن ولندیزی کمپنی کو اپنے ہر عمل کے سلسلہ میں اپنی حکومت کی پشت پناہی کا یقین رہا کرتا۔ حکومت نے انھیں وسیع اختیارات دے رکھے تھے لیکن ساتھ ہی یہ حکومت کے اندر ایک ایسی طاقت کے مالک ہو گئے تھے کہ حکومت ان سے قطع تعلق کی جرأت نہ کر سکتی تھی۔

ولندیزی کمپنی کی قومی حیثیت کو اس کی تجارتی کامیابی میں بڑا دخل حاصل تھا۔ لیکن اسے اپنے انگریزی حریف پر جو نمایاں برتری حاصل تھی اس کا تنہا یہی سبب نہ ہو سکتا تھا۔ قومی حمایت کے علاوہ ہم ان کی برتری کو ان فائدوں سے بھی منسوب کر سکتے ہیں جو تقدم مالی استحکام، معقول نظم ونسق اور غالباً ان کے کارکنوں کی بہتر صلاحیت کی وجہ سے انھیں حاصل تھے۔ ان کے تقدم کا واقعہ واضح ہے۔ جب انگریزوں کا پہلا جہاز جاوا پہنچا تو اس وقت ولندیزی وہاں کی منڈیوں کا چھ سال کا تجربہ رکھتے تھے اور ہر امید افزا بندرگاہ میں جہاں انگریز بحیثیت اجنبی کے جاتے وہ وہاں پہلے ہی سے بحیثیت خریدار مصروف تھے۔ ان کے مالی استحکام کا خاص سبب ان کا کثیر مستقل سرمایہ تھا جس کی صورت انگلستان میں سمندری سفر کے بعد دوسرے سمندری سفر کے لیے جانے والے سرمایہ کے بالکل خلاف تھی۔ اس لیے انھوں نے مسالوں کے جزائر کے لیے اپنی جدوجہد کو ایک واضح برتری کے ساتھ شروع کیا۔ علاوہ اس کے انھوں نے اس نکتہ کو جواب ایک واضح شکل میں ہمارے

سامنے ہے، اسی وقت سمجھ لیا تھا کہ مشرق میں ایک طاقتور مرکزی نظم و نسق کا قیام امر لازم تھا۔
۱۶۱۹ء اور اس کے بعد کے پرخطر دور میں ان کے جملہ وسائل کی نگرانی جاوا میں ان کے گورنر
جنرل کی ذات سے وابستہ رہی ورنہ لحالیکہ انگریز آڑ مقیبے اور حکام جن کے درمیان اکثر
اختلافات رہا کرتے اپنی رہنمائی کے لیے لندن سے احکام کے منتظر رہا کرتے۔ ان امور کے
علاوہ جین پیٹرسن ذون کوین، کے ایسی ایک واقعۂ عظیم، قوی العزم اور سخت مزاج
شخصیت اوّلاً جاوا کی تجارتی کوٹھیوں کے مہتمم اور بعدہ، وہاں کے گورنر جنرل کی حیثیت
سے اُبھری جس کے متعلق بلا مبالغہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے مشرقی سمندروں پر بالکل
اسی طرح غلبہ حاصل کر لیا جیسا کہ ایک صدی قبل البوقرق ان سمندروں پر حاوی ہوا تھا
اور مسالوں کے جزیروں اور مشرق البعید میں اجارہ داری کے حصول میں ولندیزیوں کو جو
ابتدائی کامیابیاں حاصل ہوئیں وہ ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا۔

زیر مطالعہ عہد کی مابقی مدت میں ان کی تجارتی کامیابیوں کا بیشتر مدار اسی اجارہ
داری پر تھا لیکن ان کے نظم و نسق کی مسلسل بہتری کا بھی اس میں دخل تھا تحریروں سے
ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی بٹاویا میں کونسل انتہائی صلاحیت کی مالک تھی۔ اس کے ماتحتوں
کا سلسلہ حد درجہ منظم تھا۔ تائیوان، امبوئینا، پوئی کٹ یا سورت ایسے مراکز کے سربراہ اپنے اپنے
حدود کے اندر واقع تجارتی کوٹھیوں کے لیے کونسل کو براہِ راست جوابدہ رہا کرتے۔ بٹاویا
کے اونچے افسران کے جانب سے ان کوٹھیوں کے وقتاً فوقتاً معائنے نظم کے قیام اور
بدعنوانیوں کے انسداد کے علاوہ ایک نفع بخش تجارت کے فروغ اور توسیع میں معاون
ثابت ہوتے تھے۔ ان ایام میں انگریزی تجارتی کوٹھیوں کو جو نسبتاً بہت تھوڑے علاقہ
پر پھیلی ہوئی تھیں سورت اور بنتم کی دو مساوی الحیثیت کونسلوں کے زیر نگرانی تقسیم کیا
گیا تھا۔ ان کونسلوں کے درمیان اکثر اختلافات رہا کرتے جن کے متعلق لندن سے
فیصلے موصول ہوتے ہوتے کمپنی شدید نقصان سے دوچار ہو چکی ہوتی تھی۔ میرے خیال
میں ان کونسلوں کی نگرانی ڈھیلی تھی اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایک طرف ولندیزی اپنے
کاموں کو ایک مشاق اور منظم جماعت کے طور پر انجام دیا کرتے تو دوسری طرف انگریزوں

JAN PIETERSZOON COEN ×

کی کارگذاری بیشتر ان کی انفرادی کوششوں کا نتیجہ ہوا کرتا تین صدیاں گذر جانے کے بعد دونوں کمپنیوں کے عملہ کا باہمی موازنہ ایک مشکل کام ہوگا لیکن ان دونوں کمپنیوں کی تحریروں کے مطالعہ سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ولندیزی اوسطاً بہتر تھے حالانکہ یہ فیصلہ قطعاً نہیں کیا جا سکتا کہ اگر انگریزوں کو بھی ایسا ہی معقول دستور العمل فراہم کیا گیا ہوتا تو وہ اتنے اچھے کارکن ثابت ہوتے

انگریزی کمپنی کے دستور العمل کی سب سے بڑی خرابی نجی تجارت کے معاملہ میں نمایاں ہوتی ہے۔ یہ موضوع تحریروں میں اس کثرت سے آتا ہے کہ دورِ حاضر کے قارئین کی واقفیت کے خیال سے اس کی تھوڑی سی وضاحت ضروری محسوس ہوتی ہے۔ آڑھتیے کمپنی کے ملازم ہوا کرتے اور کمپنی کو ان کی کارگذاری اور تجربہ کے ثمرات کی ملکیت کا حق پہنچتا تھا لیکن برخلاف اس کے جب یہ لوگ اپنے وقت اور دماغ کو خود اپنے ذاتی نفع کے حصول پر صرف کرتے جیسا کہ عام طور پر پیش آتا تو کمپنی کو کم و بیش شدید خسارہ برداشت کرنا ہوتا۔ ہم ان کی نجی تجارت کو کمپنی کے نقطۂ نگاہ سے ان تین زمروں میں تقسیم کرسکتے ہیں، درآمدات برآمدات اور مقامی تجارت۔ واپس ہونے والے تجارتی گماشتوں یا کمپنی کے جہازوں کی یورپی درآمدات سب سے کم قابل اعتراض عمل تھا اور انھیں انفرادی طور پر چند مستثنیات کو چھوڑ کر سامان کی ایک معینہ مقدار وطن لانے کی اجازت رہا کرتی لیکن وہ ان حدود کے پابند نہ رہتے بلکہ کمپنی کے جہازوں پر لاد کر ٹنوں سامان لاتے اور بعض اوقات تو کمپنی کی منڈیوں میں بھی دخیل ہوا کرتے[1] کمپنی اس نوعیت کی حکم عدولیوں کے معاملہ میں غیر معمولی نرمی برتتی۔ وہ ان حکم عدولی کرنے والوں میں سے ہر ایک کے ساتھ گفت و شنید کرتی، کبھی کبھی معقول داموں پر ایسے سامانوں کو خود خرید لیتی، بعض وقت محض جہاز کے محصول کی وصولی پر قناعت کرتی اور اکثر جرمانے بھی عائد کرتی۔ ان جرمانوں کی مقدار شخص متعلقہ کے خدمات سابقہ کی اچھائی یا برائی پر منحصر رہتی اور کوئی بھی شخص جس کی نظروں سے اس دور کے کورٹ مینٹس گذرے ہیں ان طریقوں کے تقریباً عام ہونے پر شبہ نہیں کرسکتا۔ نجی درآمدات کی نوعیت قیاسی کاروبار کی ہوا کرتی جن کے نفع

---

[1] مثلاً کپتان ویڈل وطن ۷۰ ٹن سامان لایا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس مقدار میں سامان لانے میں پورے سال کے لیے جہاز پر جو جگہ موجود تھی اس کا کافی حصہ استعمال ہوا ہوگا۔

میں کمپنی بھی شریک رہی لیکن اگر گماشتہ کی کارگذاری اچھی رہی ہوتی تو اس کا بیشتر حصہ اسی کو ملتا۔

نجی برآمدت سے بیشک کمپنی کی بیرونی منڈیاں متاثر ہوتی تھیں لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی ممانعت کا خاص سبب یہ ہوا کرتا کہ یہ سرمایہ کے حصول کا ذریعہ بنتیں جو مقامی تجارت میں لگایا جاسکتا تھا۔ پُرانے گماشتوں کے اکثر "ان مہموں" میں جس میں وہ ملازمتیں کر چکے ہوتے سرمایہ لگانے کی اجازت دی جاتی۔ یہ طریقہ واضح طور پر سُود مند ثابت ہوتا۔ لیکن ان دِنوں نجی طور پر کی جانے والی ایک کامیاب قیاسی تجارت سے اس قدر زیادہ منافع حاصل ہوسکتا تھا کہ کوئی بھی شخص جس نے تھوڑے ہی سرمایہ کے ساتھ باہر کا سفر کیا ہو ان دنوں مشرقی تجارت سے اچھی خاصی دولت کما کر وطن واپس ہوسکتا تھا۔ اس سلسلہ میں بعض خرید وفروخت کے کام پر حالانکہ یہ بعض اوقات اس پیمانہ پر کیا جاتا جو مقامی منڈیوں کو متاثر کرتا، سب سے کم اعتراض کیا جاتا۔ بعض گماشتے کمپنی کے سرمایہ کو اپنے نجی کاروبار کے استعمال میں لاتے۔ اسی مقصد کے تحت بعض گماشتے دکھانے کے لیے کمپنی کے کھاتہ میں قرض لیتے۔ کمپنی کے جہازوں کے راستے تاجروں کے ذاتی سامان ڈھونے کی غرض سے تبدیل کر دیے جاتے۔ معاملات اس طور پر کیے جاتے کہ نفع ان افراد کو اور نقصان کمپنی کو پہنچتا اور مقامی تاجروں کے ساتھ خفیہ شرکت داریاں قایم کی جاتیں۔ اس طور پر مقامی تاجران معلومات سے فائدہ اُٹھاتے جو کمپنی کا حق ہوا کرتا۔ یہ جملہ حالات انتہائی ضرر رساں تھے اور ایک معقول انتظامیہ کا فرض تھا کہ وہ اس کا قلع قمع کرے۔ مگر 1634 میں ایک تاجر نے بنتم میں پریسیڈنٹ کے عہدہ پر مقرر ہونے کے بعد جب اس مقصد کے لیے اختیارات چاہے تو اُس کی یہ خواہش رد کر دی گئی اور اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنے اختیارات کو "بہت زیادہ تشدد اور سختی کے ساتھ" استعمال نہ کرے۔ امر واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی جو مشاہرے اور خرچ کے لیے رقمیں دیا کرتی اس کی مقدار باصلاحیت تاجروں کے لیے کشش نہ رکھتی تھی۔ کمپنی کے ڈائرکٹر بخوبی سمجھتے تھے کہ نجی تجارت سے حاصل

لہ جیسا کہ کتاب ہٰذا کے متن میں بتایا گیا ہے، پارہ نجی برآمد کے لیے ایک مقبول شے تھی ــــ 1630 میں اس دھات کی لندن میں قیمت سمندری سفر پر جانے والے جہاز رانوں اور دیگر اشخاص کی خریداریوں کے باعث بڑھ گئی تھی۔

ہونے والا منافع حقیقتاً ان کے اور ملازمین کے درمیان معاہدہ کا ایک جزو ہے اور وہ نجی تجارت کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے اسے ایک حد کے اندر رکھنے کی کوشش کرتے جس میں انھیں ذرا بھی کامیابی نہ ہوتی۔

ولندیزیوں کے نسبتاً زیادہ محکم نظم ونسق میں اس نوعیت کی مصالحت کی کوئی گنجائش نہ تھی اور جہاں تک مطبوعہ تحریروں سے پتہ چلتا ہے، نجی تجارت سے انھیں کم از کم زیرِ مطالعہ عہد کے اختتام تک نسبتاً بہت کم نقصان پہنچا۔ رینل نے اٹھارہویں صدی میں لکھتے ہوئے ولندیزی تاجروں کی کفایت شعاری اور دیانتداری پر بیحد زور دیا ہے اور اس نے دعویٰ کیا ہے کہ 1650 کے قبل زر کثیر جمع کرنے کی ایک مثال بھی سامنے نہیں آتی۔ لیکن اس کے بیان کے مطابق اس کے بعد عیش و عشرت اور بداطواری بہت تیزی سے بڑھی۔ ہمعصر تحریروں سے اس مسئلہ کے سلسلہ میں ایک مسلسل کشمکش کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے حالانکہ 1603 میں نجی تجارت کو کلیتہً ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ 1610 ہی میں نجی مال کو پکڑ کر ضبط کر لینے کی اطلاع ہے۔ یہ ایک ایسا سخت قدم تھا جو میرا خیال ہے کہ اس دور میں مشرق کے انگریزی حکام نے کبھی نہ اٹھایا تھا۔ اس کے بیس برس بعد ایمسٹرڈم سے بھیجے گئے احکام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ برائی عام ہو رہی تھی اور ہم سنتے ہیں کہ ولندیزی آڑھتیے انگریزوں کو درمیان میں ڈال کر نجی کاروبار کر رہے ہیں۔ یٹور نیر 1640 کے بعد نجی تجارت میں بیحد اضافہ کی اطلاع دیتا ہے لیکن اس کا ولندیزیوں سے جھگڑا تھا لہٰذا اس کی اطلاع میں مبالغہ آرائی کا امکان ہو سکتا ہے۔ وہ ساتھ ہی بعض مواقع پر سخت سزائیں دیے جانے کی بھی تصدیق کرتا ہے۔ 1653 میں بٹاویا سے مجریہ ایک حکم سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا رواج ان دنوں ترقی پر تھا کیونکہ مخبروں کو ضبط شدہ مال میں حصہ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس کے تین برس بعد ہمیں دو اونچے افسران کے خلاف بڑے پیمانہ پر نجی تجارت کرنے کے الزام میں عدالتی کارروائی کیے جانے کی اطلاع ملتی ہے اور 1664 اور اس کے بعد کے بٹاویا جرنل سے ظاہر ہوتا ہے کہ کمپنی کے صدر مقام پر اس مسئلہ کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے۔ ان واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ ولندیزی دھیرے دھیرے

× RAYNAL

اس لعنت میں مبتلا ہوتے جارہے تھے اور 1676 کے ایک حکم سے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے جس میں ایمسٹرڈم سے ڈائرکٹروں نے اس طریقہ کو بتکرار منع کیا ہے" جو کمپنی کے جسم کے لیے طاعون اور سڑنے کے مرض کا درجہ رکھتا ہے اور باوجود جملہ احکام اور تنبیہوں کے جاری کیے جانے کے ہر جگہ ترقی پر ہے"۔ غالباً اس حکم کی بناء پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت تک ولندیزی تاجروں میں نجی تجارت قطعی طور پر رائج ہوچکی تھی۔ لیکن ہمارے لیے رینال کے بیان اور نیز مذکورہ بالا دیگر شہادتوں کو جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ولندیزی کمپنی کو اپنے مشرقی قیام کی ابتدائی مدّت میں اپنے ملازمین کی بہترین خدمات حاصل کرنے کے معاملہ میں انگریزی کمپنی پر فوقیت حاصل رہی، قابلِ قبول ہونا چاہیے۔

ہمیں مذکورہ "نجی تجارت" کو یورپ کے ان باشندوں کی تجارت سے جو دونوں کمپنیوں میں سے کسی ایک کے بھی ملازم نہ تھے اور جو "نجی تاجر (پرائیواٹ ٹریڈرس) کہے جاتے تھے، مختلف تصور کرنا چاہیے۔ زیرِ مطالعہ عہد میں ان کی سرگرمیاں چنداں اہم نہ تھیں۔ یہ لوگ آزاد ولندیزی باشندے تھے جو بٹاویا اور ایشیا کے دیگر مقامات پر سکونت پذیر تھے۔ لیکن وہ کمپنیاں جن کی بستیوں میں ان کی سکونت رہتی ان کی تجارت پر کڑی نگرانی رکھتی تھیں اور غالباً ان سے کمپنی کے تاجروں کے کام میں رکاوٹ کے بجائے مدد ملا کرتی تھی۔ انگریزی کمپنی کی زیرِ مطالعہ عہد کے اختتامی چند برسوں تک منفرد انگریزوں سے بالکل نزاع نہ رہی۔ برسوں (تقریباً 1655) کی آزاد تجارت کا ایک یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ مشرقی ساحل پر ایسے افراد آباد ہوگئے جن پر کمپنی کی کوئی بلاواسطہ پابندی نہ تھی اور 1658 اور اس کے بعد سے انھیں تجارتی مراسلات میں ایک نمایاں مقام حاصل ہونا شروع ہوگیا۔

ضمیمہ الف کے ماخذ

جوائنٹ اسٹاک کمپنی کی ابتدائی تاریخ کا SCOTT میں مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ انگریزی کمپنی کے نام پہلی شاہی سند PURCHAS 1-iii-139 میں درج ہے۔ اس کے بعد کی تاریخ کو خاص طور سے COURT MINUTES میں تلاش کرنا چاہیے۔ علیحدہ سمندری سفر کی خرابیاں، علاوہ دیگر مصنفین کے 304 JOURDAIN میں

درج ہیں۔ بالآخر مشترکہ سرمایہ کا قایم ہو جانا ENGLISH FACTORIES. 113 میں
درج ہے۔ اس سلسلہ کی ابتدائی جلدوں کے دیباچہ میں کمپنی کی حیثیت کے متعلق اہم
امور درج ہیں، اور مالی نتائج پر نومبر 1654 کے COURT MINUTES میں تبصرہ
کیا گیا ہے۔ ولندیزی کمپنی کے قانون اساسی کو میں نے VENDER CHIJS سے داخل
کیا ہے جس نے باب 12 میں چارٹر کی مکمل نقل درج کی ہے۔ اس کے طریقے کار پر
61ff. Van Loon میں بحث آئی ہے۔ اذکر رد مقسوم RENNEVILLE
کے دیباچہ میں درج ہے اور ابتدائی برسوں کے بعض اختلافات MACPHERSON'S
EDMUNDSON, P-124 میں اور ANNALS OF COMMERCE, iv-488
میں ایک کثیر رقم کی ادائیگی دکھائی گئی ہے جو ان میں سے کسی بھی جدول میں درج نہیں
ہے۔ گورنر جنرل کے اختیارات کی صراحت DE JONGE, iii-136 میں ملتی
ہے۔ انگریزوں اور ولندیزیوں کی طویل گفت و شنید کو CALENDER S.P. میں
دیکھا جا سکتا ہے۔

انگریزوں میں نجی تجارت کا رواج ENGLISH اور COURT MINUTES
میں درج ہے۔ طامس کی بعض تحریروں سے ظاہر ہے کہ کمپنی کے قیام FACTORY
کے چند برسوں کے اندر اندر اس طریقہ نے رواج پکڑ لیا تھا۔ وہ معاملہ جس کے
سلسلہ میں کمپنی نے واضح طور پر زیادہ گرمجوشی کو منع کیا ہے۔ 3 جنوری 1634 کے
COURT MINUTES میں درج ہے ——— ولندیزیوں کی نجی تجارت کے
متعلق رینیال کی رائے ج ا ص 199 پر ملتی ہے۔ ابتدائی ممانعت DE JONGE, iii-206
میں ہے۔ ضبطی کی ابتدائی مثال TERPSTRA'S KOROMANDEL,144 میں 1632
کا حکم HAGUE'S TRANSCRIPTS, ii-95,97 میں انگریزوں کی مدد ENGLISH
FACTORIES-iv- 166 & PASSIM میں ٹیورنیر کا تصنیف کردہ تذکرہ
ff 43-50, 327, ii, 311, i میں، بعد کا حکم جس کا حوالہ آیا ہے 31 دسمبر
1653 اور 6 نومبر 1653 کے DAGH REGISTER میں اور DE JONGE
vi-163, میں درج ہے۔ ایسے نجی تاجروں کے لیے جو کمپنی کی ملازمت میں نہ تھے،
ملاحظہ ہو ENGLISH FACTORIES x 149. اور اس کے بعد کے اندراجات۔

ضمیمہ ب

ولندیزیوں کی ابتدائی یورپی برآمدات

ولندیزیوں کی ساحل کورومنڈل پر تجارتی سرگرمیوں کی مطبوعہ اطلاعات میں، ڈاکٹر ٹرپسٹرا کے تذکرہ کے 1610 پر ختم ہونے کے بعد سے جو خلاء پیدا ہوتا ہے وہ بٹاویا جرنل کے سلسلہ کے 1624 میں شروع ہونے تک قایم رہتا ہے۔ اس مدت میں ان کی یورپی برآمدات کا تھوڑا سا اندازہ ہالینڈ میں محفوظ بعض بیجکوں کے مندرجہ ذیل اقتباسات سے جن کی عکسی نقلیں ہیگ کے پبلک رکارڈ آفس نے مجھے فراہم کی ہیں، لگایا جا سکتا ہے۔ ان میں مالیت بمقدار 'گلڈرس'+ ($\frac{5}{6}$ روپیہ) درج ہیں۔ میں نے کسر کے اندراجات حذف کر دیے ہیں اور انگریزی پاؤنڈ اور گزوں میں تحویل کرتے وقت مقدار کو پورے پورے اعداد میں ظاہر کیا ہے۔

بلیک بیر (سوارٹے بیر) کا بیجک۔ مسولی پٹم سے ہالینڈ کو اغلباً 16 - 1615 میں۔ (KOL, ARCHIEF, PORTEF_O)

بیجک کے صفحہ اول پر تاریخ درج نہیں ہے۔ لیکن اندر ہر صفحہ کے سرے پر "اینو# 1616 : مسولی پٹن" درج ہے۔ میں ان سرخیوں کو ایمسٹرڈم کا اضافہ اور اس سن کو جہاز کے پہنچنے کا سال تصور کرتا ہوں۔ انگریزی تحریروں سے ہمیں یہ اطلاع ملتی ہے کہ ایک دوسرے 'وہائٹ بیر' نامی جہاز کی 1616ء میں ہالینڈ کے لیے روانگی متوقع تھی (LETTERS RECEIVED IV. 34) اور ممکن ہے کہ 'بلیک بیر' 1615 کے اواخر میں روانہ ہوا ہو۔ انگریزی تحریریں 1615 میں براہ راست ہالینڈ جانے والے کسی جہاز کی نشاندہی نہیں کرتیں۔

+ GUILDERS

ANNO

مالیت بمقدار گلڈرس	مقدار	گانٹھیں	مال
23,992	2800 من = تقریباً 73,000 ایل۔بی	450	نیل
12,689	$968\frac{3}{4}$ من = 〃 25,000 - 〃 〃	155	سوتی تاگہ کتا ہوا
7,778	1322 تھان = 66,000 گز	66	گنی کلاتھ
716	135 تھان (لمبائی ندارد)	1	بنگال ٹیفے سلز نمونے
45,175	میزان		
4,554	مال کی بندھائی، ڈھلائی اور برآمدی محصولات		
49,729	جہاز کے سامان کی مالیت		

نیل اور کتے ہوئے تاگے کی گانٹھوں کا وزن $6\frac{1}{4}$ من درج ہے۔ من کا وزن دیا ہوا نہیں ہے۔ مسولی پٹم کے معمول کے من کے تقریباً 26 ایل۔بی کے مساوی ہونے کے حساب سے گانٹھوں کا وزن $162\frac{1}{2}$ ایل۔بی ہوگا جبکہ اس کے بعد کے بیجکوں میں گانٹھوں کو 150 ایل۔بی ولندیزی یا 361 ایل۔بی ایورڈ پوائیز کا بتایا گیا ہے۔ ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ اس سے عام مقامی من کا مفہوم رہا ہوگا اور پونڈ میں دیے ہوئے اعدادای حساب پر نکالے گئے ہوں گے۔

گنی کلاتھ کے تھانوں کو 10.0 کوویڈوس یا 700 'ایلس'* دکھایا گیا ہے۔ ایمسٹرڈم کا 'ایل' تقریباً 68 میٹر کے مساوی تھا۔ پس یہاں 'کوبیڈو' سے مراد سورت کا نسبتاً بڑا 'کوڈ' نہیں بلکہ استا یعنی 18 انچوں کا اصلی ہاتھ مراد ہے۔ 'ٹیفے سلز' سے مراد غالباً وہی چیز ہے جسے انگریزی تحریروں میں 'ٹیپلز'‡ کہا گیا ہے۔ اس نام کا ریشمی اور سوتی دونوں طرح کے مال پر اطلاق ہوا کرتا تھا اور اس نمونہ کی گانٹھ کی صحیح نوعیت مشتبہ ہے۔

---

* ELLS

‡ TAPSEEDS.

لہ ان ناپوں کے لیے ملاحظہ ہو ضمیمہ 7

'بلیک بیر' (وارٹے بیر) مسولی پٹم سے ہالینڈ کو 1619 (KOL. ARCHIEF, POR-TEF P) انگریزی تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ 'بلیک بیر' جولائی 1618 میں ہالینڈ کے لیے مال لادنے کی غرض سے مسولی پٹم پہنچا تھا۔ قیاس ہے کہ یہ جہاز برسات کے بعد روانہ ہو کر اگلے موسم بہار میں ایمسٹرڈم پہنچا تھا۔ 1619 خود بیجک پر نہیں بلکہ اس کے سرورق پر درج ہے جسے میں ایمسٹرڈم کا اضافہ تصور کرتا ہوں۔

مال	مقدار	قیمت بمقدار گلڈرس
نیل	693 گانٹھیں = تقریباً 113,000 - ایل.بی۔ اوائڈر ویوائیز	46,833
موم	13,528 ولندیزی ایل.بی = ,, 14,750 ,, ,,	3,340
دار چینی	48 گانٹھیں = ,, 7,800 ,, ,,	900
سہاگہ	8 ,, = ,, 4,200 ,, ,,	1,329
سوتی تاگہ کتا ہوا	30 ,, = ,, 4,900	1,548
گنی کلاتھ	10,406 تھان = ,, 2,46,000 گز	46,583
بنگال کلاتھ	180 ,, = ,, ندارد	6,474
جنگھم	294 ,, = ,, ,,	1,750
دیگر کپڑے	170 ,, = ,, ,,	355
قالین	50 ,, = ,, ,,	784
متفرق سامان		596
		110,492
	بھرتی کا سامان، بندھائی، ڈھلائی اور محاصل	11,192
	جہازی سامان کی صحیح مالیت	121,684

بیجک میں دی ہوئی میزان 122,84 'ایف' ہے لیکن اس پر 400 ایف کی غلطیوں کا قیاساً ایمسٹرڈم میں اضافہ کیا گیا ہے۔ اس جہاز کے لیے سامان، بمقابلہ پہلے جہاز کے زیادہ پھیلے ہوتے

+ ایف (F) گلڈرس کی علامت ہے۔ (مترجم)

علاقہ سے حاصل کیا گیا تھا۔ لیکن اس میں نیل، گنی کلاتھ، اور نمونے، یا متفرق سامان بہر حال شامل تھے۔ ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ دار چینی لنکا سے اور موم سہاگہ بنگال سے حاصل کیا گیا تھا۔

اس بار گنی کلاتھ کے تھان معینہ ناپ کے نہ تھے لیکن ہر گانٹھ کے مشمولات کو 'استوں' میں دکھایا گیا ہے جس سے میں نے گزوں کا حساب نکالا ہے۔ ان کی قیمتیں بہ اعتبار تھانوں کے نہیں بلکہ بہ اعتبار 7.0 'استوں' کے لگائی گئی ہیں اور بیشتر تھان کی لمبائی اس سے کم تھی۔

دیگر کپڑوں کی لمبائیاں درج نہیں ہیں لیکن بظاہر 'بنگالس' بہت اعلیٰ قسم کے تھے اور ان کی قیمتیں بیجک میں 3.6 ایف فی تھان اور 'جنگھم' کی 5 ایف سے 17 ایف تک درج ہیں۔

بیجک 'میڈن بلک جہاز' مسولی پٹم سے، مئی 162 ہالینڈ کے لیے۔ KOL. ARCHIEF. PORTEF P) انگریزی تحریروں میں ذکر آیا ہے کہ 'میڈن بلک' مئی 1621 میں تقریباً لادا جا چکا تھا۔ (ENGLISH FACTORIES I-254) روانگی کی تاریخ خود بیجک پر درج ہے۔

مال	مقدار	قیمت بہ اعتبار گلڈرس
نیل	452 گانٹھیں = تقریباً 73,900 ایل بی ایوارڈ پوائیز	31,473
ہیرے	- -	27,094
'گنی کلاتھ'	12,348 تھان = 308,750 گز	57,666
'بنگالی جنگھم'	80 تھان (لمبائی ندارد)	384
		116,617
	بھرتی کا مال، سامان کی بندھائی، لدائی اور محاصل	11,877
	جہاز پر سامان کی مالیت	128,494

یہ سامان مسلم طور پر بہ استثنائے جنگھم کے 80 تھانوں کے مقامی طور پر حاصل کیا گیا تھا۔ 'گنی کلاتھ' کی قیمت اسی نہج پر لگائی گئی تھی جیسا کہ نمبر 2 میں۔

MS. DENBLICK *

بیجک 'نیردین' جہاز مسولی پٹم سے اکتوبر 1621 میں ہالینڈ کے لیے KOL. ARCHIEF PORTEF بیجک پر تاریخ درج ہے ــــــــ جس کی تصدیق ENGLISH FACTORIES 1, 297, 30 کے اندراجات سے ہوتی ہے۔ یہ اندراجات ظاہر کرتے ہیں کہ اس جہازی سامان کی نوعیت بیشتر تجرباتی تھی۔ سیاہ مرچ جو اس کی خاص مد تھی مالابار سے براہ ٹیگنا پٹم زمینی راستہ سے حاصل کی گئی تھی۔

مال	مقدار		مالیت بہ اعتبار گلڈرس
سیاہ مرچ	تقریباً 156,000	ایل۔بی۔ایوارڈو پوائیز	36,457
شورہ	" 47,500	"	2,964
شورہ صاف کیا ہوا	" 8,700	"	1,170
ہیرے	—		1,326
سہاگہ	" 650	"	175
کاتا ہوا تاگہ	" 5,400	"	2,390
'گنی کلاتھ'	" 65,000	گز	11,918
موریز	900 تھان (لمبائی ندارد)		3,154
'بٹیلز'×	100 تھان = 1200 گز		1,200
			60,754
	متفرق اخراجات اور چند معمولی غلطیاں		2,000
	جہازی سامان کی مالیت		62,754

سیاہ مرچ 'کافی گراں' تھی اور اس کی تجارت کو اہمیت حاصل نہ ہوئی، سوتی سامانوں میں 'موریز' (اعلیٰ قسم کے کیلیکو) کو تجربہ کی کھیپ تصور کرتا ہوں لیکن اس کی تفصیلات درج نہیں ہیں۔ 'بٹیلز' (ڈھاکہ کا باریک تن زیب) قیمتی تھے اور ان کی قیمت ایک گلڈر فی گز تھی۔

بیجک 'ڈورڈریشٹ' جہاز مسولی پٹم سے غالباً ستمبر 1642 (KOL. ARCHIEF PORTEF X)

BETILES

اس بیجک میں تاریخ نہیں درج ہے لیکن اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ENGLISH FACTORIES 147 - 12 میں مندرج ممنا رنی سفر سے متعلق ہے۔ اس کے سامان کا بیشتر حصہ مالاباری سیاہ مرچ (200,000 ایل۔بی)، شورہ (180,000 ایل۔بی)، نیل (60,000 ایل۔بی) اور کاتا ہوا سوتی تاگہ (550.00) مع 325,000 ایل۔بی۔ اشین کی سیاہ مرچ کی دوبارہ برآمد پر مشتمل تھا۔ سوتی سامانوں میں تقریباً 325,000 گز گنی کلاتھ، 2,720 تھان (تقریباً 220,000 گز) 'پارسیلز' اور 600 تھان دیگر اقسام کے شامل تھے۔

بیجک 'شون ہووین'+ جہاز مسولی پٹم سے اکتوبر 1624 (KOL ARCH. PORTEF DD)

بیجک کی مندرجہ تاریخ اگست 1624 ہے لیکن اس میں بماہ اکتوبر ایک ضمیمہ کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس جہاز پر سیاہ مرچ نہیں بلکہ معمولی مقدار میں نیل، کاتا ہوا سوتی تاگہ، اور شورہ بھیجا گیا تھا۔ سوتی سامان میں تقریباً 100,000 گز گنی کلاتھ، تقریباً 30,000 گز 'موریز'، تقریباً 3,000 گز 'پارسیلز' اور اسی مقدار میں سالیم پورس (کیلیکو کی ایک معمولی قسم) شامل تھے۔

1624 اور 1625 میں سورت سے ہالینڈ براہ راست جہازوں پر سامان لے جانے کے بیجک موجود ہیں۔ یہ اس شق کی تجارت کے سلسلہ میں ولندیزیوں کی اگر پہلی نہیں تو تقریباً پہلی کوشش تھی۔

1624۔ اس سال کے اوائل میں 'ہیوسڈن' اور 'وریڈ' نامی دو جہاز ہالینڈ کے لیے روانہ ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک کے دو دو بیجک محفوظ ہیں KOL. ARCHIEF. PORTEF اور ان میں سے ہر ایک کی ایک ایک نقل پر تاریخ درج ہے۔ ان کے خاص خاص مال نیل و شورہ اور تھوڑی تھوڑی مقدار میں کاتے ہوئے تاگے، لاکھ، سہاگہ اور دیگر سامان تھے۔ مندرجہ سوتی کپڑوں کے تھان اس طور پر ہیں: گنی کلاتھ (1520) منتاسیز (9240) مختلف قسم کے بافتے (2928)، سیمیانوز‡ (200) اور کاسس (باریک تنزیب) (120)۔ گنی کلاتھ معمولاً لمبے تھانوں میں ہوا کرتا تھا جن میں سے ہر ایک 150 ایلس یا 37 گز کے ہوتے تھے۔ مجھے منتاسیز کا کوئی ذکر نہیں ملتا لیکن ان کے تفصیلی اندراجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے

+ SCHOONHOVEN

‡ SEMIANOES

تھان چھوٹے ہوا کرتے تھے کیونکہ ایک گانٹھ میں (بافتوں کے 120 کے مقابل) ان کے 280 تھان ہوتے تھے اور ان کی قیمت (8 روپیہ فی بیس تھان) سے ان کی قسم کا انتہائی گھٹیا ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ مجھے شبہ ہوتا ہے کہ ان کی خریداری یورپ کے لیے نہیں بلکہ افریقہ کے لیے ہوتی تھی۔ بلفتے ہر رنگ اور ناپ کے ہوا کرتے تھے۔ بعض گانٹھوں پر "نمونہ" اور بعض پر 'ہالینڈ کے لیے' درج ہے۔ یہ سوچنا مناسب ہوگا کہ سُوتی سامانوں کی بیشتر مقدار افریقی کاروبار کے لیے اور متعدد تجرباتی گانٹھیں دوسری منڈیوں میں آزمائے جانے کے لیے تھیں۔

5 - 16 ۔ 'ولیپ'، اور 'ڈورڈریشٹ' نامی دو جہازوں کے بیجک موجود ہیں۔ ان پر تاریخیں درج نہیں ہیں لیکن DAGH REGISTER مورخہ 28 جون 1625 سے واضح ہوتا ہے کہ ساحل گامبرون کی سمندری جنگ میں شرکت کے بعد ان جہازوں نے اس سال کے اپریل میں جو سفر کیا یہ ان سے متعلق ہیں۔ (ENGLISH FACTORIES III, 47, 76) ان دونوں جہازوں پر سب سے زیادہ بیش قیمت مال ملک فارس کا ریشم تھا جو اس سمت میں ولندیزی مہم کا پہلا ثمرہ تھا۔ جہاز کی بیشتر جگہ نیل اور شورہ پر صرف ہوگئی تھی۔ سُوتی سامانوں کی مد میں 'ولیپ' جہاز پر نمونہ کی صرف ایک گانٹھ تھی۔ 'ڈورڈریشٹ' جہاز پر 'منتاسیز' کے 6,000، 'گنی کلاتھ' کے 1000، 'سیمیانوز' کے 200 اور 'کیسز' (جنھیں بنگال کا لکھا گیا ہے) کے 800 تھان تھے۔ اگر منتاسیز کے متعلق میرا قیاس درست ہے تو ہم پچھلے برس کی طرح اس کھیپ کو بھی افریقی منڈیوں کے لیے مخصوص اور نیز یورپ کے لیے تھوڑے نمونہ کے طور پر تصور کر سکتے ہیں۔

DORDRECHT X

ہو جاتی اسے قبول کر لینے پر قناعت کرتا۔ جہانگیر نے 1605 میں اپنی مملکت کے بندوبست کرنے کا حکم صادر کیا لیکن اس کا کوئی نتیجہ تحریروں میں نہیں ملتا اور 1658 کے قبل تک فرد محاصل کی کسی باضابطہ نظرثانی کی بھی کوئی اطلاع نہیں[1]۔ تیسرے میں نے اپنے جدول سے سندھ کے چھوٹے صوبہ کو بھی خارج کر دیا ہے کیونکہ اس کے بعض اعداد میں بشمول اعداد آئین، بہری کے زیادہ غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ آخر میں، صوبجات کابل، قندھار اور کشمیر کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے کیونکہ ان کے اپنے مخصوص طرز کے مالی نظام تھے۔ اس طور پر محض دس صوبے بچتے ہیں جو مملکتِ اکبری کا اہم ترین حصہ تھا جس پر اس کے جانشینوں کی بھی حکومت برقرار رہی۔

محاصل کے مطالبات مختلف اوقات میں (لاکھ درم)

صوبہ	تقریباً 1594		شاہ جہاں				اورنگزیب
	اصل	درستگی کے بعد	جانشینی	تقریباً 1647	بعد کے	بعد کے	قبل 1668
	الف	ب	پ	ت	ٹ	ج	ح
بہار	22,19	22,70	31,27	40,00	39,43	39,69	[72,18]
الہ آباد	20,83	21,00	30,70	40,00	42,43	44,96	43,67
اودھ	20,17	20,34	23,22	30,00	27,95	31,52	32,01
آگرہ	54,62	54,47	82,25	90,00	86,12	1,07,19	1,05,17
مالوہ	24,07	23,51	28,00	40,00	40,83	38,99	42,55
گجرات	43,68	43,27	50,64	53,00	53,65	50,70	44,01
اجمیر	28,84	28,34	42,05	60,00	60,29	65,12	63,69
دہلی	60,16	59,56	65,61	1,00,00	1,22,29	1,19,35	1,16,84
لاہور	55,95	55,91	82,50	90,00	89,30	85,47	90,70
ملتان	15,14	14,95	[40,00]	28,00	21,98	21,62	24,53
میزان جوڑنے پر	3,45,65	3,44,05	4,76,24	5,71,00	5,84,27	6,04,01	[6,35,35]

نوٹ: مربع نما قوسین کے اندر کے اعداد جیسا کہ ذیل میں واضح کیا گیا ہے مشتبہ ہیں لہٰذا ان کے میزان بھی قوسین کے اندر دکھائے گئے ہیں اور متن میں فیصدی کا حساب لگانے کے قبل انھیں درست کیا گیا ہے۔

---

[1] جہانگیر کے احکام تزکِ جہانگیری ج 1 ص 22 پر ملتے ہیں۔ 1658 میں فرد محاصل کی نظرثانی پر اسکولی (ASCOLI) ص 23 میں بحث آئی ہے۔

ضمیمہ 'ج'

مغلوں کے مالی شماریات

سترھویں صدی کے وقائع نگاروں نے بعض اوقات اپنے تذکروں کے اختتام پر مغلیہ صوبوں کی فہرست کے ساتھ ساتھ ان کی تحریر کے وقت ان میں سے ہر ایک پر محاصل کی جو تشخیص شدہ رقمیں ہوتی تھیں انھیں بھی درج کیا ہے۔ اسی نوعیت کے اعداد 'دستور العمل' کے نام سے موسوم بعض ان قلمی تحریروں میں جن کے متعدد نمونے برٹش میوزیم میں موجود ہیں' ملتے ہیں۔ یہ نسخے میوزیم میں "سرکاری ضوابط ناموں (مینویل)" کے عنوان کے تحت درج فہرست ہیں۔ میں نے ان ماخذ سے دس مغلیہ صوبوں کے لیے حسبِ ذیل جدول مرتب کیا ہے جن کے اعداد لاکھ داموں میں جن میں کا ہر لاکھ زیرِ مطالعہ عہد کی مروجہ سرکاری شرح مبادلہ کے اعتبار سے 2500 روپیوں کے مساوی تھا، درج کیے گئے ہیں۔

یہ جدول پوری مملکت سے متعلق نہیں ہے۔ ان میں سے اولاً دکن کے صوبے جہاں مغلیہ حکومت کا تسلط اضافہ پذیر تھا، شامل نہیں ہیں۔ ان صوبوں کے دیے ہوئے نام مختلف ہیں اور ان کے حدود بھی وقتاً فوقتاً بدلتے رہتے۔ لہٰذا ان اعداد کا باہمی موازنہ اسی صورت میں کار آمد ہو سکتا ہے جب یہ تفصیلی طور پر معلوم رہے کہ کسی خاص وقت میں انتظامی طریقے کیا تھے۔ دوسرے بنگال کے اعداد کے بعض سلسلوں کے لیے قابلِ اطمینان نقطۂ آغاز نہ ہونے کے باعث اس جدول سے اس صوبہ کو خارج کر دیا گیا ہے۔ آئینِ اکبری میں مندرج اس صوبہ کے فرد محاصل میں ایسے زیادہ علاقے جو عہدِ عالمگیری تک مملکتِ مغلیہ کے باہر تھے، شامل کر لیے گئے ہیں اور غالباً ان میں مغلوں کی فتح کے قبل کے مطالبات درج کیے گئے ہیں۔ میرا گمان ہے کہ اکبر فی الوقت جس قدر علاقہ بھی اس کے زیرِ حکومت رہتا اور اس سے جس قدر بھی رقم اسے وصول

---

[1] ملاحظہ ہو مثلاً 'بادشاہ نامہ' ج (2) ص 710-14۔

اعداد کا پہلا مجموعہ (کالم الف) آئینِ اکبری ترجمہ ج (2) سے براہ راست ماخوذ ہے۔ میں 1919 کے 'دی یونائٹیڈ پراونسز ہسٹاریکل سوسائٹی کے جرنل' میں بتا چکا ہوں کہ ان اعداد میں چند بڑی غلطیاں پائی جاتی ہیں جنھیں میرے بتائے ہوئے مفصل طریقہ کو اختیار کرکے درست کیا جاسکتا ہے۔ اعداد کو اس طریقہ پر درست کرنے کے بعد انھیں کالم ب میں درج کیا گیا ہے۔ یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ باوجودیکہ یہ غلطیاں منفرد اضلاع یا پرگنوں کے لیے اہم ہیں لیکن ان سے صوبجاتی میزان زیادہ متاثر نہیں ہوتی۔ میں نے کتاب کے متن میں جو فیصدی دکھلائی ہیں وہ کالم ب پر مبنی ہیں۔

کالم پ کے اعداد 'ایلیٹ کی ہسٹری ج (7) ص 138 سے ماخوذ ہیں۔ مجالس السلاطین جن میں یہ اعداد درج ہیں (اپنے مادّہ تاریخ کی رُو سے) 1628 میں مکمل ہوئی تھی۔ یہ عہد جہانگیری تک کی ہندوستان کی تاریخ ہے اور اس کا تاریخی حصہ شاہجہاں کی تخت نشینی پر ختم ہوتا ہے۔ محاصل کے اعداد کے صحیح سال درج نہیں ہیں لیکن بہرحال 1628 کے قبل ہی کے ہوں گے اور عبارت کے سیاق سے واضح ہوتا ہے کہ یہ عہدِ جہانگیری کے اختتام سے متعلق ہیں اور یہ وہ محاصل ہیں جو شاہجہاں کو وراثت میں ملے تھے۔ اس تحریر میں صوبہ ملتان[1] بلکہ اس میں سندھ کے صوبہ کو بشمول ملتان، ٹھٹھ اور بھکر بیان کیا گیا ہے۔ بعض دوسری تحریروں میں سندھ کے اعداد مشتبہ ہیں اور میں یہ نہیں بتا سکتا کہ مندرجہ چالیس لاکھ کی رقم سے کس قدر ملتان سے متعلق ہے۔ لہٰذا میں نے اس کتاب سے اس صوبہ کو حذف کر دیا ہے اور اس کے محاصل کو میزان میں اضافہ کی فیصدی نکالتے وقت خارج کر دیا ہے۔

جیساکہ پہلے گزر چکا ہے، اس کالم میں صرف آگرہ اور لاہور کے اعداد ایسے ہیں جس پر تعجب ہوتا ہے۔ مجھے اس امکان کا شبہ ہے کہ ان دونوں صوبوں یا ان میں سے صرف ایک کے اعداد میں پہلا 8 بجائے 6 کے سہواً لکھ گیا ہے۔ یہ ایک ایسی غلطی ہے جو جدولات کو رقم میں لکھے جانے کی صورت میں بہت آسانی سے سرزد ہوسکتی ہے۔ میں اپنے اس شبہ کی جانچ نہ کرسکا کیونکہ مُلک

(JOURNAL OF THE UNITED PROVINCES HISTORICAL SOCIETY)

[1] یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ملتان اور سندھ کو یکجائی طور پر اس برس کے لیے جن کے متعلق یہ اعداد ہیں، اجارہ پر دیا گیا ہو۔

کے اندر 'مجالس السلاطین' کا واحد قلمی نسخہ جس کا میں پتہ چلا سکا وہ سرہنری ایلیٹ کے لیے تیار کیا ہوا نسخہ ہے جو اب برٹش میوزیم میں موجود ہے (اورنٹیل 1903) اور جیسا کہ توقع کی جا سکتی تھی ایلیٹ کے ترجمہ کے اعداد اس کے استعمال میں لائے ہوئے ماخذ کے مطابق ہیں۔ یہ رقم میں نہیں بلکہ الفاظ میں دیے ہوئے ہیں لیکن یہ ممکن ہے کہ نقل کنندہ کے رُوبرو رقم رہی ہو لیکن اس نے اعداد کو سرہنری ایلیٹ کی سہولت کے پیشِ نظر الفاظ میں لکھا ہو۔ نقل کے اس حصہ میں جو خاتمہ کے قریب ہے تحریر کی کثیر واضح غلطیاں موجود ہیں لہٰذا اعداد کی غلطیوں پر ہمیں تعجب نہ ہونا چاہیے۔ لیکن یہ مسئلہ بہرحال صرف اصل قلمی نسخہ کے دیکھنے ہی سے حل ہو سکتا ہے جس کے حصول کی مجھے کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ نقل میں ایک انوکھی بات یہ ملتی ہے کہ لاہور کے حاصل کو 'حال' کا بتایا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا لفظ ہے جو دوسرے اندراجات میں استعمال نہیں کیا گیا ہے اور ممکن ہے اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہو کہ لاہور کے اعداد بمقابلہ دوسروں کے بعد کی مدت کے ہیں۔ لیکن یہ محض نقل کنندہ کی غلطی بھی ہو سکتی ہے۔

کالم 'ت' کے اعداد 'بادشاہ نامہ' (ج 2 - 710 اور مابعد صفحات) مصنفہ عبدالحمید سے ماخوذ ہیں۔ بیشتر اعداد کے برخلاف، وقایع نگار نے یہاں پورے پورے اعداد درج کیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طور پر کسی مخصوص سال کے صحیح اعداد کے بجائے موجودہ محاصل کا ایک عمومی خاکہ پیش کرنا مقصود ہے۔ یہ سرگزشت 1647 پر ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد مملکت کے جو شماریات بیان کیے گئے ہیں ان کو میں اسی سال کا یا اس سے سال دو سال قبل کا تصور کرتا ہوں۔ اس کا متن قابلِ اعتبار ہے کیونکہ میزان، مختلف مدات سے مطابقت رکھتی ہے اور اس کے مصنف نے اپنے زیرِ بحث مدت کے دوران اضافہ کی وضاحت کرنے میں عرق ریزی سے کام لیا ہے اور وہ گجرات اور دکن کے صوبوں کے محاصل کا اس سے زیادہ نہ ہونے کا سبب 32-1630 کے قحط کو قرار دیتا ہے۔

کالم 'ث' اور 'ج' کے اعداد برٹش میوزیم کے غیر مطبوعہ مخطوطات سے ماخوذ ہیں۔ مؤخر الذکر 'ایڈیشنل 6588' سے اور آخر الذکر 'اورنٹیل 1779' اور 'اورنٹیل 1842' سے۔ میرا خیال ہے کہ آخری کو '1779' سے اخذ کیا گیا ہے اور اس میں تھوڑی ضمنی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ مخطوطے میوزیم کی فہرست میں "سرکاری ضوابط ناموں" کے تحت مندرج ہیں۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس عنوان کے تحت بیشتر مخطوطات بنگال کے انگریز افسروں

کے استعمال کی غرض سے اٹھارھویں صدی میں نقل کیے گئے تھے اور یہ باور کرنے کے کچھ وجوہ پائے جاتے ہیں کہ جہاں تک بنگال کا تعلق ہے ان میں سے بعض جعلی ہوں لیکن مجھے ہندوستان کے دیگر حصوں سے متعلق معلومات کی صحت پر شبہ کرنے کا کوئی سبب نہیں ملتا۔ میں نے جن مخطوطات کو استعمال کیا ہے ان میں عہدِ عالمگیری کے ایک غیر مصرحہ مدت کے محاصل اور اس کے بعد، بخیال موازنہ عہدِ شاہجہانی کے اعداد درج کیے گئے ہیں۔ ان کے بھی سن نہیں دیے گئے ہیں (یا اگر دیے گئے ہیں تو مجھ سے سہو ہوئی ہے) لیکن میرا خیال ہے کہ صورتِ حال ایسی ہے کہ ہم تصور کر سکتے ہیں کہ یہ عہدِ شاہجہانی کے نصف آخر کی مدت کے متعلق ہیں۔ متعدد مجموعوں سے میں نے اعداد کے ان مجموعوں کو اولاً اس لیے کہ ان میں کھلی ہوئی غلطیاں نہیں پائی جاتیں اور ثانیاً اس لیے کہ یہ نسبتاً صاف لکھی ہوئی ہیں، منتخب کیا ہے۔ ان کے اعداد رقم میں لکھے ہوتے ہیں۔

کالم 'ح' کے اعداد ایلیٹ کی ہسٹری ج (7)ص 164 سے ماخوذ ہیں جس سرگذشت میں یہ پائے جاتے ہیں ان کا سلسلہ 10 جلوس عالمگیری کے آگے نہیں بڑھتا اور میں تصور کرتا ہوں کہ یہ اعداد انھیں دس برسوں میں سے کسی ایک کے متعلق ہیں لیکن ان کا صحیح سن زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ اپنے دو سابقہ خانوں کے اعداد سے اس قدر زیادہ مطابق ہونے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ درمیانی مدت خواہ کچھ بھی رہی ہو مگر محاصل میں کوئی زیادہ تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ صوبہ بہار کی صورتِ حال اس بیان سے مستثنیٰ ہے۔ لیکن سابقہ اور بعد کے اعداد کے پیشِ نظر میرا خیال ہے کہ اس کے لیے 72 کروڑ کے اندراج کو مشتبہ تصور کرنا چاہیے۔ یہ رقم واضح طور پر اس سرگذشت کے انڈیا آفس کے مخطوطہ (فارسیہ 122) موسومہ 'مراۃ جہاں نما' میں 72 کروڑ (عدد میں نہیں بلکہ الفاظ میں) درج ہے۔ لیکن محاصل میں اضافہ بہت زیادہ ہے اور عہدِ عالمگیری کے متعلق، اس کے بعد کے جو اعداد میری نظر سے گزرے ہیں وہ عمومی طور پر مزید اضافے تو ضرور ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن ان سے بہار کے محاصل 50 کروڑ سے بہت زیادہ سطح پر نہیں پہنچتے۔ یا تو یہ عدد ہی غلط ہیں یا یہ ایک غیر حقیقی معاہدہ کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جنوب کے پہاڑی علاقے جو بعد کی بعض تحریروں میں علیحدہ طور پر گونڈوانہ کے نام سے موسوم کیے گئے ہیں۔ ان کے محاصل کو عارضی طور پر بہار میں شامل کر لیا گیا ہو۔ اس غیر یقینی صورتِ حال کے پیشِ نظر

میں نے اس عدد کو کتاب کے متن میں مندرجہ فیصدی نکالنے میں خارج کر دیا ہے۔
آئینِ اکبری کے مطبوعہ متن اور نیز اس کے اس قلمی نسخہ میں جس سے میں نے رجوع کیا ہے عام عربی رسم اعداد استعمال کیے گئے ہیں جن کے پڑھنے میں کوئی دقت نہیں محسوس ہوتی۔ بعض ان قلمی نسخوں میں جن سے بعد کے اعداد اخذ کیے گئے ہیں، رقم کے اعداد استعمال میں آئے ہیں جنھیں نقل کرنا کسی طور پر آسان نہیں۔ جن قلمی نسخوں سے میں نے رجوع کیا ہے ان میں کروڑ اور لاکھ معمولاً صاف لکھے ہوئے ملتے ہیں مگر ہزار اور ان سے کم ہندسوں کے اعداد کو اکثر گنجلک ہونے کے باعث پڑھنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ موجودہ مقصد کے لیے ظاہر ہے کہ ایک لاکھ دام سے کم کو حساب میں لانا غیر ضروری ہوگا اور میں نے نسبتاً چھوٹے اعداد کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ لہٰذا مندرجہ بالا میزانوں کے داہنے طرف کے ہندسوں میں غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ لیکن جہاں اربوں اور کروڑوں کا معاملہ ہو وہاں ایک لاکھ کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔
بعض زیرِ بحث قلمی نسخوں میں 'محاصل' کو دو یا تین ناموں کے تحت دکھایا گیا ہے۔ مثلاً 'جمع دامی'، 'حاصل کامل' اور 'حاصل سنوات' (یا حاصل عملی)۔ ظاہر ہے کہ یہ اصطلاحی الفاظ ہیں کیونکہ ہمیں وقتاً فوقتاً 'کیفیت دامی' و حاصلات، یعنی "دامی اور حاصلوں کے گوشوارہ" کا عنوان ملتا ہے۔ 'حاصل' روپیوں میں اور 'دامی' جیساکہ نام سے ظاہر ہے بمقدار دام دیے گئے ہیں۔ 'حاصل کامل' کا "معیاری محاصل" کے طور پر اور 'حاصل سنوات' (یا عملی) کا "مروّجہ محاصل" کے طور پر ترجمہ کرنا معمولات میں داخل ہے۔ لیکن مجھے ان اصطلاحات کی کوئی ہمعصر صراحت نہ مل سکی۔ آئینِ اکبری سے واضح ہے کہ محاصل کی واقعی تشخیص کی ہوئی رقم ان میں سے کسی بھی دھات کے سکوں میں ادا کی جا سکتی تھی اور بعد کے قلمی نسخوں میں 'جمع دامی' کو جو حیثیت حاصل ہے وہ اس امر کی قوی شہادت ہے کہ اصل اعداد یہی تھے۔ میں نے اس مفروضہ پر عمل کیا ہے کہ 'جمع دامی' آئینِ اکبری کے اعداد کے مثل محاصل کے اس مجموعی مطالبہ کو ظاہر کرتا ہے جو مقامی تشخیص کرنے والے حکام فراہم کرتے اور پھر ان سے 'حاصل' کو کسی ایسے طریقہ پر حساب کرکے نکالتے تھے جس کے متعلق مجھے کوئی تفصیلی تحریر نہ مل سکی۔ میں اس امر کا کہ 'جمع دامی' اصل تشخیص ہوا کرتی تھی کوئی باضابطہ ثبوت فراہم نہیں کر سکتا لیکن نسبتاً یہ بہت زیادہ ممکن معلوم ہوتا ہے کہ مالگزاری کی تشخیص تانبہ ہی میں جاری رہی جیسا

عہدِ اکبری میں قطعی طور پر تھا اور یہ کہ دفاترِ مال اس کی بنیاد پر انتظامی ضروریات کے تحت بعض روپیہ کے اعداد نکال لیتے تھے، بمقابلہ اس کے کہ تشخیص کی بنیاد کو تانبہ سے تبدیل کرکے چاندی میں کر دیا گیا تھا اور یہ کہ بعد کے قلمی نسخوں میں جو تانبہ کے مساوی اعداد ملتے ہیں وہ روپیہ کی بنیاد پر نکالے گئے ہیں۔ یہ سوال کہ 'حاصل' سے واقعی کیا مراد ہے ایک قدرے دلچسپ موضوعِ بحث ہے اور ہم اسے قابلِ حصول قلمی نسخوں کے مطالعہ سے حل کر سکتے ہیں، لیکن یہ مسئلہ ہمارے بیان کے مفروضہ کی بنیاد پر نہیں اٹھتا جس کی رُو سے زیرِ مطالعہ عہد کی پوری مُدت کے دوران 'جمع دامی' ایک امرِ واقعہ کے طور پر مسلم رہا۔

طامس نے اپنی تصنیف 'دی ریونیو سورسز آف دی مغل ایمپائر'+ میں اس ضمیمہ میں مندرج بعض اعداد پر غور کیا ہے اور ان دونوں کے معلومات کے فرق کو ظاہر کرنا مناسب ہوگا۔ طامس نے اپنی توجہ کو خاص طور پر محاصل کے میزان پر محدود رکھا ہے اور اس نے اپنی بحث میں کل صدیوں کو شامل رکھا ہے۔ پس اس کی میزانیں، دس پرانے صوبوں کی ہماری میزانوں سے کوئی نسبت نہیں رکھتیں۔ اس نے جو اعداد 'آئینِ اکبری' سے اخذ کیے ہیں وہ بہ استثنائے ملتان تقریباً وہی ہیں جو میں نے کالم 'الف' میں درج کیے ہیں۔ قلمی نسخوں کی رُو سے اسی صوبہ کے لیے یا تو 38 ، 40 یا 15 ، 14 کے اعداد ثابت ہیں اور طامس نے اول الذکر کو اور میں نے ان بنیادوں پر جن کا میں نے ذکر کیا ہے آخر الذکر کو تسلیم کیا ہے۔ طامس نے کالم 'پ'، 'ث'، 'ج'، یا 'ح' کے اعداد کو استعمال نہیں کیا بلکہ کالم 'ت' کے اعداد کو استعمال کیا ہے۔ جن میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دوسری طرف میں نے 1654 کے متعلق اس کے اعداد کو یا برنیئر کے اپنے گوشوارہ میں دیے ہوئے اعداد کو استعمال نہیں کیا ہے اور نہ ہی میں نے اس کے بعد کے اعداد کا جو زیرِ مطالعہ عہد کے حدود کے باہر ہیں، حوالہ دیا ہے۔

جن اعداد کو طامس 1654 کا بتاتا ہے وہ دو قلمی نسخوں سے (برٹش میوزیم ایڈیشنل 6599 ، 6598) سے جو اعتبارِ نتیجہ ایک ہی ماخذ ہیں، مستعار لیے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں محاصل کے دو گوشوارے ہیں۔ طامس نے ان کی ترتیب کے اعتبار سے پہلے

+ THE REVENUE RESOURCES OF THE MUGHAL EMPIRE

کو لیا ہے اور دوسرے کا محض "وضاحت کے لیے" حوالہ دیا ہے (ملاحظہ ہو ص 33 پر اس کا فٹ نوٹ) لیکن میں متن میں اس تفریق کے جواز میں کوئی سند نہیں پاتا اور مجھے یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ معلوم ہوتا ہے کہ ان گوشواروں میں سے کون سا (اگر کوئی ایک بھی) اس مُدت سے متعلق ہے جو مخطوطہ میں درج ہے۔ پھر اس مُدت کے متعلق بھی ایک دقت یہ ہے کہ مخطوطہ کے آغاز پر اسے "دستور العمل" م ۔ ح ۔ م ۔ یؔ[1] حسب الحکم اورنگ زیب (مع القاب) 3 جلوس مطابق 1605 " بتایا گیا ہے۔ یہ دونوں سال ایک دوسرے کے مطابق نہیں آتے۔ بقول طامس آخر الذکر سن 1654 ۔ 1655ب.م ہے اور اسی سے اورنگ زیب کی تخت نشینی کا سرکاری سال 53 ۔ 1652 آتا ہے۔ میرے علم میں کوئی سند اسے اس قدر قبل معین کرنے کے حق میں نہیں ہے۔ اس کے عہدِ حکومت کا سرکاری شمار 1658 میں شاہجہاں کی معزولی سے کیا جاتا ہے۔ بہر حال، اس کا سن جو بھی رہا ہو، مجھے اس امر میں شک ہے کہ ہم اسے مخطوطہ میں مندرج محاصل کے گوشواروں میں سے کسی ایک پر بھی منطبق کر سکتے ہیں۔ مذکورہ عنوان کا صرف یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ دستور ایک ایسے حسب الحکم (اصطلاحاً فرمان سے کمتر درجہ کا حکم) کے مطابق مرتب ہوا جو اس سال جاری ہوا تھا اور ایسے دستور کے اعداد کسی آنے والے سال کے متعلق ہو سکتے ہیں۔ ان اعداد کو 1654 کے لیے استعمال کیے جانے کی صورت میں اس نتیجہ کو جو پہلے اخذ کیا جا چکا ہے کہ عہدِ شاہجہانی میں اضافہ کی مقدار بہت زیادہ تھی، تقویت پہنچے گی۔ لیکن میں نے ان کے زمانہ کے غیر یقینی ہونے کے باعث انھیں نظر انداز کر دیا ہے۔

جہاں تک برنیئر کے اعداد کا مسئلہ ہے، ان کے پیرس آخری بار طبع ہونے کے قبل ان میں غلطیوں کے راہ پانے کے امکانات اس قدر زیادہ ہیں کہ مجھے یہ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ میں انھیں ان ماخذ کا جن سے میں نے رجوع کیا ہے، درجہ دوں۔ دس صوبوں کے لیے اس کے دیے ہوئے روپیوں کے اعداد کی میزان 778 , 5 - 6 لاکھ دام کے مساوی آتی ہے جو

---

[1] حروفِ علت کے نقطے نہیں دیے گئے ہیں اور مجھے لغتوں یا فرہنگوں میں اس شکل کا کوئی لفظ نہ مل سکا۔ درمیانی وقفے صرف یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہاں چند حروفِ علت مضمر رہے ہوں گے۔ اس قسم کے الفاظ مثلاً "محمل" یا "محل" غالباً یہ قیاس آرائی کی جا سکتی ہے کہ "م" کے معنی "مرتبہ" ہے۔

کالم ج کے اعداد کے بہت قریب ہے۔ لیکن مدات کے اندراج میں بعض بڑی بڑی غلطیاں ہیں جو نقل کی یا حساب کی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ تھیونیو کے اعداد کے سلسلہ میں جنھیں طامس نے درج تو کیا مگر انھیں جدول کی شکل میں مرتب نہ کیا، یہ ایک مزید غیر یقینی صورت ہے کہ اس نے روپیوں یا داموں کو 'لیورے' میں تحویل کرتے وقت کون سی نسبت اختیار کی۔ لیوڑے کی تقریباً معمول کی قیمت کے حساب پر، اس کے اعداد کی میزان دس صوبوں کے لیے 60 - 91 5 لاکھ دام کے برابر آتی ہے لیکن ان اعداد کے سلسلہ میں بھی مدات کے اندراجات سے کچھ دشواری سامنے آتی ہے جس کا وہی سبب ہو سکتا ہے جس کی برنیر کے اعداد کے سلسلہ میں نشاندہی کی گئی ہے۔ لہٰذا معقول صورت یہ ہوگی کہ ہم ان سیاحوں کے دیے ہوتے اعداد کو علیٰحدہ رکھتے ہوتے ان سے اس دور کے محاصل کے مطالبات کی بہت بڑی مقدار کی تصدیق کا کام تو لے لیں، لیکن جزویات کے معاملہ میں زیادہ مشکوک ہونے کے باعث ہم انھیں ان معلومات کا ہم پلہ نہ تصور کریں جو مذکورہ سرگذشتوں اور دیگر ہندوستانی تحریروں سے اخذ کی گئی ہیں۔

ضمیمہ 'د'

مروجہ سکے، اوزان اور پیمائشیں

زیرِ بحث عہد کی تجارتی تحریروں کے مطالعہ کے سلسلہ میں منجملہ اور معمولی دقتوں کے ایک یہ بھی ہے کہ ان کے مصنفین نے ان میں انواع و اقسام کی اکائیاں استعمال کی ہیں۔ اس دقت سے عہدہ برآ ہونے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ عام استعمال کے خیال سے سکہ، وزن اور لمبائی کے لیے علیحدہ علیحدہ ایک ایک اکائیاں منتخب کر لی جائیں۔ میں نے کتاب کے متن میں صرف مغلیہ روپیہ اور اور ڈیوائیز پونڈ مع اس کے اضعاف اور انگریزی گز کو استعمال کیا ہے۔ اس ضمیمہ میں ان مصنفین کی عام اکائیوں اور ان معیاروں کی درمیانی نسبت میری بحث کا موضوع ہوگا۔

مروجہ سکے

زیرِ مطالعہ عہد میں روپیہ کی بناوٹ میں کوئی فرق واقع نہ ہوا۔ بہ دھات کے لحاظ سے یہ 180 گرین (جس میں 165 گرین چاندی ہوتی) کے موجودہ سکے کے تقریباً مساوی تھا۔ ان دنوں مختلف نام کے روپیے رائج تھے لیکن کسی وقت میں وہی روپیے بطور معیار قابلِ قبول ہوتے جو اس وقت جاری ہوئے ہوں (جسے 'چلنی' کہتے تھے) اور اس کے قبل کے روپیے (جنھیں خزانہ کہتے تھے) مختلف منہائیوں کے بعد قبول کیے جاتے اور گھسے ہوئے روپیوں پر بھی منہائیاں وصول کی جاتیں۔ ہندوستان اور لندن کے درمیان ان دنوں مبادلہ کی کوئی منڈی نہ تھی۔ لیکن حساب کتاب کے مقصد سے آڑھتیے روپیوں کو پہلے دو شلنگ 6 پنس اور اس کے بعد 2 شلنگ 3 پنس کے مساوی تصور کرتے تھے۔ ان ایام میں روپیہ کی قوتِ خرید پر باب۔ 5 میں بحث آ چکی ہے۔

جہانگیر نے معیار سے 20 فیصدی زیادہ وزن کا روپیہ جاری کیا تھا۔ اس کا

بظاہر مقصد من میں اضافہ سے ہے جس کا نیچے ذکر آتا ہے، ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ سکہ کے موجودہ ذخیروں میں اس جسامت کے روپیے ملتے ہیں لیکن معیاری وزن کے روپیوں کے مقابلہ میں یہ بہت ہی تھوڑے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تبدیلی کا کوئی مستقل نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

روپیہ کے علاوہ سکوں کی دیگر عام استعمال میں آنے والی حسب ذیل اکائیاں تھیں۔ واضح رہے کہ ان میں سے ہر ایک کی جو قیمتیں دی گئی ہیں وہ شرح مبادلہ کے مطابق کم و بیش ہوا کرتی تھیں۔

نام	دھات	حدودِ استعمال	قیمت بمقدار روپیہ
گلڈر یا فلورن^x^	سکہ برائے حساب کتاب	ولندیزی حسابات اور تحریریں	$\frac{5}{6}$ روپیہ پر مقررہ
ریال آف ایٹ	چاندی	ہسپانوی۔ پورے مشرق میں معروف	2 روپیہ
محمودی	چاندی	جنوبی گجرات	ابتداً $\frac{2}{5}$ روپیہ سے بڑھ کر $\frac{4}{9}$ تک
دام (پیسہ)	تانبہ	مملکتِ مغل	ابتداً $\frac{1}{40}$ روپیہ سے بڑھ کر تقریباً $\frac{1}{30}$ تک
پیسہ (نصف دام)	تانبہ	〃	$\frac{1}{80}$ 〃 〃 $\frac{1}{50}$ 〃
پگوڈا نئے*	سونا	جنوبی ہند اور مشرقی ساحل	تقریباً 3 سے $3\frac{1}{2}$ روپیہ تک
پگوڈا پرانے	سونا	〃 〃 〃	کم از کم 4 سے زیادہ 5 روپیہ تک یا زائد۔
فنم	سونا	〃 〃 〃	تغیر پذیر۔ تحریروں میں مختلف قیمتوں کا ذکر آتا ہے۔

گلڈرس :۔ گلڈرس (یا گلڈنس یا فلورنس جو 'F' کی علامت سے ظاہر کی جاتی ہے)

GUILDERS x

PAGODA *

مشرق میں عمومی استعمال کا سکہ نہ تھا لیکن ولندیزی معمولاً اپنے حساب کتاب میں اسے استعمال کرتے۔ اس کی مقامی سکوں میں تحویل رسمی شرحوں کے مطابق کی جاتی۔ لہٰذا جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے انھیں زیادہ سے زیادہ حساب کتاب کا سکہ کہا جاسکتا ہے۔ ایک گلڈرس میں 24 اسٹائیور اور 5/8 روپیہ ہوتے۔ بٹاویا جنرل کے متعدد اندراجات سے بھی جن میں دونوں طرح کے سکے درج ہوا کرتے، یہی شرح حاصل ہوتی ہے۔ ولندیزی تحریروں میں گلڈرس کا جو واحد مجموعہ ملتا ہے وہ "ٹن آف گولڈ" ہے۔ لیکن ہمیں اس فقرہ کے لفظی معنوں پر نہ جانا چاہیے۔ یہ 100,000 'گلڈرس' کے مساوی ہوتا تھا۔

ریال آف ایٹ :۔ ان دنوں مشرق میں سب سے زیادہ عمومی استعمال میں آنے والا یورپی سکہ ہسپانوی ریال آف ایٹ تھا۔ ہم اسے دو روپیہ کے مساوی تصور کر سکتے ہیں لیکن ایسے علاقوں میں جہاں چاندی کی ٹکسالیں نہ تھیں وہاں اس میعار سے عارضی تبدیلیاں زیادہ ہوا کرتیں ـــــ

محمودی :۔ گجرات کی خود مختاری کے دنوں میں محمودی وہاں کا خاص سکہ تھا۔ اکبر نے 1572 میں احمد آباد فتح کرنے پر وہاں روپیے کے سکے چلا دیے لیکن محمودیاں اس کے تھوڑے عرصہ بعد تک سورت میں چلتی رہی۔ راجہ پرتاپ شاہ بھی دریائے تاپتی کے جنوب میں واقع اپنے علاقۂ بگلان کے قلعۂ مُلہر میں اس سکہ کو ڈھلواتا تھا۔ اس کی سورت میں ڈھلائی سے بند ہونے پر اس کے حصول کا یہ واحد ذریعہ رہ گیا تھا۔ مُلہر کی ٹکسال کا فینچ نے 1610 میں اور 1619 کے ایک سورت کے خط میں ذکر کیا ہے۔ 1622 میں راجہ سے سکوں کی بحفاظت باربرداری کی اجازت حاصل کی گئی تھی اور یہ سکہ 1636 تک چلتا رہا۔ زیر مطالعہ عہد کے آغاز پر شمالی گجرات میں پہلے ہی سے روپیہ کو اختیار کرلیا گیا تھا لیکن جنوبی مقامات پر اور سورت اور بڑودچ میں کاروبار محمودیوں ہی میں رہا اور انگریز آڑھتیے اپنے حسابات میں اسے مسلسل طور پر استعمال کرتے رہے۔ البتہ اس کی شرح مبادلہ کم وبیش ہوا کرتی رہی لیکن سورت میں تجارتی کوٹھی کے قایم ہونے پر شرح معمول 5 محمودی برابر 2 روپیہ کے تھی اور 1650 کے بعد بھی یہی شرح برقرار رہی حالانکہ محمودی کی قیمت میں اضافہ کا رجحان پایا جاتا تھا اور ہمیں کبھی کبھی یہ اطلاع ملتی ہے کہ صحیح شرح 9 برابر 4 کے تھی اور یہ شکایت بھی تھی کہ سورت کے حسابات اس اعتبار سے غلط ہیں۔ 1651 میں انگریزی کمپنی نے اس اضافہ کو تسلیم کرلیا۔ اب

حسابات کے لیے 2 شلنگ 3 پنس برابر ایک روپیہ اور ایک شلنگ برابر ایک محمودی کی شرح معین کی گئی۔ اس طور پر آخرالذکر، اوّل الذکر کے $\frac{4}{9}$ کے برابر ہو گئی۔

دام اور پیسے: زیر مطالعہ عہد میں 'پیسہ' کا لفظ متعدد سکوں کے لیے مستعمل تھا اور ہم اسے مملکت مغلیہ کے اس مخصوص حصہ میں جس سے زیر بحث بیان کا تعلق ہے سب سے زیادہ عام تانبہ کا سکہ تصور کر سکتے ہیں۔ اکبر نے تقریباً 324 گرین کے اُس بڑے سکہ کا نام دام رکھا تھا جو اس کے عہد میں ایک روپیہ کا 40 ہوتا تھا۔ لیکن ہمارے علم میں ہے کہ شمالی ہندوستان میں یہ سکہ اکثر پیسہ کے نام سے موسوم تھا اور ہم "30 پیسہ کے سیر" کے فقرہ میں جو اکبر کے معیاری سیر کو بیان کرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا اس کا عمومی حوالہ پاتے ہیں۔ اکبر نے سیر کا وزن 30 دام معین کیا تھا۔ دوسری طرف سورت میں معمولاً 'پیسہ' پکارا جانے والا دام نہیں بلکہ نصف دام یا دھیلا تھا جیسا کہ اس امر سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیر مطالعہ عہد کے آغاز پر محمودی، 32 پیسوں کی ہوتی تھی یعنی ایک روپیہ میں 80 پیسہ ہوئے۔ تانبے کے سکے علامتی سکے نہ تھے بلکہ وہ اپنی دھات کی مقدار کے مطابق چلتے تھے اور ان کی بمقدار چاندی کی قیمت کے اضافہ پر باب 5 میں بحث آچکی ہے۔ لاہور اور کلکتہ کے عجائب گھروں کے ذخیروں کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ زیر مطالعہ عہد کے دوران عام سکوں کے وزن تبدیل نہ ہوئے لیکن عہدِ عالمگیری میں ان کے وزن کم کر دیے گئے تھے۔ یہاں اس بات کا اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ روپیہ کی موجودہ چھوٹی تقسیمیں (آنہ و پائی) شمالی اور مغربی ہندوستان کے اب تک محفوظ تذکروں میں نہیں ملتی۔ انھیں محض روپیوں (یا محمودی) اور پیسوں کا ذکر آتا ہے۔ لیکن علاقہ بنگال اور بہار میں لوگ 'آنہ' سے سکے کے طور پر تو نہیں مگر حساب کتاب کی ایک اکائی کے طور پر واقف تھے۔

پگوڈے: سونے کے سکے جو ہندوستان میں 'ہُن' کے نام سے معروف تھے لیکن جسے یورپی باشندے 'پگوڈا' کہتے تھے مملکت گولکنڈہ اور بیجاپور اور مزید جنوب کے ہندو علاقوں کے عام سکے تھے۔ زیر مطالعہ دور میں ان کی دو قسمیں رائج تھیں جو ترتیب وار 'نئی' اور 'پرانی' کہی جاتیں۔ اول الذکر سکہ رائج الوقت تھا اور اپنے دھات کی مقدار کی بنیاد پر چلتا تھا اور آخرالذکر اب نہ ڈھالے جاتے اور مصنوعی قیمت پر چلا کرتے۔

نئے پگوڈے: یہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی متعدد ہندو ٹکسالوں اور ولندیزیوں اور انگریزوں کی ان متعدد ٹکسالوں میں جو حکام کی اجازت سے قایم کی گئی تھیں ڈھالے جاتے

... 1621 میں نئے پگوڈے کی قیمت 1½ اسپینی ریال یا 3 روپیہ کے بہت قریب تھی
1633 میں ... ماگون کا پگوڈا جو بین طور پر نیا تھا 3/5 ا ریال یا تقریباً اپنی سابقہ شرح پر چلتا
تھا۔ اس ترتیب میں ریال کو 5 شلنگ کا تصور کیا گیا تھا۔ اس طور پر نیا پگوڈا تقریباً
6 شلنگ 8 پنس کے برابر ہوا۔ اس کے بعد نئے پگوڈے کو مسلسل 8 شلنگ کا تصور
کیا گیا اور اس تبدیلی سے ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ سونے کی بمقدار چاندی کی قیمت بڑھ
رہی تھی۔ اس امر کے پیش نظر کہ 1651 میں کمپنی نے روپیہ کی قیمت 2 شلنگ 3 پنس
اور نئے پگوڈے کی 8 شلنگ مقرر کیا، ہم آخر الذکر سکہ کی قیمت کو زیر مطالعہ عہد کے ابتدائی
برسوں میں 3 روپیہ کے بالمقابل آخری میں 3½ روپیہ تصور کر سکتے ہیں۔ یہ ایک مشہور
بات ہے کہ بمقدار چاندی، سونے کی قیمت کا اضافہ دور زیر مطالعہ کے اختتام کے بعد
بھی قایم رہا۔

پُرانے پگوڈے ... میں مختلف پگوڈوں میں دھات کی صحیح مقدار معلوم کرنے سے
قاصر رہا لیکن مناسب ہوگا کہ ٹیورنیئر کی اطلاع کو دُرست تصور کریں۔ اس نے جنوبی ہندوستان
کی اپنی سیاحت میں وسیع پیمانہ پر تجارتی کاروبار کیا تھا اور اس کا امکان نہیں پایا جاتا کہ
اس قسم کے مسئلہ پر اس سے غلطی ہوئی ہو۔ بقول اس کے، پُرانے پگوڈے مملکت وجے نگر کی
یادگار تھے اور ان میں سونے کی مقدار نئے پگوڈوں کے برابر تھی لیکن یہ (اس کے زمانہ میں)
تقریباً ایک ... زاید پر چلا کرتا تھا کیونکہ بعض قسم کے معاملات خصوصاً محاصل سرکاری کی ادائیگی
مخصوص انھیں سکوں میں کرنی ہوتی تھی۔ اس کا یہ بھی قول ہے کہ ان دنوں ایک مروجہ ضعیف
الاعتقادی کے تحت پُرانے پگوڈوں کو گلانا معیوب تصور کیا جاتا تھا اور صراف شاہ
گولکنڈہ کو اس لیے کہ وہ انھیں دوبارہ سکے ڈھالنے کی غرض سے واپس نہ لے ہر سال
زر کثیر ادا کرتے تھے۔ اگر یہ اطلاع صحیح ہے تو ہمیں یہ توقع کرنا چاہیے کہ پُرانے پگوڈوں کی
قیمت نئے پگوڈوں کی نسبت سے بڑھ رہی تھی کیونکہ اگر ایک طرف اس کی قیمت کا
زیادہ ہونا اس کے گلانے یا برآمد کرنے کے عمل میں مانع تھا تو دوسری طرف اتفاقیہ
نقصانات سے اس کی گردش کی مقدار میں کمی واقع ہو جایا کرتی تھی اور اس طور پر صراف،
جب تک اس کی طلب قایم رہتی، منافع کی توقع کر سکتے تھے۔ حقیقتاً زیر مطالعہ عہد میں ہم
یہ دیکھ سکتے ہیں کہ پُرانے سکوں کی قیمت، بمقدار نئے سکوں کے اور نئے سکوں کی قیمت

بہ اعتبار چاندی بڑھ رہی تھی۔ تقریباً 1632 میں نئے اور پرانے میں 125 :100 کی نسبت تھی لیکن 1651 میں عام شرح 130 اور 1656 میں 145 سے زائد[1] ہو گئی تھی، جب کہ نئے پگوڈوں کی قیمت کم از کم 4 سے بڑھ کر 5 روپیہ سے خاصی زیادہ ہو گئی۔

پگوڈوں کے ساتھ چلنے والے کسری سکے بہت زیادہ تبدیل ہوا کرتے۔ چھوٹا طلائی سکہ 'فنم'، مختلف اوقات میں یا مختلف مقامات پر ایک پگوڈے میں 12، 15، 16، 18، 28 اور 32 ہوا کرتے اور اسی طور پر تانبہ کے سکوں میں بھی تبدیلی کا دائرہ وسیع تھا۔ یہ اکائیاں صرف اس صورت میں کہ شرح مبادلہ ان کے بمقدار بتائی جائیں، اہم ہو جاتی ہیں اور ہمیں ان شرحوں کو ان کے سیاق کے اعتبار سے سمجھنا چاہیے۔

اوزان

زیر مطالعہ عہد میں، ہندوستان میں وزن کی عام اکائی کے طرح کی کوئی چیز نہ تھی اور ہم نے اور ڈبلیو آئز پونڈ کو جسے انگریزی آڑھتیے استعمال کیا کرتے بطور ایک معیار کے اختیار کیا ہے۔ یہ پونڈ درمیانی مدت میں تبدیل نہ ہوا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ دیگر یورپی مصنفین کے پونڈ (یا لیورے) اس سے مختلف تھے اور ان دونوں پونڈوں کا درمیانی فرق بعض صورتوں میں نسبتاً زیادہ ہوا کرتا تھا۔ ان میں اہم ترین وہ پونڈ ہے جو ولندیزی تجارتی تحریروں میں استعمال کیا گیا ہے[2]

ولندیزی پونڈ:۔ ان دنوں ہالینڈ میں مختلف پونڈ زیر استعمال تھے اور ولندیزی کمپنی کے ابتدائی چارٹر میں یہ ہدایت تھی کہ تمام مسالے بمقدار ایمسٹرڈم پونڈ جس کا

---

[1] انگریزی کمپنی کے 1667 میں مدالم سے لکھے ہوئے ایک خط سے واضح ہوتا ہے کہ مقامی حکام نے ان دنوں پرانے پگوڈوں کی اجارہ داری حاصل کر لی تھی اور سرکاری محاصل کے زیادہ قیمتی سکوں میں ادائیگی پر اصرار کر کے اس کی نسبت کو 170 پر پہنچا دیا تھا۔

[2] مطبوعہ جلدوں یا جرنلوں میں پونڈ کے لیے دو واضح مخففات استعمال کیے گئے ہیں۔ اگر مطالعہ کرنے والے ایسا خیال کرتے ہوں جیسا کہ میرا خیال تھا کہ یہ علامات مختلف اوزان کو ظاہر کرتے ہیں تو میں انھیں بتا دوں کہ اس کے ناشرین سے دریافت کرنے پر یہ اطلاع ملی ہے کہ یہ دونوں علامات اوزان کا مفہوم ایک ہی ہیں۔

وزن 494 ؎ کلوگرام یا تقریباً 109 ال۔بی تھا فروخت کیے جائیں۔ بٹاویا جرنل، میں مختلف مساوی اوزان کو جانچنے سے واضح ہوتا ہے کہ جو پونڈ مسالوں کے لیے معین کیا گیا تھا، ولندیزی اسے غالباً مشرق میں ہر ضرورت کے لیے استعمال کیا کرتے۔ ولندیزی اوزان کو ان اور ڈوپوآئز میں تحویل کرنے کے لیے ہمیں انہیں بقدر 9 فیصدی بڑھا دینا چاہیے لیکن تخمینی طور پر $\frac{1}{10}$ کے اضافے سے بھی ہم صحیح مقدار کے ایک معقول حد تک قریب پہنچ جاتے ہیں۔

اس زمانہ کا فرانسیسی لیورے، ولندیزی پونڈ سے قدرے چھوٹا تھا مگر ہم اسے ایک عمومی انداز میں اس کے مساوی تصور کر سکتے ہیں۔

ان ایام میں ٹن کو وزن کی ایک اکائی تصور کرنا غلط ہوگا۔ یہ معمولاً مگر ہمیشہ نہیں جہاز پر سامان رکھنے کی تقریباً 60 مکعب فٹ جگہ کو ظاہر کرتا ہے؎ یہی صورت ولندیزی 'لاسٹ' کی بھی ہے جو تقریباً 120 مکعب فٹ یا دو ٹن (ناپ) کے برابر ہوتا تھا۔ ایک مقام پر 158 لاسٹ چاول کا وزن 200، 474 ولندیزی ال۔بی بتایا گیا ہے۔ اس طور پر چاول کا ایک 'لاسٹ' 327 ال۔بی۔ اور ڈوپوآئز کے برابر ہوا۔ کسی جگہ ایک دوسرے قسم کے چاول کا ایک 'لاسٹ'

؎ یہ عدد STARING AND VAN WIERINGEN'S PAST AND PRESENT, MEASURES سے ماخوذ ہے۔ میں اس حوالہ کے لیے ڈاکٹر ڈبلو۔ آر۔ بشپ DR. W. R. WEIGHTS AND COINS BISHOP کا ممنون ہوں۔ میں خود اس کتاب کی نقل حاصل کرنے سے قاصر رہا۔

؎ اور ڈوپوآئز کے جدول میں ٹن تدریجی طور پر سترھویں صدی کے دوران داخل ہوا۔ صدی کی ابتدائی مدت میں جو اسکول کتابیں شائع ہوئیں ان میں ہنڈریڈ ویٹ سے بڑا کوئی وزن نہ تھا لیکن بالآخر ٹن تسلیم کر لیا گیا۔ البتہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ تاجروں نے اس کے استعمال کو وزن کی ایک عام اکائی کے طور پر کب شروع کیا لیکن غالباً اسکولوں نے بازاروں کی تقلید کی اور مخصوص عبارتوں میں تو یہ لفظ لوہے، سیسے یا کسی دیگر وزنی سامان کے لیے استعمال ہوا ہے۔ لیکن زیر مطالعہ عہد میں یہ عموماً پیمائش کے لیے مستعمل تھا۔ مجھے اس مسئلہ پر کوئی تحقیقی تحریر دل سکی اور میں نے اس موضوع پر جو رائے ظاہر کی ہے وہ سترھویں صدی میں مطبوعہ متعدد تجارتی اور تعلیمی ضوابط ناموں کے مطالعہ پر مبنی ہے۔

3750 ال-بی- کے برابر آیا جب کہ سیاہ مرچ کے ایک 'لاسٹ' کا وزن 616 ال-بی تھا۔ 'کوئنٹل' یا کنٹل، پرتگیزیوں کی مشرق میں عام طور پر استعمال ہونے والی اکائی کا وزن تقریباً 130 ال-بی تھا۔

وزن کی خاص ہندوستانی اکائی 'مَن' کے نام سے موسوم تھی جسے اب 'مانڈ' کہتے ہیں۔ وہ تمام من جن سے ہمارا تعلق ہے 40 سیر کے تھے لیکن 'سیر' کے وزن بہت زیادہ مختلف ہوا کرتے تھے[1] عہدِ اکبری اور اس کے بعد مملکتِ مغلیہ کا من ایک اصولی بنیاد پر قایم تھا سیر کو تانبہ کے سکّے 'دام' کی ایک معینہ تعداد کے وزن کے برابر قرار دیا گیا خود اکبر کا سیر 30 داموں کا تھا۔ اس طور پر اکبری من 120 دام (جن میں سے ہر ایک 324 گرین) کے وزن یا تقریباً $55\frac{1}{2}$ ال-بی کا ہوا اور ہم اسے نصف ہنڈرویٹ کا تصور کر سکتے ہیں لیکن انگریز آڑھتیے اسے معمولاً 55 ال-بی کا خیال کرتے تھے اور غالباً عملاً یہ درست بھی تھا کیونکہ بیچنے والوں کے اوزان قدرے گھسے ہوئے سکوں پر مبنی ہو سکتے ہیں۔ ولندیزی اسے اپنے پونڈ کے حساب سے 50 کے برابر خیال کرتے تھے جس سے اس کا وزن $54\frac{1}{2}$ اور ڈیڑھ اَونز ہوا لیکن ان کے اکثر پورے پورے اعداد کے استعمال سے مجھے شبہ ہوتا ہے کہ ان کے انتخاب میں بالکل ٹھیک صحت کا ہی نہیں بلکہ عملی سہولتوں کا بھی لحاظ رکھا جاتا تھا۔

1619 میں جہانگیر کو ایک ہندو سادھو نے مطلع کیا کہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کی رو سے سیر کا وزن 36 دام ہونا چاہیے۔ پس اس نے فوراً اس کے مطابق احکام جاری

---

[1] ہمیں کبھی کبھی 39، 41 یا 42 سیروں کے منوں کے حوالے ملتے ہیں۔ میں انھیں مخصوص یا مخصوص زمروں کے معاملوں کی تجارتی گنجائشیں تصور کرتا ہوں۔ کوئی بیچنے والا فی من ایک سیر زاید کی گنجائش نکال سکتا تھا یا کوئی خریدار ایک سیر فی من پر راضی ہو سکتا تھا۔ جدید تاجر اسے $2\frac{1}{2}$ فیصدی کی گنجائش کہیں گے۔ چند صورتوں میں 20 سیر کے من کا بھی ذکر آتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہے کہ لکھنے والا اپنے عام استعمال کے سیروں کے بمقدار ایک نامانوس من کا ذکر کر رہا ہے۔ کسی تاجر کے 20 پیسہ کے سیر سے کاروبار کرنے کی صورت میں یہ قدرتی بات ہوگی کہ اکبری من 60 سیر کا ہوگا کیونکہ واقعتاً ایسے سیروں کا ایک اکبری من ہوا کرتا تھا۔

QUINTAL X

کیے۔ ہمیں 1620 میں پٹنہ میں جہانگیری من کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے اور ہم 1622 میں برہانپور میں سیر کو 36 پیسوں کے وزن کا پاتے ہیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس حکم کا دور دور کے علاقوں پر اثر ہوا۔ اس من کا وزن تقریباً 66 ال۔بی۔ کے مساوی ہوگا۔ شاہجہاں کے ایک دوسرا من جاری کرنے کے بعد بھی بظاہر بنگال میں چند برسوں تک یہی من چلتا رہا کیونکہ ولندیزی تحریروں میں 1636 میں ہگلی میں اور 1642 میں بالاسور میں تقریباً 66 ال۔بی۔ کے ایک من کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن 1645 میں پپلی بندر پر شاہجہانی من مستعمل تھا۔ 1632 میں منڈی نے 37 پیسہ کے سیر پر مبنی من کو پٹنہ میں استعمال ہوتا ہوا پایا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ایک پیسہ فی سیر کی تجارتی گنجائش کے ساتھ جہانگیری من یا یہ کوئی اور مقامی اکائی رہی ہو۔ 1620 میں ہیوگس نے اسی منڈی میں ایک 30 پیسہ کا اور دوسرا ½34 پیسہ کا اکبری سیر پایا۔

شاہجہاں نے سیر کو 40 دام کے وزن کا مقرر کیا جس سے من کا وزن تقریباً 74 ال۔بی۔ ہوگیا۔ مجھے اس کے شروع ہونے کی مدت کے متعلق کوئی قطعی اطلاع نہ مل سکی لیکن یہ 1642 میں آگرہ میں رائج تھا۔ ان دنوں ایک ولندیزی تحریر میں 67 ولندیزی پونڈ کا ذکر آتا ہے جو تقریباً 74 ال۔بی۔ کے برابر ہوا۔ زیر مطالعہ عہد کی بقیہ مدت کے دوران ہم ان کا رواج سندھ سے بنگال تک کے مختلف علاقوں میں پاتے ہیں لیکن اس کا استعمال عمومی نہ تھا اور یہ ایک قابلِ لحاظ بات ہے کہ آگرہ میں خاص طور پر نیل اکبری من سے خریدی جاتی تھی[1]۔ یہاں یہ ذکر بھی کر دینا مناسب ہوگا کہ 82 ال۔بی۔ کا 'معیاری من' عہد حاضر کی چیز ہے اور یہ زیر مطالعہ عہد میں نہ پایا جاتا تھا۔

یہاں تک میں نے اپنے بیان کو مغلوں کے سرکاری من تک محدود رکھا ہے۔ گجرات میں وہاں کا خود اپنا ایک نظام پایا جاتا تھا۔ زیر مطالعہ عہد کے آغاز پر ہم وہاں دو منوں

---

[1] آگرہ کی منڈی میں نیل تنہا کوئی استثنائی شئے نہ تھی کیونکہ 1655 میں ایک آڑھتیے کی قرمز کی خرید و فروخت کے سلسلے میں اطلاع ہے کہ "سیر مستعملہ 40 پیسے کا ہے" 36 پیسہ کا نہیں جیسا کہ پہلے ہمیں یقین دلایا گیا تھا۔ وہ طریقہ تین سال گذرے تبدیل ہوگیا ENGLISH FACTORIES X[illegible] بالفاظ دیگر قرمز کے سلسلے میں جہانگیری سیر کو 1652 تک قائم رکھا گیا تھا۔ HUGHES X

کو رائج پاتے ہیں ایک تقریباً 27 ال۔بی۔ کا دوسرا ½32 ال۔بی۔ کا لیکن تمام اہم معاملے آخرالذکر من میں ہوا کرتے جسے 33 ال۔بی۔ کا تصور کرتے ہوئے حساب کتاب کیا جاتا تھا۔ اسے 18 پیسہ کے سیر پر مبنی بتایا جاتا ہے[۵] بمقدار ولندیزی پونڈ کے یہ کبھی 30 کا اور کبھی ½30 کا تصور کیا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آخرالذکر عدد زیادہ صحیح ہے لیکن اول الذکر کو پورا عدد ہونے کے باعث ترجیح دیتے تھے۔ شاہجہاں نے اس مقامی یا گجراتی سیر کو 18 سے 20 پیسوں کا کر دیا۔ اس تبدیلی کو میتھولڈ کی 1636 کی ڈائری میں اس طور پر قلمبند کیا گیا ہے: "2 / فروری۔ بادشاہ کے حکم کے بموجب جس نے اس مقصد کے تحت اپنا فرمان بھیجا، یہاں (سورت) کا سیر جو پچھلے زمانہ میں 18 پیسہ کا تھا اب 20 پیسہ کا ہو گیا ہے، جس کے مطابق تمام، اوزان کو درست کیا گیا ہے۔ احمدآباد میں یہ صورت ایک سال سے زاید سے ہے اور یہاں کا من اب 'جہان، کے من کا ٹھیک آدھا ہے جس میں 40 سیر اور ہر سیر کا وزن 40 پیسے کے برابر تھا[۶] اوزان کی درستگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکم واقعی میں موثر ثابت ہوا اور اب سے گجراتی من کو انگریزی تحریروں میں 37 ال۔بی۔ کا یا تقریباً اس کے مساوی تصور کیا جانے لگا اور ولندیزی اسے ½34 کا خیال کرتے تھے جو اس سے قدرے زیادہ تھا۔ سورت کے آڑھتیوں نے شاہجہانی من کو کبھی کبھی 'دوہرا من، بتایا ہے۔ یہ اصطلاح ان کے نقطۂ نگاہ سے ٹھیک ہے۔

سورت کے جنوب میں مشرقی ساحل پر مسولی پٹم تک من بظاہر سرکاری مداخلت سے محفوظ رہا اور اس کا وزن تقریباً 26 ال۔بی تھا (ایک ال۔بی۔ کم یا زیادہ)۔ من نظام پٹم میں 27، مسولی پٹم اور کالیکٹ میں 26، ڈبھول، نیگنا پٹم اور مدراس میں 25 اور اس علاقہ میں 'کینڈی[+]، یا 'بھر، معمولاً 20 من کی ہوا کرتی۔ واضح رہے کہ ملک فارس میں جس

---

[۵] چھوٹا گجراتی من واضح طور پر جنوبی علاقہ کا من تھا جس کے بارے میں بعد میں ذکر آتا ہے کہ یہ ساحل پر رائج تھا۔

[۶] DAGH REGISTER کے اندراج مورخہ 22 / اکتوبر 1634 سے واضح ہوتا ہے کہ 1634 تک احمدآباد میں پرانا من چل رہا تھا۔ لہٰذا 35-1634 کے موسم سرما میں اس شہر میں تبدیلی کی گئی ہوگی۔

[+] CANDY

وزن کو 'من' کہتے وہ مذکورہ اوزان سے کم کا تھا۔ تبریز میں من صرف 6 ال۔ بی 5 آؤنس کا اور اصفہان میں من شاہی یا تمن※ 12½ ال۔ بی کا تھا۔ ہندوستان کے دوسرے سمت ارا کانی میں تقریباً 46 ال۔ بی کا تھا۔

پس ہندوستان میں مستعمل خاص منوں کو ہم ایک جدول کی شکل میں اس طور پر درج کرسکتے ہیں۔

نام	تخمینی وزن ال۔ بی میں		سیر کا بمقدار وزن	علاقہ رواج	مدت
	اور ٹولپا آئز	وندیزی			
اکبری	55	50	30	شمالی ہندوستان	1619 تک
جہانگیری	66	60	36	〃	1620 سے تقریباً 1634 تک لیکن بنگال میں 1642 یا اس کے بعد تک
شاہجہانی (یا دو مرامن)	74	67 / 68	40	〃	تقریباً 35-1634
گجراتی پرانا	33	30 / 30½	18	گجرات	36-1635 تک
گجراتی نیا	37	34½	20	〃	36-1635 تک
جنوبی	26(1±)	24(1±)		جنوبی ہند اور مشرقی ساحل	زیر مطالعہ عہد کی پوری مدت۔

چینی اوزان جو سماترا سے مشرق کی جانب تمام منڈیوں میں رائج تھے ان کے پیمانوں کی بھی تھوڑی واقفیت حاصل کرنا ضروری ہوگی۔ یہ اوزان جزیروں میں اپنے ملایائی ناموں سے پکارے جاتے تھے۔ بڑی اکائی 'پی سل' کا وزن 33½ ال۔ بی۔ اور اس کے نیچے کی اکائی 'کٹی' کا وزن 1⅓ ال۔ بی۔ تھا۔ 100 کٹوں کا ایک 'پی سل' ہوتا۔ ان اکائیوں

※ DA TIKAN

میں کسی تبدیلی کا پتہ نہیں چلتا لیکن مسالہ کے کاروبار کے مطالعہ کے سلسلہ میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جزیرۂ باندہ کی کٹی نسبتاً زیادہ بڑی یعنی تقریباً 26 ال۔بی۔ کی تھی اور جاوتری اور جائے پھل اسی اکائی میں وزن کیے جاتے تھے۔

حجم کے پیمانے

اس عہد کی تحریروں میں حجم کے کسی ہندوستانی پیمانہ کا کوئی نمایاں ذکر نہیں ملتا۔ اس سلسلہ میں پچھلی ہی بات کو دہرایا جا سکتا ہے یعنی یہ کہ ٹن سے معمولاً سامان کی اس قدر مقدار کا مفہوم ہوتا ہے جو تقریباً ۲۰ مکعب فٹ جگہ میں سما سکے اور اسی طرح لاسٹ، 120 مکعب فٹ کو ظاہر کرتا ہے۔

لمبائی کے پیمانے

گز، کوڈ+، اور ہستا۔ لمبائی کا کوئی ایسا ہندوستانی پیمانہ نہیں ملتا جسے ہم زیرِ مطالعہ عہد کا معیار تصور کر سکیں اور ہمیں انگریزی گز کو جو درمیانی مدت میں تبدیل نہیں ہوا ہے استعمال میں لانا چاہیے۔ شمالی ہندوستان میں رائج لمبائی کا پیمانہ گز کے نام سے موسوم تھا۔ ان میں بیحد اختلاف پایا جاتا تھا۔ اکبر نے 'الٰہی گز' قایم کر کے انھیں ایک معیار پر لانے کی کوشش کی تھی۔ اسے ابوالفضل کی فراہم کردہ معلومات کی رو سے تقریباً ۳۱ انچ کا ہونا چاہیے لیکن یہ عملاً اس سے ایک انچ زاید لمبا تھا۔ 'الٰہی گز' شمال میں مستعمل تھا لیکن اس کا استعمال زیادہ عام نہ تھا۔ جہانگیر نے من اور روپیہ میں ۲۰ فیصدی کے اضافہ کے بعد گز کو بھی اسی قدر بڑھا دیا تھا۔ ہم ۴۰ انچ کے اسی گز کو پٹنہ میں مستعمل پاتے ہیں لیکن مجھے اس کے بہت تھوڑے حوالے ملتے ہیں جس سے اس کے علاقۂ استعمال کی تنگی ظاہر ہوتی ہے 1646 میں شاہجہاں نے آگرہ میں مستعمل گز میں اس مقصد سے کہ یہ لاہوری گز کے مطابق ہو جائے تھوڑی سی تخفیف کر دی۔ زیرِ مطالعہ عہد میں، ہمیں ان کے علاوہ کسی اور سرکاری تبدیلی کی اطلاع نہیں ملتی۔ لیکن 1647 میں آگرہ میں گز تقریباً 32 انچ ہی کا چلتا رہا۔

+ : covad

گجرات میں دو پیمانے مستعمل تھے۔ ان میں سے بڑا جو تقریباً ٹھیک ایک گز کے برابر تھا سورت میں اونی سامانوں میں استعمال ہوتا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احمد آباد میں اس مقصد کے لیے "الٰہی گز" ہی کو کام میں لایا کرتے تھے۔ لیکن سوتی کپڑوں کے ¾ گز سے قدرے چھوٹا ایک دوسرا پیمانہ تھا جو مغربی ساحل پر عام طور پر رائج تھا۔ اس کی لمبائی بہر حال جو بھی رہی ہو اسے یا تو ۱۶ اگرہ یا 24 'تسج' میں تقسیم کرتے تھے اور تجارتی مراسلات میں یہ دونوں تقسیمیں ملتی ہیں۔

مغربی ساحل پر پرتگیزی بازار میں جو بھی گز استعمال ہوتا تھا اس پر 'کوڈو' کے لفظ کو منطبق کیا جاتا۔ وہ 'ہاتھ' کیلئے 'کویڈ' کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ انگریزوں کی اصطلاح میں (کوڈ، کُویٹ وغیرہ) اس لفظ کی بگڑی ہوئی شکلیں تھیں۔ گجرات کے تھانوں کے کاروبار کے سلسلے میں 'کوڈ' کو ¾ گز کے قریب تصور کرنا مناسب ہوگا۔ سندھ کے متعلق ہمیں اطلاع ملتی ہے کہ وہاں کے 17 مقامی کوڈ گجرات کے ¾ 20 کوڈ کے مساوی تھے۔ اس طور پر سندھ کے لیے ½ 32 انچ آتے ہیں جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہاں 'الٰہی گز' کو کوڈ کے نام سے پکارتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ آگرہ میں بھی اس سے ہمیشہ 'الٰہی گز' کا مفہوم ہوا کرتا لیکن یہ بات بالکل صاف نہیں ہے۔ پٹنہ میں 40 انچ کے جہانگیری 'کویڈ' کا پہلے ذکر آچکا ہے۔

مشرقی ساحل میں ہم صحیح معنوں میں ہندوستانی ہاتھ کا پیمانہ پاتے ہیں جسے انگریز 'ہستا' اور ولندیزی 'استا' کہتے تھے۔ اسے معمولاً نصف گز یا اس سے ذرا بڑا تصور کیا جاتا تھا۔ ساحلی کاغذات میں 'کویڈ' کا اکثر ذکر آتا ہے لیکن یہاں اس لفظ کو کسی مختلف اکائی کے طور پر نہیں بلکہ 'ہستا' کے مترادف کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ضمیمہ 'ب' میں ایک ایسی مثال دی گئی ہے جس میں ۶۰ کوبیڈوز کو 70 ولندیزی 'ایلوں' کے برابر بتایا گیا ہے۔ سالیم پور کپڑوں کی معیاری لمبائی کو بعض اوقات ½ 16 گز اور بعض اوقات 32 گز بتایا گیا ہے اور متعدد دیگر ضمنی حوالے بھی اس کے استعمال کیے جانے کو ثابت کرتے ہیں۔

پس اُن دِنوں عملی اہمیت کے پیمانے حسبِ ذیل ہیں:۔

مشرقی ساحل پر ——— ہستا (یا کویڈ) تقریباً 18 انچ

گجرات میں ——— کویڈ تقریباً 27 انچ
سندھ میں ——— کوڈ (الٰہی گز) تقریباً 32 انچ
شمالی ہندوستان میں ——— الٰہی گز (یا کویڈ) تقریباً 32 انچ
ایضاً ——— جہانگیری گز (یا کوڈ) تقریباً 40 انچ ۔ [illegible]

[illegible] یقینی ہیں ۔ لیکن یہ زیادہ دنوں تک نہ چلا ۔

کوڑی اور تھان : کپڑے کا کاروبار عموماً گزوں، یا کویڈوں [illegible] سے نہیں بلکہ کوڑی یا تھان کے حساب سے ہوا کرتا تھا ۔ ایک کوڑی میں [illegible] تھان [illegible] اور تجارت کی مقدار کا اندازہ کرنے کے لیے تھان کی عام لمبائی کا تھوڑا علم ضروری [illegible] ہوتا ہے ۔ گجراتی کیلیکو کی یورپی تجارت کے سلسلہ میں تو اسے معقول صحت کی حد میں [illegible] کیا جا سکتا ہے کیونکہ زیادہ مقدار میں برآمد کیے جانے والے کپڑے [illegible] اقسام کے ہوا کرتے اور ہرچند کہ منفرد تھانوں میں فرق کا انحصار [illegible] والوں کے [illegible] افتاد مزاج پر ہوا کرتا لیکن یہ فرق گزوں میں نہیں بلکہ محض انچوں تک محدود [illegible] بعض [illegible] کی معیاری لمبائیاں اس طور پر تھیں ۔

گجراتی بافتے	14 سے 15 گز تک
گجراتی دُنیاں	تقریباً 12 گز
سمانہ کے سیمیانوز	تقریباً 10 گز
سندھ کے جوریز	12 اور 15 گز کے درمیان
آگرہ کے مرکولیز	تقریباً 15 گز

مجھے اودھ کے خریدے ہوئے دریا آبادی کپڑوں کی لمبائی [illegible] 1662 میں انگریزی کمپنی نے گجرات میں اس کے نمونہ کے کپڑے تیار کر [illegible] 13 سے 14 گز تک کی لمبائی اور 1 گز کی چوڑائی معین کی گئی ۔ ہم یہ تصور کر [illegible] سے عام طور پر روانہ کیے جانے والے سامانوں کی اس کھیپ میں تھانوں کی [illegible] 15 گز سے کم ہوا کرتی اور اس کمی کا انحصار مال کی اس کھیپ [illegible] ڈتیز، شارٹ جوریز [illegible]

CORGE X

کے تناسب پر ہوا کرتا۔ ایک لاکھ تھانوں میں ½13 سے لے کر 15 لاکھ تک گز ہوا کرتے۔ یہ اعداد مال کے کسی ایسے کھیپت میں نہ ہو سکتے تھے جس میں آگرہ کی گزیاں زیادہ تناسب میں ہوں کیونکہ یہ کپڑا 30 گز یا اس سے زاید لمبے تھانوں میں تیار کیا جاتا تھا لیکن مجھے زیر مطالعہ عہد میں کسی ایسے کھیپت کی اطلاع نہ مل سکی اور گزیوں کی یورپی برآمد کی مقدار زیادہ نہ بڑھ سکی۔

مشرقی ساحل پر معاملات زیادہ پیچیدہ تھے کیونکہ وہاں سے زیادہ مقدار میں لانگ کلاتھ یورپ جایا کرتے تھے۔ یہ گزی کی طرح جس کا ابھی ذکر کیا جا چکا ہے بہت زیادہ لمبے یعنی معمولاً 35 سے لے کر 40 گز کے تھانوں میں ہوا کرتے تھے [ئه] 1657 میں لندن سے بھیجی گئی فرمائش میں کمپنی نے یہ شکایت کی تھی کہ بہت سے تھانوں کی لمبائی کم کر کے 36 گز کر دی گئی ہے اور اس کے ایک برس بعد اس نے 37 سے 38 گز کے تھانوں کی ہدایت کی۔ لہٰذا ہم ان اعداد کو ایک تخمینی حساب کرنے میں استعمال کر سکتے ہیں۔ اسی خط سے یہ واضح ہوتا ہے کہ 'سالیم پورس، 12 گز' موریز، تقریباً 9 گز' پارسیلز' تقریباً 8 گز اور 'جنگمس' تقریباً 21 گز کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

شمالی افریقہ کو جانے والے مال میں خاص طور پر صافے کے کپڑے شامل رہتے جن کے تھان اوسطاً تقریباً 12 گز لمبے ہوا کرتے۔ ملک گنی کو جانے والے سامان نسبتاً بہت چھوٹے ہوتے: 'نیگرو کلاؤتس' ولندیزی NEGROSB CLEEDEN صرف 4 گز کے لیکن 'گنی کلاتھ' کے نام سے موسوم کپڑوں کی بہت بڑی مقدار 'لانگ کلاتھ' کی ہوا کرتی جس کے بیجک معمولاً ہاتھوں کی مقدار میں تیار کیے جاتے۔ سماترا، جاوا اور اس کے آگے کے علاقوں کی برآمدات میں اقسام کی تعداد اس قدر زیادہ ہوا کرتی کہ ان کے متعلق جو چند تحریریں موجود ہیں ان کی بنا پر کوئی صحیح اوسط نہیں نکالا جا سکتا۔ بعض عام کپڑوں کی لمبائی وہی ہوتی جو کیلیکوز کے

له O.C. 1656 میں منسلک 1639 کے بیجک میں لانگ کلاتھ کے تین کھیپوں میں تھانوں کی تعداد اور نیز 'کوڈوں' کی تعداد واضح کی گئی ہے۔ اوسط فی تھان ترتیب وار ½71،62 اور 72 کوڈا آتا ہے۔ کوڈ کو نصف گز کا تصور کرتے ہوئے ان کھیپوں کا اوسط ¼31، ¼35 اور 36 گز نکلتا ہے۔ پہلا معیار سے بہت کمتر اور بقیہ دونوں اس کے تقریباً برابر ہیں۔

+ NEGRO CLOUBS

لیے درج کی گئی ہیں۔ ان میں بہت ہی کم کی لمبائی ان سے بڑی ہوتی اور بہت زیادہ کی لمبائی بہت چھوٹی ہوتی جو 8 گز سے کم ہو کر رومالوں کی حد تک پہنچ جاتی۔ غالباً جنوب جانے والے سامانوں کی کھیپ میں اوسط لمبائی 5 اگز سے بہت کم رہا کرتی لیکن ہم اس کمی کو صحیح طور پر متعین کرنے سے معذور ہیں۔

گانٹھیں، گٹھ، فارڈلس وغیرہ

دور زیر مطالعہ میں تجارتی کاروبار کے متعلق اس قدر زیادہ معلومات گانٹھوں اور دیگر گٹھروں کی مقدار میں ملتی ہیں کہ ان کے متعلق تھوڑی بہت واقفیت حاصل کرلینا مناسب ہوگا۔ مجھے جن اشیاء کے گٹھروں کے اوسط یا معیاری اوزان کے تحریری اندراجات مل سکے وہ حسب ذیل ہیں۔ بعض صورتوں میں اوزان خالص اور بعض میں انھیں باندھنے کے سامان بھی شامل ہیں لیکن ان کی علیحدہ علیحدہ مقدار صرف قیاس سے ہی متعین کی جا سکتی ہے۔

سامان	مقام حصول	گانٹھ کے اندر سامان	باربرداری کا ذریعہ	
نیل	آگرہ	220 ال۔بی وزن خالص	اونٹ	انگریزی تحریریں
"	"	240-230 ال۔بی	"	ولندیزی تحریریں
"	گجرات	148 ال۔بی وزن خالص	غیر محرہ	انگریزی تحریریں
"	"	155-145 ال۔بی	"	ولندیزی تحریریں
شکر	"	296 ال۔بی	"	" "
شورہ	"	295 ال۔بی	"	" "
ریشم	بنگال	143 ال۔بی	"	" "
سوتی تاگہ	کورومنڈل	165 ال۔بی	"	" "
"	سورت	188 ال۔بی	"	" "
کپڑوں کے تھان	آگرہ	110 تھان کیلیکو	بھینس	" "
"	گجرات	100 تھان بافتے	غیر محرہ	" "

کپڑوں کے تھان	گجرات	200 تھان برامی (6 گز) 25 تھان لانگ کلاتھ (36 گز)	غیر محررہ	ولندیزی تحریریں
//	//		//	// //

واضح رہے کہ گانٹھوں کی جسامت کے تعین میں سہولیت کا لحاظ رکھا جاتا تھا اور دریا کے کنارے سامان باندھنے کی صورت میں وزن اس لحاظ سے متعین کیے جاتے کہ گانٹھیں موجودہ مشینی اوزار کی امداد کے بغیر اِدھر اُدھر منتقل کی جا سکیں۔ میں جدول بالا میں مندرج شکر اور شورہ کی گانٹھوں کے متعلق خیال کرتا ہوں کہ ان کے وزن کو کسی حالت میں بھی 300 ال۔بی سے زاید نہ رکھنے میں اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے حالانکہ زیادہ جسامت کے سامان مثلاً سوتی تاگے کا وزن اس سے کم ہو سکتا تھا خشکی کے راستہ سے ڈھوئے جانے والے سامان، وسائل باربرداری کا لحاظ رکھتے ہوئے باندھے جاتے تھے۔ عام اصول یہ تھا کہ ایک بوجھ میں دو گانٹھیں ہوا کرتیں جنھیں بیل یا اونٹ کی پشت پر ایک گانٹھ ایک طرف اور دوسری گانٹھ دوسری طرف لٹکا دیتے تھے بیل کا بوجھ تقریباً 300 ال۔بی ہوا کرتا[1] اور گجراتی نیل اور بنگالی ریشم کی گانٹھوں کی جسامت بھی باربرداری کے اس طریقہ کے لحاظ سے معین کی جاتی۔ آگرہ سے نیل اکثر اونٹوں پر ڈھوئی جاتی تھی جس کا بوجھ تقریباً 500 ال۔بی ہوا کرتا اور مندرجہ وزن اونٹ کے نصف بوجھ کا ہے۔ پس مال کے خشکی کے راستہ سے ڈھونے کی صورت میں تقریباً 150 ال بی کی گانٹھوں

---

[1] ٹیورنیئر (ج ۱ صفحہ 39) بیل کے بوجھ کو 300 سے 350 لیور سے تک بتاتا ہے منڈی اسے $2\frac{1}{2}$ ہنڈرویٹ یا 280 ال۔بی وزن خالص کہتا ہے۔ صفحہ 95 پر وہ اسے "4 بڑے من" تصور کرتا ہے جو یا تو جہانگیری (265 ال۔بی) یا شاہجہانی (296 ال۔بی) ہو سکتا ہے۔ وہ من کو لندن کے پیمانہ کا 6 گیلن یا بُشل بیان کرتا ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس کا مفہوم لندن کے کسی پیمانہ سے ہے۔ ان دنوں گیہوں کا عام گیلن، $8\frac{1}{2}$ ال۔بی ٹرائے یا 7 ال بی اور ڈیوآئز کے مساوی تھا جس سے من میں 112 ال۔بی ہوتا ہے لہٰذا وہ یا تو لندن کی کوئی دوسری اکائی استعمال کر رہا تھا یا اس سے حساب میں سہو ہوئی انگلستان میں غلہ کے سلسلہ میں استعمال ہونے والے اوزان اور پیمائشوں پر سرسری۔ ایم۔ واٹس کی تصنیف BRITISH WEIGHTS & MEASURES LONDON 1910. میں بحث آئی ہے۔ شمالی ہندوستان میں اب بھی ایک بیل کے لیے 4 من یا 330 ال۔بی کے وزن کا رواج ہے۔

کے وزن کا ایک معقول تخمینہ ہوگا اور اونٹوں کے کرایہ پر لے جانے کے صورت میں ان کا وزن تقریباً 250 ال۔بی ہوسکتا ہے۔ لیکن جب دریا کے کنارے مالوں کو دوبارہ باندھا جاتا تو گانٹھیں غالباً نسبتاً بڑی یعنی 300 ال۔بی کے انتہائی وزن تک کی ہوسکتی تھیں جہاں تک سوتی سامانوں کا تعلق ہے، وزن کے غیر مصرحہ ہونے کی صورت میں کیلیکوز 1000 سے لے کر 500 اگز تک کی گانٹھوں میں باندھے جاتے تھے۔

ہندوستان کے باہر کے تیار کیے ہوئے گٹھروں میں صرف دو قابل توجہ میں سیاہ مرچ کے تھیلے اور جاوتری کے گٹھر (سُکل۔ سُاکل)۔ بنتم میں سیاہ مرچ کے تھیلے تقریباً 62 ال۔بی کے ہوا کرتے تھے۔ جاوتری کے گٹھروں[ل] کے وزن میں بہت زیادہ فرق ہوا کرتا۔ بٹاویا جرنل، کے متعدد تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ یہ 120 اور 140۔ال۔بی کے درمیانی وزن کے ہوتے تھے۔

ضمیمہ 'د' کے ماخذ

اس ضمیمہ میں جن مسائل پر بحث آئی ہے، ان پر مراسلاتی تحریروں میں مندرج متعدد بیانات کی جانچ کے بعد رائے قایم کی گئی ہے۔ میں نے ان تحریروں کی مکمل فہرست نہیں دی ہے، لیکن میں امید کرتا ہوں کہ حسب ذیل حوالے میرے اخذ کردہ نتائج کی تائید کے لیے کافی ثابت ہوں گے۔

سکے : روپیہ کے لیے آئین اکبری (ترجمہ) ج ۱ ص 35-16 اور مختلف سکوں پر

ل اس قیاس کی کہ پی سُل، (PICUL) کو غلطی سے سُکل (SUCKELL) پڑھا گیا ہے CATTY کے بجر میں) ولندیزی تحریریں قطعی طور پر تردید کرتی ہیں۔ یہ امر کہ سکل، گٹھر HOBSON_JOBSON، ہوتا تھا، بٹاویا جرنل 31 مئی 1657 کے تحت مندرج ایک بیجک سے ثابت ہوتا ہے۔ اس میں سکل اور دیگر باندھنے کے سامانوں کی اخراجات، جاوتری کے لیے ادا کردہ قیمت سے علیحدہ درج کیے گئے ہیں۔

× SOOKEL

منہائیوں کے لیے ENGLISH FACTORIES, 1,113,236,248 ملاحظہ ہوں۔ جہانگیر کے
بڑے روپیہ کا ذکر PELSART 11 میں آیا ہے لیکن اس موضوع پر فرانسیسی ترجمہ بالکل صحیح نہیں
ہے۔ گلڈر کی مساوی قیمتوں کے لیے DAGH REGISTER, JUNE 21, 1634 JULY 31, 1641
FEBRUARY 17,1659, اور ریال کے لیے ENGLISH FACTORIES 1,8, ملاحظہ ہوں۔ ٹھٹھ
کی ٹکسال کا PURCHAS, iv-424 & ENGLISH FACTORIES 1-91, ii-25, v-225
میں ذکر آیا ہے۔ محمودی کی قیمت کے لیے ملاحظہ ہو LETTERS RECEIVED, 1-34,
ENGLISH FACTORIES -vi-91- viii-256 & COURT MINUTES, MAY 9,
1651 مغلوں کے تانبہ کے سکوں کے لیے ملاحظہ ہو آئین اکبری (ترجمہ) ج ۱ صہ 31، گجراتی
پیسہ کے لیے LETTERS RECEIVED; 1-33 & ENGLISH FACTORIES, 1 آنہ کے لیے
تصنیف مذکور 316 I.194, vi پگوڈوں پر HOBSON JOBSON, S.V. میں بحث آئی ہے۔ نئے
پگوڈوں کی قیمت میں تبدیلیوں کے لیے ملاحظہ ہو ENGLISH FACTORIES, 1-262,
x-33 & COURT MINUTES, MAY 9,1651 پرانے پگوڈوں کے لیے ملاحظہ ہو
TAVERNIER ii-90 ff. & ENGLISH FACTORIES, iv-80 ان کی زیادہ قیمتوں
کے بارہ میں تصنیف مذکورہ 42,103 ×، ix.51 ,291, 300 ii فنم اور لقد کے متعلق
'HOBSON-JOBSON, S.V.; BOWERY, 114; & SCHORER, PASSIN ملاحظہ ہو
اوزان: VANDERCHIJ'S میں مطبوعہ چارٹر کے دفعہ 40 میں ولندیزی کمپنی کو
ایمسٹرڈم پونڈ کا پابند کیا گیا تھا۔ لیور سے پر LA GRANNDE CYCLOPEDIA.S.V میں
بحث آئی ہے جہازی ٹن پر 'INDIA AT THE DEATH OF AKBAR' کے ضمیمہ میں بحث
آئی ہے۔ DAGH REGISTER مثلاً مورخہ 19 / فروری 1641، 14 / نومبر 1644 اور 8 / جون
1645 کی متعدد عبارتوں سے "لاسٹ" کا لفظ اخذ کیا گیا ہے ___ اکبر کے وزن کے لیے
PURCHAS, 1-iii-218, 'INDIA AT THE DEATH OF AKBAR, 53 ملاحظہ ہو
اور 21 / جون 1634 کا DAGH REGISTER جہانگیر نے اپنی نافذ کردہ تبدیلیوں کو تزک
جہانگیری ج 2 صہ 109 میں بیان کیا ہے۔ اس کے من کا ENGLISH FACTORIES, 1-199
PURCHAS 11 اور 8 / فروری 1634، 15 / جون 1636 اور 5 / جنوری 1645 (کورومنڈل)
کے DAGH REGISTER میں ذکر آیا ہے پیلی میں تبدیلی کا ذکر ENGLISH FACTORIES, vii

بین اور پٹنہ کے اوزان تصنیف مذکورہ 193. i اور 11/56 MUNDY میں ملتا ہے۔ شاہجہانی من کا مجھے پہلا تذکرہ 22 اکتوبر 1634 کے DAGH REGISTER میں ملا نیل کے لیے اکبری من ہی کے استعمال ہونے کی اطلاع TAVERNIER, i-38 & ENGLISH FACTORIES, VIII 202 v11-84; viii-202 میں ملتی ہے۔

گجراتی منوں کے لیے ملاحظہ ہوں LETTERS RECEIVED, i-34, v-106, vi-

DAGH REGISTER کے 1634 اور 24 فروری 1633 مئی 11 ENGLISH FACTORIES, i-60

اس تبدیلی کا میتھولڈ نے ENGLISH FACTORIES, v-156 میں ذکر کیا ہے۔ جنوبی ہند کے منوں کے لیے ملاحظہ ہوں ENGLISH FACTORIES, i-153, 255, 289; viii SCHORERR,

ENGLISH FACTORIES کے لیے اور کینڈی کے لیے PASSIM, & LETTERS RECEIVED, i-

202, 304; -ii فارسی منوں کا 23, LETTERS RECEIVED, v-194 میں، اراکان کے منوں کا 16 فروری 1632، 13 فروری 1637 DAGH REGISTER میں ذکر آیا ہے۔ چینی پیمانہ اوزان کے لیے HOBSON JOBSON، "کیٹی" اور "پیسول" کے تحت اور نیز 15 مارچ 1637 کا DAGH REGISTER اور باندہ کی کٹی کے لیے تصنیف مذکورہ مورخہ 27 ستمبر 1636 اور PURCHAS, i-iii-203 ملاحظہ ہوں۔

پیمائشیں :- گز کے لیے ملاحظہ ہو آئین اکبری (ترجمہ) ج (2) 61-58 ENGLISH FACTORIES, i-192, viii گجراتی پیمائشوں کے لیے تصنیف مذکورہ 241. i. 21, iii. 356, vi. اور ENGLISH FACTORIES, v14 سندھ کے لیے LETTERS RECEIVED, i-34 اور مشرقی ساحل کے لیے مورخہ 1 فروری 1637 LETTERS RECEIVED, vi- PURCHAS, iv DAGH REGISTER, LETTERS RECEIVED, i- تھانوں کی لمبائیوں کے حوالے، بافتوں کے MASTER, i- ENGLISH FACTORIES, iii-247 وتیوں کے لیے مذکورہ تصنیف 9- 62, iv-1 اسپانوز کے لیے تصنیف مذکورہ 134 -VI اور 239-LETTERS RECEIVED, iv سندھ کے مال کے لیے ENGLISH FACTORIES, v-129, vi-136; مرکوزیر کے لیے تصنیف مذکورہ 123, vii 311, vi. اور گزیوں کے لیے تصنیف مذکورہ 7 .vii۔

LETTER BOOK, 11, لانگ کلاتھ اور ساحل کے دوسرے تھانوں کی لمبائی وچوڑائی

سے ماخوذ ہے، شمالی افریقی مالوں کی LETTERS RECEIVED, 1, سے ملک گنی کے لیے مثالوں کی لمبائی چوڑائی 13 / فروری 1637 کے DAGH REGISTER اور متعدد ولندیزی بیجکوں سے ماخوذ ہے۔ ایشیائی تجارت کے لیے مطلوبہ لمبائی و چوڑائی کی مثالیں ENGLISH FACTORIES, iv- 204, v اور 15 / مارچ 1637، 29 / دسمبر 1644 اور 14 / مئی 1645 کے DAGH REGISTER میں ملتی ہیں۔

گانٹھیں: گانٹھوں کی جسامت کے حوالے، آگرہ کی نیل کے لیے ENGLISH FACTORIES, vii, 84, اور DAGH REGISTER مورخہ 20 / مئی 1641 اور 20 / جون 1642، گجراتی نیل کے لیے O.C. 1656 (بیجک) اور 20 / مئی 1641، 3 / جولائی 1643 کے DAGH REGISTER شکر کے لیے تصنیف مذکورہ مورخہ 20 / مئی 1641 شورہ کے لیے تصنیف مذکورہ 20 / جون 1642 ریشم کے لیے تصنیف مذکورہ 20 / مئی 1641، سوت کے لیے تصنیف مذکورہ 4 / دسمبر 1634، تھانوں کے لیے تصنیف مذکورہ مورخہ 14 / مارچ 1637، 20 / مئی 1641 اور O.C 1656 (بیجک)۔ باربرداری کے جانوروں کے لیے ملاحظہ ہو: ENGLISH FACTORIES, i-73, 76; ii- سیاہ مرچ کے تھیلوں کے لیے ملاحظہ ہو 161 iii اور 21 / اگست 1631 کا DAGH REGISTER اور جاوتری کے گٹھر کے لیے تصنیف مذکورہ مورخہ 29 / ستمبر 1625، 29 / ستمبر 1628، 7 / مئی 1637 اور اس کے بعد کے متعدد اندراجات۔

ضمیمہ

فہرست ماخذ....

یہ فہرست کتاب کے متن کے نوٹ میں استعمال کیے گئے مخففات یا کلیدی الفاظ کے حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے۔

AGRA ACCOUNTS :- آگرہ میں ولندیزیوں کی تجارتی کوٹھی کے 39-1637 کے حالات 'دی ہیگ پبلک رکارڈ آفس' میں موجود W. GELENSSEN DE JONGH کے ذخیرہ میں نمبر شمار 120 اور 123 پر درج ہیں۔

Ain آئین اکبری، مولفہ ابوالفضل علامی۔ فارسی متن مرتبہ ایچ۔ بلاک مین اور ترجمہ بلاک مین اور جیرٹ ہر دو شائع کردہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔

AKBAR NAMA ، اکبر نامہ، مصنفہ ابوالفضل علامی۔ فارسی متن مرتبہ و ترجمہ ایچ بیوریج ہر دو شائع کردہ ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔

ALBOQUERQUE, COMMENTARIES DO GRANDO ALFONSO DALBOQUERQUE تیسرا پرتگالی ایڈیشن۔ لزبن 1774۔

ASCOLI EARLY REVENUE HISTORY OF BENGAL & THE FIFTH REPORT- 1812, BY, F.D.ASCOLI OXFORD 1917

BADSHAH NAMA :- بادشاہ نامہ، مصنفہ عبدالحمید لاہوری۔ ببلیوتھیکا انڈیکا شائع کردہ

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔

<u>BAINES</u> HISTORY OF THE COTTON MANUFACTURE'S IN GREAT BRITAIN BY EDWARD BAINES, LONDON, 1835.

BARBOSA THE BOOK OF DURATE BARBOSA TRANSLATED BY M.LONGWORTH (COLLECAS DE NOTICIAS PARA پرتگال متن DAMES FOR HAKLUYT SOCIETY. A HISTORIC.GEOGRAPHIC DES NACCES, ULTRA MARINAS.VOL ii.No.xii ← ISSUED BY THE LISBON ROYAL ACADEMY OF SCIENCES)

BARROS DA ASIA (DECADES) BY J.DE BARROS, LISBON 1777 etc.

BEGINENDE VOORTGANGH 'BEGINENDE VOORTGANG, VAN DE VEREENIGDE, NEDERLANDTSCHE GEOOTROYEERD OOST INDISCHE COMPAGNIE, AMSTERDAM 1646'

BERNIER TRAVELS IN THE MOGHUL EMPIRE BY F.BERNIER, REVISED EDITION 1656-58 BY A.CONSTABLE LONDON 1891.

<u>BOWERY</u> A GEOGRAPHICAL ACCOUNT OF THE COUNTRIES ROUND THE BAY OF BENGAL BY J.BOWREY, EDITED BY SIR RICHARD TEMPLE FOR THE HAKLUYT SOCIETY.

CALENDAR <u>S.P.</u> CALENDAR OF STATE PAPERS COLONIAL SERIES. EAST INDIA ETC.1516-1639 BY E.SAINSBURY. LONDON 1862.

CAMB.MOD.HISTORY THE CAMBRIDGE MODERN HISTORY VOL I-V. CAMBRIDGE 1902.

CAMPOS HISTORY OF THE PURTUGESE IN BENGAL BY J.J.A. CAMPOS, CALCUTTA 1919.

CASTENHEDA HISTORIA DO DESCOBRIMENTS CONQUISTA DA INDIA BY F.L. CONSTANHEDA LISBON 1830.

CORREA LENDAS DA INDIA BY G. CORREA LISBON 1858 etc.

COURT MINUTES (1) CALENDAR OF THE COURT MINUTES OF E.I.CO. BY E.B.SAINSBURY. OXFORD 1907 ETC. (2)THE M.S. COURT MINUTES IN THE INDIA OFFICE RECORDS. (میں نے مندرجہ اندراجات کی تاریخوں کی نشاندہی کی ہے جو کیلنڈر اور نیز اصل کاغذات دونوں ہی کے حوالوں کا کام کرتی ہیں)۔

COUTO DA ASIA DECADAS BY D DE COUTO LISBON 1777 ETC.

CUNNINGHAM 'GROWTH OF ENGLISH INDUSTRY AND COMMERCE BY W. CUNNINGHAM 3RD EDITION, LONDON 1903.

DAGH REGISTER DAGH REGISTER GEHOUDEN INT CASTEEL BATAVIA & THE HAGUE 1896-1919 ولندیزی حکام کا سرکاری روزنامچہ 1624-81. (کسی مندرجہ اندراج کے بعد کسی نام مثلاً سورت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ اندراج اس انتظامی مرکز کی فصل کے ذیل میں ملے گا۔ بہت تھوڑی جلدیں، بہ اعتبار فصل مرتب کی گئی ہیں اور معمولاً

تاریخ ہی قلمبند کی ہوئی عبارت کی رہنمائی کے لیے کافی ہے)۔

DALGADO_ 'GLOSSARIO LUSO-ASIATICO' BY S.R. DALGADO COIMBRA, 1919-21.

DANIEALS THE EARLY ENGLISH COTTON INDUSTRY BY G.W. DANIELS, MANCHESTER 1920.

DANVERS THE PORTUGESE IN INDIA BY F.C. DANVERS, LONDON 1894

DE JONGE: DE OPKOMST VAN HET NEDERLANDSCH GEZAG IN OOST INDIE BY J.K.J DE JONGE AMSTERDAM & THE HAGUE 1862 ETC.

DE LAET THE IMPERIO MEGNIMOGOLIS BY J.DE.LAET, LEYDEN 1631 FINCH.

DELLA VALLE THE TRAVELS OF PICTRO DELLA VALLE TO INDIA, EDITED BY E GRAY FOR THE HUKLUYT SOCIETY.

DUTCH IN MALBAR: SELECTIONS FROM THE RECORDS OF THE MADRAS GOVT, DUTCH RECORDS NO.13 - THE DUTCH IN MALABAR, MADRAS 1911.

EARLY TRAVELS: EARLY TRAVELS IN INDIA, EDITED BY W.FOSTER, OXFORD 1921. HAWKINS MILDENHALL FINCH CORYAT, WITH- (اس میں INGTON اور TERRY کی سرگذشتیں شامل ہیں)۔

EDMUNDSON: HISTORY OF HOLLAND BY G.EDMUNDSON CAMBRIDGE 1922.

ELIAS: HET VOORSPEL VAN DEN EERSTEN ENGELSCHEN OORLOG BY J.E. ELIAS, THE HAGUE 1920.

ELLIOT: THE HISTORY OF INDIA AS TOLD BY ITS OWN HISTORIANS
سر ایچ۔ ایم ایلیٹ کی تحریروں سے۔ لندن 77 -1867۔

ENGLISH FACTORIES : THE ENGLISH FACTORIES IN INDIA BY W.FOSTER. OXFORD 1906 ETC. (اس کی جلدوں کی شناخت ان برسوں سے ہوتی ہے جن پر وہ 1618 کے بعد کی مدت میں حاوی ہیں۔ حوالے کے اختصار کے خاطر میں نے ان جلدوں کے لیے برائے سنوات 21-1618 عدد i اور برائے سنوات 60-1655 عدد x استعمال کیے ہیں)۔

ETHERIDGE: REPORT ON PAST FAMINES IN THE BOMBAY PRESIDENCY. BY A.T.ETHERIDGE. BOMBAY 1668.

FACTORY RECORDS ملاحظہ ہو انڈیا آفس رکارڈس۔

FARIA Y SOUSA THE PURTUGESE ASIA BY M.DE FARIA Y SOUSA, TRANSLATED BY J STEVENS LONDON 1695.

FIRST LETTER BOOK: THE REGISTER OF LETTERS ETC. OF THE GOVERNER & COMPANY OF MERCHANTS TRADING INTO THE EAST INDIA 1600-19 (یہ نام کتاب کے سرورق سے ماخوذ ہے۔ سرورق پر کتاب کا نام اس طور پر THE FIRST LETTER BOOK OF THE EAST INDIA COMPANY. LONDON 1893. درج ہے

FRYER: A NEW ACCOUNT OF EAST INDIA & PERSIA BY J. FRYER EDITED BY W. CROOKS FOR THE HAKLUYT SOCIETY.

GUJRAT REPORT گجرات کی مختلف منڈیوں سے متعلق ولندیزیوں کی ایک قلمی رپورٹ بابت سنوات قبل 1630 ہیگ میں وجود W. GELEYNSSEN DE JONG ذخیرہ کا نمبر 28۔

HAGUE RECORDS اس سے مراد وہ غیر مطبوعہ تحریریں ہیں جو ہیگ کے ولندیزی پبلک رکارڈ آفس کے محافظ خانہ میں موجود ہیں۔

HAGUE TRANSCRIPTS انڈیا آفس میں ولندیزی کاغذات کے سلسلہ موسومہ TRANSCRIPTS FROM ARCHIVES THE HAGUE کے نقول میں نے ان تین سلسلوں کے لیے یہ رومن اعداد استعمال کی ہیں LETTERS FROM THE EAST-I کے لیے LE- TTERS FROM THE DUTCH CO. TO THE EAST-II کے لیے اور LETTERS FROM THE GOVERNOR GENERAL TO HIS SUBORDINATES III کے لیے

HAY ' DE REBUS LAPONICIS, INDICIS ET PERVANIS' BY JOHN HAY, ANTWERP 1605.

HOBSON-JOBSON: A GLOSSARY OF COLLOQUIAL ANGLO-INDIAN WORDS AND PHRASES. NEW EDITION, EDITED BY W. CROOKE, LONDON 1903.

HOUTMAN :- DE EERSTE SCHIPVAART DE NEDERLANDERS NAAR OOST INDIE ONDER CORNELIS DE HOUTMAN- 1595-97 (LODEWYEKSZ, JOURNAL OF THE FIRST DUTCH VOYAGE ROUND THE CAPE) EDITED BY G.P. ROUFFAER & J.W. IJZERMAN FOR THE LINSCHOTEN VEREENIGING 1915.

IMPERIAL GAZETTEER : THE IMPERIAL GAZETTEER OF INDIA OXFORD 1908.

INDIA RECORD OFFICE ان کاغذات کی تفصیل A GUIDE TO THE INDIA OFFICE RECORD BY W.FOSTER. LONDON 1919. میں موجود ہے۔ میں نے جن سلسلوں سے حوالے اخذ کیے ہیں وہ "FACTORY" "COURT MINUTES" "ORIGINAL CORRESPONDENCE" RECORDS" اور "LETTER BOOKS" ہیں۔ ان سب کی زیادہ تفصیلات مذکورہ گائڈ میں ملتی ہیں۔

JOURDAIN : JOHN JOURDAIN'S JOURNAL OF A VOYAGE TO THE EAST INDIES EDITED BY W.FOSTER FOR THE HAKLUYT SOCIETY.

JOURNAL A.S.B. THE JOURNAL OF THE ASIATIC SOCIETY OF BENGAL-CALCUTTA.

JOURNAL R.A.S.: THE JOURNAL OF THE ROYAL ASIATIC SOCIETY OF GREAT BRITAIN & IRELAND, LONDON.

LETTER BOOK ملاحظہ ہو انڈیا آفس رکارڈس۔

LETTERS RECEIVED: LETTERS RECEIVED BY THE EAST INDIA CO. FROM ITS SERVANTS IN THE EAST (1602-17) LONDON 1896-1901.

LINSCHOTEN . THE VOYAGE OF JOHN HUOFGHEN VAN LINSCHOTEN TO THE EAST INDIES. TRANSLATION EDITED BY A.C. BURNELL AND P.A. LINSCHOTEN VERECNVI (ٹیل نے THICLE FOR THE HUKLUYT SOCIETY.

1910 GING کے لیے H. KERN کے شائع کردہ متن سے بھی رجوع کیا ہے۔ میں نے
ابواب کے جو حوالے دیے ہیں ان کا اطلاق مساوی طور پر ہوتا ہے۔

LARSON TRANSCRIPTS انڈیا آفس کی پرتگیزی تحریروں کے نقول و ترجمے جیسے دیے
گئے ہوئے جملہ حوالے سلسلہ "BOOKS OF THE MONSOONS" کے ترجمہ سے متعلق ہیں۔

SULTAN ... اس سرگزشت کے اقتباسات ایلیٹ میں ہیں۔ برٹش میوزیم
کا 1903 .OR وہ واحد مخطوطہ ہے جو مجھے دستیاب ہو سکا۔

MANDESLO: VOYAGES & TRAVELS INTO THE EAST INDIES BY J.A. DE MANDELSLO. TRANSLATED BY JOHN DAVIES: SECOND EDITION, LONDON 1669. (اصل تصنیف میری نظر سے نہیں گذری۔ اس "ترجمہ" کا زیادہ کام مدیروں کا ہے۔
ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ نے اپریل 1951 کے جرنل R.A.S. میں اس کی بحیثیت ایک ماخذ کے قدر و
قیمت پر بحث کی ہے)۔

MANRIQUE مجھے FRAY SEBASTAIN MANRIQUE کی تصنیف INTENERARIES کا
اصل نقد نہ مل سکا۔ میں نے جو حوالے دیے ہیں وہ چند ابواب کے ترجموں کے ہیں جن
میں سے ای میکلاگن نے جرنل پنجاب ہسٹوریکل سوسائٹی۔ 1911 ج (1) 83، 513 میں
شائع کیا ہے۔

MANUCCI. STORIA DO MOGOR BY N. MANUCCI TRANSLATED BY W. IRWINE, LONDON 1907.

MASTER: THE DIARIES OF STREYNSHAM MASTER, 1675-1680 EDITED BY SIR RICHARD TEMPLE LONDON 1911.

MATHWOLD اس سے مراد RELATIONS OF THE KINGDON OF GOLKONDA AND
OTHER NEIGHBOURING NATIONS WRITTEN BY W. METHWOLD. اور مطبوعہ
PURCHAS HIS PILGRIMAGE, چوتھی اشاعت، لندن 1626 میں۔

MIDDLETON: THE VOYAGE OF SIR HENRY MIDDLETON TO BANTAM AND THE MALUCS ISLANDS. EDITED BY B. CORNEY FOR THE HAKLUYT SOCIETY.

MUNDY: THE TRAVELS OF PETER MUNDY INERUOOPE AND ASIA 1608-1667 EDITED BY SIR RICHARD TEMPLE FOR THE HAKLUGT SOCIETY.

ORIGINAL CORRESPONDENCE ملاحظہ ہو انڈیا آفس ریکارڈس۔

OVINGTON: A VOYAGE TO SURAT IN THE YEAR 1684 BY J. OVINGTON LONDON 1696.

PELSART: AN ACCOUNT (RAMONSTRAUTIC) OF LIFE IN AGRA.
اسے 1626 میں ایف۔ پلسارٹ نے ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام کی واقفیت کے
لیے تصنیف کیا تھا۔ اس کا ایک فرانسیسی ترجمہ RELATIONS DE DIVERS VOYAGES
CURIEUSE. مطبوعہ ایم۔ تھیونو، پیرس 1663 میں شامل ہے لیکن یہ تلخیص کی صورت میں
ہے اور اکثر مقامات پر غلط بھی ہے۔ میں نے ہمعصر ولندیزی مخطوطہ پر اعتماد کیا ہے۔

PURCHAS: PURCHAS HIS PILGRIMES BY S. PURCHAS (حوالے ابتداً والے
گئے صفحات کے مطابق ہیں جو ہکلیٹ سوسائٹی۔ گلاسگو 1905 کی دوسری اشاعت کے
حاشیہ پر مندرج ہیں) PURCHAS HIS PILGRIMAGE کے لیے ملاحظہ ہو میتھولڈ کے تحت۔

PYRARD: THE VOYAGE OF FRANCOIS PYRARD OF LEVEL TO THE EAST INDIES. TRANSLATED AND EDITED BY A. GRAY FOR THE HAKLUIT SOCIETY.

RAYNAL; A PHILOSOPHICAL AND POLITICAL HISTORY OF THE SETTLEMENT AND TRADE OF THE EUROPEANS IN THE EAST AND WEST INDIES
J. JUSTAMOND نے اس کار (RANAL کی) فرانسیسی زبان سے ترجمہ کیا ہے۔ اڈنبرا۔ 1776۔

REALIA; REGISTER OP DE GENERALE RESOLUTION VAN HET CASTEEL BATAVIA ½ LEYDEN AND THE HAGUE 1882-85.

RENNEVILLE; RECUEIL DES VOYAGES? ROUEN 1725 (BEGIN ENDE' VOORT GANGH. کا معہ اضافہ کے ترجمہ)۔

ROE; THE EMBASSY OF SIR THOMAS ROE 1615-1619 مطبوعہ ڈبلو فاسٹر برائے ہکلیٹ سوسائٹی۔

SARKARS ADMINISTRATION; MUGHAL ADMINISTRATION BY JADUNATH SARKAR CALCUTTA 1920.

SARKARS AURANGZEB; HISTORY OF AURANGZEB BY JADU NATH SARKAR? CALCUTTA 1919.

SCHORER; CORT VERHAEL VAN DE CUST VAN CHORMANDEL
(OVERAGE یہ ساحل کورومنڈل کے حالات کا ایک قلمی نسخہ ہے جو 1616 میں ہالینڈ پہنچا تھا

KOMMEN BRIEVEN 1616, EERSTE BOOK, HAGUE RECORDS.

SCOTT: CONSTITUTION FINANCE OF ENGLISH, SCOTTISH & IRISH JOINT STOCK COMPANIES TO 1720 BY W.A. SCOTT, CAMBRIDGE 1910.

SEWELL: A FORGOTTEN EMPIRE BY R. SEWELL LONDON 1900.

SMITH' AKBAR; AKBAR THE GREAT MOGHAL BY V.A. SMITH 2ND EDITION OXFORD, 1919.

TAVERNIER; TRAVELS IN INDIA BY J.B. TAVERNIER EDITED BY V. BALL. LONDON 1889.

TAYLORS DACCA; SKETCH OF THE TOPOGRAPHY AND STATISTICS OF DACCA BY DR. J. TAYLOR, CALCUTTA 1840.

TERPESTRA'S KORMANDEL; DE VESTIGING VAN DE NEDERLANDERS AAN DE KUST VAN KOROMANDEL BY TERPESTRA GRONNIGEN 1911.

TERPESTRAS SURAT; DE OPKOMST DER WESTER _ KWARTIERSON. VAN DE OOST INDISCHE COMPANIE (SURATTE, ARABIC, PERZIE) BY H. TERPESTRA THE HAGUE 1918.

THEVNOT; LES VOYAGES DE M (JEAN) DE THEVNOT AUD INDIES ORIENTALES AMSTERDAM 1727 - MELCHISECH THEVNOT.
سمندری سفروں کے مجموعے

کے لیے ملاحظہ پلیسارٹ کے تحت۔

THOMAS; THE REVENUE RESOURCES OF THE MUGHAL EMPIRE IN INDIA BY E. THOMAS LONDON 1871.

TUZUK; MEMOIRS OF JAHANGIR, ترجمہ اے۔ راجرز۔ مطبوعہ ایچ بیورج براۓ رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ لندن۔ 4-1909-14

VALENTIJN; OUD EN NIEW OOST INDIEN I. VALENTIJN; AMSTERDAM 1725-26

VANDER CHIJS ; GEOCHIEDENIS DER STICHING VANDER VEREENIGDE O. I. CAMPAGNIE? BY J. A. VANDERCHIJS. 2ND EDITION. LEYDEN 1857

VANDIJK; "ZES JAREN NIT HET LEVEN VAN WEMMER VAN BERCHEM BY L.C.D. VAN DIJK AMSTERDAM 1858.

VANLOON; THE FALL OF THE DTUCH REPUBLIC BY H.W. VAN LOON. LONDON 1913.

VAN TWIST; GENERALE BESCHRIJVINGE VAN INDIAN BY J. VAN TWIST, AMSTERDAM 1648.

WHITE WAY; THE RISE OF THE PORTUGUESE POWER IN INDIA BY R. S. WHITE WAY, LONDON 1899.